اُردو زبان اور اُردو رسم الخط

لسانی تعبیر اور روحانی تفسیر

ترتیب وتدوین

پروفیسر فتح محمد ملک

رَأسُ الحِکمَۃِ مَخَافَۃُ اللّٰہِ

اللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالأَرض

SÁLÁNA सालाना
वार्षिक (Várshik وارشک) साल भर का (Sál bhar ka سال بھر کا) साल में एक बार होने वाला (Sál meg ek bár hone

SÁDA-KAR सादाकार
वह सुनार जो चांदी सोने पर बेल बूटे बनाता हो

اِک وَلولۂ تازہ دیا مَیں نے دِلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بُخارا و سمرقند!
— اقبال

مقتدرہ قومی زبان

پاکستان

اُردو زبان اور اُردو رسم الخط

لسانی تعبیر اور روحانی تفسیر

ترتیب و تدوین

پروفیسر فتح محمد ملک

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

۲۰۰۸ء

سلسلہ مطبوعات مقتدرہ: ۴۸۳

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN ۹۶۹-۴۷۴-۲۱۰-۶

☆

طبع اوّل ۲۰۰۸ء

تعداد .... پانچ سو

قیمت .... ۳۰۰/= روپے

کمپوزنگ .... مختار احمد

ترتیب و صفحہ بندی .... منظور احمد

طابع .... ورڈ میٹ پرنٹرز، اسلام آباد

سرورق و اہتمامِ اشاعت .... تجمل شاہ

ناشر .... مقتدرہ قومی زبان،
ایوانِ اُردو، پطرس بخاری روڈ،
ایچ۔۸/۴، اسلام آباد، پاکستان۔
فون: ۹۲۵۰۳۱۱-۱۲-۱۳

☆

ترتیب

☆☆☆

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

اقبالؔ

پیش لفظ

اُردو رسم الخط کے خلاف گزشتہ دو سو سال سے جاری مہم جارحانہ ہندو احیائیت کی سیاست کا شاخسانہ ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے طویل دورِ اقتدار کے دوران بلادِ اسلامیۂ ہند میں جو عظیم الشان ہند اسلامی کلچر وجود میں آیا تھا اُردو زبان اُس کا ایک حسین، توانا اور متحرک عوامی مظہر ہے۔ جب مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھین کر انگریز برصغیر پر قابض ہو بیٹھے تو ہندو احیائیت کے علمبرداروں نے انگریزوں کی سرپرستی میں ہند اسلامی کلچر کی اسلامی شناخت کو مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ اُردو زبان کے عربی رسم الخط کے ساتھ ساتھ اُردو میں شامل عربی فارسی الفاظ مسلمانوں کے خلاف منافرت کی اس مہم کا اوّلیں نشانہ بنے۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے منشی للولال جی نے ۱۸۰۳ء میں ''پریم ساگر'' کی صورت میں اُردو پر پہلا پتھر پھینکا۔

ہر چند فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی شعبے کے صدر ڈاکٹر گلکرسٹ کی سرپرستی کے باوجود اُردو کو ہندی بنا ڈالنے کا یہ تجربہ بڑی حد تک ناکام رہا تاہم بہت جلد بنارس کی ہندی پرچارنی سبھا کی سی متعدد انجمنیں سیاسی محاذ پر سرگرمِ عمل ہو گئیں اور گورنر میکڈونلڈ کی استعماری سیاست اور گریرسن کا لسانی استعمار اِن انجمنوں کی سرپرستی کو اپنا قومی فریضہ سمجھنے لگا۔ یہ امر بہت معنی خیز ہے کہ عربی فارسی الفاظ سے ''پاک'' اور سنسکرت الفاظ سے گراں بار خالص ہندی کی پہلی کتاب ہندو احیا کی جارحیت پسند تنظیم آریا سماج کے بانی دیانند سرسوتی کی مشہور تصنیف ''ستیارتھ پرکاش'' ہے۔ وی ڈی ساورکر نے ہندو مہاسبھا کے ۱۹۳۹ء کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اِس کتاب کے حوالے سے اعلان کیا تھا کہ چونکہ برصغیر کے مختلف خطوں میں آباد ہندوؤں کی زبان ہندی ہے اس لیے ہر ہندو کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ اس آریا بھاشا کے فروغ کی خاطر سرگرمِ عمل ہو جائے۔ آریا سماج اور ہندو مہاسبھا کی آئیڈیالوجی کے پیروکار دانشوروں نے جہاں دیوناگری رسم الخط میں لکھی

جانے والی ہندی زبان کو برصغیر میں بین الہندو (Pan-Hindu) زبان قرار دیا وہاں اُردو کو ''مسلمانی بھاشا'' اور ''ملیچھ بھاشا'' قرار دیا۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنی کتاب ''ایک بھاشا: جو مسترد کردی گئی'' میں ملیچھ بھاشا کے کلمۂ تحقیر کو شتی کنٹھ مشر کی کتاب ''کھڑی بولی کا آن دولن'' کے حوالے سے چندر دھر شرما گلیری کی ایجاد بتایا ہے۔ بہت جلد اس ایجاد نے ہندو انتہا پسندوں میں بے پناہ مقبولیت پائی اور یوں ''ملیچھ بھاشا'' کو پوتر ہندی بنانے کے عمل نے زور پکڑ لیا۔

بیسویں صدی کا المناک ترین سانحہ یہ ہے کہ اِس کی تیسری دہائی کے آغاز ہی میں انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں اپنے وسیع النظر اور صلح کُل مسلک سے منحرف ہو کر انتہا پسند ہندو سیاست کا مسلمان دشمن لسانی اور تہذیبی ایجنڈا اپنا لیا۔ فطری ارتقاء کے صدیوں پر پھیلے ہوئے لسانی اور تہذیبی مراحل طے کرنے کے بعد اُردو کا نام پانے والی زبان کو جب گاندھی جی کی قیادت میں پہلے ہندی اور پھر ہندوستانی زبان بنانے کی پُرتصنع لسانی سیاست نے زور پکڑا تو کانگریسی مسلمانوں میں اضطراب کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس کتاب میں شامل پنڈت نہرو کے نام سیّد محمود کا خط شامل ہے جس میں کانگریس کی لسانی سیاست پر احتجاج کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد محمود نے سوال اُٹھایا ہے کہ مہاتما گاندھی اُردو کو مسلمانوں کی مذہبی زبان کیوں قرار دیتے ہیں؟ علامہ نیاز فتح پوری اور منشی پریم چند کی خط و کتابت بھی آئندہ صفحات میں درج کر دی گئی ہے جس میں منشی پریم چند علامہ نیاز فتح پوری کے اُٹھائے ہوئے اسی طرح کے سوالات کو ''اُردو فسطائیت'' کا نام دیتے ہوئے ذرا نہ شرمائے تھے۔ جہاں تک مجوزہ "Pan-Hindu" ہندی زبان کے غیر سائنسی، پُرتصنع اور خود ہندوؤں کے لیے ناقابلِ فہم ہونے کا ثبوت مہاتما گاندھی نے سُندر لال جی کے نام اپنے خط میں فراہم کر دیا ہے۔ ایک ہندو عقیدت مند کے نام پندرہ سطروں پر مشتمل اِس خط میں مہاتما جی اُنیس الفاظ کے اُردو مترادفات دینے پر اِس لیے مجبور ہوئے کہ اُنھیں یقین تھا کہ اُن کا ہندو مکتوب الیہ اِن الفاظ کا مطلب نہ سمجھ سکے گا۔ چنانچہ اُنھیں درج ذیل اُنیس الفاظ کا مفہوم اُردو (ملیچھ بھاشا) میں سمجھانا پڑا:

۱۔ لیکھ (مضمون)
۲۔ نرمل ہتیو (نیک نیتی)
۳۔ پرتھن (کوشش)
۴۔ یوجنا (تقرر)
۵۔ شبد (لفظ)

۶۔	پرچلت	(جاری)
۷۔	دیاکھیا	(تشریح)
۸۔	ہتیو	(مقصد)
۹۔	کارن	(وجہ)
۱۰۔	ویاکرن	(قواعد)
۱۱۔	سوکھرت	(منظور)
۱۲۔	لیکھک	(مصنف)
۱۳۔	مہیا	(غلط)
۱۴۔	کارن	(وجہ)
۱۵۔	تیاگ	(چھوڑنا)
۱۶۔	ڈھیریہ	(اطمینان)
۱۷۔	پرشنوں	(سوالوں)
۱۸۔	اتر	(جواب)
۱۹۔	بھیر	(مشغولیت)

قوسین میں دیے گئے اُردو الفاظ کو اچھوت قرار دے کر زبان سے خارج کر دینے کی اس حکمتِ عملی کے برعکس مسلمانوں نے نہ ہندوؤں کو اچھوت سمجھا اور نہ ہی اُن کی بولیوں کو۔ اُردو کی ابتدائی نشو ونما کا خیال کرتا ہوں تو مجھے وہ مسلمان یاد آتے ہیں جو پہلے پہل ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ ہندوستان میں آباد ہونے والے یہ اوّلین مسلمان اُردو بولتے ہوئے ہندوستان میں واردنہ ہوئے تھے۔ عربی، فارسی اور ترکی ان کی مادری زبانیں تھیں۔ اُردو کی ابتدا اور مسلسل نشو ونما مقامی زبان کے ساتھ ان مسلمانوں کے عشقانہ سلوک کا نتیجہ ہے۔ صوفیائے کرام نے برصغیر کے ہر خطّے میں اپنے انسان دوست طرزِ حیات کی مثال قائم کی اور یوں خلقِ خدا اُن کی جانب کھنچی چلی آئی۔ اگر ہم صرف پنجاب میں اجودھن (پاک پتن شریف) اور دکن میں گلبرگہ کی مثال سامنے رکھیں تو چشتی صوفیا کا عاشقانہ مسلک ایک نئی زبان کو جنم دیتا نظر آتا ہے۔ اُردو کا ابتدائی زمانہ وہ زمانہ ہے جب علم پر برہمن کی اجارہ داری ہے اور دیوتا بانی (سنسکرت) برہمنوں کی مقدس زبان ہے۔ عوام کی زبانیں مبتذل (Vulger) قرار پائی ہیں۔ مسلمہ انسانی حقوق سے محروم اچھوت اور دیگر نچلی ذاتوں

کے ہندوؤں کو لکھنے پڑھنے کی آزادی بھی میسر نہیں ہے۔ چنانچہ ان کی بولیوں کا کوئی رسم الخط بھی نہیں ہے۔ صوفیا کے طرزِ احساس اور طرزِ حیات سے متاثر ہو کر یہ لوگ جب جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو اُنھیں دیگر انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا حق بھی مل جاتا ہے۔ صوفیا کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر کے لکھنا سیکھنا چاہتے ہیں تو لامحالہ صوفیائے کرام اُنھیں وہی عربی/ فارسی رسم الخط سکھاتے ہیں جو انھیں آتا ہے۔ چنانچہ اُردو زبان کو ابتدا ہی میں عربی/ فارسی رسم الخط کی نعمت میسر آ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر کے ہر خطے کی زبان میں بالکل قدرتی طور پر عربی/ فارسی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ صدیوں یہ لسانی عمل جاری رہا۔ تب جا کر کہیں اُردو زبان ہند اسلامی کلچر کی علامت بن کر اُبھری۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی موت کے بعد جب برطانوی استعمار کی سرپرستی میں ہند اسلامی کلچر کے اسلامی عناصر کو ملیا میٹ کر کے آمدِ اسلام سے پیشتر کے خالص ہندو کلچر کے احیا کے عمل نے جارحانہ رُخ اختیار کیا تو اُردو زبان کے ملیچھ الفاظ کے اخراج اور اس کے عربی/ فارسی رسم الخط کو دیوناگری رسم الخط میں بدلنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ یوں رفتہ رفتہ ایک مصنوعی جناتی زبان نے ہندی کا نام پایا۔

خود ہندوؤں کے لیے اِس بالکل اجنبی اور سراسر ناقابلِ فہم ہندی زبان کو اُردو کے وسیلے سے مقبول بنانے کی یہ مہم گزشتہ دو صدیوں سے جاری ہے۔ اکیسویں صدی میں اس مہم نے گیان چند جین کی ہنگامہ خیز کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے قالب سے از سرِ نو جنم لیا ہے۔ ہندوستانی دانشوروں نے اس پرانی مہم کے نئے پیرہن کو تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شمیم حنفی نے اِس کتاب کو بجا طور پر ''فسطائیت کا لسانی اور ادبی محاذ'' قرار دیا ہے۔ متعدد مقالہ نگاروں نے اِس کے جواب میں ''دو زبانیں، دو رسم الخط اور دو ادب'' کا نظریہ زبان کے سائنسی اصولوں کی روشنی میں پیش کر دیا ہے۔ اِن میں سے بیشتر تحریریں اس کتاب میں شامل ہیں لیکن یہ کتاب صرف اکیسویں صدی میں برپا ہونے والے لسانی ہنگامے تک محدود نہیں ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ عہد در عہد سر اُٹھانے والی اِس مہم کو ہر عہد کے سیاق و سباق میں پیش کر دیا جائے۔ اُردو رسم الخط کے تنازع کو پاکستان میں وقتاً فوقتاً کی گئی رومن رسم الخط کی وکالت کی سیاست کے تناظر میں بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُردو سے عربی فارسی الفاظ کے اخراج اور اُردو کے عربی رسم الخط کے ترک اور اُس کی جگہ دیوناگری یا رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کی اِس حکمتِ عملی کا زبانوں کے آغاز و ارتقاء کے لسانی اصول و قواعد سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ دو صدیوں پر پھیلتی چلی جانے والی ہندو احیائیت کی اِس بنیاد پرست مہم کا تعلق برصغیر کے ہند

اسلامی کلچر کی اسلامی شناخت مٹانے کی دیرینہ تمناؤں سے ہے۔اُردو کی اسلامی شناخت کو پہلی دھندلانے اور پھر رفتہ رفتہ مٹا ڈالنے کی انتہا پسند ہندو سیاست کو برطانوی استعمار کی جو تائید وحمایت حاصل رہی ہے وہ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے ہاں فرنگی استعمار کی بخشی ہوئی ذہنی ساخت پرداخت کے حامل پاکستانی دانشوروں میں عربی رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط اپنانے کی ناکام سیاست کا سامراجی ورثہ ثابت ہوئی۔

لگ بھگ نصف صدی پیشتر امریکی سی آئی اے کی تائید وحمایت سے اقتدار میں آنے والے فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان نے جب اُردو کو رومن رسم الخط اپنا کر ''ترقی'' کرنے کا فرمان جاری کیا تھا تب ہمارے سرکردہ ادیبوں اور دانشوروں نے یہ فرمان ماننے سے انکار کر دیا تھا۔اس کتاب کا آخری حصہ اُن عہد آفریں مضامین پر مشتمل ہے جو اس بحث کے دوران لکھے گئے تھے۔اِن مضامین میں اُردو رسم الخط کی روحانی اور فکری بنیادوں کو بڑی جرأت کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔آج ہمارے ہاں ایک مرتبہ پھر بڑی خاموشی اور کمال عیاری کے ساتھ ہمارا الیکٹرانک میڈیا اُردو کو رومن رسم الخط میں پیش کرنے میں مصروف ہے۔ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اشتہارات میں رومن رسم الخط کے ذریعے ہماری قومی زبان کا حلیہ بگاڑنے میں منہمک ہیں۔ کراچی کے ماہنامہ ''نفاذِ اُردو'' نے اپنے مئی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں خبر دی ہے کہ کراچی سے رومن رسم الخط میں اُردو کے ایک روزنامہ اخبار کا اجرا عمل میں آ گیا ہے۔مجھے یقین ہے کہ اِس اخبار کا بھی وہی حشر ہوگا جو اِس سے پہلے وقتاً فوقتاً رومن رسم الخط میں لکھی گئی اُردو کتابچوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔رومن اُردو کی ترویج کی یہ مساعی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ہماری اور ہماری قومی زبان کی منفرد تہذیبی اور لسانی شناخت کو مٹانے کے درپے قوتیں آج بھی سرگرمِ کار ہیں مگر بقول اقبال:

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

—— پروفیسر فتح محمد ملک

شمس الرحمٰن فاروقی

ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب

ہمارے نامور دوست، بزرگ محقق، مؤرخ ادب، شاعر اور بزعم خود ماہر لسانیات پروفیسر گیان چند جین نے تاحیات اُردو زبان و ادب کی تدریس اور خدمت کی ہے۔ ان کی کئی کتابوں کے بارے میں بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ان کی جگہ مدت مدید تک قائم رہے گی اور تصنیف و تعلیم کے اس محترم اشرافی پیشے سے انھوں نے نام اور عزت بھی خوب کمائی ہے۔ اب وہ عمر کی آخری منزلیں طے کر رہے ہیں اور انھیں شاید یہ خیال آ رہا ہے کہ ساری عمر اُردو پڑھ پڑھا کر انھوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور اب اس کا پرائشچت یوں کیا جانا چاہیے کہ اُردو کو اور اس کے بولنے والوں کو، لسانی تنگ نظری، سماجی استحصال اور سیاسی علیحدگی پسندی اور بالآخر پاکستان نوازی کے جرائم کا مرتکب ٹھہرایا جائے۔

موجودہ کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے عنوان سے کسی ہندی کتاب یا کرسٹوفر کنگ کی کتاب "One Language Two Scripts" کے ترجمے کا گمان گزرتا ہے لیکن یہ کتاب نہ تو کرسٹوفر کنگ کی کتاب کا ترجمہ ہے اور نہ ہی یہ کتاب ہندی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُردو کتاب کا نام ہندی میں رکھ کر مصنف علام نے ہندی کو اُردو پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے، ورنہ اُردو زبان اور اُردو رسم الخط میں لکھی گئی اس کتاب کا نام ''ایک زبان، دو رسم الخط، دو ادب'' بھی رکھ سکتے تھے لیکن سچ پوچھیے تو اس کتاب کے لیے یہ عنوان بھی غلط ہے۔ یہ کتاب اُردو، ہندی تنازع پر نہیں بلکہ ہندو مسلم تنازع پر لکھی گئی ہے بلکہ ہندو مسلم افتراق کو ہوا دینے اور ابنائے وطن کے درمیان غلط فہمیوں کو فروغ دینے کے لیے لکھی گئی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اس کتاب کا انتساب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی ادب دوست شخص کے لیے یہ دونوں نام نہایت محترم ہیں اور ان کے نام کسی کتاب کا انتساب موجب مسرت ہونا چاہیے لیکن ذرا انتساب کی عبارت ملاحظہ ہو:

انتساب بہ

دشمنانِ ہندی کے معتوب اوّل

امرت رائے

کاش کوئی اُردو والا تاریخی لسانیات میں ان کی انگریزی کتاب

A House Divided کے برابر یا نصف یا کم از کم

ایک چوتھائی علمیت کی کتاب تصنیف کر سکتا

اور

پدم بھوشن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

صدر، ساہتیہ اکیڈمی

جن کی کتابوں ''امیر خسرو کا ہندوی کلام (طبع دوم) اور ہندوستانی

قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں (طبع دوم) نے بڑے بڑے محققوں

کے ہوش اڑا دیے ہیں اور وہ انھیں اپنا ہمسر ماننے پر مجبور ہیں

انتساب کی بچگانہ اور سکولی لڑکیوں کی Cheer leader جیسی زبان سے قطع نظر کر بھی لیا جائے تو اس کی عبارت سے نکلنے والے حسب ذیل نتائج سے قطع نظر کرنا غیر ممکن ہے:

۱۔ امرت رائے کی کتاب بنیادی طور پر اُردو کے خلاف ہے اور اُردو کو تقسیم ہند کا ذمے دار ٹھہراتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ گیان چند جین صاحب ہی نکال سکتے ہیں کہ جو شخص اس کتاب سے اختلاف رکھے وہ ''دشمنانِ ہندی'' میں سے ہے اور امرت رائے ان ''دشمنانِ ہندی'' کے ''معتوبِ اوّل'' ہیں۔ یعنی کسی اُردو مخالف کتاب سے علمی اختلاف کرنے کے معنی ہیں دشمنانِ ہندی میں شمار کیے جانے کا مستوجب ٹھہرنا اور اس کے مصنف کو اپنا ''معتوبِ اوّل'' قرار دینا۔

۲۔ پروفیسر موصوف شاید نہیں جانتے کہ امرت رائے کی کتاب کے خلاف بہت ہی کم اُردو والوں نے احتجاج کیا اور جو کیا وہ بھی غیر موثر۔ اس کتاب کے سب سے بڑے مخالف خود امرت رائے کے صاحبزادے اور مشہور ہندی اور انگریزی ادیب آلوک رائے ہیں۔ لہٰذا گیان چند جین دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ آلوک رائے ابن امرت رائے ابن پریم چند ''دشمنانِ ہندی'' میں ہیں اور خود آلوک رائے کے باپ ان کے ''معتوبِ اوّل'' ہیں۔

۳۔ پروفیسر گیان چند جین کے پاس کوئی پیمانہ ہے جس کے ذریعے وہ ناپ سکتے ہیں کہ کس کے پاس کتنا علم ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ کسی اُردو والے کے پاس امرت رائے کا نصف یا چوتھائی علم بھی نہیں۔ جین صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے علم کو بھی من، سیر، چھٹانک یا روپیہ، آنہ، پائی کی مقدار میں ناپنے کا پیمانہ ایجاد کر لیا ہے۔

ہم اُردو والوں کے علم کی مقدار متعین کرنے سے پہلے وہ ''دشمنان ہندی'' کے سر فہرست آلوک رائے کے علم کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ آلوک رائے آکسفورڈ یونیورسٹی میں روڈز اسکالر (Rodes Scholar) رہے ہیں۔ یہ اعزاز دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ کیمبرج کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور ان کی کتابیں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے مطبعوں سے چھپتی ہیں۔ وہ آئی۔ آئی۔ ٹی، دلی میں انگریزی کے پروفیسر رہے ہیں۔ اس وقت وہ دہلی یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں اور دنیا کی مختلف بڑی یونیورسٹیوں میں لکچر یا تعلیم دے چکے ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین اپنے پیمانے میں ناپ لیں کہ آلوک رائے کا علم اپنے باپ کے علم کا چوتھائی ہے یا نصف یا اس سے کچھ کم۔ اب رہے بچارے اُردو والے تو ان میں کوئی روڈز سکالر یا کیمبرج کا پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں ہے لیکن اگر گیان چند جین صاحب اُردو کے ایک دو علماء مثلاً بزرگوں میں گوپی چند نارنگ اور مختار الدین احمد، رشید حسن خاں، انصار اللہ نظر اور نوجوانوں میں سراج منیر مرحوم، تحسین فراقی اور سہیل احمد ہی کی تحریریں پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ صاحب علم کسے کہتے ہیں اور جہاں تک سوال ''تاریخی لسانیات'' کا ہے تو اس فن میں گیان چند جین کا مبلغ علم اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ ماکس میولر اور شوکت سبزواری کو تاریخی لسانیات میں مستند سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کسی اور کے علم کا کیا محاکمہ کر سکیں گے۔

۴۔ دنیا جانتی ہے کہ پروفیسر گیان چند جین کو اُردو کی ساری دنیا سے جتنے اعزاز، اکرام، ایوارڈ اور انعام ملے ہیں اتنے اُردو کے کسی ادیب کو نہیں ملے اور نہ شاید آئندہ مل سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ممدوح گوپی چند نارنگ کو اُردو کی دنیا میں اپنے بزرگوں اور معاصروں کے ساتھ کسی گھوڑ دوڑ میں مبتلا بیان کرنا پسند کرتے ہیں کہ ان کی تیز

رفتاری نے اُردو کے ''بڑے بڑے محققوں'' کے ''ہوش اڑا دیے ہیں'' اور ''وہ انھیں اپنا ہمسر ماننے پر مجبور ہیں''۔ اصل صورت حال تو یہ ہے کہ اُردو والے گوپی چند نارنگ کو اپنا ہمسر تو کیا اپنے سے برتر مانتے ہیں لیکن افسوس کہ اس کی وجہ ''امیر خسرو کا ہندوی کلام'' نہیں جو گوپی چند نارنگ کی کمزور کتابوں میں سے ہے۔ ''دیباچہ غرۃ الکمال'' میں خود خسرو نے تحریر کیا ہے کہ انھوں نے ہندی کلام کو کبھی جمع نہیں کیا بلکہ دوستوں کے تفنن کی خاطر کبھی کبھی ہندی میں بھی طبع آزمائی کی۔ امیر خسرو کے معتبر ترین محقق وحید مرزا نے اپنی کتاب ''امیر خسرو'' میں تحریر کیا ہے کہ بدقسمتی سے خسرو کا زیادہ تر ہندی کلام دستبرد زمانہ سے غارت ہوگیا۔ اس لیے کہ خود انھوں نے یا ان کے کسی ہم عصر نے اس کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور خود گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں شامل پہیلیوں کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اس کتاب میں شامل زیادہ سے زیادہ دس پہیلیاں ایسی ہیں جن کا ''مستند ہونا زیادہ تر قرین صحت ہے'' (امیر خسرو کا ہندوی کلام'' ص ۵۲)۔ یعنی یہ دس بھی بے شک وریب خسرو کی تصنیف نہیں ہیں۔ خود مصنف/محقق کے اس اعلان کے بعد اس غیر معتبر کلام کو جرمنی کی کسی لائبریری سے نکال کر شائع کرنے سے کس محقق کے ہوش اڑ گئے؟

دوسرا افسوس ہمیں یہ ہے کہ جین صاحب نے بے وجہ اور بے دلیل یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ اُردو کے محققوں اور گوپی چند نارنگ کے درمیان کوئی معاندتی رشتہ اور مقابلہ تھا اور گوپی چند نارنگ نے ان ''محققوں'' کو ''مجبور'' کر کے اپنی وقعت ان سے منوالی۔ گویا ادب کا میدان نہ ہوا داستان امیر حمزہ کا اکھاڑا ہوا۔ جہاں دو سرداروں میں تین تین بلکہ کبھی کبھی تو سات سات شبانہ روز کشتی ہوتی ہے۔ پھر کوئی فاتح اور کوئی مفتوح قرار پاتا ہے۔ تیسرا افسوس یہ ہے کہ ایک مدت ٹھوس علمی کاموں میں مشغول رہنے کے باوجود جین صاحب کا دماغ علمی معاملات میں بھی طالب علمانہ مقابلوں، امتحان میں اوّل آنے اور ''حریفوں'' کو زک دینے کے بچگانہ خیالات سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔

انتساب کی اس بد مذاقی اور غیر علمی انداز کو دیکھنے کے بعد کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی بلکہ یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کتاب سے علم تو کیا معلومات بھی نہ حاصل ہو سکیں گی۔ لیکن تبصرے کا حق ادا کرنے کی خاطر مجھے یہ کتاب پوری پڑھنی پڑی۔

سترہ ابواب پر مشتمل زیرِ تبصرہ کتاب کا باب اوّل ''تمہید'' پوری کتاب کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نہ تو زبان کے بارے میں کوئی علمی یا تحقیقی بحث ہے، نہ رسم الخط پر اور نہ ہی ادب پر۔ پورے باب میں غیر ضروری باتیں، اُردو زبان، اُردو کے مصنفین اور بالخصوص اُردو کے مسلمان مصنفین اور مسلمانوں کے خلاف بغیر کسی حوالے یا ٹھوس ثبوت کے یکجا کی گئی ہیں۔

پروفیسر جین ''تحقیق کا فن'' نامی ایک لمبی چوڑی کتاب کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ محقق کو غیر جانب دار، سچائی کا جویا، حق پرست اور غیر متعصب ہونا چاہیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کوئی بات پوری چھان بین اور اصل ماخذ کا حوالہ دیے بغیر نہ لکھنی چاہیے۔ اس کتاب میں بھی وہ فرماتے ہیں (ص ۱۳) کہ ''اہل علم کی وفاداری صرف سچ سے ہوتی ہے۔'' اور (ص ۱۵) ''اہلِ قلم کی وفاداری کسی علاقے، مذہب، زبان یا رسم الخط سے نہ ہو بلکہ صرف سچ سے ہونی چاہیے''۔ اور خود ان کا عالم یہ ہے کہ پورا باب بے حوالہ اور بے دلیل اور متعصبانہ بیانات سے بھرا پڑا ہے۔

''حرف اوّل'' میں پروفیسر جین صاحب خود تحریر کرتے ہیں: ''میرے اُردو شاگردوں اور دوستوں کو شاید اس بات کا قلق ہو کہ میں نے کچھ لکھا ہے وہ ایسے ہے جیسے میں کوئی اُردو دشمن یا مسلمان دشمن ہوں۔'' یعنی انھوں نے یہ کتاب خوب جان کر لکھی ہے کہ اس کے بعد انھیں اُردو دشمن اور مسلمان دشمن سمجھا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو بلکہ اُردو کے ہندو اور مسلم مصنفین کو بھی ایک دوسرے سے متنفر کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں اور اُردو کے خلاف جتنا بھی مواد مل سکا، انگریزی، ہندی اور اُردو کے مصنفین کے اقتباسات خواہ وہ کسی کتاب کے ہوں یا تقریر کے، یا خطوط کے، وہ کتاب کے موضوع سے متعلق ہوں یا نہ ہوں، شامل کیے گئے ہیں اور ہوشیاری یہ کہ ان باتوں کے معتبر یا غیر معتبر ہونے، درست یا نادرست ہونے پر کوئی بحث نہیں ہے۔ دیگر یہ کہ یہ باتیں کن سیاق و سباق میں کہی گئی ہیں اس کا بھی پتہ نہیں۔ اس کے علاوہ اکثر معاملات میں راوی یا تو خود جین صاحب ہیں یا ان کا کوئی شاگرد یا دوست یا ان کا کوئی قریبی رشتے دار۔

اب کتاب کے باب اوّل ''تمہید'' (ص ۱۳ تا ص ۴۳) سے کچھ جواہر ریزے ملاحظہ ہوں:

۱۔ میری ایک نہایت قریبی رشتے دار سکھ خاتون .... نے دہلی اور یوپی میں رہنے والے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو ملک کی تقسیم چاہتے تھے، پھر یہ یہاں کیوں ہیں؟'' (ص ۲۵)

۲۔ میری نگرانی میں پی۔ ایچ۔ڈی کے لیے ریسرچ کرنے والے ایک ریسرچ اسکالر نے مجھے بتایا کہ......اس نے اتحاد المسلمین کے امیدوار کے حق میں چار بار ووٹ دیا۔(ص۲۵)

۳۔ دو تین سال پہلے ستیہ پال آنند پاکستان گھوم کر آئے۔ وہاں انھوں نے اسکولی نصاب کی کتابیں دیکھیں۔ تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر لکھا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے آنے سے پیشتر یہاں کے باشندے جاہل اور غیر مہذب تھے......محبوب صدر نے پاکستان کے اسکولی نصاب کی تفصیل دی ہے......اس میں اسلام کی ستائش اور غیر مسلموں کی جھوٹی ہجو کے سوا کچھ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ نصاب افغانستان کے طالبان نے تیار کیا ہے۔(ص۲۴)

۴۔ کالی داس (گپتا رضا) نے (میرے نام) ۵۔جنوری ۲۰۰۰ء کو خط لکھا......''میں نے دیکھا ہے کہ کسی ہندو مشہور شاعر یا ادیب کو بخشا نہیں گیا۔ دیاشنکر نسیم، چکبست، فراق، مالک رام، گیان چند، گوپی چند نارنگ اور اب میں، سبھی پر کیچڑ اچھالی گئی ہے۔ صرف جگن ناتھ آزاد بچے ہیں کیونکہ انھوں نے اقبال کی پرستاری میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے''۔(ص۲۱تا۲۲)

۵۔ اُردو کی چھوٹی اسامیوں کے لیے ہندوؤں کی بہت تعریف اور آؤ بھگت کی جاتی ہے لیکن بڑے مقامات کے لیے امیدوار کا مذہب بھی دیکھا جاتا ہے۔(ص۲۳)

۶۔ مسلم بڑے ادیب پر کوئی چھوٹا ادیب درشتی کا لہجہ اختیار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ لیکن ایک بڑے ہندو ادیب کے خلاف چھوٹا ادیب بھی اپنے قلم کو بے لگام چھوڑنے کے لیے آزاد ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رسالے کے قارئین اور ادارتی عملے کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔(ص۲۳)

۷۔ بڑے سے بڑے ہندو ادیب کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اُردو دنیا میں جینا ہے تو مسلمانوں کی خوشنودی پر نظر رکھے۔(ص۲۶)

۸۔ اُردو میں زبان کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔(ص۱۴)

۹۔ تاریخ میں مسلمانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے وہاں کی زبان، بالخصوص رسم الخط کو ختم کر کے اپنی زبان اور لپی (رسم الخط) کو ان پر مسلط کیا جائے...... ہندوستان میں بھی ایسی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی......سندھی، پنجابی، کشمیری وغیرہ کی لکھاوٹ پوری طرح بدل دی گئی۔ (ص ۱۶)

۱۰۔ اُردو کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ کہا گیا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس کا بھانڈا پھوڑ دیا گیا...... ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی ضخیم تصنیف ''ہندی اُردو تنازع'' میں انکشاف کیا کہ ابتدا ہی سے انجمن ترقی اُردو اور مسلم لیگ سے گہرا رابطہ تھا...... تقسیم ملک سے پہلے ایسے فرقہ وارانہ خیالات کو اُردو والوں کا ہندوؤں سے پوشیدہ رکھنا کہ اُردو تحریک کا بنیادی مقصد پاکستان بنوانا ہے۔ ایسی غداری ہے جس پر میں افسوس کرتا ہوں۔ (ص ۱۸ تا ۱۹)

۱۱۔ امریکہ اور کینیڈا میں پاکستانی انگریزی اخبارات ہفتے وار ہیں۔ ان سب کی وفاداری پاکستان سے ہے۔ ان میں کھل کر ہندوستان اور ہندوؤں کو گالیوں سے نوازا جاتا ہے...... جب ہر ملک کے اہل اُردو اتنی شدت سے پاکستان نواز ہیں تو ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی ان کے ہم نوا ہوں لیکن ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں۔ (ص ۲۳ تا ۲۴)

۱۲۔ میں اپنے اُردو والے مسلمان دوستوں کی تحریریں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ان میں اب بھی وہی علیحدگی پسندی دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی۔ ابنائے وطن کے بارے میں ان کے جذبات وہی ہیں جو ہندوستان کے باہر کے اُردو والوں کے ہیں۔ (ص ۳۳)

۱۳۔ اُردو کے متعدد بڑے شعرا مثلاً مومن، داغ، جگر اور اصغر وغیرہ کی زندگیوں کے ساتھ طوائفوں کے معاملات لپٹے ہوئے ہیں۔ (ص ۳۸)

۱۴۔ گوپال کرشن مانک ٹالہ نے مجھے اپنی ۲۸۔ نومبر ۲۰۰۱ء کی چٹھی میں لکھا ''آپ نے اُردو کے مسلم ادیبوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے لیکن...... آپ کچھ بھی کر لیجیے یہ لوگ سدھرنے والے نہیں بلکہ وہ آپ کو "Ignore" کرنا شروع

کر دیں گے''۔(ص ۳۹ تا ۴۰)

۱۵۔ ہندوستان میں مسلمان اُردو والے اپنی کمر پر دو قومی نظریے کا بھاری گٹھر اٹھائے پھرتے ہیں......ایک عام ہندو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے۔(ص ۳۳)

۱۶۔ اُردو ادب...... میں غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کے دینی عقائد، معاشرے اور معاصر شخصیتوں پر اتنی سیاہی پوت دی گئی ہے کہ کوئی ہندی معاصر اسے قبول نہیں کر سکتا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ میرا ادب نہیں، کسی دوسری ملت کی چیز ہے۔(ص ۲۰)

۱۷۔ ہندوستان میں اُردو کے ہندو مصنف اتنے گھبرائے ہوئے ہیں کہ وہ مسلمان اُردو ادیبوں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔(ص ۳۹)

یہ تحقیقی جواہر پارے اور''حق پرستانہ'' شہ پارے کسی علمی و ادبی کتاب کے بجائے وشو ہندو پریشد یا شیو سینا کے انتخابی منشور یا نریندر مودی کی تقریر کا اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔

یہ کتاب علم سے کتنی دور ہے، اس کی ایک مثال مصنف علام کا یہ بیان ہے کہ مسلمان جس علاقے کو فتح کرتے ہیں وہاں کی زبان، بالخصوص رسم الخط کو ختم کر دیتے ہیں۔ گیان چند جین صاحب نے راجا رام موہن رائے کی ایک مبینہ تحریر فرمان فتح پوری کے حوالے سے نقل کی ہے کہ''ہندوستان کا بڑا حصہ کئی صدیوں سے مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں چلا آ رہا ہے...... بنگالی چونکہ جسمانی طور پر کمزور تھے۔ وہ اسلحہ اٹھانے سے گریز کرتے تھے......ان کی جائیدادیں تباہ کی جاتی رہیں۔ ان کے مذہب کی توہین ہوتی رہی......''اگر یہ صحیح ہے کہ سب سے زیادہ غلامی بنگال میں رہی تو سو سال کی مسلمانوں کی حکمرانی کے باوجود بنگال کی زبان اور اس رسم الخط مسلمانوں نے ختم کیوں نہیں کر دیا؟ زبان نہیں تو رسم الخط تو ضرور ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟

جین صاحب کے عقیدے کے مطابق سندھی، پنجابی اور کشمیری کے رسم الخط مسلمانوں نے تبدیل کر دیے۔ لیکن جین صاحب یہ نہیں بتاتے کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ان زبانوں کا رسم الخط کیا تھا اور اس کی تبدیلی کس زمانے میں ہوئی، اور کشمیریوں، پنجابیوں اور سندھیوں نے کن حالات میں اسے قبول کیا اور رسم الخط کتنے عرصے میں پوری طرح تبدیل ہو سکا۔

پروفیسر جین کو ان سوالوں سے غرض نہیں۔ انھیں تو اُردو کی مخالفت کے بہانے مسلمانوں کی ہجو لکھنی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''بیرونی حملہ آوروں نے اپنے اقتدار اور احساس برتری کے نشے میں ہندوستانی زبان اور لپی کو قبول نہ کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائی............ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے جب دوسرے ممالک کو فتح کیا، سب سے پہلے وہاں کی زبان اور رسم الخط پر ضرب کاری لگائی............ اس کی بہترین یا بدترین مثال فتح ایران ہے''۔ (ص ۱۵۳)

سوال از آسماں جواب از ریسماں شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے دعویٰ تھا ہندوستان کے بارے میں اور دلیل لائے ایران کے بارے میں۔ وجہ ظاہر ہے، مصنف علام کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ان کا دعویٰ سراسر پا در ہوا ہے۔ لہٰذا وہ بھاگ کر ایران میں پناہ لیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ ایران کی حقیقت نہیں بیان کرتے کہ مسلمانوں کے حملے کے وقت ایران میں تحریری زبان، یعنی پہلوی، بیشتر کاہنوں اور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ہزوارش کی بے تحاشا آمیزش کے سبب تقریری زبان سے اس کا رشتہ اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ خود مذہبی رہنما صاحبان لکھتے کچھ تھے اور پڑھتے کچھ تھے۔ عربوں کے یہاں زبان اور رسم الخط پر کوئی پابندی نہ تھی۔ تحریر سب کی میراث تھی۔ اب جن لوگوں کو علم کا شوق تھا انھوں نے لامحالہ عربی رسم الخط اختیار کیا۔ اس کے باوجود خود انگریزوں کے بیان کے مطابق ایران کو مکمل طور پر عربی رسم الخط اختیار کرنے میں کوئی تین سو برس لگ گئے۔ فارسی زبان باقی رہی، صرف رسم الخط بدل گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ جس فارسی زبان سے ہم واقف ہیں اس زبان میں ادب کی متفرق پیداوار آٹھویں صدی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ یہ کیونکر ممکن ہوتا اگر زبان ختم کرنے کا کوئی منصوبہ عربوں کے پاس تھا اور اس پر وہ عمل درآمد کر رہے تھے؟

مصر کا حال سب پر عیاں ہے۔ مسلمانوں کے آنے کے بہت پہلے وہاں کی زبان مصری تھی (جسے "Demotic" بھی کہتے ہیں)، قبطی اس کا رسم الخط تھا اور رسم الخط بیش از بیش تر کاہنوں اور مذہبی رہنماؤں کے پاس تھا۔ عیسائی مبلغوں نے اپنی آسانی کی خاطر قبطی کو ترک کر کے یونانی کو رائج کیا۔ زبان وہی مصری رہی۔ ساتویں صدی کے وسط میں جب عرب وہاں پہنچے تو انھوں نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا اور سرکاری نوکریوں کے حصول کے لیے قبطی عیسائیوں نے عربی پڑھنی شروع کی۔ لیکن ان کی اپنی زبان وہی یونانی رسم الخط میں قبطی (یا درست تر کہیں تو مصری) رہی۔ یہ سلسلہ کوئی پانچ سو برس چلا۔ اس دوران قبطی عیسائیوں پر

فلسطینی اور شامی عیسائیوں کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ قبطیان عیسائی نے صلیبی جنگوں کے زمانے میں عربی زبان قبول کر لی۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہم ان صلیبی جنگوں والے عیسائیوں سے اظہار برأت کرتے ہیں۔ لہٰذا عربی کو مصر میں پھلتے پھولتے اور عمومی طور پر قائم ہوتے کوئی سات سو برس لگ گئے اور یہ تلوار کی نوک پر نہیں ہوا۔ بعد میں قبطی عیسائیوں نے بے تکلف اسلام بھی قبول کیا لیکن وہ الگ مبحث ہے۔

مصر کے چند ہی سال بعد سپین پر مسلمان قابض ہوئے اور وہاں کم وبیش آٹھ سو برس رہے۔ لیکن وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ وہاں کی زبان وہی رہی جو پہلے تھی۔ عربی علمی زبان البتہ ہوگئی لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ جب اس وقت آدھی دنیا کی علمی زبان عربی ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔

شمالی اور مشرقی افریقہ میں عربوں کی آمد کے وقت قبائلی زبانیں رائج تھیں، جن کا کوئی رسم الخط نہ تھا۔ جب عربوں کی ہمت افزائی کے باعث وہاں علم کا چرچا ہوا تو لامحالہ عربی کا چلن تھا۔ کچھ علاقوں نے عربی زبان بھی اختیار کر لی۔ لیکن نائیجیریا، سینیگال وغیرہ خطوں میں پرانی ہی زبانیں رائج رہیں اور اب بھی رائج ہیں۔ نائیجیریا میں دو اہم قبائلی زبانیں اب بھی رائج ہیں لیکن وہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہے، عربی نہیں۔ سینیغال میں بھی قبائلی زبانیں موجود ہیں لیکن وہاں کی سرکاری زبان عربی نہیں، فرانسیسی ہے۔

سوڈان کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں قبائلی زبانوں اور عربی کے میل ملاپ سے کئی زبانیں پیدا ہوئیں جو عربی النسل ہیں لیکن اکثر ایسی ہیں کہ جن میں آپسی مفہومیت (Comprehensibility) نہیں ہے۔ لہٰذا انھیں الگ زبانیں سمجھنا چاہیے۔ گیان چند جین صاحب ماکس میولر اور شوکت سبزواری جیسے غیر سائنسی ''ماہرین'' کے حوالے سے بار بار کہتے ہیں کہ دو زبانوں کے اختلاط سے نئی زبان نہیں پیدا ہوتی۔ وہ اور کچھ نہیں تو یہودیوں کی زبان ییدی (Yiddish) کو دیکھ لیتے جو عبرانی حرفوں میں لکھی جاتی ہے لیکن جس میں مصوتوں کو ظاہر کرنے والے حرف بھی ہیں اور جس کی بنیادی لفظیات اور صرف ونحو نویں صدی کی جرمن کی ہیں۔ گیان چند جین صاحب لسانیات میں اپنی تربیت کا بار بار حوالہ دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ایک زبان پنسلوانیا ڈچ (Pennsylvania Dutch) یا پنسلوانیا جرمن (Pennsylvania German) بھی ہے جو امریکہ کی ریاست پنسلوانیا میں بسنے والے جرمن اور سوئس آج بھی بولتے ہیں۔ یہ زبان جرمن اور انگریزی کے امتزاج کا براہ راست نتیجہ ہے۔ جین صاحب گھر کے قریب آئیں تو ماپلا عورتوں کی ملیالم ملاحظہ کریں جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور معیاری ملیالم سے بہت مختلف ہے۔ تامل ناڈو میں ایک زبان ''اروی'' نامی ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں تامل اور عربی لفظیات کو بخوبی برتتے ہیں۔

زبانوں کے اختلاط سے نئی زبان نہیں بنتی۔ یہ دعویٰ گیان چند جین صاحب اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں بعض ''اُردو والے مسلمان'' کہتے ہیں کہ مسلمانی زبانوں اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے اختلاط سے اُردو پیدا ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس ذمے دار ماہر لسانیات یا ماہر تاریخ نے یہ بات کہی ہے۔ جین صاحب کی عادت یہ ہے کہ سیاسی پلیٹ فارم سے دیے گئے بیانات اور غیر علمی لوگوں کے غیر ذمے دارانہ اقوال کو ''مسلمان اُردو والوں'' کے ''علمی نظریات'' کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ایک دنیا جانتی ہے اور اس بات پر فخر کرتی ہے کہ اُردو ہندوستانی زبان ہے اور ''فوجی لشکروں'' وغیرہ سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ جین صاحب رائی کا پہاڑ بناتے ہیں پھر لات مار کر اسے گرا دیتے ہیں اور پھر بغلیں بجاتے ہیں کہ وہ مارا، دیکھو میں ''ہندو'' ہوں اور کتنا عقل مند اور انصاف پسند ہوں اور ''مسلمان'' کتنے احمق اور بے ایمان ہیں۔

دنیا میں مسلمانوں کی حکومت مغرب و مشرق کے اور بھی کئی ممالک میں رہی اور آج بھی ہے۔ کتنے ممالک ایسے ہیں جہاں کی زبان اور رسم الخط کو مسلمانوں نے ختم کیا؟ وسطی اور مشرقی یورپ میں یونان و بلقان تک کے وسیع علاقے پر مسلمان صدیوں قابض رہے لیکن وہاں کی سب زبانیں اور سب رسم الخط موجود ہیں۔ عربی، ترکی کہیں بھی نہیں۔ یوگوسلاویہ کے خطوں بوسنیا، کوسوو، کو دیکھیے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن ان کی زبان اور رسم الخط اب بھی وہی ہیں جو مسلمانوں کے پہلے تھے۔ البانیہ میں مسلمان نوے فی صدی سے بھی زیادہ ہیں لیکن وہاں بھی زبان، رسم الخط مقامی ہیں، عربی یا ترکی نہیں۔ انڈونیشیا اور ملیشیا کو دیکھیے جہاں کی زبانیں قبل اسلام ہیں حالانکہ مسلمان وہاں بھاری اکثریت میں ہیں۔ رسم الخط البتہ دونوں زبانوں کا رومن ہے اور یہ کرم فرمائی بیچارے مسلمانوں کی نہیں، ڈچ حاکموں کی ہے۔ چین کے مشرقی علاقے میں مسلمان حضرت عثمانؓ کے وقت سے ہیں اور اکثریت میں ہیں۔ انھوں نے مقامی چینی زبان اور رسم الخط کو حسب سابق قائم رکھا ہے۔

کالی داس گپتا یا جین صاحب کا عقیدہ ہے کہ اُردو کے مسلمان ادیبوں کے ہاتھوں اُردو کے ہندو شاعروں اور ادیب کی تذلیل کی گئی اور ان پر کیچڑ اچھالی گئی۔ لیکن کالی داس گپتا رضا صاحب نے جن لوگوں کے نام لیے ہیں وہ سب ہندو ادیب اور شاعر اُردو کے ابتدائی درجے سے لے کر ایم۔ اے تک کے نصاب میں شامل رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ان پر ریسرچ کل بھی ہو رہی تھی آج بھی ہو رہی ہے۔ تو اس کے ذمے دار ہندو حضرات ہیں جنھوں نے اُردو کو ترک کر دیا۔ ورنہ ہندو ادیبوں کی قدر اُردو ادب اور اُردو کے ادبی معاشرے میں اب تو پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ فراق صاحب کو میر سے بھی برتر سمجھنے والا کوئی ہندو نقاد نہیں،

اسلام پسند اور مولانا تھانوی کے عقیدت مند محمد حسن عسکری تھے۔ پریم چند کے بارے میں یہ کہنے والے کہ وہ بڑے بڑے لکھنوی اور دہلوی علما سے بہتر اُردو لکھتے ہیں کوئی جناردھاری پنڈت نہیں بلکہ علامہ شبلی تھے۔ بیدی کی اہمیت منوانے والے ماسٹر تارا سنگھ نہیں، آل احمد سرور تھے۔ گوپی چند نارنگ کو امریکہ میں مقیم علی گڑھ کے سابق طالب علموں نے ''محسن اُردو'' کا خطاب اور ایوارڈ دیا۔ یہ وہی علی گڑھ ہے جہاں جین صاحب کے بقول ہندودشمنی کے ''خلیفہ'' سرسید احمد خاں نے اپنی ''ہندودشمنی'' کی روایت قائم کی تھی۔ مثالیں بے شمار ہیں۔ یہ صرف چند نمونے ہیں جین صاحب عالم فاضل اور ادب کے مؤرخ ہیں۔ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔

فاضل مصنف نے ہندوؤں کی تذلیل کرنے والوں میں سرسید احمد خاں کا نام اس لیے بھی رکھا ہے کہ ان کے کالج میں ہندو طلبہ کو سرخ ٹوپی پہننی پڑتی تھی۔ کیا سرخ ٹوپی پہننے سے غیر مسلموں کے مذہب پر کوئی ضرب پڑتی ہے؟ دنیا جانتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ڈریس ہندو اور مسلمان کے لیے الگ الگ نہیں ہوتے۔ آج پورے ملک میں انگریزی سکولوں میں طالب علموں کو ٹائی لگانی پڑتی ہے اور لڑکیوں کو انگریزی لباس پہننا بھی پڑتا ہے۔ ان بچوں میں کثیر تعداد ہندوؤں کے بچوں کی ہے۔ اس سے بہت کم تعداد میں مسلمانوں کے بچے ہیں اور عیسائی تو نام کے ہیں۔ نہ کبھی ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ یہ لباس عیسائیوں کا ہے، نہ مسلمانوں نے اور نہ اس مغربی لباس کے پہننے سے کسی ہندو کی رگ ہندویت پھڑکتی ہے۔ پھر یہ سرخ ٹوپی کی شکایت کیوں؟ سرخ ٹوپی کوئی اسلام کی علامت تو نہیں اور اب تو یہ ٹوپی اور شیروانی دونوں ہی علی گڑھ سے خارج ہو گئے ہیں۔ مصنف علام یہ بھول گئے کہ جب ۱۸۸۸ء میں پنجاب کے مسلمانوں نے علی گڑھ میں ایک سونے کا تمغہ قائم کیا جو مسلمانوں کے درمیان بی۔اے میں اول آنے والے لڑکے کو ہر سال دیا جاتا تھا تو سرسید نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے ایسا ہی تمغہ ہندو طالب علموں کے لیے بھی قائم کیا۔

مسلمانوں کے خلاف جین صاحب کے دل میں (اور اب زبان پر) شکووں کا ایک طومار ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک یہودی لطیفہ یاد آتا ہے جسے مشہور یہودی رپورٹر ٹامس فریڈ مین (Thomas Friedman) نے بیان کیا ہے:

> ''دو یہودی کسی غیر ملک میں پہنچتے ہیں۔ وہاں سرحد پر پاسپورٹ کنٹرول افسران سے پاسپورٹ اور ویزا طلب کرتا ہے۔ اس پر ایک یہودی اپنے ساتھی سے سرگوشی میں کہتا ہے دیکھا! ''یہاں کے لوگ بھی کس قدر اینٹی یہودی ہیں۔ ہم سے پاسپورٹ اور ویزا طلب کر رہے ہیں''۔

جہاں تک سوال ہے اس بات کا کہ بڑے سے بڑے ہندو ادیب پر کوئی بھی چھوٹا موٹا مسلمان ادیب درشت لہجے میں تنقید کر سکتا ہے۔ لیکن کسی ہندو ادیب کی مجال نہیں کہ کسی بڑے مسلمان ادیب پر کچھ تنقید تو کر دیکھے، تو ہمارے پروفیسر صاحب ذرا اس بات کو ذہن میں لائیں کہ ابوالکلام آزاد، کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور سے بڑھ کر عالی مرتبت اُردو ادیب کون ہیں؟ اور پھر یہ غور کریں کہ اسلوب احمد انصاری صاحب ان تینوں حضرات کو مسلسل سب وشتم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کو آل احمد سرور نے ایک انتخاب میں رضیہ سجاد ظہیر پر فوقیت دی تھی لیکن اس کے باوجود محمد حسین صاحب نے سرور صاحب کے بارے میں کیا کیا دل آزار باتیں نہیں لکھیں؟ خود محمد حسین کے خلاف گوپال متل نے نہایت سخت لکھا لیکن ''مسلمان اُردو والوں'' نے گوپال متل کو کچھ بھی نہ کہا۔ رشید حسن خاں نے ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کے مصنفین کے خلاف کیا سخت ترین تنقید نہیں کی؟ رضوان احمد نے عابد رضا بیدار کو کئی سال تک اپنے قلم کے نشانے پر رکھا۔ کیا گیان چند جین صاحب کو نہیں معلوم کہ ذکی کاکوروی نے مسعود حسن رضوی ادیب کو کس کس طرح طنز وتعریض کا نشانہ بنایا؟ اور بھی مثالیں ہیں۔ گیان چند جین صاحب اگر ایمان دار دل سے غور کریں گے تو انھیں خود یاد آ جائیں گی (میں پاکستان سے مثالیں نہیں دے رہا ہوں، ورنہ فوری طور پر کئی باتیں میرے ذہن میں موجود ہیں)۔

جین صاحب کے ''دل میں خیال آتا ہے کہ...... ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی'' پاکستان نواز ہوں۔ لیکن ''ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں۔'' یعنی ہندوستان کے اُردو لکھنے والے مسلمان پاکستان نواز اور غدار ہیں۔ خیر، یہ تو جین صاحب کا خیال تھا اور ایسے خیالات آر۔ ایس۔ ایس۔ وشو ہندو پریشد، اور شیوسینا وغیرہ کے عالم فاضل لوگوں کے بھی دل میں آتے ہوں گے۔ لیکن ان کے اس ارشاد کی دلیل کیا ہے کہ ان کے ''اُردو والے مسلمان دوستوں کی تحریروں'' میں ''اب بھی وہی علیحدگی پسندی دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی۔'' (ص ۳۳) جین صاحب نے اپنے کئی ''اُردو والے مسلمان دوستوں'' کا ذکر اس کتاب کے صفحہ vi پر کیا ہے۔ کچھ مزید دوستوں کا ذکر متن کتاب میں بھی ہے۔ بھلا ہوان میں سے ایک کی کوئی تحریر کیا، ایک جملہ ہی دکھا دیں جس میں ''علیحدگی پسندی'' ہو اور ''ابنائے وطن (=ہندوؤں)'' کے تئیں ان کا وہی رویہ نظر آتا ہے جو ہندوستان کے باہر والوں (=پاکستانیوں) کا ہے اور لگے ہاتھوں اپنے ان ہی دوستوں کی کسی تحریر کا ایک جملہ بھی ایسا دکھا دیں جس میں ''وہ علیحدگی پسندی'' نظر آئے ''جو پہلے تھی'' اور اس ''پہلے تھی'' کی بھی تھوڑی سی تفصیل وہ پیش کر دیتے تو اور بھی خوب ہوتا۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے بقیہ ابواب میں اسی قسم کے نظریات اور عقائد کی تفصیل ہے۔ کہیں کہیں

عنوانات سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہاں شاید کوئی علمی بحث ہوگی، مثلاً تیسرے باب کا عنوان ہے ''اُردو اور ہندی کے آغاز کی تلاش اور محققین''، لیکن پورے باب میں ''وہابیت''، شاہ ولی اللہ کی تحریک، شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی کی تحریک، ''تحریک اتحاد اسلامی'' سے لے کر بھارتی جنتا پارٹی تک کا ذکر ہے اور آخر میں حسب ذیل گل افشانی کی گئی ہے:

> ''ہندوستان کے مسلمان طلبہ اور اساتذہ کا اہل پاکستان سے کافی رابطہ رہتا ہے۔ اپنے عزیزوں سے ملنے ملانے کے لیے۔ ان پر پاکستان کے طرز تعلیم اور نصاب کا اثر ضرور پڑتا ہوگا۔'' (ص ۶۵)

معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں آباد ہونے کے بعد جین صاحب کے علمی اور تحقیقی طریق کار میں گمان، ظن (خاص کر سوئے ظن) اور عقلی گدے کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ورنہ وہ ''ضرور پڑتا ہوگا'' جیسے فقروں کو علمی بحث میں جگہ نہ دیتے اور یہی نہیں، اُنھوں نے کئی جگہ ایسا کیا ہے۔ جین صاحب کو غالباً یہ بھی معلوم نہیں کہ اپنے عزیزوں سے ملنے ملانے کے لیے پاکستان کے لیے عموماً ایک ماہ کا ویزا ملتا ہے اور ہندوستان سے پاکستان جانے والے زیادہ تر سن رسیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ نئی نسل والوں میں سے اکثر نے تو اپنے اعزا کو دیکھا بھی نہیں۔ وہاں یہ سن رسیدہ یا نوعمر لوگ (اگر کوئی ہوں) ایک ماہ میں نہ تو سکول میں کچھ پڑھ سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں۔ پھر ان پر پاکستان کا زہریلا اثر کہاں سے اور کتنا پڑتا ہوگا؟

جین صاحب کے باب ہشتم ''ہندی کے ماضی پر اہل اُردو کے دو سوالات'' میں مسلم لیگ کے بارے میں ارشاد ہے:

> ''ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کا ہریجنوں کے لیے پریم دکھانا حبِ علی کی وجہ سے نہیں، بغض معاویہ کے سبب تھا۔ ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنے کی خاطر۔'' (ص ۱۱۹)

جین صاحب نے ''ظاہر ہے'' کہہ کہ تاریخی تحقیق کا حق ادا کر دیا لیکن یہ نہ واضح کر سکے کہ اس باب میں (بلکہ اس پوری کتاب میں) اس بحث کی ضرورت کیونکر ظاہر سمجھی جائے۔ وہ آگے چل کر ہندی کی برتری اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ہندی کے علما کی تحریریں دیکھیے کس قدر عبور اور قدرت کے ساتھ سنسکرت، پالی، پراکرت اور اب بھرنش کے الفاظ اور قواعد کو پانی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے مقابل ناواقفان اُردو کو دیکھیے جو اپنی لسانی عصبیت کو عدم واقفیت اور جہالت کا جواز سمجھتے

ہیں۔'' (ص ۱۲۵)

پروفیسر گیان چند جین یہ بات کہتے نہیں تھکتے کہ ''اُردو کا مزاج تنگ نظری کا ہے۔'' (ص ۱۴۴) پھر اگلے باب میں آگے اُردو کو میل جول کی زبان نہ مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فاتح اور مفتوح میں کہاں کا میل، کیا ہندو سومناتھ کے مندر توڑنے والوں، جزیہ لگانے والوں، ہندو کلچر کو تباہ کرنے والوں پر ملتفت ہوتے۔ اُردو میل جول کی نشانی ہے یا ہندوستان کی زبان سے لگاؤ برتنے کی علامت۔'' (ص ۱۴۷)

دسویں باب ''ہندی اُردو تنازع اور فرقہ وارانہ سیاست'' میں بھی پیٹ بھر کر زہر اگلا گیا ہے۔ مندروں کو توڑنے اور مسلمان بادشاہوں کی ہندو بیویوں وغیرہ کا ذکر کرنے سے شوق ستم نہ پورا ہوا تو بھارتیندو کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''یہ (اُردو) طوائفوں کی زبان ہے، ہندو رئیسوں کے بدچلن لڑکے طوائفوں اور دلالوں سے گفتگو کرنے کو اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔'' (ص ۱۸۰)۔ جین صاحب کا عقیدہ ہے کہ بھارتیندو نے ''طوائفوں کی زبان'' والا لقب بنگال کے گورنر سے سیکھا ہوگا۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ جین صاحب نے یہی طوائفوں کی زبان (اُردو) نہ صرف پڑھی بلکہ تیس چالیس سال تک یونیورسٹیوں میں پڑھائی اور پچیسیوں کتابیں لکھیں۔ اسی کی روٹی کھائی، اسی سے نام ونمود کمایا۔ انھیں کس بنگال کے گورنر نے گمراہ کیا تھا؟

گیارھویں باب ''اُردو کی ادبی تاریخ کے کچھ موضوعات'' میں صرف ایک موضوع ہے اور وہ یہ کہ اُردو کی کچھ مثنویوں میں (سب میں نہیں، یہ جین صاحب بھی مانتے ہیں) ہیرو مسلمان ہوتا ہے اور ہیروئین ہندو۔ جین صاحب کے خیال میں یہ ہندوؤں کی توہین ہے۔ ''اس موضوع میں مذہبی تفوق کے ساتھ ایک رکیک جنسی جارحیت ہے۔'' (ص ۱۹۲) جین صاحب یہ ملاحظہ کرنا بھول گئے کہ وہ غالباً پہلے محقق ہیں (اور وہ ہندو بھی نہیں، جین ہیں) جنھیں یہ نکتہ سوجھا ہے۔ مثنویوں کے کردار تو فرضی ہوتے ہیں۔ حقیقی دنیا میں کہیں اور نہیں۔ ہندوستان کے سیاسی حلقوں، فلم انڈسٹری اور میٹروپولیٹن شہروں کو دیکھیے، بہتیرے ایسے مسلمان ملیں گے جن کی بیویاں اور محبوبائیں ہندو ہیں اور بہت سے ایسے ہندو ملیں گے جن کی بیویاں مسلمان ہیں۔ جین صاحب کو فرضی کہانی پر اعتراض ہے حقیقی زندگی پر نہیں۔

پروفیسر موصوف کی مسلمان دشمنی کا یہ عالم ہے کہ اختر حسین رائے پوری کے ترجمہ ''شکنتلا'' پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں ''ابا''، ''امی جان''، ''بڑی بی'' اور ''میاں'' (شوہر) جیسے الفاظ استعمال کیے گئے

ہیں جو خالص ''اسلامی معاشرت'' کے الفاظ ہیں اور ''ہندو گھرانوں کے لیے بھی یہ الفاظ بالکل اجنبی اور بیگانہ ہیں'' (ص ۲۰۷/۲۰۸) لیکن اگر جین صاحب کو اختر حسین رائے پوری کی ''ذہنیت'' پر اعتراض ہے کہ انھوں نے اپنے دیباچے میں ایک جملہ ایسا لکھا ہے جو نازیبا ہے تو انھیں گوپی چند نارنگ کی بیگم پر بھی اعتراض ہے کہ انھوں نے جین صاحب کے سوال ''آپ کیسی ہیں؟'' کے جواب میں ''خدا کا شکر ہے'' کہا۔ انھیں ''بھگوان'' یا ''ایشور'' کہنا چاہیے تھا۔ (ص ۲۸)

گیارھویں باب کے آخر میں پورا ایک صفحہ ''بابری مسجد'' پر ہے۔ پیراگراف شروع ہوتا ہے اس جملے سے: ''عام اُردو پڑھنے والے محمود غزنوی کے موید ہیں۔'' (ص ۲۱۵)۔ بابری مسجد کا ذکر جین صاحب نے اس لیے کیا کہ ان کے عقیدے کے مطابق جب ۱۹۴۹ء میں اس مسجد میں رام چندر جی کی مورتی رکھ دی گئی تھی تو جو ''عمارت'' توڑی گئی وہ مسجد تھی ہی نہیں۔ ''وہ تو مندر میں تبدیل ہو چکی تھی''۔ لیکن ''بابری مسجد ٹوٹنے کے انتقام کے طور پر بنگلہ دیش میں ہزاروں مندر توڑے گئے۔'' جین صاحب نے یہ واقعہ کہیں پڑھا ہوگا کہ ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد کا دروازہ کھول کر اندر مورت رکھ دی گئی۔ پھر انھوں نے ۱۹۹۲ء میں مسجد کے انہدام کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ اس انہدام کے ساتھ ساتھ اور فوراً بعد جو کثیر تعداد میں مسلمانوں کا جان و مال ضائع ہوا اس کا ذکر شاید انھوں نے کہیں پڑھا نہ سنا۔ بنگلہ دیش میں مندر توڑے جانے کا واقعہ انھوں نے بے شک پڑھا ہوگا یا پھر سنا ہوگا۔ لیکن وہ کسی قسم کا حوالہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا راوی ستیہ پال آنند، بنگلہ دیش نہیں، پاکستان میں توڑے گئے مندروں کی تعداد ''سیکڑوں'' بیان کرتا ہے لیکن یہاں بھی ستیہ پال آنند صاحب کی کسی تحریر کا حوالہ نہیں۔ جین صاحب ثانوی حوالے دینے کے ماہر ہیں۔ (ان کی یہ کتاب بیشتر ثانوی حوالوں کی مرہون منت ہے اور کسی بھی ثانوی حوالے کی انھوں نے بچشم خود تصدیق نہیں کی)، لیکن یہاں وہ ثانوی حوالہ دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ بابری مسجد اگر ۱۹۴۹ء میں مندر میں تبدیل ہو چکی تھی تو جین صاحب کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں نے اپنا ہی مندر توڑا۔ سومناتھ کے مندر کا بھی جین صاحب کو نہایت غم ہے۔ اس کا ذکر وہ بار بار کرتے ہیں۔ کاش وہ رومیلا تھاپر کی کتاب اس موضوع پر پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ سومناتھ کے مندر کی محمود غزنوی یا کسی بھی مسلمان کے ہاتھوں انہدام کی کوئی معاصر یا قریبی شہادت نہیں ہے۔

پروفیسر گیان چند ہم طالب علموں کو قدم قدم پر ہدایت کرتے ہیں کہ حق بات کے سوا کچھ نہ کہو، تعصب سے کام نہ لو، سچ کو مت چھپاؤ لیکن خود وہ جگہ جگہ ان باتوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور کتمان حق کی یہ ادا

انھوں نے آغاز کتاب ہی سے اختیار کر لی ہے۔ ملاحظہ ہو اپنی ''تمہید'' میں فرماتے ہیں:

''میں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی ''تاریخ زبان و ادب اُردو'' پر ایک مضمون لکھا۔ ہندوستان کے کسی بھی اُردو رسالے نے یہ مضمون نہیں چھاپا لیکن اتنا احترام کیا کہ تحریر میں انکار لکھ بھیجنے کو بھی تیار نہ ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ امریکہ آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان کا کوئی رسالہ میرا مضمون نہیں چھاپ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ مضمون دیکھ کر بتائیں گے۔ وہ مضمون دیکھنے کے لیے لے گئے۔ کچھ دن بعد انھوں نے فون کیا کہ مضمون چھپ جائے گا۔ یہ قومی اُردو کونسل کے رسالے میں چھپا۔ اس کی وجہ سے مملکت پاکستان میں آسمان ٹوٹا نہ ہندوستان میں کوئی جوالا مکھی پھوٹا۔ ہاں ہندوستان کے اُردو پریس کی آزادی ضرور بے نقاب ہوگئی۔'' (ص ۳۳)

ابواللیث صدیقی کی تاریخ کے بارے میں گیان چند صاحب کا کوئی ''مضمون'' نہیں ہے۔ ہاں ان کی کتاب ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' کا ایک باب ضرور ابواللیث صدیقی کی تاریخ کے بارے میں ہے۔ اس باب (یا مضمون ہی کہہ لیجیے) کے بارے میں جین صاحب کا یہ ارشاد غلط ہے کہ ''ہندوستان کا کوئی رسالہ میرا مضمون نہیں چھاپ رہا''۔ کم از کم ''شب خون'' میں اشاعت کے لیے یہ مضمون کبھی نہیں آیا۔ لیکن اگر اس تحریر کی عدم اشاعت کا سبب ''مسلمانی تعصب'' ہو یا گیان چند جین صاحب کے ''اُردو والے مسلمان دوستوں'' کی ''علیحدگی پسندی'' ہوتا تو اس بات کی کیا وجہ ہے کہ جین صاحب کا یہ ''مضمون'' ہی نہیں بلکہ پوری کتاب ہی پاکستان میں انجمن ترقی اُردو نے سنہ ۲۰۰۰ء میں شائع کر دی ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جین صاحب اس حقیقت کو پردہ پوش رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ وہی انجمن ترقی اُردو ہے جسے وہ زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۱۹ پر ''غداری'' کا مرتکب قرار دے چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ یہ کتاب ہندوستان میں بھی زیر اشاعت ہے اور اس کے پاکستانی ایڈیشن میں ابواللیث صدیقی کے بارے میں حسب ذیل الفاظ گیان چند جین صاحب نے استعمال کیے ہیں:

''(ابواللیث صدیقی) جب تک چند صفحات میں ہندوؤں پر سب وشتم نہ کر لیں انھیں چین نہیں آتا۔ (ص ۷۵۲)، افسوس کہ وہ ہندوؤں کی محترم ترین ہستیوں اور ہادیوں کا ذکر کرتے ہیں تو کمال بے حرمتی کے ساتھ (ص ۷۶۲)، کتاب کا انداز تحقیقی نہیں...... خود اشتہاری کثرت سے ہے (ص ۷۵۳)۔ (مصنف میں) ہندو کشی (کا رجحان

ہے)(ص ۷۵۳)، (مصنف کی) کس غضب کی ناواقفیت ہے۔ وہ نہ یہ جانتے ہیں
کہ شدر کسے کہتے ہیں، نہ ہندوستان کی قدیم تاریخ جانتے ہیں (ص ۷۵۴)،
(مصنف کو) آریوں اور سنسکرت سے بغض (ہے) (ص ۷۵۷ مصنف) کی طبیعت
میں موزونیت نہیں تھی۔ (ص ۷۷۵) وغیرہ۔

یہ باتیں بالکل صحیح ہیں، بلکہ میرے خیال میں تو ابواللیث صدیقی اور بھی زیادہ سخت الفاظ میں مطعون کیے جانے کے مستحق ہیں۔ جب پاکستانیوں کو ایسی تحریر چھاپنے پر اعتراض نہیں تو ہندوستانیوں کو کیوں ہوگا۔ پھر ''ہندوستان کے اُردو پریس کی آزادی ضرور بے نقاب ہوگئی'' (یعنی ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کا اُردو پریس پاکستان کا غلام ہے)۔ کہنے سے جین صاحب کا کیا مطلب ہے؟

تین سو سے کچھ اوپر صفحات پر مشتمل اس کتاب کا چودھواں (آخری باب) ''اُردو ہندی اور رومن رسم الخط پر ایک طائرانہ نظر'' صرف دس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ہندو مسلم تنازع کے موضوع سے پاک ہے اور اپنے عنوان کے مطابق ہے۔ لیکن اس میں اُردو رسم الخط کی ''برائیاں'' اور ناگری رسم الخط کی ''خوبیاں'' بیان کرنے میں خاصے جوش سے کام لیا گیا ہے۔ ''اُردو رسم الخط کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ صرف اسی کے کام کا ہے جو اس زبان کو جانتا ہو۔'' (ص ۲۵۱)۔ سبحان اللہ، پھر تو یہ ''سب سے بڑی خرابی'' دنیا کی اکثر زبانوں میں ہے۔ بھلا جین صاحب ان زبانوں کو جانے بغیر صرف حرفوں کو پہچان کر تامل یا تیلگو یا ملیالم کا ایک فقرہ پڑھ کر دکھادیں، روسی اور چینی کی تو بات ہی نہ کیجیے۔ رومن رسم الخط جاننے والا تو ڈچ یا جرمن کو بھی بمشکل ہی پڑھ سکتا ہے۔ ''پاکستانی علاقے کے.......... ایک مولوی صاحب پنڈت پنت کو پنڈت نپت (ن پ ت nipat) پڑھتے تھے''۔ (ص ۲۵۱/۲۵۲)۔ درست، ہمارے ایک استاد انگریزی میں "Gokhale" کو مدتوں ''گوکھیل'' پڑھتے رہے۔ ایک اور استاد نے مجھے "Silhouette" کا تلفظ ''سلوٹی'' بتایا، نہ ''سلوئٹ'' جو صحیح تلفظ ہے۔ جین صاحب کے ملاقاتی ایک دو ہائی کورٹ کے جج ضرور ہوں گے۔ ذرا وہ ان سے پوچھ کر دیکھیں کہ ہائی کورٹ کے عام جج کو "Puisne" جج جو کہا جاتا ہے تو اس کا تلفظ ''پیونی'' کیونکر ہوا؟ یقیناً یہ رسم الخط ہی نہیں، پوری انگریزی زبان کی ''خرابی'' ہے تو کیا جین صاحب قبلہ اپنے نئے ہم وطنوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ انگریزی زبان نہ سہی، رومن رسم الخط ہی ترک کردیں؟

اس کتاب کا طرز بیان اور طریق کار غیر علمی اور مناظرانہ ہے۔ اس کی توقع گیان چند جین جیسے استاد تو کیا کسی معمولی درجے کے سیاسی اکھاڑے کے داؤ پیچ بیان کرنے والے سے بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔

لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ مصنف علام کی تمام گہرافشانیوں سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ یہ نتیجہ لابدی ہو جاتا ہے کہ اُردو بولنے والوں اور اُردو کے مصنفین کی برائی کے پردے میں مسلمانوں کی برائی کی گئی ہے کہ لوگوں کے دل میں مسلمانوں اور اُردو زبان کے خلاف بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ اُردو کا تو محض بہانہ ہے۔ مصنف اُردو سے دراصل مسلمان مراد لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کے تشخص کا جو اظہار اُردو زبان وادب میں ہوتا ہے وہ ہندی میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہندوؤں کے تہذیبی تشخص کا اظہار جو ہندی ادب میں ہوتا ہے اس قدر اُردو میں نہیں ہوتا۔ اُردو زبان وادب کا لسانی تہذیبی پس منظر عربی، فارسی اور اسلام سے نزدیک ہے۔ ہندی زبان وادب کا سنسکرت اور ہندو دھرم سے۔'' (ص ۲۷۹)

پوری کتاب میں پروفیسر صاحب نے دو باتوں کی تکرار کی ہے:

۱۔ لسانیاتی اعتبار سے اُردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں۔

۲۔ اُردو کو مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ اُردو کے بنیاد گزار اور اوّلین معمار ہندو ہیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ ''ہندوؤں'' نہیں ''ہندوستانیوں'' کو اُردو کا بنیاد گزار اور اوّلین معمار قرار دینا چاہیے۔ جین صاحب کی دونوں باتیں بالکل صحیح ہیں لیکن یہ نئی دریافتیں نہیں ہیں۔ شاید ہی کوئی صاحبِ ہوش اُردو والا ہوگا جسے ان باتوں سے انکار ہو۔ خود پروفیسر جین نے ان باتوں کی تائید میں اُردو کے متعدد معتبر بزرگوں کے اقوال پیش کیے ہیں، جن میں آل احمد سرور، احتشام حسین، ابومحمد سحر، مسعود حسین خاں، سہیل بخاری اور گوپی چند نارنگ کے نام نمایاں ہیں۔ میرا بھی ہمیشہ سے یہی موقف رہا ہے کہ اُردو اور جدید کھڑی بولی ہندی صرف سیاسی اور بعض تاریخی وجوہ سے دو الگ زبانیں قرار پائی ہیں ورنہ لسانیات کے اصول سے دونوں میں کوئی فرق نہیں اور اُردو کسی غیر ملک سے نہیں آئی، یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی کہ ان دو بدیہی باتوں کو بیان کرنے کے لیے جین صاحب کو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ایسی کتاب جس میں از اوّل تا آخر مسلمانوں اور اُردو کے خلاف زہر اُگلا گیا ہے۔ جین صاحب کے کچھ ارشادات ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اب مزید عبرت کے لیے یہ چند اور ملاحظہ ہوں:

۱۔ (عربی زبان کے) اس لے پالک (اُردو زبان) کا فرضی جد عربی، اس کے صلبی جد

سنسکرت سے علیحدگی اور آویزش پر عمل کرتا رہا ہے۔(ص ۵۷)

۲۔ ہندی کا مزاج مرکز گریز وسعت کا ہے، اُردو کا مزاج تنگ نظری کا۔(ص ۸۹)

۳۔ اُردو کا مزاج تنگ نظری کا ہے۔(ص ۱۲۴)

۴۔ ہندی اپنا دائرہ زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہتی ہے۔اُردو اپنا دائرہ تنگ سے تنگ تر کرنا چاہتی ہے۔عوام سے ہٹ کر والیان ملک اور رؤسا کی جاگیر بنا (کذا) کر (ص ۱۲۵)۔

۵۔ سات سو سال مسلم حکومت نے .... ہندو تہذیب کو دبا کر تیسرے درجے کی چیز بنادیا تھا۔(ص ۱۷۶)

۶۔ اس صدی میں اُردو تحریک کے سالار علیحدگی پسند یا مسلم لیگی مسلمان رہے ہیں۔(ص ۲۴۲)

۷۔ اگر آپ سر سید کی طرح اُردو کے محافظ ہیں تو یہ بھی جان رکھیے کہ اُردو کے تمام یا بیشتر ہندو ادیب اپنے سینے میں ایک راجہ شو پرشاد لیے ہوئے ہیں۔(ص ۲۷۸)

یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کی ہے۔یہ ادارہ اُردو اشاعت کا ایک معتبر ادارہ ہے۔اس کے مالک جمیل جالبی کے بھائی ہیں۔وہی مشہور محقق اور ادبی مؤرخ جمیل جالبی جن کے معتقد ہمارے فاضل مصنف بھی ہیں اور جن کو انھوں نے اپنی کتاب ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' یہ لکھ کر معنون کی ہے کہ جمیل جالبی ''ادبی تاریخ کے سب سے اچھے اہل قلم'' ہیں۔حیرت ہے کہ اُردو کے صریحاً خلاف جھوٹ اور اغلاط اور تعصب سے بھری ہوئی یہ کتاب ایک اُردو ادارہ سے کیسے اور کیوں کر شائع ہوئی؟؟؟

(بشکریہ: کتاب نما، نئی دہلی، بھارت)

☆☆☆

فسطائیت کا لسانی اور ادبی محاذ

ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب

پربندھ سینوجک، الٰہ آباد کی طرف سے ۲۰۰۳-۰۲ء میں ایک عجیب و غریب کتاب شائع ہوئی تھی۔ کتاب چھپی، حکومت بدلی اور کتاب غائب ہوگئی۔ اس کتاب کا نام تھا ''ہندوستانی تہذیب کا مردآہن: ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی''۔ اس کتاب میں اُردو ادیبوں کے ایک حلقے کے مضامین شامل ہیں۔ ایک معروف ادیب نے ڈاکٹر جوشی کو ''اُردو کے ماتھے کا تلک'' قرار دیا ہے۔

پچھلی این۔ڈی۔اے سرکار کے وزیر (ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ) بی جے پی کے ڈاکٹر جوشی جنھیں ''اُردو کے ماتھے'' کا تلک کہا گیا تھا، اُردو زبان وادب اور اُردو تہذیب کا ایک خاص تصور رکھتے ہیں۔ اس تصور کی کچھ تصویر ان کی اس تقریر سے ابھرتی ہے جو ''فروغ اُردو کے سفر میں میرے پانچ سال'' کے عنوان سے قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے شائع کی تھی۔ اس تقریر میں جوشی صاحب نے فرمایا تھا:

> ''گزشتہ پانچ برس میں قومی اُردو کونسل نے ایک نئے وژن کے ساتھ کام کیا ہے۔ یہ وژن نہ صرف اُردو کی ہندوستانی جڑوں کی بازیافت کا ہے بلکہ اُردو کو ہندوستان کی کثیر لسانی حقیقتوں سے جوڑنے کا بھی ہے۔ پچھلے کئی برسوں میں قومی پہچان کو عام ہندوستانی نے نئے انداز میں محسوس کرنا شروع کیا ہے اور اس سے ہم آہنگ ہونے اور وقت کے دھارے کے ساتھ ہم قدم ہونے کے لیے بھی ہندوستان کے کثیر لسانی منظرنامے میں اُردو کی جڑوں کی بازیافت ضروری ہے کیونکہ زبانیں تن تنہا علیحدگی میں نہیں پنپ سکتیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ زبانیں تہذیب اور سنسکرتی کا سب سے اہم حصہ ہیں، ان کے اظہار کا سب سے اہم وسیلہ ہیں۔''

☆

''سبھی زبانوں کو اپنی اساس کی طرف دیکھنا ہوگا تبھی وہ عظیم ہندوستان کی قومی یکجہتی کی

صحیح تصویر پیش کر سکیں گی۔ جیسے دنیا بھر کی دوسری زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں اپنی قومی پہچان کے اظہار کا وسیلہ بنتی ہیں۔ اس حوالے سے اُردو کی جڑوں کی بازیافت کی یہ کوشش، جس کے عملی اقدام قومی اُردو کونسل نے کیے ہیں، بہت ہی اہم اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔''

ان اقتباسات میں خاص طور پر وہ جملے جو خط کشیدہ ہیں، بی جے پی کے ثقافتی اور فکری منصوبوں اور ڈاکٹر جوشی کی راسخ العقیدہ اور محدود و متعین ہندوستانیت کے قیاس میں، ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ ان کے واسطے سے ذہن نہیں بلکہ ذہنیت کے ایک مخصوص نظام کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک طویل مدتی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لیے زبان، ادب، ثقافت، تہذیب، تاریخ، ماضی، روایت، فکری وراثت غرض کہ ہمارے شخصی اور اجتماعی وجود کو چاروں طرف سے گھیرنے والی سرگرمی درکار تھی۔ اور اس سرگرمی کے سب سے تند و تیز رو، سب سے بڑے اور بے حجاب نمائندے ڈاکٹر جوشی تھے۔ انھوں نے اُردو والوں میں اپنے کام کے کچھ لوگ ڈھونڈ نکالے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایسے کام کے لوگ خود بہ خود کھنچ کر ڈاکٹر جوشی تک جا پہنچے۔ پچھلے ان پانچ برسوں کے دوران، جن کی طرف اپنی تقریر دل پذیر میں ڈاکٹر جوشی نے اشارہ کیا تھا، ذرا غور تو کیجیے کہ ثقافتی اور تعلیمی اداروں کے تجربے کیا رہے ہیں؟ قومی اُردو کونسل، ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، آئی سی سی آر کی مثالیں سامنے کی ہیں اور ڈاکٹر جوشی کے اپنے فیضان اور ان کی نظریاتی وابستگی کا مرکزی حوالہ بننے والے سرچشمۂ فیضان کے باج گزار اور اطاعت شعار لوگوں نے کیسے کیسے کرتب دکھائے تھے۔ کانگریس کے عہد ایمرجنسی میں قائم ہونے والا نیشنل رائٹرز فورم اس کے سامنے پھیکا پڑ گیا۔ ڈاکٹر جوشی کی ''پالیسی سازی'' تک کے مداح اُردو والوں میں دیکھتے دیکھتے پیدا ہو گئے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کی انتہائی فکر انگیز بلکہ تشویش انگیز کتاب، جسے آپ جو بھی چاہیں کہہ لیں، لیکن غیر متوقع نہیں کہہ سکتے۔ جین صاحب کے کئی مشاہدات ایسے ہیں جن پر سنجیدہ علمی بحث ہو سکتی ہے اور بحث کی بھی جانی چاہیے۔ لیکن کئی باتیں انھوں نے ایسی بھی کہی ہیں جو اخلاقی اور ذہنی لحاظ سے ہندوستان کے جیسے کمزور جذباتی ماحول میں ایک نئے فرقہ وارانہ فساد کا بہانہ بھی بنائی جا سکتی ہیں۔ اس کتاب کے تذکرے کی یہ تمہید بہتوں کو پریشان کرے گی۔ میں خود بھی اس تمہید سے اپنی جگہ کم ناخوش یا پریشان نہیں ہوں۔ یہ ان معدودے چند کتابوں میں ہے جو اپنے قاری کو شرمندہ کرنے بلکہ خوف زدہ کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ کتاب اس تنبیہ کو دہراتی دکھائی دیتی ہے کہ میاں باز آ جاؤ یا پھر ایک نیا پاکستان اپنے

لیے اور بنالو۔ اس متنازعہ اور محیر العقول کتاب پر ٹھیٹ علمی انداز میں شمس الرحمٰن فاروقی کا تبصرہ شائع ہو چکا ہے اور اس پر علمی اعتبار سے کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ ہر چند کہ فاروقی صاحب کی طبعی سخاوت اور شخصی معاملات میں چشم پوشی کا عنصر بھی اس تبصرے سے کہیں کہیں صاف جھلکتا ہے۔ لیکن انھوں نے جس مستحکم، مدلل، معقول اور مربوط طریقے سے جین صاحب کی قائم کردہ بیشتر دفعات کو مسترد کیا ہے، اس پر انھی کا حق تھا۔ وہ نہ تو جین صاحب پر جھنجلائے ہیں، نہ ان کے علم و فضل کا کہیں مذاق اڑایا ہے جین صاحب کا شمار اُردو والوں نے ہمیشہ ایک سنجیدہ معلم، محقق اور سستی شہرت کے چکر سے دور رہنے والے شائستہ اور منکسر المزاج انسانوں میں کیا ہے۔ اس کتاب ''ایک بھاشا......'' کی اشاعت کے بعد بھی، ان کے پچھلے علمی کاموں کی وقعت اور قدر و قیمت برقرار رہے گی اور جہاں تک ان کی اس گہری، نفرت آمیز عصبیت کا تعلق ہے جو ان کے اس کتاب ''ایک بھاشا......'' کی شریانوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے، تو اسے دیکھ کر واقعی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ گجرات کے ۲۰۰۳ء کا قصہ ابھی تازہ ہے اور نریندر مودی کو ابھی بھی کچھ لوگ اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ جین صاحب کی بعض کتابوں میں ہندو مسلم تعلقات پر مثنویوں یا داستانوں کے حوالے سے جس طرح کی تیکھی ترچھی نظر ڈالی جا چکی ہے، اس کے پیش نظر ''ایک بھاشا............'' کے تھیس کا ان کی زندگی کے اس المناک دور میں سامنے آنا، غیر متوقع ہرگز نہیں۔ لیکن اس تھیس کے پس پشت اتنا غم و غصہ بھرا ہوا ہے، جذبوں کا ایسا جوالا مکھی بھبھک رہا ہے، اس بات کا کسی کو، جس نے جین صاحب کو ہمیشہ ایک نرم آثار انسان کے ظور پر دیکھا ہے، دور دور تک گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لگتا ہے جین صاحب اپنی کمزور بوڑھی چال چلنے کے بجائے رجزیہ انداز میں اور نریندر مودی کی طرح کسی انتخابی ریلی کو خطاب کر رہے ہیں۔ جین صاحب ڈھونڈ ڈھونڈ کر (بالعموم حوالے کے بغیر) ایسے مفروضات، واقعات اور حقائق سامنے لائے ہیں جن کے ذریعے ہندی والوں کو مشتعل، اُردو والوں کو شرمندہ و منفعل کر سکیں۔ انھیں ایک دوسرے سے کسی طرح قریب نہ آنے دیں۔ ان کا حملہ صرف اُردو زبان پر نہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کی پوری تاریخ پر ہے۔

اصل میں تاریخ کا دامن ہر قسم کے مال مسالے سے بھرا ہوتا ہے۔ اچھی بُری ہزار باتیں ہمارے مشترکہ اور غیر مشترکہ ماضی سے ایسی نکالی جا سکتی ہیں جو باہمی اعتماد، اخوت اور رواداری کی قدروں کو دھکیل کر سامنے سے ہٹا دیں۔ اس معاملے میں ہمارے جین صاحب اس انتہا کو جا پہنچیں گے، یہ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا اور تو اور میر، غالب، اقبال تک ان کی ضرب سے نہیں بچے۔ جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے ترجمانوں میں انھوں نے جان بوجھ کر سرسید کو نشانہ بنایا، جن کی بابت ہندی والوں میں بھی (ویر بھارت تلوار)

یہ خیال عام ہے کہ انیسویں صدی کے تمام سماجی مصلحوں میں اکیلی سرسید کی ذات سیکولر قدروں کی ترویج و ترقی چاہتی تھی اور اکیلی علی گڑھ تحریک ایسی منصوبہ بند کوشش تھی جس کے مقاصد آریہ سماج، برہمو سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، رام کرشن مشن، پرارتھنا سماج کے برعکس کسی ایک قوم (Community) یا مسلک کے پابند نہ تھے۔ میں اس طرح کے موازنے کو شرانگیز اور بے توفیقی کی بات سمجھتا ہوں، تاہم جین صاحب سے پلٹ کر پوچھا جا سکتا ہے کہ میر، غالب، اقبال، سرسید جیسی وسیع المشربی کا خواب انھیں ان کے معاصرین میں کتنے ہندی والوں کے یہاں ملتا ہے؟ یہاں، ہندو مسلمان، کے لفظ سے میں نے قصداً گریز کیا ہے۔ جین صاحب نے اُردو ہندی کے مسئلے کو ہندو مسلم مسئلہ بنانے میں اپنی ساری دانائی، عمر بھر کی ذہنی کمائی اور ساری بچی کھچی توانائی داؤ پر لگا دی ہے۔ ان کی اس تحقیقی کاوش کا سب سے افسوسناک پہلو یہی ہے۔ متحدہ قومیت کے تصور اور مشترکہ معاشرتی قدروں میں بے یقینی نیز (مسلمان) اُردو والوں سے چھوٹی بڑی شکایتوں کے پہلو جین صاحب کی سابقہ تحریروں (خاص کر سیدہ جعفر کے اشتراک سے لکھی جانے والی تاریخ ادب) اور جین صاحب کے تحقیقی مقالات (ڈی۔فل اور ڈی لٹ) میں نمایاں ہیں۔ لیکن ہزار گلے شکوے، ملامتوں اور مذمتوں کے باوجود یہ لَے کہیں بھی اتنی اونچی نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اس کتاب ''ایک بھاشا...... ،، میں دکھائی دیتی ہے۔ جین صاحب کو اقبال سے تو خیر ہمیشہ سے کدر رہی ہے اور وہ اقبال کے ابتدائی کلام پر ایک عجیب و غریب کتاب بھی لکھ چکے ہیں جس کا ایک جواب بھی شائع ہو چکا ہے۔ (پروفیسر یعقوب عمر: اقبال کے اشعار پر زعفرانی یلغار) لیکن اقبال کے ساتھ میر، غالب اور سرسید کا جین صاحب کی زد میں آنا واقعی حیران کن ہے۔

جین صاحب سے بہت پہلے آچاریہ رام چندر شکل نے ۱۹ اپریل ۱۹۱۷ء کے انگریزی روزنامے "The Leader" (الٰہ آباد) میں ایک مضمون بہ عنوان ''ہندی اور مسلمان،، لکھا تھا جس کا ہندی ترجمہ ہندی کے رسالے کے تازہ ترین شمارے میں شائع ہوا ہے۔ شکل جی اُردو کو غیر فطری زبان سمجھتے تھے۔ اس کی ''ہندوستانیت،، کے قائل نہ تھے۔ پورے ملک میں صرف ایک زبان کے چلن کا خواب دیکھتے تھے۔ انھوں نے اُردو پر بہت سے حملے کیے ہیں۔ لیکن جین صاحب کا حملہ صرف اُردو پر نہیں اُردو کو اپنی زبان سمجھنے والے مسلمانوں پر بھی ہے۔ رام چندر شکل جی کے مضمون کا ہندی ترجمہ میں نے 'اُردو ادب،، کے مدیر اسلم پرویز صاحب کو پیش کیا ہے، چاہیں تو اسے اُردو میں منتقل کرنے کے بعد 'اُردو ادب، میں شائع کر دیں لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تاریخ کے گھاؤ، جو بڑی مشکلوں سے اور بہت دیر میں بھرتے ہیں، انھیں بار بار کریدنے سے کیا حاصل۔ شکل جی نے اپنا مضمون ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا۔ جین صاحب کی کتاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی اور اس کی

پشت پر ۲۰۰۲ء کے گجرات اور فسادات کا گہرا لمبا سایہ ہے۔ ان حالات میں تو پہلے سے زیادہ ہوش مندی اور ضبط اور رواداری درکار تھی۔

اسی سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ آچاریہ رام چندر شکل کے مضمون اور اُردو کے سلسلے میں ڈاکٹر دھیریندر ورما (الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر) کے اعتراضات کا جواب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے دیا تھا۔ یہ جواب ''ناگزیر قیل وقال'' کے عنوان سے ''زبان اُردو پر بعض اعتراضات کا مسکت جواب'' کے طور پر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا اور اشاعت سے پہلے ۴ مارچ ۱۹۴۰ء کی اُردو کانفرنس، ناگپور میں اسے پڑھا بھی گیا تھا۔ پنڈت کیفی صاحب نے شروعات یہاں سے کی تھی کہ:

''حضرات!

اب زمانہ وہ آیا ہے کہ کلیہ اور مستثنیات، مبادی اور منتہا سے قطع نظر کی جائے اور حالات حاضرہ پر غور کیا جائے۔ اس سے ہماری داخلی کوششیں کچھ مدت کے لیے التوا میں ضرور پڑ جائیں گی لیکن ہم ایسا کرنے پر مجبور کیے گئے ہیں۔ جیسی حالت آج کل یورپ میں ہو رہی ہے کہ کوئی جاندار اور متمدن قوم کم سے کم مسلح علیحدگی اور اپنی حفاظت کے مکمل سامان کے بغیر نہیں رہ سکتی، اسی حالت میں ہم اس وقت اُردو اور اُردو والوں کو پاتے ہیں۔ اس پر تو پھر غور کیا جائے گا کہ یہ ادبی اور لسانی نازیت وطن کی ترقی اور وطنیت کے حق میں کہاں تک زہر قاتل ہے؟ اس وقت ہمارا یہ فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ جو کچھ اُردو کے خلاف کہا جاتا ہے، اس میں آیا کچھ صداقت ہے؟''

آج تو حالات پہلے سے بھی بدتر ہیں۔ جین صاحب نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب بھارتیہ جنتا پارٹی یا این۔ ڈی۔ اے کا اقتدار قائم تھا اور چھوٹے بڑے سب اس گمان میں تھے کہ 'ہندوستان چمک رہا ہے، سو، یہ اقتدار ابھی اور چلے گا اور چلتا رہے گا۔ صاف لگتا ہے کہ جین صاحب بھی اس رَو میں بہہ گئے۔ جین صاحب اور ان کی جیسی فکر رکھنے والوں کے ساتھ المیہ یہ پیش آیا کہ یا تو این۔ ڈی۔ اے کی حکومت قبل از وقت ختم ہو گئی یا پھر اس کتاب کی تکمیل میں وقت تھوڑا زیادہ لگ گیا، ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ کتاب قومی اُردو کونسل سے یا ساہتیہ اکیڈمی سے بڑے کروفر کے ساتھ شائع ہوتی۔ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے ملک کے پورے تعلیمی نظام کو، تمام ثقافتی اداروں کو اپنے مشن کا تابع دار بنانے کی جیسی جدوجہد شروع کی تھی، اس کے نتائج کچھ بھی ہو

سکتے تھے۔ اُردو کو اس وقت پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی جیسے بے لوث اُردو سے محبت کرنے والوں کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے۔

جین صاحب کی کتاب کا بنیادی عیب یہ ہے کہ اس سے بڑے معاشرتی مقاصد سے ایک کھسکے ہوئے ذہن کے بجائے، دراصل ایک خاص ذہنیت کا اظہار ہوا ہے۔ اُردو کو، مسلمانوں کو، اُردو کے سیکولر کردار میں یقین رکھنے والوں کو، ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کو، ہندوستان کے حال اور مستقبل کو سب سے زیادہ خطرہ اسی ذہنیت سے لاحق ہے۔ یہ کتاب پروین توگڑیا، یا اشوک سنگھل یا بلراج مدھوک، یہاں تک کہ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے قلم سے نکلی ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اُردو والے بھی شاید سب کچھ خاموشی سے پی جاتے کیوں کہ ان برگزیدہ اصحاب کی اول فول کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن جین صاحب تو زبان وادب کے استاد رہے ہیں اور ان کا تعلق پچھلی کئی نسلوں سے، خود ان کے اپنے قول کے مطابق، اس عظیم انسانی ہند اسلامی روایت سے رہا ہے جس نے ایک بے مثال ثقافتی تجربے کے لیے زمین ہموار کی۔ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی سے قطع نظر، اس ثقافتی تجربے نے تو مغرب کی کسی زبان کے لیے بھی اپنے دروازے کبھی بند نہ کیے۔ پرتگالی، فرانسیسی، اطالوی، انگریزی، جرمن لفظوں اور ان کے آہنگ کا اجالا اُردو زبان وادب کی پوری روایت پر پھیلا ہوا ہے۔ علامہ اقبال نے ۱۸۷۰ء کی فرنیکو پرشن وار کے بعد جرمن اثباتیت پسندی کے تحت رونما ہونے والے ان شاعروں اور شعری میلانات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو سعدی، حافظ، رومی کی روح میں اپنی روح کا عکس دیکھتے ہیں، اپنے آپ کو فارسی شاعری کی متصوفانہ روایت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جین صاحب کا اُردو جیسی لوچ دار، ہمہ گیر، وسیع المشرب زبان اور اس سے وابستہ ثقافتی روایتوں کو بے اعتباری، لاتعلقی یا تحقیر کی نظر سے دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟ ہمیں ایک دوسرے سے دور کرنے والی بہت سی باتیں تھیں۔ علاقے، مذہب، رنگ و نسل کے نام پر کتنی دیواریں اجتماعی زندگی کے نقشوں کو تتر بتر کر چکی ہیں۔ جین صاحب نے زبان وادب کو تو بخش دیا ہوتا اور وہ بھی اُردو جیسی زبان جس کی پوری تاریخ اتحاد و اتفاق، اشتراک اور یک جہتی کی شہادتوں سے بھری پڑی ہے انھیں اُردو کلچر کے پرشکوہ سرمائے میں سے یہی کچھ ہاتھ آیا۔ جس کی بنیاد پر انھوں نے اُردو اور اُردو والوں (مسلمانوں) کی ہندو دشمنی اور ہندوستان دشمنی کا ہوائی افسانہ ترتیب دیا ہے!

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں (۱۹۶۲ء تا ۶۶-۱۹۶۵ء) اُردو ہندی کے تنازعے اور اُردو رسم الخط کے مسئلے نے ایک پریشان کن رخ اختیار کر لیا تھا۔ راہی معصوم رضا کے مضامین دھرم

ویر بھارتی کے رسالے (دھرم یگ) میں بہت طمطراق کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ رام لعل مرحوم ہندو ادیبوں کی ایک الگ انجمن بنانے کی فکر میں تھے۔ عصمت چغتائی، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کرشن چندر اور منظر سلیم نے اپنے اپنے طور پر اور اپنی اپنی توفیق کے مطابق ان مسئلوں کو سلجھانے کے مشورے دیے تھے۔
فراق صاحب نے لگ بھگ اسی دور میں "My Anti Hinduism The Mistake of Hindi" کے سلسلۂ مضامین کی باڑھ لگا دی تھی، انگریزی کے قومی روزناموں (بالخصوص "Hindustan Times" میں)۔
امرت لال ناگر، بھگوتی چرن ورما، دھرم ویر بھارتی، مہا دیوی ورما اور ہمارے جین صاحب کے ایک سینئر ہم مسلک صحافی گری لال جین، جو ان دنوں ''ٹائمز آف انڈیا'' کے ایڈیٹر تھے، اُردو ہندی کی بحث میں بہت پرجوش تھے۔ لیکن کسی نے بھی اپنی جذباتی اور شدت پسندی کے باوجود اس مسئلے کو ہندو مسلم مسئلہ بنانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اُردو والوں میں پنڈت آنند نرائن ملا جیسے لوگ بھی تھے جو یہ کہتے تھے کہ میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں، زبان نہیں چھوڑ سکتا۔ مانا کہ دنیا بدل گئی اور وہ سانچے اب ٹوٹ چکے ہیں جن میں ملا صاحب کی جیسی روشن شخصیتیں ڈھلتی تھیں۔ یہاں جین صاحب اور ان کے طرزِ خیال و طرزِ احساس میں شریک اصحاب کو یہ بھی یاد دلا دیا جائے کہ گوپال متل مرحوم نے تقسیم کے بعد ہندوستان میں اُردو کی صورتحال اور اُردو کے ہندو ادیبوں کا احاطہ کرتے ہوئے کیا کہا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ تقسیم سے ہندوستان کو جو بھی نقصان پہنچا ہو، اُردو کے ہندو ادیب، بہرحال فائدے میں رہے۔ انھیں اپنی صلاحیت، منصب اور خدمات کا صلہ اور معاوضہ کسی بھی سطح پر کم نہیں ملا۔ انعامات، اعزازات، مناصب، اعترافات، تعریف و تحسین کے ڈونگرے آخر کہاں کوئی کمی دکھائی دیتی ہے؟ ایسی صورت میں جین صاحب کی اس کتاب کا منصۂ شہود پر نمودار ہونا، ہمیں اسی وہم کی طرف لے جاتا ہے کہ ہو نہ ہو، ان کی اس خدمت (کارنامے) کے ڈانڈے کسی نہ کسی طور پر اس فرقہ پرستانہ مہم سے جا ملتے ہیں جس کا ایک نتیجہ ۲۰۰۲ء کا گجرات تھا۔ ہماری اجتماعی زندگی اور مشترکہ تہذیب، اب کسی اور گجرات کا بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں ہے!

☆☆☆

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

علی گڑھ، بھارت

ہندی امپیریلزم اور اُردو

''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' کو دوبارہ پڑھنے پر

اُردو کے ممتاز محقق و عالم پروفیسر گیان چند جین نے اپنی حالیہ متنازع فیہ تصنیف 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں ہندی کو اُردو سے قدیم تر زبان ثابت کرنے کے لیے ''کھڑی بولی ہندی'' کی تاریخ کا آغاز ''اندازاً ۱۱۰۰ء'' سے کیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ کھڑی بولی ہندی کی ابتدا جسے 'ناگری ہندی' بھی کہتے ہیں اور جو زمانۂ حال کی 'ہندی' ہے، درحقیقت انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے جب للوجی لال فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں بیٹھ کر 'پریم ساگر' لکھتے ہیں۔ جین صاحب نے اپنی متذکرہ کتاب میں اس لسانی اور تاریخی حقیقت کو جھٹلانے کی پوری کوشش کی ہے۔

گیان چند جین کا یہ کہنا کہ ''کھڑی بولی ہندی...... محض ایک واحد زبان نہیں بلکہ شمالی ہند کی مختلف زبانوں اور بولیوں کا ایک وفاق ہے'' ('ایک بھاشا......'ص ۱۵)، ان کی ہند آریائی لسانیات سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ وہ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے بعد شمالی ہندوستان میں شورسینی اپ بھرنش، ماگدھی اور اردھ ماگدھی اپ بھرنش کے بطون سے پیدا ہونے والی بولیوں (Dialects) کے باریک اختلافات سے قطعی ناواقف ہیں۔ اسی لیے وہ ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، اودھی، میتھلی، بگھیلی، چھتیس گڑھی، بھوجپوری، راجستھانی وغیرہ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ یہ بولیاں کبھی ایک دوسرے سے مماثل نہیں رہیں ورنہ ان کے الگ الگ نام کیوں پڑتے اور یہ اپنی علاقائی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے کیوں پہچانی جاتیں۔ ان تمام بولیوں کو ایک لسانی وفاق میں شامل کرنا (اور وہ بھی کھڑی بولی کے تحت جو ایک نہایت کمزور اور پچھڑی ہوئی بولی تھی) محض لسانی جبر ہے اور ان بولیوں کی لسانی انفرادیت اور شناخت کو ختم کرنا ہے۔ جین صاحب نے یہ اس وجہ سے کیا ہے کہ ہندی کے لسانی دائرے کو علاقائی سطح پر وسیع سے وسیع تر کیا جا سکے اور ہندی کی ایک 'وسیع برادری'' تشکیل دی جائے۔ وہ اپنی متذکرہ کتاب میں لکھتے ہیں:

''ان زبانوں/ بولیوں کے بولنے والے اپنی خوشی اور رضامندی سے...... خود کو ہندی کی وسیع برادری کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ پھر اُردو والے ان کے موقف پر کیوں اعتراض کرتے ہیں'' (ص ۱۵)۔

جین صاحب! بھلا اُردو والے اس ''موقف'' پر کیوں اعتراض کرنے لگے۔ یہ تو خود ان بولیوں کے بولنے والے ہندی کی اس آمریت پر وقتاً فوقتاً احتجاج کرتے رہے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو جین صاحب حکومتِ ہند کے مقتدر ادارے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (میسور) سے شائع شدہ کتاب "Language Movements in India" (ہندوستان کی لسانی تحریکیں) کو دیکھ لیں، ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اس کتاب کے ایک مضمون نگار بال گووند مشر نے اپنے مضمون میں ہندی علاقوں میں سر اٹھانے والی لسانی تحریکوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو تمام تر ہندی کی بولیوں سے متعلق تحریکیں ہیں۔ ان تحریکوں کو چلانے والے اپنی اپنی بولیوں کا لسانی، ادبی اور ثقافتی تشخص چاہتے ہیں اور ان کے فروغ کے امکانات کے متلاشی ہیں۔ بعض بولیوں نے اپنے بہت سے مطالبات سرکاری سطح پر منوا بھی لیے ہیں۔

یہ ہندی امپیریلزم ہی تو ہے کہ شمالی ہندوستان (ہریانہ و راجستھان تا بہار و جھارکھنڈ) کی ۴۸ علاقائی بولیوں (Regional Dialects) کو ہندی نے اپنی 'قلم رو' میں شامل کر رکھا ہے جس سے ان بولیوں کی انفرادیت ختم ہوگئی ہے اور ہندی بولنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے۔ "Census of India" جو حکومتِ ہند کی ایک مشینری ہے مردم شماری میں ان بولیوں کا اندراج ہندی زبان کے تحت کرتی ہے جب کہ ان میں سے متعدد بولیاں اپنی لسانی ساخت اور قواعد و تلفظ نیز ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے ہندی سے حد درجہ مغائرت رکھتی ہیں۔ بعض بولیاں ادبی اعتبار سے بھی نہایت متمول اور ترقی یافتہ ہیں اور ان کا ادبی سرمایہ نہایت قدیم اور وقیع ہے۔ ان میں سے دو بولیوں میتھلی اور راجستھانی کو ساہتیہ اکادمی نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ میتھلی کو بہار کی بعض یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم میں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ لیکن ہندی نے ان بولیوں کو اپنے شکنجے میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ یہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ بعض لوگوں نے ان میں سے کچھ بولیوں کو ہندی سے الگ کرنے کی مہم اور تحریک چلائی تھی، مثلاً جے کانت مسرا اور سبھدرا جھا نے اپنی تحقیق کی رو سے میتھلی کو ہندی سے الگ زبان 'گھوشِت' کیا تھا۔ اسی طرح اُودے نارائن تواری نے کافی چھان بین کے بعد بھوجپوری کو ہندی سے الگ زبان قرار دیا تھا۔ راجستھان کے جے نارائن ویاس نے راجستھانی کو ہندی سے الگ کرنے کی زبردست مہم چلائی تھی۔ جارج گریرسن جیسا زبان شناس اور ہند آریائی لسانیات کا ماہر بھی میتھلی، بھوجپوری اور

راجستھانی کو ہندی سے الگ زبانیں تسلیم کرتا تھا۔ سنیتی کمار چٹرجی بھی میتھلی کو ایک باقاعدہ زبان مانتے تھے اور اسے ہندی کی بولی قرار دیے جانے کے سخت خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میتھلی کا اپنا ادب اور اپنی خصوصیات ہیں۔ اودے نارائن سنگھ نے بھی، جو سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند) کے موجودہ ڈائریکٹر ہیں، اپنے ایک مضمون "The Maithili Language Movement" (مشمولہ "Language Planning" مرتبہ ای۔ انا ملائی) میں میتھلی کی تاریخی وتہذیبی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس کی لسانی تحریکات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن ان عالموں اور دانشوروں کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں اور ہندی آمریت اپنی جگہ بدستور قائم رہی۔

اہلِ ہندی کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر ان بولیوں نے سر اٹھایا اور انھیں زبان کا درجہ مل گیا تو ہندی کا دائرۂ اثر ورسوخ سمٹ کر رہ جائے گا اور اس کے بولنے والوں کے اعداد وشمار بھی بڑی حد تک گھٹ کر رہ جائیں گے۔ اس امر کا ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ہندی بولنے والوں کی کل تعداد ۳۳،۷۲،۷۲،۱۱۴ (تینتیس کروڑ بہتر لاکھ بہتر ہزار ایک سو چودہ) تھی جو ہندوستان کی کل آبادی کا ۳۹،۸۵ فی صد ہے۔ اس میں ہندی کی ۴۸ بولیوں کے بولنے والوں کے اعداد بھی شامل ہیں۔ اگر ان بولیوں کا اندراج ہندی کے تحت نہ کیا جاتا تو ہندی بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر ۲۳،۳۴،۳۲،۲۸۵ (تیئیس کروڑ چونتیس لاکھ بتیس ہزار دو سو پچاسی) رہ جاتی، لیکن ۱۰،۳۸،۳۹،۸۲۹ (دس کروڑ اڑتیس لاکھ انتالیس ہزار آٹھ سو انتیس) لوگوں کی لسانی انفرادیت برقرار رہتی جنھوں نے اپنی مادری زبان کی حیثیت سے اس مردم شماری میں ان ۴۸ بولیوں کا اندراج کروایا تھا۔ یہ لسانی جبر ہی تو ہے کہ بعد میں ان بولیوں کو ہندی کی بولیوں میں شامل کر لیا گیا اور ان کے اعداد وشمار ہندی کے اعداد وشمار میں ضم کر دیے گئے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندی بولنے والے ہندوستان کی کل آبادی کا ۳۹،۸۵ فی صد ہیں۔ اسی مردم شماری کی رو سے ہندی کے تحت شمار کی جانے والی ۴۸ بولیوں کے بولنے والے ہندوستان کی کل آبادی کا تقریباً ۱۲،۰۲ فی صد ہیں۔ اگر ہندی کے فی صد میں سے ان بولیوں کے فی صد کو وضع کر لیا جائے تو ہندی بولنے والوں کا فی صد گھٹ کر ۲۷،۸۳ رہ جاتا ہے۔

اگر ہندی کی ان ۴۸ بولیوں کو آزادانہ طور پر پھلنے پھولنے کے مواقع ملیں تو ان میں سے متعدد بولیاں، مثلاً اودھی، میتھلی، بھوجپوری، مگہی، برج بھاشا، راجستھانی، میواتی، بگھیلی، چھتیس گڑھی، ہریانوی، گڑھوالی، میواڑی وغیرہ جدید ہند آریائی زبانوں کی ہمسر بن سکتی ہیں جیسا کہ دہلی ونواحِ دہلی (شمال مشرقی

دہلی اور مغربی یو۔پی) کی ایک بولی 'کھڑی بولی' کے ساتھ ہوا۔ کھڑی بولی جو ۱۰۰۰ء کے بعد شورسینی اپ بھرنش کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی کافی کمزور اور پچھڑی ہوئی بولی تھی لیکن جیسے ہی نو وارد مسلمانوں نے اسے درخورِ اعتنا سمجھا یہ چمک اٹھی اور اس نے بہت جلد ایک خود مختار اور آزاد و مستقل زبان کا درجہ حاصل کرلیا۔ یہی زبان اپنے ادبی، معیاری اور ترقی یافتہ روپ میں آج 'اُردو' کہلاتی ہے۔ ہندی، ہندوی اور ریختہ اسی زبان کے قدیم نام ہیں۔ گیان چند جین کو بھی اس لسانی حقیقت کا اعتراف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کھڑی بولی ہندی (''کھڑی بولی ہندی'' نہیں، بلکہ صرف کھڑی بولی)، نسبتاً ایک پچھڑی ہوئی جامد زبان (''زبان'' نہیں، بولی) تھی۔ بیرونی مسلمانوں کی سرپرستی اور نوک پلک سنوارنے کے بعد یہ اُردو کے پیرہنِ دلکش کی شکل میں، ادبی محاورے میں چہچہاتی ہوئی ظاہر ہوئی'' (ایضاً ص ۱۶)۔
>
> (نوٹ: قوسین میں دیے ہوئے الفاظ راقم الحروف کے ہیں)۔

تاہم اُردو کے بارے میں جین صاحب کی نیت صاف نہیں ہے۔ وہ اپنی کتاب 'ایک بھاشا.....' میں اُردو کے تاریخی ولسانی پہلوؤں کو اہلِ ہندی بالخصوص امرت رائے کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے (امرت رائے کو) جس نے بقول ان کے ''بے خوفی سے اُردو کے خلاف لکھا ہے''، وہ (گیان چند جین) ''صالح مصنف'' کے خطاب سے نوازتے ہیں (ص ۱۴)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گیان چند جین نے اپنی اِس کتاب میں درحقیقت ہندی زبان کی تاریخ بیان کی ہے اور ساتھ میں اُردو زبان وادب اور مسلمانوں کو بھی گھسیٹ لیا ہے جیسے کہ سارا قصور انھیں کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندی علاقے کی بولیوں کی تمام تر لسانی تحریکیں غیر اُردو والوں نے چلائیں (یا چلا رہے ہیں) کیوں کہ وہ ''ہندی کی وسیع برادری'' میں شامل ہونا نہیں چاہتے لیکن اس کا الزام جین صاحب ''اُردو والوں'' کو دے رہے ہیں۔

اُردو ہندی کے لسانی معاملات کو جین صاحب نے نہایت جانب داری کے ساتھ پیش کیا ہے اور ہر جگہ ان کا موقف ''ہندی والوں'' کا ہی رہا ہے۔ اہلِ اُردو کے کسی بیان سے انھیں اتفاق نہیں جب کہ وہ خود اُردو کے ایک نامور محقق اور عالم ہیں اور لسانیات سے بھی قدرے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور ان سے غلط مطلب اخذ کرتے ہیں تاکہ ہندی کو اُردو پر فوقیت زمانی حاصل ہوجائے۔ جہاں تک کہ ہندی امپیریلزم کا تعلق ہے، جین صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''ہندی والوں نے

ہندی امپیریلزم کے بل پر متعدد دوسری زبانوں اور بولیوں کو اپنی قلم رو میں ملا لیا۔'' (ص ۴۳)

اُردو بھی جو ایک خود مختار، ترقی یافتہ اور معیاری زبان ہے ہندی امپیریلزم سے نہ بچ سکی۔ اہلِ ہندی نے اُردو کی ادبی اور لسانی تاریخ سے مبینہ طور پر چشم پوشی کرتے ہوئے محض اپنی تنگ نظری اور لسانی تعصب کی بنا پر اور ہندی کی برادری کو وسیع تر کرنے کی غرض سے اس زبان کو ہندی کی ایک ''شیلی'' قرار دے دیا۔ شیلی کا مطلب ہوتا ہے کسی زبان کا محض ایک اسلوب یا اسٹائل۔ کسی آزاد، مستقل اور ترقی یافتہ زبان کو کسی دوسری زبان کی شیلی کہنا اس کے وجود کی نفی کرنا ہے، اس کی لسانی انفرادیت کو ختم کر دینا ہے اور اس کے تمام تر ادبی اور لسانی سرمایے پر شب خون مارنا ہے۔ اہلِ ہندی نے اُردو کو ہندی کی شیلی قرار دے کر یہی سب کچھ کیا ہے۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تو ہے کہ اُردو جیسی آزاد، مستقل، معیاری اور ترقی یافتہ زبان کو جو تاریخی اعتبار سے ہندی (کھڑی بولی ہندی) سے کہیں زیادہ قدیم اور ادبی اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ متمول زبان ہے، محض ایک شیلی کہا جائے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو ہندی کی ہمسر ہے، اس کی شیلی نہیں۔

اُردو کو ہندی کی شیلی کہنے کی بدعت انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں شروع ہوئی جب کھڑی بولی ہندی کے ایک حمایتی ایودھیا پرساد کھتری نے کھڑی بولی ہندی اور اُردو میں کوئی فرق نہ مانتے ہوئے اُردو کو ہندی کی ''شیلی'' قرار دے دیا۔ کھتری کہتے تھے کہ اُردو اور ہندی میں فرق صرف ''لپی'' (رسمِ الخط) کا ہے۔ کھتری اہلِ اُردو کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ وہ فارسی رسمِ الخط کو چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیں۔ ایودھیا پرساد کھتری کے بعد بیشتر اہلِ ہندی نے اسی طرز پر سوچنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اُردو کو ہندی کی شیلی کہنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہندی کے حلقے سے باہر سنیتی کمار چٹرجی جیسے عالم بھی اپنی تنگ نظری اور متعصبانہ ذہنیت کے باعث اُردو کو ہندی کی شیلی کہنے میں نہیں جھجکتے (دیکھیے ان کی تصنیف 'انڈو آرین اینڈ ہندی'، ص ۲۰۹)۔

آئینِ ہند کے آٹھویں شیڈول (Schedule VIII) میں مندرج ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے ساتھ اُردو کا بھی اندراج ملتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کی دوسری شیڈول زبانوں کی طرح اُردو کا بھی اندراج ملتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کی دوسری شیڈول زبانوں کی طرح اُردو بھی ایک آئینی زبان (Constitutional Language) قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردم شماری کا عملہ اُردو کی انفرادیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے اعداد و شمار کا اندراج دوسری شیڈول/آئینی زبانوں کی طرح علیحدہ طور پر کرتا ہے۔ اگر اُردو کو آئینی زبان کا درجہ حاصل نہ ہوا ہوتا تو آج مردم شماری کی رپورٹ میں اسے غالباً 'ہندی' کے تحت ہی

درج کیا جاتا جیسا کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی ۴۸ بولیوں (جن کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہے) کو درج کیا گیا ہے اور ان کے بولنے والوں کی تعداد کو ہندی بولنے والوں کی تعداد میں ضم کر دیا گیا ہے۔

گیان چند جین جو اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں نہیں مانتے، اس بات پر معترض ہیں کہ ہندوستان کے آئین میں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کا اندراج کیوں کیا گیا؟ بقول ان کے یہ ''سیاسی مصلحت'' ہے۔ جین صاحب اپنے ایک لسانی مضمون ''اُردو، ہندی یا ہندوستانی'' (مطبوعہ 'ہندوستانی زبان'، اکتوبر ۱۹۷۳ء) میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کے آئین میں اُردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے، لسانی حقیقت نہیں۔''

جین صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب ہندوستان کے آئین میں ہندی کا اندراج کر دیا گیا تھا تو پھر اس میں اُردو کو درج کرنے کی ضرورت کیا تھی کیوں کہ اُردو اور ہندی دونوں ایک ہی زبانیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بول چال کی سطح پر جو زبان کی نچلی سطح (Grass-root level) ہے، اُردو اور ہندی میں نمایاں فرق نہیں پایا جاتا اور یہ دونوں زبانیں اس سطح پر پہنچ کر تقریباً ایک ہو جاتی ہیں کیوں کہ ان دونوں زبانوں کا ارتقا ایک ہی ماخذ سے ہوا ہے، لیکن زبان کی نچلی یا بول چال کی سطح ہی سب کچھ نہیں۔ زبان اپنے اصلی جوہر اعلیٰ سطح پر ہی پہنچ کر دکھاتی ہے جو اس کی ادبی، علمی، تہذیبی اور فنکشنل (Functional) سطح ہے۔ یہ جوہر کسی زبان میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب وہ زبان اپنے ارتقا کے کئی مدارج و مراحل طے کرنے کے بعد ایک آزاد، مستقل، معیاری اور ترقی یافتہ زبان بن جاتی ہے۔ اُردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے۔ یہ ایک معیاری اور ترقی یافتہ زبان بھی ہے۔ اس میں یہ خوبی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے کہ یہ تمام عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ جین صاحب زبان کی اعلیٰ سطح سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اس کی نچلی سطح کو ہی دیکھتے ہیں اور بہ اصرار یہ بات کہتے ہیں کہ ''اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں۔'' ('ایک بھاشا......'، ص ۱۲)

اُردو اور ہندی نچلی سطح پر بلا شبہ ایک زبانیں ہیں۔ اس سے کسی ماہرِ لسانیات کو انکار نہ ہوگا، لیکن ادبی، علمی، تہذیبی اور فنکشنل سطحوں پر بلا شبہ یہ دو مختلف زبانیں ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نچلی سطح پر پہنچ کر یہ دونوں زبانیں باہم اتنی گھل مل جاتی ہیں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی دونوں زبانیں اعلیٰ سطح پر حد درجہ مغائرت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اور ہندی کو ایک زبانیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جیسے جیسے یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی اعلیٰ سطحات تک پہنچتی جاتی ہیں ان میں فصل بڑھتا جاتا ہے اور یہ دونوں آگے چل کر ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ بلکہ بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ پھر انھیں ایک زبانیں قرار دینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ ہندوستانی آئین سازوں کے ذہن میں بھی یہی بات رہی ہوگی جس کی وجہ سے ہندی اور اُردو کو دو علیحدہ زبانوں کی حیثیت سے آئینِ ہند کے آٹھویں شیڈول میں جگہ دی گئی۔ گیان چند جین اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہوئے ہندوستان کے آئین میں اُردو اور ہندی کو دو علیحدہ زبانوں کی حیثیت سے درج کیے جانے کو ''سیاسی مصلحت'' قرار دیتے ہیں۔

اُردو اور ہندی میں پائی جانے والی اَن گنت لسانی مماثلتوں کے باوصف ان دونوں زبانوں میں تلفظ، روزمرّہ، محاورات وضرب الامثال، ذخیرۂ الفاظ، مرکباتِ لفظی (بشمول اضافتِ زیر)، تعلیقیوں (سابقے ولاحقے)، قواعدی زمروں (تعداد وجنس)، حروف (Particles) اور بعض نحوی ساختوں کا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں زبانیں اپنی ادبی روایات، تلمیحات واشارات، اصنافِ شعر، اوزان وبحور، ادبی رویّوں اور تاریخی وتہذیبی حوالوں نیز لسانی مزاج (Idiocyncrasies) کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دونوں زبانیں اپنی علمی و ادبی اصطلاحات اور تہذیبی لفظیات بھی الگ الگ ماخذوں سے لیتی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ دونوں زبانوں کا رسم الخط بھی جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اور ہندی کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھیں ایک زبانیں قرار نہیں دیا جاسکتا اگرچہ لسانیات (=توضیحی لسانیات) کی رو سے یہ ایک زبانیں ہیں۔ عام مفہوم میں ہم 'لسانیات' سے توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) ہی مراد لیتے ہیں جو صرف زبانوں کی ساخت اور ہیئت کے مطالعے اور تجزیے سے سروکار رکھتی ہے۔ زبانوں کے مطالعے کا یہ انداز 'عدم سماجی' (a social) کہلاتا ہے۔ لیکن ہر زبان سماج میں ہی پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے اور تہذیب کا جزوِلاینفک ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان کو سماج یا تہذیب سے الگ کر کے یا اس کے بولنے والوں سے منقطع کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ چنانچہ زبانوں کا مطالعہ ان کی ہیئت وساخت سے قطعِ نظر سماجی سیاق وسباق میں اور تہذیبی وثقافتی حوالوں سے بھی کیا جاتا ہے جسے سماجی لسانیات (Sociolinguistics) کہتے ہیں۔ زبانوں کے اس نوع کے مطالعے کی بنیاد زبانوں کے سماج اور تہذیب کے ساتھ گہرے رشتوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس مطالعے میں کسی لسانی طبقے (Speech Community) نیز اس کے لسانی تشخص (Language Identity) اور زبان کے سماجی وظائف (Social Functions) اور تہذیبی قدروں (Cultural Values) کو بطورِ خاص ملحوظِ خاطر رکھا

جاتا ہے۔

اُردو اور ہندی کا آغاز اگرچہ ایک ہی ماخذ سے ہوا ہے اور بنیادی ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے یہ دونوں مماثل (Identical) زبانیں ہیں لیکن اپنے ارتقا اور نشوونما کے مراحل میں بعض وجوہ سے یہ ایک دوسرے سے دور جا پڑی ہیں کہ ان کے سماجی سیاق و سباق، تاریخی و تہذیبی حوالوں اور قدروں، ثقافتی وظائف نیز مزاج میں قابلِ لحاظ فرق پیدا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی لسانیات کی رو سے انھیں ایک زبانیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں ادبی روایتوں اور رویّوں، اصطلاحاتِ علمی نیز ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط کے واضح فرق کی وجہ سے بھی یہ دونوں زبانیں ایک نہیں کہی جا سکتیں۔ اُردو اور ہندی کے مشترک بنیادی قواعدی ڈھانچے اور کینڈے سے قطعِ نظر ان میں تلفظ، روزمرّہ، محاورات و ضرب الامثال، مرکبات، اضافتِ زیر/ہمزہ، سابقوں اور لاحقوں، نیز جنس و تعداد کا فرق بھی نہایت واضح ہے۔ پھر انھیں، ہم ایک زبانیں کیوں کہیں؟

آج سے نصف صدی قبل مشہور ترقی پسند ادیب و دانشور سجاد ظہیر نے اُردو اور ہندی کے درمیان ادبی اور تحریری شکلوں میں فرق کے علاوہ تہذیبی سطح پر پائے جانے والے فرق کی اہمیت کو اُجاگر کیا تھا اور تہذیبی بنیادوں پر اُردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دیا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے ایک کتابچے 'اُردو، ہندی، ہندوستانی' (بمبئی: کتب پبلشرز، ۱۹۴۷ء) میں لکھتے ہیں:

> ''اُردو اور ہندی، اپنی موجودہ ادبی اور تحریری شکل میں الگ الگ ہیں، حالانکہ ان کی نحوی ساخت بنیادی طور سے ایک ہے...... بہر حال ان کا فرق ظاہر ہے اور اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ ہمارے کلچر کے دو متوازی دھاروں کی آئینہ دار ہیں'' (ص ۴۰)۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی تہذیب اس ملک کے مختلف حصوں میں مختلف شکلیں رکھتی ہے اور ان میں بے شمار باتیں مشترک ہیں۔ پھر بھی ان علاقوں میں جہاں اُردو یا ہندی عام طور سے بولی جاتی ہے، ہندو اور مسلم کلچر کا فرق ہمیں اُردو اور ہندی کی موجودہ ادبی شکلوں میں صاف دکھائی دیتا ہے'' (ایضاً)۔

یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ اہلِ اُردو نے سجاد ظہیر کی اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور یہی کہتے رہے کہ اُردو اور ہندی ایک زبانیں ہیں، مثلاً ڈاکٹر کمال احمد صدیقی جین صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتے ہیں:

''جہاں تک گیان چند جین کے بنیادی نظریے کا سوال ہے کہ اُردو ہندی ایک زبان ہیں، مجھے اس سے اتفاق ہے''(''مقدمہ''،'ایک بھاشا.....'ص۹)۔

گیان چند جین اگر چہ اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں تسلیم نہیں کرتے، تاہم وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ تہذیبی اعتبار سے اُردو مسلمانوں کے تشخص (Muslim Identity) اور ہندی، ہندوؤں کے تشخص (Hindu Identity) کی علامت ہے۔ وہ صاف لفظوں میں لکھتے ہیں:

''آپ مجھ سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کے تشخص کا جو اظہار اُردو زبان و ادب میں ہوتا ہے وہ ہندی میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہندوؤں کے تہذیبی تشخص کا اظہار جو ہندی زبان و ادب میں ہوتا ہے، اس قدر اُردو میں نہیں ہوتا۔ اُردو زبان و ادب کا لسانی و تہذیبی پس منظر عربی، فارسی اور اسلام سے نزدیک ہے، ہندی زبان و ادب کا سنسکرت اور ہندو دھرم ہے'' ('ایک بھاشا '، ص۲۷۹)۔

گیان چند جین کی یہ بات نہایت معقول ہے اور اس سے سجاد ظہیر کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ''ہندو اور مسلم کلچر کا فرق ہمیں اُردو اور ہندی کی موجودہ ادبی شکلوں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔''

گیان چند جین جب ادبی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں نیز مذہبی و تہذیبی تشخص کے اعتبار سے اُردو اور ہندی میں پائے جانے والے فرق کو برملا تسلیم کرتے ہیں تو انھیں اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں مان لینے میں کیوں تامل ہے؟ اس سے اُردو اور ہندی کی اس حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ یہ دونوں زبانیں پیدائشی اعتبار سے یا لسانیاتی نقطۂ نظر سے ایک ہیں یا نچلی سطح (Grass-root level) پر پہنچ کر یہ دونوں ایک ہو جاتی ہیں۔ کچھ لوگ لاکھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ اُردو اور ہندی ایک زبانیں ہیں لیکن صحیح، سچی اور کھری بات وہی ہے جو سجاد ظہیر اور گیان چند جین نے کہی ہے کہ ادب و تہذیب اور کلچر کی سطح پر نیز مذہبی و تہذیبی تشخص (Religious and Cultural Identity) کے اعتبار سے اُردو اور ہندی میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں اور نہ ہی ہندوستان کے سارے مسلمان اُردو بولتے ہیں، لیکن میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو زبان کو بولنے والوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ اسی لیے اس میں مسلم کلچر اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا رنگ زیادہ ہے اور اسی لیے ہندوستان میں یہ مسلم تشخص کی علامت بن گئی ہے بالکل اسی طرح جس طرح

ہندی، ہندو تشخص کی علامت، ہے اور ہندوستان جیسے جمہوری اور سیکولر ملک میں اس بات کا اظہار یا اقرار کوئی بری بات نہیں ہے۔ اگر اُردو اور ہندی کے درمیان کلچر، تہذیب و ثقافت نیز مذہبی و تہذیبی تشخص کا واضح اور نمایاں فرق کسی کو دکھائی نہیں دیتا تو اس میں ان دونوں زبانوں کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہے صرف نہ دیکھنے والی آنکھ کا:

گر نہ بیند بروز شپّرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ (سعدیؔ)
(اگر چمگادڑ کی آنکھ دن کو نہ دیکھے تو چشمۂ آفتاب کا کیا قصور!)

اُردو جو کھڑی بولی کا نکھرا ہوا روپ ہے اور جس کا ارتقا بارہویں صدی میں دہلی و نواحِ دہلی میں ہو چکا تھا، اسی کی بنیاد پر انیسویں صدی کی ابتدا میں 'کھڑی بولی ہندی' (زمانۂ حال کی ہندی) کی تشکیل عمل میں آئی جسے اولاً نثری زبان کے طور پر استعمال کیا گیا، لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے اسے شعری ذریعۂ اظہار کی حیثیت سے بھی اختیار کر لیا گیا۔ اس طرح کھڑی بولی ہندی (= جدید ہندی)، اُردو کے بعد کا ارتقا ہے۔ اس لسانی حقیقت کو دھیریندر ورما (مصنف 'ہندی بھاشا کا اتہاس') اور بعض دوسرے ہندی عالموں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ انیسویں صدی نے ہی ان دونوں زبانوں میں نمایاں فرق پیدا ہونے لگا تھا۔ اُردو تو اپنی اسی نہج پر قائم رہی لیکن کھڑی بولی ہندی الگ خطوط پر گامزن ہوگئی۔ اس نے دیوناگری (یا ناگری) رسم الخط اختیار کر لیا اور 'ناگری ہندی' کہلائی۔ اسی کو 'اعلیٰ ہندی' بھی کہا گیا۔ اس نے اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اصطلاحاتِ علمی کے لیے سنسکرت کا سہارا لیا۔ ہندو دیو مالائی عناصر و اساطیر سے بھی اس نے اپنا دامن مالا مال کیا۔ ادبی روایات، سماجی سیاق و سباق اور تاریخی و تہذیبی حوالوں نیز لسانی مزاج کے اعتبار سے بھی یہ اُردو سے بالکل مختلف ہو گئی اور آج بھی مختلف ہے۔ لہٰذا اُردو اور ہندی (جدید ہندی) کو ایک زبانیں کہنا ادبی و علمی نقطۂ نظر سے نیز سماجی و تہذیبی قدروں کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے اور نہ ہی ان دونوں زبانوں کے سماجی لسانیاتی تناظرات (Sociolinguistic Perspectives) میں یہ بات درست ہے۔ اُردو اور ہندی کو اپنی الگ الگ راہیں متعین کیے ہوئے کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ ہندوستان کے عصری لسانی تناظر میں ان دونوں کو ایک زبانیں کہنا حقیقت پسندانہ طرزِ فکر نہیں!

اہلِ اُردو کو اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں نیز اُردو، ہندی کی 'شیلی' (اسلوب) نہیں، اس کی ہمسر ہے۔ ان دونوں زبانوں کی اپنی لسانی خصوصیات، ادبی روایات اور

تہذیبی قدریں ہیں۔ دونوں اپنی جداگانہ پہچان رکھتی ہیں۔ دونوں زبانوں کے بولنے والے ہندوستان میں قابلِ لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ دونوں یہاں کی بڑی زبانیں ہیں۔ ان میں اعداد وشمار کے لحاظ سے ہندی اگر پہلے نمبر پر ہے تو اُردو کا نمبر چھٹا ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُردو بولنے والے ہندوستان کی کل آبادی کا ۵ء۱۳ فی صد ہیں اور ان کی مجموعی تعداد ۴,۳۴,۰۶,۹۳۲ (چار کروڑ چونتیس لاکھ چھے ہزار نو سو بتیس) ہے۔ اس اعتبار سے یہ ہندوستان کی بعض دوسری بڑی زبانوں (جن کا ذکر ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈول میں موجود ہے)، مثلاً گجراتی، کنڑ، ملیالم، اڑیا، پنجابی، کشمیری، سندھی وغیرہ سے اوپر ہے۔ اُردو اور ہندی کے بولنے والے اپنا لسانی تشخص (Language Identity) رکھتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں دولسانی طبقوں (Two Speech Communities) میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے آزاد، علیحدہ اور مستقل زبانوں کا درجہ دیتی ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ ہندی تو شروع سے ہی یہ کہتے آرہے ہیں کہ ہندی اور اُردو ایک زبانیں ہیں لہٰذا ان کا رسم الخط بھی ایک ہونا چاہیے یعنی دیوناگری۔ اس خطرناک رجحان کے برخلاف اہلِ اُردو کا یہ موقف ہونا چاہیے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں لہٰذا ان کے رسومِ خط بھی دو ہونا چاہئیں، نیز اُردو کا موجودہ رسم الخط اس کے لیے ناگزیر ہے۔ اہلِ اُردو نے اگر یہ موقف اختیار نہ کیا اور اُردو کی ہندی سے الگ، جداگانہ اور آزاد مستقل حیثیت پر اصرار نہ کیا اور گیان چند جین اور دوسرے اہلِ ہندی کی طرح اس بات کی رٹ لگاتے رہے کہ اُردو اور ہندی ایک زبانیں ہیں تو ہندی کا تو کچھ نہ بگڑے گا، البتہ اُردو کا وجود مبادا خطرے میں پڑ سکتا ہے اور شمالی ہندوستان کی متعدد دوسری بولیوں اور زبانوں کی طرح اُردو بھی آئندہ کبھی 'ہندی امپیریلزم' کا شکار ہوسکتی ہے!

(بشکریہ: ''ہماری زبان''، نئی دہلی)

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
علی گڑھ، بھارت

اُردو زبان، فرقہ پرستی کے تناظر میں

'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'، پر ایک نظر

پروفیسر گیان چند جین کی حالیہ تصنیف 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء) ان دنوں علمی حلقوں میں شدید بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے یہ کتاب پڑھی ہے انھیں انتہائی رنج و افسوس ہے۔ کچھ لوگوں کو بے حد غصہ بھی ہے۔ اس کے رد میں پچھلے دنوں بعض تحریریں بھی منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں اس کتاب کی کھل کر مذمت کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو شائع کر کے جین صاحب نے بیٹھے بٹھائے اپنے لیے رسوائی مول لے لی ہے جو تادمِ آخر ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

گیان چند جین صاحب اُردو کے ایک ممتاز عالم، نامور محقق اور معروف ادیب و انشاپرداز ہیں۔ وہ کئی دہائیوں تک اُردو زبان و ادب کی درس و تدریس سے وابستہ رہے اور ملک کی بعض مایۂ ناز یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں کے منصبِ صدارت پر بھی فائز رہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اُردو کے تصنیفی و تالیفی کاموں میں صرف کر دی، اور اب جب کہ وہ عمر کی آخری منزل میں ہیں اور پارکنسن جیسی انتہائی مہلک بیماری کا شکار ہیں، انھوں نے 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جس نے پوری اُردو دنیا کو حیرت و استعجاب اور سکتے میں ڈال دیا ہے۔

جین صاحب نے گزشتہ سال امریکہ سے بھیجے گئے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ ''میری ایک لسانی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' ساہتیہ اکادمی شائع کر رہی ہے امید ہے اکتوبر میں آ جائے گی۔ ڈاکٹر نارنگ سے پوچھیے۔'' اسی خط میں انھوں نے اپنی بیماری کے بارے میں بھی لکھا تھا کہ ''میں اس بیماری کا مریض ہوں جس کا نام ہے "Multiple System Atrophy"۔ اس بیماری کے بارے میں سائنس کچھ نہیں جانتی۔ اس کا علاج موت کے سوا کچھ نہیں......'' حیرت ہے کہ اس مہلک اور جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے نیز امریکہ جیسے دور دراز ملک میں بیٹھ کر جہاں اُردو ہندی سے متعلق علمی وسائل کی حد درجہ کمی ہے

جین صاحب نے یہ کتاب کیسے لکھ لی۔ اس کتاب کے بارے میں میری یہ پختہ رائے ہے کہ یہ کتاب ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور اُردو زبان وادب کے بارے میں ان کی منفی سوچ کا نتیجہ ہے جس پر ردعمل لازمی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ان کے متعصبانہ نظریات نیز لسانی تعصب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جین صاحب نے یہ کتاب خالص یک رخے انداز اور ''ہندی والوں'' نیز ''ہندوؤں'' کے نقطۂ نظر سے لکھی ہے جس کا اعتراف انھوں نے اس کتاب کے ''حرف اول'' میں خود کیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب ایک خاص زاویے سے لکھی گئی ہے اور ایک مخصوص مذہبی طبقے کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر خالص یک طرفہ انداز سے نیز فرقہ پرستی کے تناظر میں تصنیف کی گئی ہے اس لیے اس کے غیر جانب دارانہ اور معروضی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ گیان چند جین نے اردو ہندی کے مسئلے کو جو ایک خالص لسانی اور علمی مسئلہ ہے، نہایت جذباتی اور غیر معتدل انداز سے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب غیر متعلق مباحث، غیر معقول دلائل اور غیر ضروری حوالوں سے اٹی پڑی ہے۔ اس میں زیادہ تر انھیں ہندو مصنفین کے افکار و نظریات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو اُردو سے شدید منافرت کا جذبہ رکھتے ہیں اور لسانی تعصب و تنگ نظری کا بری طرح شکار ہیں۔ مسلمان مصنفین کے حوالے صرف وہاں دیے گئے ہیں جہاں جین صاحب کو اپنے مطلب اور مفاد کی کوئی بات نظر آئی ہے۔ انھوں نے اس پورے لسانی مسئلے کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر ''ہندی والوں'' اور ''اُردو والوں'' میں تقسیم کر رکھا ہے اور خود کو (کیوں کہ وہ غیر مسلم ہیں) اُردو والوں سے الگ کر کے ہندی والوں کے زمرے میں شامل کر لیا ہے اور انھیں کے خیالات و نظریات کا 'پرچار' کرنے میں اپنا سارا زور صرف کیا ہے۔

یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ جو شخص تمام عمر اُردو زبان و ادب کا درس دیتا رہا ہو، جس نے اُردو تحقیق و تاریخ کی زریں خدمات انجام دی ہوں اور جس کے اُردو سے والہانہ لگاؤ اور علم و فضل پر پوری اُردو دنیا ناز کرتی ہو وہ آخر عمر میں اُردو کے حلقے سے خود کو الگ کر کے مخالفین اُردو کا ہم نوا بن جائے اور اپنی ساری علمی صلاحیت اور عقل و ذہانت اُردو کی تاریخ کو مسخ کرنے اور اس کے ادب کو رسوا کرنے میں صرف کر دے۔

گیان چند جین جی کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہمارا تعارف ایک ایسے گیان چند جین سے ہوتا ہے جو ہندی کی بے جا پاسداری کرتا ہے، جس کی نظروں میں اُردو ادب کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، جو اُردو کو ایک تنگ نظر اور علیحدگی پسند زبان قرار دیتا ہے اور جو اُردو رسم الخط میں بھی کیڑے نکالتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو ہندی (زمانۂ حال کی ہندی) کے مقابلے میں اُردو کو ایک کم تر و کہتر زبان تصور کرتا ہے اور جو اُردو پر ہندی کی

زمانی فوقیت کو ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔ علاوہ ازیں جو اُردو بولنے والے مسلمانوں سے بھی بغض وعناد رکھتا ہے، جس کے ذہن میں فرقہ واریت کا زہر گھلا ہوا ہے اور جس کے نظریات ہندوستان کی کسی بھی فرقہ پرست جماعت کے اینٹی مسلم نظریات سے کم نہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ جس شخص نے تمام عمر اُردو کا رزق کھایا ہو اور جسے تمام تر عزت، شہرت، مرتبہ، اعزاز واکرام اور نام ونمود محض اُردو کی وجہ سے حاصل ہوا ہو، اور جو اُردو کو ''اپنی زبان'' کہتا ہو اور مردم شماری کے وقت اپنی مادری زبان ''اُردو'' درج کرواتا ہو وہ اُردو زبان وادب کے بارے میں ایسی لغو، بے بنیاد اور گمراہ کن باتیں کیسے لکھ سکتا ہے اور اس زبان سے متعلق انتہائی مخالفانہ، معاندانہ اور غیر منصفانہ رویہ کیوں اختیار کرسکتا ہے!

دوسرے اہل اُردو کی طرح میں بھی جین صاحب کے علم وفضل اور دانش وبینش کا تہ دل سے معترف رہا ہوں اور انھیں اُردو کی ایک لائق صد احترام شخصیت سمجھتا رہا ہوں اور ان کی علمی وتحقیقی فتوحات کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہوں نیز اُردو کے لسانی مسائل اور پہلوؤں سے ان کی دلچسپی کو سراہتا رہا ہوں۔ لیکن ان کی مذکورہ کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اُردو سے انھیں جو والہانہ لگاؤ تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے اور انھوں نے اُردو اور اہل اُردو سے نظریں پھیر لی ہیں۔ حالانکہ دعویٰ تو انھوں نے یہ کیا ہے کہ ''میں اب بھی اُردو کا ویسا ہی شیدائی ہوں جیسا کہ تھا'' (ص۱۱)۔ لیکن ان کی تصنیف کردہ اس زہر آلود کتاب کو پڑھنے کے بعد ان کی اس بات پر کسے یقین آئے گا اور ان کے اس قول پر کہ ''مجھے ہندی سے اُردو زبان بہتر لگتی ہے'' (ص۲۸۲)، بھلا کون اعتبار کرے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب نے تمام اُردو بولنے والوں اور اس زبان سے محبت کرنے والوں کا دل دکھایا ہے:

تم نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر
دل کے آئینے میں بال آ ہی گیا (آنند نرائن ملاؔ)

(۲)

اس کتاب کے مواد وموضوع پر نظر ڈالنے سے قبل ذرا اس کے نام کو لیجیے۔
اس کے ابتدائی الفاظ ہیں ''ایک بھاشا......'' لیکن یہ بھی بتا تا چلوں کہ گیان چند جین کی یہ کتاب اُردو زبان (اور اُردو رسم الخط) میں لکھی ہوئی ہے نہ کہ ہندی زبان میں تو کیا اُردو زبان میں ''بھاشا'' کے لیے

انھیں کوئی لفظ نہیں ملا؟ جین صاحب کی ہندی دوستی اور اُردو دشمنی کا آغاز گویا یہیں سے یعنی کتاب کے نام سے ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو کے ایک نہایت مانوس، موزوں اور مروج لفظ 'زبان' کو چھوڑ کر ''بھاشا'' کا انتخاب کیا۔ مجھے اس لفظ کو کتاب کا عنوان بنانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا' اگر جین صاحب نے یہ کتاب ہندی زبان میں لکھی ہوتی۔ لفظ زبان کی جگہ ''بھاشا'' کے استعمال کا مقصد اُردو پر ہندی کی بالا دستی اور فوقیت قائم کرنے اور اُردو کو ایک کم تر و کم مایہ زبان ثابت کرنے کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے! اب ذرا اور آگے بڑھیے اور کتاب کے ذیلی عنوان'' دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر نظر ڈالیے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ'' لکھاوٹ'' کا لفظ کتنا غریب، غیر فصیح اور غیر موزوں ہے جبکہ اُردو میں اس کے لیے رسم الخط موجود ہے۔ جین صاحب جو اُردو کے ایک سرکردہ عالم ہیں اور اُردو زبان و ادب کے ایک مایۂ ناز استاد رہ چکے ہیں، آخر چلن میں آئے ہوئے اُردو کے ان الفاظ سے کیوں گریز کرتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اسی مزاج کے ماتحت وہ زبان اپنا ذخیرۂ الفاظ تشکیل دیتی ہے جو اس زبان کے فطری عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اُردو زبان کا لسانی مزاج یہ کہتا ہے کہ "Language" کے لیے 'زبان' اور "Script" کے لیے رسم الخط کے الفاظ استعمال کیے جائیں، نہ کہ'' بھاشا'' اور'' لکھاوٹ''۔

اس کتاب کا انتساب توصیفی کلمات کے ساتھ آنجہانی امرت رائے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام ہے (بظاہر ان دونوں ناموں میں کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی)۔ امرت رائے کو'' دشمنان ہندی کے معتوب اول'' کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ جین صاحب نے کن کن لوگوں کو'' دشمنان ہندی'' کی فہرست میں شامل کیا ہے اور کیوں؟ گوپی چند نارنگ کے نام کے بعد تین سطروں میں ان کے تحقیقی کام کی خوشامدانہ انداز میں ستائش کی گئی ہے۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ جین صاحب اپنی یہ کتاب پہلے ساہتیہ اکادمی سے چھپوانا چاہتے تھے جس کے نارنگ صاحب ان دنوں صدر ہیں۔ اچھا ہوا کہ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی نے شائع نہیں کی ورنہ برصغیر کے اس مقتدر ادبی ادارے کی خواہ مخواہ رسوائی ہوتی۔

پوری کتاب ۱۱۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کے شروع میں'' حرفِ اول'' اور آخر میں ''کلمات آخر''،'' ختم کلام'' اور ضمیمہ شامل ہے۔ کتاب کا'' پیش لفظ'' پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے جو نہایت مختصر ہے۔'' مقدمہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی تحریر بھی شامل کتاب ہے۔ کتاب کا نام اگرچہ کرسٹوفر آر۔ کنگ کی کتاب "One Language Two Scripts" (ایک زبان دو رسوم خط) سے ماخوذ

ہے، لیکن ان دونوں کتابوں کے مواد و موضوع میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کنگ کی کتاب میں نہ تو اُردو اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا گیا ہے اور نہ ہی ہندی کی بے جا پاسداری کر کے جانب دارانہ رخ اختیار کیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا باب ''تمہید'' خاصا طولانی (۱۳ تا ۴۳ صفحات پر مشتمل) ہے اور کافی حد تک اختلافی ہے۔ جین صاحب نے اگرچہ دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ وہ ''سچ'' پر ہیں اور ایک جگہ انھوں نے لکھا بھی ہے کہ ''اہل علم کی وفاداری صرف سچ سے ہوتی ہے'' (ص ۱۳)، لیکن ''تمہید'' کے مطالعے کے بعد صرف یہی سچ کھل کر سامنے آتا ہے کہ ان ۳۱ صفحات میں انھوں نے علمی باتیں کم کہی ہیں اور اپنے 'دل کا غبار' زیادہ نکالا ہے۔ تاریخ کے بھی بخیے ادھیڑے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُردو، نیز اُردو بولنے اور پڑھنے والے مسلمانوں اور اُردو کے مسلمان ادیبوں، اُردو کے ادبی اداروں اور انجمنوں کو بھی جی بھر کر ہدف ملامت بنایا گیا ہے اور ان پر الزام تراشیاں کی گئی ہیں۔ امریکہ اور دیگر ممالک میں مقیم اہل اُردو کو بھی نہیں بخشا گیا ہے اور ان پر بھی تہمتیں لگائی گئی ہیں اور انھیں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت اور منفی سوچ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب گیان چند جین کی نہیں بلکہ کسی تنگ نظر اور متعصب ذہن فرقہ پرست کی لکھی ہوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ مصنف کی حسب ذیل باتیں قابل غور ہیں:

(۱) سر سید احمد خاں کے بارے میں گیان چند جین نے لکھا ہے کہ ''ہندوؤں نے اُردو کے بجائے ہندی کو اختیار کرنا چاہا تو سید صاحب جامے سے باہر ہو گئے اور بقیہ عمر میں ہندوؤں کی بیخ کنی کو اپنی پالیسی بنالیا'' (ص ۱۸)۔

(۲) علامہ اقبال کو ''ہندو بیزار'' اور ''ہندو دشمن'' ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے اور ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''شاعری میں تو نہیں لیکن نثر میں اقبال نے ہندوؤں کے بارے میں جہاں بھی لکھا ہے وہ تحقیر و تذلیل کے سوا کچھ نہیں'' (ص ۲۱)۔

(۳) مولوی عبدالحق کو اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ وہ ''اُردو تحریک'' سے وابستہ تھے۔ اُردو تحریک کے بارے میں کہا گیا ہے ''اُردو تحریک کا واحد مقصد ملک کی تقسیم اور پاکستان بنوانا تھا جسے مولوی عبدالحق نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا'' (ص ۳۹)۔

(۴) مالک رام کو ''ڈرپوک'' کہا گیا ہے کیوں کہ ''وہ دل سے احمدی تھے لیکن اپنے اہل خانہ اور برادری کے خوف کی وجہ سے کبھی کھل کر کوئی قدم نہیں اٹھایا'' (ص ۲۷)۔

(۵) جگن ناتھ آزاد کی اقبالیات سے دلچسپی کو ''غلو'' سے تعبیر کرتے ہوئے جین صاحب نے انھیں پاکستان کا ''نمائندہ'' تک کہہ ڈالا کہ ''تمام مستشرقین میں آزاد اقبالیات میں نوازے گئے ہیں۔ غلو کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آزاد کو پاکستان نے اپنا نمائندہ بنا کر ہندوستان بھیجا ہو'' (ص ۲۸)۔

(۶) عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) کو ''اُردو تحریک کی ایک شاندار پیداوار'' بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ''وہ یونیورسٹی ایک اسلامی اُردو یونیورسٹی تھی'' (ص ۱۹، ۲۰)۔

(۷) انجمن ترقی اُردو (ہند) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''روز اول سے انجمن ترقی اُردو (ہند) اور مسلم لیگ مل جل کر کام کر رہی تھیں'' (ص ۳۹)۔

(۸) میر تقی میر، داغ دہلوی اور محمد حسین آزاد جیسے مستند ادیبوں کی اُردو دانی پر ''تنقید'' کی گئی ہے اور ان کے ہاں لسانی ''خام کاری'' (گیان چند جین کی نظروں میں) کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مالک رام کے اُردو روزمرہ/محاورہ اور تلفظ کے پنجابی پن کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے اور اپنے بارے میں جین صاحب نے کہا ہے کہ ''مجھے اُردو نہیں آتی'':

میں ایک بنیائے قصباتی مجھے اُردو نہیں آتی

(نوٹ: یہ مصرع ساقط الوزن ہے۔ یہاں ''ایک'' کے بجائے 'اک' ہونا چاہیے تھا لیکن مذکورہ کتاب میں یہ اسی طرح درج ہے)

(۹) اُردو غزل کے ''محبوب'' کا ذکر کرتے ہوئے اُردو کے بعض شعرا کی کردار کشی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''اُردو کے متعدد بڑے شعرا، مثلاً مومن، داغ، جگر اور اصغر وغیرہ کی زندگیوں کے ساتھ طوائفوں کے معاملات لپٹے ہوئے ہیں'' (ص ۳۸)۔

(۱۰) مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''تاریخ میں مسلمانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے وہاں کی زبان بالخصوص رسم الخط کو ختم کر کے اپنی زبان اور لپی (رسم الخط) کو ان پر مسلط کیا جائے'' (ص ۱۵، ۱۶)۔ مسلمانوں کو ''ملک کی تقسیم'' کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے (ص ۲۵)۔

(۱۱) امریکہ میں پاکستان سے آئے ہوئے اُردو بولنے والوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ''ان

میں تقریباً تمام تر نے یا وہ جو اس کے اہل ہیں امریکہ کی شہریت لے لی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ خود کو پاکستان سے منسوب کرتے ہیں۔ جب اُردو کی کوئی تقریب ہوتی ہے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تقریب اہل پاکستان نے برپا کی ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں اُردو کے کئی ہفتہ وار اور ماہانہ رسالے نکلتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ کامیاب پاکستانی انگریزی ہفتہ وار ہیں۔ ان سب کی وفاداری پاکستان سے ہے۔ ان میں کھل کر ہندوستان اور ہندوؤں کو گالیوں سے نوازا جاتا ہے اور پاکستان کی ستائش کی جاتی ہے'' (ص ۲۳)۔

اس سے گیان چند جین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ '' جب ہر ملک کے اہل اُردو اتنی شدت سے پاکستان نواز ہیں تو ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی ان کے ہم خیال ہوں، لیکن ہندوستان میں ہندو اکثریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں'' (ص ۲۳، ۲۴)۔

(۱۲) گیان چند جین نے پاکستان میں رہنے والے اہل اُردو پر بھی اپنا غصہ اتارا ہے اور پاکستان کے اسکولی نصاب کے بارے میں لکھا ہے کہ '' معلوم ہوتا ہے جیسے یہ نصاب افغانستان کے طالبان نے تیار کیا ہے'' (ص ۲۴)۔

غرض کہ اس قسم کے فرقہ وارانہ نظریات اور اُردو اور مسلم دشمنی پر مبنی متعصبانہ خیالات پوری '' تمہید'' میں نہایت جارحانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ طنز کے نشتر بھی چلائے گئے ہیں اور سنجیدہ بات کو بھی تمسخرانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی صرف ایک مثال یہاں دی جاتی ہے۔ '' چتلی قبر'' دہلی کی جامع مسجد کے پاس واقع ایک محلے کا نام ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس نام کے ساتھ گیان چند جین نے '' اُردو کی قبر'' کی ترکیب استعمال کر کے اُردو کا کتنا زبردست مذاق اڑایا ہے اور طنز کا وار بھی کیا ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

'' اب دہلی میں ہر طرف پنجابی بھرا پڑا ہے..... اب آپ اُردو کی قبر تلاش کرنے کے لیے چتلی قبر جائیں اور رکشا یا اسکوٹر والے کو خود کو پوتڑوں کا اُردو والا ثابت کرنے کے لیے قبر کو 'ب' ساکن سے بولیں تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ پردیسی مرغا ہے'' (ص ۳۶)۔

اس کی آخری سطر کو دیکھیے، بھلا یہ کون سی علمی زبان ہے؟

جین صاحب کے غیر علمی اور سوقیانہ لہجے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''جہاں فٹنیں چلتی تھیں وہاں اِکّے اور رکشائیں چل رہی ہیں اور وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندر اعظم تک کو بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوا نظر آنے لگے'' (ص۳۶)۔

فیضی سے اعتذار کے ساتھ:

زبانِ 'یار' جنبد بے محابا در سخن رانی
مطالب نا درست آید دلائل ناتمام افتد

(۳)

گیان چند جین نے اس کتاب میں اصل نکتے کی جانب اپنی توجہ مرکوز کرنے کے بجائے ان مسلمانوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے جو آج اُردو بولتے ہیں یا جنھوں نے ازمنہ وسطیٰ میں اس ملک میں بقول ان کے تقریباً ۶۰۰ سال حکومت کی'' (ص۱۴۰)۔ جین صاحب نے ان مسلمانوں کو ''سومناتھ کے مندر کو توڑنے والوں، جزیہ لگانے والوں، ہندو کلچر کو تباہ کرنے والوں'' کے خطابات سے نوازا ہے (ص۱۴۷)۔

گیان چند جین کو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندو انتہا پسندوں کے ذریعے بابری مسجد کے شہید کیے جانے کا بالکل افسوس نہیں۔ لیکن اس کے ردِ عمل میں جسے وہ ''انتقام'' کہتے ہیں پڑوسی ملکوں میں جو ''مندر توڑے گئے'' (اگر واقعی توڑے گئے!) اس کا انھیں گہرا دکھ ہوا اور جب ہندوستان کے ایک انصاف پسند اور حساس ہندو شاعر نے بابری مسجد کی شہادت پر اُردو میں نظم لکھ کر چھپوائی اور اس قبیح فعل کی مذمت کی تو جین صاحب چراغ پا ہو گئے (ص۲۱۵)۔ اس کے علی الرغم جین صاحب کو بنگلہ دیش کی مصنفہ تسلیمہ نسرین سے جو ملک بدر کر دی گئی تھی، محض اس لیے ہمدردی ہے کہ اس نے وہاں کے توڑے گئے مندروں کی ''ہمدردی'' میں ناول 'لجّا' لکھا (ص۲۱۵)۔ جین صاحب کی یہ کیسی منطق ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کے ایک عظیم ہندو شاعر کو محض اس لیے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ملک (ہندوستان) کی ایک مسجد کی شہادت پر نظم لکھتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ غیر ملک کی ایک غیر معروف مسلمان ادیبہ کی محض اس لیے ستائش کرتے ہیں کہ وہ اس مسجد کی شہادت کے ردِ عمل میں غیر ملکی سرزمین (بنگلہ دیش) میں رونما ہونے والے واقعے پر ناول لکھتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوسی ملکوں میں جو مندر ٹوٹے (اگر واقعی ٹوٹے!)، اس کے اصل ذمہ دار وہ انتہا پسند ہندو ہیں جنھوں نے بابری مسجد کو مسمار کیا یا کروایا۔ اس مسئلے پر گیان چند جین نے ہندوستان کی صف اوّل کی فرقہ پرست فسطائی سیاسی جماعت کے مؤقف کی حمایت کرتے ہوئے بابری مسجد کے بارے میں یہ تک کہہ دیا کہ وہ مسجد تھی ہی کہاں، ''وہ تو مندر میں تبدیل ہو چکی تھی''؟ ملاحظہ ہو ان کا یہ بیان:

''بابری مسجد ۸۶-۱۹۸۵ء کے قریب کھول دی گئی۔ ہندوؤں کو وہاں مورتی پوجا کی اجازت دے دی گئی اور مسلمانوں کا اس میں داخلہ ممنوع کر دیا گیا۔ اس طرح دسمبر ۱۹۹۲ء میں جو عمارت توڑی گئی وہ مسجد تھی یا وہ تو مندر میں تبدیل ہو چکی تھی؟ (ص ۲۱۵)

لیکن گیان چند جین ایک لسانی اور علمی موضوع پر لکھی ہوئی اس کتاب میں ان باتوں کو کیوں دہرانا چاہتے ہیں؟

باز خوانم قصۂ پارینہ ات
تازہ سازم داغہائے سینہ ات (مثنوی اسرار خودی)

جین صاحب نے اپنی فرقہ وارانہ سوچ میں ڈوب کر مسلمان اُردو بولنے والوں پر جس طرح کی تہمتیں لگائی ہیں اور جس انداز سے انھیں جی بھر کر ہدف ملامت بنایا ہے اس پر احتجاج لازمی ہے۔ ان الزام تراشیوں کے پیچھے کوئی سچائی نہیں ہے۔ یہ محض سوچ کا فرق ہے۔ جب کسی شخص کے ذہن و دماغ میں 'منفی سوچ' سما جاتی ہے تو معقولیت، اعتدال پسندی، اصابت رائے، معروضیت، غیر جانبداری، ان تمام چیزوں کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ بے بس و مجبور ہو جاتا ہے اور جو جی میں آتا ہے بک دیتا ہے۔ جین صاحب کے ذہن و دماغ میں اُردو اور مسلمانوں کے خلاف جو زہر بھرا ہوا ہے وہ اسی منفی سوچ کا نتیجہ ہے۔ جین صاحب نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جانبداری سے بھی زیادہ افسوسناک علمی معاملوں کو مذہبی اور فرقہ وارانہ رنگ دینا ہے'' (ص ۱۴)۔ لیکن وہ خود علمی معاملوں کو مذہبی اور فرقہ وارانہ رنگ دینے میں پیش پیش نظر آتے ہیں جس کی مثال ان کی یہ کتاب ہے۔ یہ واقعی نہایت افسوسناک بات ہے کہ ادب ہو کہ تاریخ، سیاست ہو کہ ثقافت، زبان ہو کہ رسم الخط ہر چیز کو جین صاحب نے فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دیا ہے اور ان تمام مباحث میں ان کے متعصب ذہن کی ہی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں مسلمان اُردو والے اپنی کمر پر دو قومی نظریے کا بھاری گٹھر اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں...... ایک عام ہندو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو

ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے'' (ص ۳۳)۔

گیان چند جین کو شاید نہیں معلوم کہ وہ دن چلے گئے۔ آج کا کوئی ہندوستانی مسلمان خواہ وہ اُردو بولتا ہو یا کوئی اور زبان ''ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ محض جین صاحب کی بہتان تراشی اور ان کی فرقہ وارانہ سوچ ہے۔'' جین صاحب کا یہ کہنا کہ ''مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے'' محض ان کا ذہنی دیوالیہ پن ہے۔ ہمارے ملک کے دستور نے ہر ہندوستانی کو برابر کے حقوق دیے ہیں۔ انھیں حقوق کے تحت ہندوستان پر جتنا حق ہندوؤں کا ہے اتنا ہی حق مسلمانوں یا کسی اور مذہب کے ماننے والے ہندوستانیوں کا ہے۔

ہندوستان کی مسلم اقلیت بالخصوص اُردو بولنے والے مسلمانوں کو جین صاحب نے پاکستان بنانے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بڑی تلخ باتیں کہی ہیں جن سے ان کی اسی فرقہ وارانہ ذہنیت اور منفی سوچ کی ترجمانی ہوتی ہے جس کے وہ شکار ہو گئے ہیں۔ جین صاحب نے اپنی ایک رشتہ دار خاتون کے حوالے سے جو ملک کی تقسیم کے بعد شرنارتھی بن کر ہندوستان چلی آئی تھیں، یہ بات کہی ہے:

> ''انھوں نے دلّی اور یوپی میں رہنے والے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا کہ یہ تو ملک کی تقسیم چاہتے تھے، پھر یہ یہاں کیوں ہیں'' (ص ۲۵)۔

اسی صفحے پر اس سے ملتی جلتی بات انھوں نے پھر دہرائی ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمان اس لیے ''نفسیاتی حیثیت سے ڈھئے ہوئے اور کمزور ہیں'' کہ وہ ملک کی تقسیم چاہتے تھے:

> ''ہندوستان میں رہنے والی مسلم اقلیت .... وہ مالی اور منصبی حیثیت سے آسودہ حال ہوں یا نہ ہوں لیکن نفسیاتی حیثیت سے ڈھئے ہوئے اور کمزور ہیں۔ ان سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ: جان من خود کردہ را چہ علاج'' (ص ۲۵)۔

جین صاحب تھوڑی دیر کے لیے اپنی فرقہ وارانہ سوچ کو بالائے طاق رکھ کر اور مسلمانوں کے خلاف ان کے ذہن میں جو زہر بھرا ہوا ہے اسے تھوک کر ذرا ٹھنڈے دل سے یہ سوچیں کہ کیا ملک کی تقسیم کے ذمہ دار صرف مسلمان ہیں؟ اور کیا وہ مسلمان اس کے ذمہ دار ہیں جنھوں نے پاکستان بننے کے بعد بھی اپنے وطن عزیز سے ہجرت نہ کی اور نئے ملک میں جا کر نہ بسے؟ اور کیا مسلمانوں کی وہ نسل اس کی ذمہ دار ہے جو ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوئی؟ ان اقتباسات کو پڑھ کر کسے حیرت نہ ہوگی کہ ایک علمی موضوع پر لکھی ہوئی کتاب میں اس قسم کی فرقہ وارانہ اور متعصبانہ باتیں کہی گئی ہیں۔

گیان چند جین کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو ادیبوں کو جو سیکولر اقدار کے پاسدار ہیں، مسلم اور ہندو ادیبوں میں تقسیم کر دیا ہے اور مسلم ادیبوں پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا ہے کہ وہ ہندو ادیبوں کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''بڑے سے بڑے ہندو ادیب کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اُردو دنیا میں جینا ہے تو مسلمانوں کی خوشنودی پر نظر رکھے'' (ص ۲۶)۔

غالباً اس بات سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جہاں تک کہ اُردو کا تعلق ہے ماضی قریب میں ہندوؤں میں فراق گورکھپوری سے بڑا شاعر، کرشن چندر سے بڑا فکشن نگار اور مالک رام سے بڑا محقق نہیں گزرا۔ کیا جین صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ ان ہندو ادیبوں کو اُردو دنیا میں جو شہرت، عزت، نام، مرتبہ اور اعزاز حاصل ہوا اس کے لیے انھوں نے کن مسلمانوں کی ''خوشنودی'' پر نظر رکھی تھی یا آج کے ہندو ادیب اُردو دنیا میں اپنا مقام بنانے کے لیے کن مسلمانوں کی خوشنودی میں لگے ہوئے ہیں یا خود ان کی (گیان چند جین کی) اُردو دنیا میں آج جو قدر و منزلت ہے وہ کن مسلمانوں کی خوشنودی یا خوشامد کا ثمرہ ہے؟

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ گیان چند جین کی نظروں میں اُردو ادب کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کیوں کہ اس میں بقول ان کے ''ہندوؤں کی تذلیل و اہانت'' کی گئی ہے (ص ۲۰۰)۔ جین صاحب نے اُردو کے پرانے قصے کہانیوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی مثالیں نکالی ہیں جہاں دیو مالائی شخصیتوں کا ذکر بقول ان کے ''مناسب آداب کے ساتھ'' نہیں کیا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ ہندی ادب سے بھی ایسی مثالیں پیش کرتے جن میں مسلمانوں کی تذلیل و اہانت کی گئی ہے اور جہاں ان کے مذہبی جذبات اور ملی وقار کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو ادب میں ایسی بے شمار نظمیں اور اشعار موجود ہیں جن میں ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی ستائش کی گئی ہے اور ان کی عظمت کے گن گائے گئے ہیں۔ اگر صرف اقبال کی نظم ''رام'' کو ہی دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اقبال کے دل میں شری رام چندر جی کی کتنی عزت و عظمت تھی کہ انھیں ''امامِ ہند'' کے لقب سے یاد کیا:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند (بانگ درا)

اسی طرح ایک مسلمان شاعر کو ''کالی کی جے'' بولنے میں بھی کوئی قباحت نہیں:

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی

ہوں مسلمان مگر بول اٹھوں جے کالی کی (امیر مینائی)

گیان چند جین نے اُردو ادب پر ''جنسی جارحیت'' کا بھی الزام لگایا ہے۔ انھوں نے اُردو کے بعض قدیم قصوں سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں عاشق مسلمان ہوتا ہے اور محبوبہ ہندو لیکن وہ اپنا مذہب چھوڑ کر ''مشرف بہ اسلام'' ہو جاتی ہے۔ انھوں نے بعض ایسی مثنویوں کی نشاندہی کی ہے ''جن میں محبوبائیں عاشق کے مذہب اسلام میں آ جاتی ہیں۔'' جین صاحب کے خیال میں یہ جنسی جارحیت ہی نہیں ''مذہبی جارحیت'' بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کی خام خیالی ہے کیونکہ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کی رسموں کا انجام پانا ایک عام سی بات تھی۔ اس میں کسی قسم کی زور زبردستی کو کوئی دخل نہ تھا۔ کیونکہ معاشرتی اور تہذیبی سطح پر یہ دور ہندو مسلم یگانگت اور فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کا ایک زریں دور تھا۔ اسی لیے ان رسموں کو فرقہ وارانہ زاویے سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور کیا راجا اور کیا پرجا کوئی بھی اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی اس سے مستثنیٰ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ امیر خسرو ہندو ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اکبرِ اعظم کی ملکہ جودھا بائی تھی۔ جہانگیر اور دکن کے بعض فرمانرواؤں کی بیگمات بھی ہندو تھیں۔ آج کے دور میں بھی ایسی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں جہاں ہندو عورتوں نے مسلمان مردوں سے اور مسلمان عورتوں نے ہندو مردوں سے اپنی کامل مرضی اور باہمی رضامندی سے شادیاں کی ہیں جن میں نہ جنسی جارحیت کا کوئی شائبہ نظر آیا اور نہ مذہبی جارحیت کا۔ یہی سماجی حقیقت اور تہذیبی سچائی اگر فکشن، قصے کہانیوں اور شعر و ادب میں بیان کر دی گئی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس قسم کی بین مذہبی شادیوں کو جو فریقین کی باہمی رضامندی سے انجام پذیر ہوتی ہیں ''جنسی جارحیت'' قرار دینا اور انھیں فرقہ وارانہ رنگ دے کر ''مذہبی جارحیت'' کہنا محض ذہنی فتور ہے۔

گیان چند جین کو ادب کی یہ باتیں بھی بری طرح کھٹکتی ہیں کہ:

''امیر خسرو نے اپنی فارسی رباعیوں میں ہندو صنم اور ہندو بچے پر ڈورے ڈالے ہیں۔ ملا شیری (؟) نے قشقہ جبیں محبوبہ سے زبان درازی کی۔ قزلباش خاں امید اور فائز نے بامن کی بیٹی اور کھترانی سے بالکل شہدوں کی طرح چھیڑ خانی کی...... منیر شکوہ آبادی مثنوی 'معراج المضامین' جیسی مذہبی مثنوی میں بھی حسن رہگذر سے فیضیاب ہونے کے لیے ہندو عورتوں کو گھورنے میں نہیں شرماتے'' (ص ۹۳-۱۹۲)۔

ایسا لکھتے وقت جین صاحب غالباً یہ بھول گئے کہ یہ 'ادب' ہے، کوئی آسمانی صحیفہ نہیں۔ لیکن چوں کہ وہ ہر چیز کو فرقہ وارانہ عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں، لہٰذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''مثنویوں اور داستانوں میں غیر مسلم حسیناؤں کا عشق اور تبدیلی مذہب، متفرق اشعار میں ہندو خواتین کو بے خوف چھیڑنا سب اس لیے جائز تھا کہ حکومت مسلم تھی'' (ص ۱۹۳)۔

گیان چند جین نے ادبی قصے کہانیوں میں مسلمان مرد کے ہندو عورت کے ساتھ معاشقے اور اس عورت کے مشرف بہ اسلام ہو جانے پر خوب واویلا کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا ذکر کہیں نہیں کیا کہ ادبی دنیا میں ایک ایسی شخصیت بھی گزری ہے جو کسی ہندو عورت کے عشق میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہندوؤں کے طور طریقے اختیار کر لیتی ہے۔ برہمنوں کا لباس اور زنار 'دھارن' کر لیتی اور اپنا نام تک بدل کر ہندوانا نام رکھ لیتی ہے اور اپنی محبوبہ کی تلاش میں متھرا کے مندروں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ یہ شخصیت کوئی اور نہیں بلکہ عہد جہانگیری کی ایک مستند شعری تصنیف 'بکٹ کہانی' کا مصنف محمد افضل (م ۱۶۲۵ء) ہے جس نے ہندو طرز زندگی اختیار کرنے کے بعد اپنا نام ''گوپال'' رکھ لیا تھا۔ اس کا ہندو مسلک پر چلنا بعید از قیاس نہیں کیوں کہ اس نے ہندو علوم میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ آخر میں ایک مندر کا پجاری بنا دیا گیا تھا۔ 'بکٹ کہانی' کے آخری دو اشعار افضل کی اسی زندگی کی جانب سوانحی اشارے ہیں:

خموش افضل ازیں مشکل کہانی
کسو نے حد اس کی کچھ نہ جانی
بیاد دلربا خوش حال می باش
کہے افضل گہے گوپال می باش

''گلستان سعدی'' میں ایک جگہ منقول ہے کہ ''چوں عاشقی و معشوقی درمیان آمد مالکی و مملوکی برخاست''، یعنی معاملات عشق میں آقا اور غلام کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اسی طرح عاشق و معشوق کے درمیان مذہب کا فرق بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عاشق یا معشوق اس مذہب کا ماننے والا ہو کہ اُس مذہب کا، ''مذہب عشق'' اختیار کرنے کے بعد دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں جنھوں نے بکٹ کہانی کی تدوین کا کام انجام دیا ہے ''گوپال'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گوپال افضل کا وہ نام ہے جو اس نے متھرا کے دوران قیام میں اختیار کیا تھا۔

حسن وعشق کے ناٹک میں افضل کا گوپال نام اختیار کرنا اس لحاظ سے بھی بامعنی ہے کہ گوپال کرشن کا ایک نام تھا۔''('بکٹ کہانی'، ص۸۴[حاشیہ])

مسعود صاحب نے نہایت تحقیق کے بعد افضل/گوپال کے حالات یوں بیان کیے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں:

''معلمی ان کا پیشہ تھا............ چوں کہ ابتدا سے 'چاشنی عشق اور مشرب فقر' سے آشنا تھے اس لیے بڑی عمر میں 'ناگاہ عشق ہندوزنے' میں مبتلا ہو گئے اور 'مجنوں صفت، متاع زہد و تقویٰ را 'خیر باد کہا' اور 'مانند ابر بہار'، طوف کوئے ملامت پر آمادہ ہو گئے .... 'افتاں و خیزاں بہ دیار محبوب رسیدہ' .... اور اس 'وحشی غزال' کو رام کرنے کے لیے داڑھی مونڈھی، زنار پہنا اور 'لباس برہمناں' اختیار کر کے ایک مندر کے پجاری کا چیلا بن بیٹھا اور 'تحصیل علوم ہندوی نمودہ' کہ 'جمیع فنون و کمال آں مسلک آمد'۔ اس سے خوش ہو کر گرو نے اسے اپنا نائب مناب بنا دیا اور جب کچھ عرصے کے بعد وہ مرض موت میں گرفتار ہوا تو وصیت کی کہ میرے بعد افضل (گوپال) کو گرو تسلیم کیا جائے۔''(مقدمہ 'بکٹ کہانی'، ص۲۴ و ۲۵)

افضل/گوپال کے ''عشق ہندوزنے'' کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

اگر مجنون و لیلیٰ زندہ گشتے

حدیث عشق ازیں دفتر نوشتے (سعدی)

کیا جین صاحب کو اب بھی اس بات کا پورا یقین ہے کہ معاملات حسن و عشق میں صرف ہندو عورت ہی مشرف بہ اسلام ہوتی ہے اور مسلمان مرد اپنے مسلک پر بدستور قائم رہتا ہے؟ میر صاحب کو ہی لے لیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ''عشق ہندوزنے'' میں مبتلا رہے ہوں (؟):

میر کے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو ان نے تو

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

(۴)

گیان چند جین نے اپنی کتاب میں اہل اُردو پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ انھیں (اہل اُردو کو) ہندی ادب کے ماضی پر ''اعتراض'' ہے۔ جین صاحب کے مطابق وہ اعتراض یہ ہے:

''کھڑی بولی ہندی ایک بالکل نئی زبان ہے جسے انگریزوں کے حکم پر فورٹ ولیم کالج میں تیار کیا گیا۔ اس کا مقصد ہندوؤں کے لیے ایک مشترکہ زبان مہیا کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا'' (ص ۱۱۸)۔

جین صاحب جسے ''اعتراض'' کہتے ہیں وہی تو اصل حقیقت ہے لیکن اس اعتراض کو انھوں نے اہل اُردو کے سر کیوں منڈھ دیا ہے؟ اگر ہندی کے لسانیاتی ادب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے ہندی مصنفین نے ہی اس حقیقت حال کو بیان کیا، پھر اسی کو گریرسن اور دوسروں نے دہرایا۔

ایودھیا پرساد کھتری انیسویں صدی کے نصف دوم کے ایک ممتاز ہندی عالم اور دانشور تھے۔ وہ کھڑی بولی میں ہندی شاعری کے زبردست حمایتی تھے۔ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں 'کھڑی بولی کا پدیہ' (کھڑی بولی کی شاعری) کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ جس میں کھڑی بولی، برج بھاشا اور ہندی اُردو کے رشتوں پر بڑی اہم باتیں کہی گئی تھیں۔ وہ برج بھاشا اور کھڑی بولی کو دو بالکل الگ الگ زبانیں مانتے تھے لیکن کھڑی اور اُردو کو ایک زبان تصور کرتے تھے۔ وہ اُردو شاعری کو کھڑی بولی کی شاعری کہتے تھے۔ وہ ہندی اور اُردو میں اگرچہ صرف رسم الخط کا فرق سمجھتے تھے لیکن اُردو کو ہندی کے مقابلے میں قدیم زبان قرار دیتے تھے اور اُردو سے ہی ہندی کا ارتقا بتاتے تھے۔ ایودھیا پرساد کھتری کے قول کے مطابق اُردو میں سے عربی فارسی الفاظ کو نکال کر ہی ''موجودہ مصنوعی ہندی'' بنائی گئی:

> ''اُردو میں سے عربی فارسی کو جان بوجھ کر چھانٹنے تتھا ان کے استھان پر سنسکرت کے کلشٹ شبد رکھنے سے ورتمان کرترم ہندی کا وکاس ہوا ہے'' (بحوالہ شتی کنٹھ مشر، 'کھڑی بولی کا آندولن'، ص ۱۶۷)۔
>
> (اُردو میں سے عربی فارسی کو جان بوجھ کر خارج کرنے اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے ٹھیٹھ الفاظ رکھنے سے موجودہ مصنوعی ہندی کا ارتقا عمل میں آیا ہے۔)

گیان چند جین نے اپنی کتاب میں ایودھیا پرساد کھتری کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے اور ان کے بیان کردہ کھڑی بولی کے پانچوں اسالیب کا بھی ذکر کیا ہے لیکن کھتری کے اس لسانی تصور کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہ علمی دیانت داری کے منافی ہے۔ جین صاحب نے کھتری کے کھڑی بولی کے پانچ اسالیب ہندی کے پانچ اسالیب قرار دیے ہیں۔ یہ بھی علمی دیانت داری کے خلاف ہے۔ (دیکھیے 'ایک بھاشا......'، ص ۱۸۱)۔

ایک اور ہندی مصنف چندر دھر شرما گلیری کا بھی ہندی کی پیدائش کے بارے میں کم وبیش وہی خیال ہے جو کھتری جی نے پیش کیا ہے۔ گلیری جی اپنی کتاب 'پرانی ہندی' میں لکھتے ہیں:

''ہندوؤں کی رچی ہوئی پرانی کوِتا جو ملتی ہے وہ برج بھاشا یا پوربی، ویس واڑی، اودھی، راجستھانی اور گجراتی آدی ہی میں ملتی ہے، ارتھا تو 'پڑی بولی' میں پائی جاتی ہے۔ 'کھڑی بولی' یا پکی بولی یا ریختہ یا ورتمان ہندی کے ورتمان گدیہ پدیہ کو دیکھ کر یہ جان پڑتا ہے کہ اُردو رچنا میں فارسی عربی یا تد بھووں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تتسم اور تد بھور کھنے سے ہندی بنائی گئی'' (ص ۱۰۷)۔

(ہندوؤں کی تخلیق کردہ جو پرانی شاعری ملتی ہے وہ برج بھاشا یا پوربی، ویس واڑی، اودھی، راجستھانی اور گجراتی وغیرہ میں ہی ملتی ہے۔ یعنی 'پڑی بولی' میں پائی جاتی ہے۔ 'کھڑی بولی' یا پکی بولی یا ریختہ یا موجودہ ہندی کی موجودہ نثر و نظم کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں مستعمل فارسی عربی کے خالص یا تحریف شدہ الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ پر سنسکرت یا ہندی کے تتسم اور تد بھو الفاظ رکھنے سے ہندی بنائی گئی)

ہندی کے مشہور شاعر جگن ناتھ داس 'رتنا کر' بھی کھڑی بولی ہندی کو اُردو کا بدلا ہوا روپ مانتے ہیں جس میں پہلے ''بھا کھا'' کے لفظ داخل ہوئے پھر دھیرے دھیرے سنسکرت کے الفاظ شامل ہونے لگے۔ انھوں نے کہا:

''جو بھاشا آج کل کھڑی بولی کے نام سے کہی جاتی ہے وہ ہماری سمجھ میں اُردو کا ہی ایک روپ انتر ہے۔ آرمبھ میں تو وہ اُردو بھاشا میں 'بھا کھا' کے پرچلت شبد رکھ کر بنائی گئی اور پھر شنے شنے اس میں سنسکرت کے شبد ملائے جانے لگے'' (بحوالہ شتی کنٹھ مشر، 'کھڑی بولی کا آندولن' ص ۲۱)۔

(جو زبان آج کل کھڑی بولی کے نام سے جانی جاتی ہے وہ ہماری سمجھ میں اُردو کا ہی ایک بدلا ہوا روپ ہے۔ شروع میں تو وہ اُردو زبان میں 'بھا کھا' کے مروج الفاظ کو داخل کر کے بنائی گئی اور پھر دھیرے دھیرے اس میں سنسکرت کے الفاظ شامل کیے جانے لگے۔)

''کھڑی بولی'' سے یہاں کھڑی بولی ہندی اور ''بھا کھا'' سے برج بھاشا مراد ہے۔ قدیم زمانے

سے ہی ہندوؤں کو برج بھاشا سے ایک خاص مذہبی لگاؤ رہا ہے، کیونکہ یہ اس علاقے کی بولی ہے جہاں کرشن بھگتی پروان چڑھی۔ ادبی حیثیت سے بھی یہ ایک اہم ترین بولی رہی ہے اور کسی زمانے میں شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق اسی کا طوطی بولتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ہندو مصنفین برج بھاشا کو زمانۂ حال کی ہندی کی اصل سمجھتے تھے اور اسے برج بھاشا سے تشکیل پذیر مانتے تھے۔ یہ بات اگر چہ صحیح نہیں ہے، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انیسویں صدی میں جب کھڑی بولی ہندی کا آغاز ہوا تو اس کے ابتدائی ادبی نمونوں پر برج بھاشا کی گہری چھاپ پڑی۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے ''بھاکھا منشی'' للوجی لال کی 'پریم ساگر' بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہندی کے کئی عالموں نے 'پریم ساگر' پر برج بھاشا کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ جگن ناتھ داس 'رتناکر' کے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔ چنانچہ انھوں نے اسی خیال کے تحت نہایت سوچ سمجھ کر یہ بات کہی کہ اُردو جو کہ پہلے سے موجود تھی اسی میں برج بھاشا کے الفاظ اور بعد میں سنسکرت الفاظ کو داخل کر کے ہندی بنالی گئی۔

گیان چند جین کی یہ عجیب منطق ہے کہ وہ اہل اُردو پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ (اہل اُردو) ہندی کے ماضی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''نئی کھڑی بولی ہندی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں ڈھالی گئی۔ اس سے پہلے ہندی تھی ہی نہیں...... اس کی پہلی کتاب للولال کی 'پریم ساگر' ہے جس میں اُردو نثر میں سے عربی فارسی الفاظ کو نکال کر سنسکرت الفاظ شامل کر دیے'' (ص ۱۲۶)۔ لیکن اس قسم کا اعتراض کرنے والوں میں جین صاحب سب سے پہلا نام جارج اے۔ گریرسن کا پیش کرتے ہیں جس نے ۱۸۹۶ء میں جب للوجی لال کی نثری تصنیف 'لال چندرکا' شائع ہوئی تو اس کے دیباچے میں یہ عبارت درج کی:

> ''اس طرح کی زبان کا اس سے پہلے بھارت میں کہیں پتا نہ تھا اس لیے للولال نے پریم ساگر لکھا تب وہ بالکل نئی بھاشا گھڑ رہے تھے'' (بحوالہ گیان چند جین، 'ایک بھاشا......'، ص ۱۲۶)۔

اس کے بعد اعتراض کرنے والوں میں جین صاحب آر۔ ڈبلیو فریزر کا نام پیش کرتے ہیں جس نے 'لٹریری ہسٹری آف انڈیا' (۱۹۱۵ء) میں کہا کہ:

> 'جدید ہندی بھاشا کو دو پنڈتوں للولال اور سدل مشر کی اختراع سمجھنا چاہیے' (بحوالہ ایضاً)۔

گیان چند جین نے ہندی کے ماضی پر اس قسم کے ''اعتراض'' کو جب اہل اُردو سے منسوب کیا تھا

تو انھیں مثالیں بھی اہل اُردو ہی کی دینا چاہیے تھیں، لیکن ایسی مثالیں انھیں اہل اُردو کے یہاں کہاں ملتیں؟ میرے علم و یقین کی حد تک کسی اہل اُردو نے انیسویں صدی میں ہندی کے ماضی پر اس قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ ایسے اعتراض کی سب سے پہلے مثال خود ہندی کے ہی عالم و دانشور ایودھیا پرساد کھتری کے یہاں ملتی ہے۔ اس کے نو سال بعد ۱۸۹۶ء میں گریرسن اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں، پھر ۱۹۱۵ء میں فریزر بھی ایسا ہی اعتراض کرتے ہیں اور ۱۹۲۰ء میں فرینک ای۔ کیئی اپنی کتاب "A History of Hindi Literature" (ہندی ادب کی تاریخ) میں یہی بات اور زور دے کر کہتے ہیں۔ یہ دراصل ''اعتراض'' نہیں بلکہ حقیقت ہے جسے ایودھیا پرساد کھتری کے بعد کئی انگریز اور ہندو/ ہندی مصنفین نے بیان کیا ہے۔ اہل اُردو نے تو انھیں مصنفین کی کہی باتوں کو بعد میں محض دہرا دیا ہے لیکن ان پر الزام یہ لگایا گیا کہ انھیں ہندی کے ماضی پر اعتراض ہے۔ اس ضمن میں جین صاحب نے جن اہل اُردو کے نام پیش کیے ہیں ان میں فرمان فتح پوری ہیں جن کی کتاب 'ہندی اُردو تنازع' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی اور شمس الرحمٰن فاروقی ہیں جن کی کتاب 'اُردو کا ابتدائی زمانہ' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ گویا سو سال پہلے کہی گئی ایک بات کو (جسے پہلے ہندو/ ہندی اور انگریز مصنفین نے ہی کہا) اگر اہل اُردو نے محض دہرا دیا تو انھیں مورد الزام قرار دیا گیا کہ وہ ہندی کے ماضی پر معترض ہیں۔ (دیکھیے 'ایک بھاشا......' آٹھواں باب)

اب ذرا گریرسن کے پاس پھر واپس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پچیس تیس سال بعد ان کے اس نظریے میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی یا نہیں۔ نئی زبان ہندی کے تشکیل پذیر ہونے سے متعلق گریرسن نے اپنا پہلا بیان ۱۸۹۶ء میں دیا تھا جب للو جی لال کی کتاب 'لال چندر کا' پر دیباچہ لکھا تھا۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں جب انھوں نے "Linguistic Survey of India" (لسانیاتی جائزۂ ہند) کی ترتیب کا کام انجام دیا تب بھی وہ اپنے اسی موقف پر قائم رہے بلکہ مزید یہ کہا کہ للو جی لال کی ہندی اُردو کی بنیاد پر ڈھالی گئی ہے اور فارسی کے الفاظ کی جگہ ہند آریائی نژاد الفاظ رکھ دیے گئے ہیں۔ گریرسن کا یہ بیان جو 'لسانیاتی جائزۂ ہند' کی نویں جلد کے حصۂ اوّل میں شامل ہے ملاحظہ ہو:

> (لہٰذا یہ ہندی، یا جسے کبھی کبھی 'اعلیٰ ہندی' بھی کہتے ہیں، بالائی ہندوستان کے ان ہندوؤں کی نثری ادبی زبان ہے جو اُردو کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے اور اس کا رواج گزشتہ صدی کے آغاز سے انگریزوں کے زیر اثر شروع ہوا۔ اس وقت تک جب بھی کوئی ہندو نثر لکھتا تھا اور وہ اُردو کا استعمال نہیں کرتا تھا، تو

اپنی بولی، اودھی، بندیلی، برج بھاکھا وغیرہ میں لکھتا تھا۔ للولال نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے جوش دلانے پر معروف کتاب 'پریم ساگر' لکھ کر سب کچھ بدل ڈالا۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے، کہ جہاں تک کہ نثری اجزا کا تعلق ہے یہ عملاً اُردو میں لکھی گئی ہے اور اس زبان کے لیے مصنف جہاں فارسی الفاظ استعمال کرتا، وہاں اس نے ہند آریائی الفاظ رکھ دیے) (ترجمہ، ص ۴۶)۔

ایک اور انگریز مصنف فرینک ای۔ کیئی نے بھی اپنی کتاب 'ہندی ادب کی تاریخ' میں اس حقیقت حال کو یوں بیان کیا ہے:

(جدید 'اعلیٰ ہندی' اُردو میں سے فارسی اور عربی الفاظ کو خارج کر کے اور ان کی جگہ پر سنسکرت یا ہندی کے خالص ہندوستانی نژاد الفاظ رکھ کر بنائی گئی) (ترجمہ، ص ۴۶)۔

اسی کتاب میں وہ مزید لکھتا ہے:

(للو جی لال ایک برہمن تھے جن کے خاندان کا تعلق اصلاً گجرات سے تھا، لیکن جو عرصہ دراز سے شمالی ہندوستان میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہدایت پر انھوں نے سدل مشر کے ساتھ مل کر جدید 'اعلیٰ ہندی' کی تخلیق کی۔ شمالی ہندوستان میں، جیسا کہ ہم نے دیکھا، بہت سی بولیاں بولی جاتی تھیں لیکن جو لوگ فارسی نہیں جانتے تھے وہ شائستہ ذریعۂ اظہار کے طور پر اُردو کا استعمال کرتے تھے۔ اُردو کا ذخیرۂ الفاظ بڑی حد تک فارسی اور عربی زبانوں سے مستعار تھا جن کا خصوصی تعلق اسلام سے تھا۔ ہندی بولنے والوں کے لیے ایک ایسی زبان کی شدید ضرورت تھی جو ہندوؤں کی زیادہ مطلب برآری کر سکے۔ اس کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ اُردو کو لے کر اس میں سے فارسی یا عربی الاصل الفاظ نکال دیے گئے، اور ان کی جگہ پر سنسکرت یا ہندی الاصل الفاظ رکھ دیے گئے (ترجمہ، ص ۸۳)۔

ہندوؤں میں اس نئی زبان کے استعمال کے بارے میں کیئی لکھتا ہے:

"للو جی لال کی ہندی درحقیقت ایک نئی ادبی زبان تھی۔ یہ 'اعلیٰ ہندی' یا جسے 'معیاری ہندی' بھی کہتے ہیں، کافی مقبول ہوئی۔ ادبی زبان کی حیثیت سے اسے شمالی ہندوستان کے لاکھوں لوگوں نے اپنایا۔ شعری تخلیقات اب بھی برج بھاشا، یا

اودھی، یا دیگر قدیم بولیوں میں لکھی جاتی رہیں، کیوں کہ اعلیٰ ہندی کو شاعری کے لیے زیادہ استعمال نہیں کیا گیا لیکن چوں کہ اس سے پہلے ہندی میں نثری تصانیف کا بڑی حد تک فقدان تھا، اس لیے اس کے بعد سے نثری ادب کی وسیع پیانے پر تخلیق عمل میں آئی'' (ترجمہ، ص ۸۳، ۸۴)۔

فورٹ ولیم کالج میں ایک نئی زبان 'ہندی' کے گھڑے جانے سے متعلق ایک اور ہندو مصنف اور مورخ تارا چند کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو انھوں نے فروری ۱۹۳۹ء میں ''ہندوستانی کیا ہے؟'' کے زیرِ عنوان اپنی ریڈیو تقریر میں دیا تھا:

''ہندوؤں کے لیے للولال جی، بدل مصر، بنی نرائن وغیرہ کو (ارباب فورٹ ولیم کالج سے) حکم ملا کہ نثر (گد) کی کتابیں تیار کریں۔ انھیں اور بھی زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ادب یا ساہتیہ کی بھاشا تو برج تھی لیکن اس میں گد یا نثر نام ہی کے لیے تھا۔ کیا کرتے، انھوں نے راستہ یہ نکالا کہ میر امن، افسوس وغیرہ کی زبانوں کو اپنایا۔ پر اس میں سے فارسی، عربی کے الفاظ چھانٹ دیے اور سنسکرت اور ہندی (برج اور دیگر بولیوں) کے الفاظ رکھ دیے...... اس طرح دس برس سے بھی کم مدت میں دو نئی زبانیں اپنے اصلی گھوارے سے سیکڑوں کوس کی دوری پر دیسیوں کے اشارے سے بن سنور، رنگ منچ پر آ کھڑی ہوئیں دونوں کی صورت مورت ایک تھی، کیوں کہ دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں۔ پھر دونوں کے سنگار، کپڑے اور زیور میں کچھ فرق نہ تھا۔ پر دونوں کے مکھڑے ایک دوسرے سے پھرے ہوئے تھے۔ اس ذرا سی بے رخی نے دیس کو دبدھا میں ڈال دیا اور اس دن سے آج تک ہم الگ الگ دوراہوں پر بھٹک رہے ہیں'' (بحوالہ شمس الرحمٰن فاروقی، 'اُردو کا ابتدائی زمانہ'، ص ۴۹، ۵۰)۔

فورٹ ولیم کالج میں اُردو میں سے عربی فارسی کے الفاظ کو نکال کر ایک نئی زبان 'ہندی یا' کھڑی بولی ہندی' کے تشکیل پذیر ہونے سے متعلق یہ تمام بیانات ہندو/ ہندی اور انگریز مصنفین کے ہیں، لیکن جین صاحب اس کے لیے قصوروار ٹھہراتے ہیں اہلِ اُردو کو!

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے (فیض احمد فیض)

گیان چند جین نے اس کتاب کی ''تمہید'' میں ہی اُردو اور ہندی کے بارے میں اپنا موقف بیان کر دیا ہے اور صاف لفظوں میں ہندی کی طرف داری کا اعلان کرتے ہوئے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ ''اُردو ادب کو ہندی کا پیش رو'' تسلیم نہیں کرتے:

''یہ بالکل ضروری نہیں کہ ہم اُردو ادب کے خمیر سے بنائے گئے ہیں تو ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اُردو ادب کو ہندی کا پیش رو قرار دیں'' (ص ۱۴)۔

جین صاحب اُردو کے عالم اور اسکالر ہونے کے باوجود اور اُردو ادب کے خمیر سے بنے ہونے کے باوصف اگر اس بات کو نہیں مانتے تو نہ سہی لیکن جو عالم ودانشور ہندی کے خمیر سے بنائے گئے ہیں وہ اس حقیقت کو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ اُردو کو ہندی پر تقدم زمانی حاصل ہے۔ گیان چند جین نے جو ہندی کے بھی 'گیانی' ہیں ہندی ادبیات ولسانیات کے ممتاز عالم دھیریندر ورما کی کتاب 'ہندی بھاشا کا اتہاس' (ہندی زبان کی تاریخ) ضرور پڑھی ہوگی۔ اس کتاب کے صفحہ ۶۰ پر ذیل کی عبارت درج ہے:

''اَیتہاسک دِرشٹی سے ساہتیک کھڑی بولی ہندی کی اپیکشا کھڑی بولی اُردو کا بیوہار پہلے ہونے لگا تھا۔''

(تاریخی اعتبار سے ادبی کھڑی بولی ہندی کے مقابلے میں کھڑی بولی اُردو کا استعمال پہلے ہونے لگا تھا)

کیا جین صاحب کو اُردو کو ہندی کا پیش رو تسلیم کرنے میں اب بھی کوئی تامل ہے؟ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دھیریندر ورما اُردو کو ہندی کی شیلی (اسلوب) یا ہندی کی تحتی زبان نہیں مانتے بلکہ وہ اُردو کے آزادانہ وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''کھڑی بولی سے زمانۂ حال کی ادبی ہندی اور اُردو کی پیدائش ہوئی ہے'' (ص ۵۶)۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ''قواعد کی شکلوں کے لحاظ سے ان دونوں ادبی زبانوں میں خاص فرق نہیں ہے، درحقیقت دونوں کی جڑ اور بنیاد ایک ہی ہے لیکن ادبی ماحول، ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے'' (ص ۶۰)۔ دھیریندر ورما دہلی میں اُردو کا وجود اس وقت سے بتاتے ہیں جب مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا۔ وہ لکھتے ہیں:

''بھارت ورش میں آنے پر بہت دنوں تک مسلمانوں کا کیندر دلی رہا، اتہہ فارسی، ترکی

اور عربی بولنے والے مسلمانوں نے جنتا سے بات چیت اور بیوہار کرنے کے لیے
دھیرے دھیرے دلّی کے اڑوس پڑوس کی بولی سیکھی۔ اس بولی میں اپنے ودیشی شبد
سموہ کو سوتنتر تا پوروک ملا لینا ان کے لیے سوَ بھاوِک تھا۔ اس پرکار کی بولی کا بیوہار سب
سے پرتھم...... قلعے کے شاہی فوجی بازار میں ہوتا تھا۔ اَتیہ اسی سے، دلّی کے پڑوس کی
بولی کے اس ودیشی شبدوں سے مشرِت روپ کا نام 'اُردو' پڑا۔ ترکی بھاشا میں اُردو
شبد کا ارتھ بازار ہے'' (ایضاً ص ۶۰)۔

(ہندوستان میں داخل ہونے پر بہت دنوں تک مسلمانوں کا مرکز دہلی رہا، لہٰذا فارسی،
ترکی اور عربی بولنے والے مسلمانوں نے عوام سے بات چیت اور رابطے کے لیے
دھیرے دھیرے دہلی کے آس پاس کی بولی سیکھی۔ اسی بولی میں اپنے بدیسی ذخیرۂ
الفاظ کو آزادانہ طور پر شامل کر لینا ان کے لیے فطری تھا۔ اس طرح کی بولی کا استعمال
سب سے پہلے...... قلعے کے شاہی فوجی بازار میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اسی (وجہ) سے، دہلی
کے پڑوس کی بولی کے اس بدیسی الفاظ سے آمیختہ روپ کا نام 'اُردو' پڑا۔ ترکی زبان
میں لفظِ اُردو کے معنی بازار ہے۔)

دہلی میں مسلمان بارہویں صدی کے اواخر (۱۱۹۳ء) میں داخل ہوئے اور ان کا سابقہ نواحِ دہلی کی
اس بولی سے پڑا جو 'کھڑی بولی' تھی۔ اسی کھڑی بولی میں جب عربی فارسی (اور ترکی) الفاظ کی آمیزش ہوئی تو
اس کا نام 'اُردو' پڑا۔ دھیریندر ورما نے اُردو کی تشکیل کے ان مراحل میں 'کھڑی بولی ہندی' کا کہیں ذکر نہیں کیا
ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے وقت اور اس کے بہت دنوں بعد تک شمالی
ہندوستان میں کھڑی بولی ہندی کا کہیں وجود نہ تھا۔ لیکن جین صاحب ہندی پر اُردو کے تقدم زمانی کو ختم کرنے
کے لیے کھڑی بولی ہندی کا آغاز ۱۱۰۰ سنہ عیسوی سے بتاتے ہیں جو محض ایک 'مفروضہ' ہے۔

دھیریندر ورما کھڑی بولی کو اُردو کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں اور کھڑی بولی اُردو کو کھڑی بولی ہندی سے
قدیم تر مانتے ہیں۔ وہ پرانی کھڑی بولی کو ''ہندوی'' (جو اُردو کا ایک قدیم نام ہے) کے نام سے موسوم کرتے
ہیں اور چودھویں صدی میں دکن میں فروغ پانے والی زبان کو بھی ''ہندوی'' کہتے ہیں۔ وہ ہندوی کو صاف
لفظوں میں ''دکنی اُردو'' کا مترادف تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''دکشن بھارت میں وکست ہندوی اتھوا دکنی اُردو ساہتیہ کا پرارمبھ ۱۳۲۶ء میں محمد تغلق

کے دکشن آکرمن کے بعد ہوا۔ ہندوی کے پرارمبھک کوی مسلمان صوفی فقیر تھے
جنھوں نے اپنے دھارمک وچاروں کے پرچار کی درشٹی سے یہ رچنائیں لکھی تھیں۔
یہ ساہتیہ ابھی دیوناگری لپی میں پرکاشت نہیں ہوا ہے یدیپی اس کی بھاشا پرانی کھڑی
بولی ہے'' (ایضاً،ص ۸۰)۔

[جنوبی ہندوستان میں فروغ پانے والے ہندوی یا دکنی اُردو ادب کا آغاز ۱۳۲۶ء میں
محمد (بن) تغلق کے جنوبی حملے کے بعد ہوا۔ ہندوی کے ابتدائی شاعر مسلمان صوفی فقیر
تھے جنھوں نے اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ کے مقصد سے یہ کتابیں تصنیف کی تھیں۔]

یہ بات نہایت قابل ذکر ہے کہ دھیریندرورما جو ہندی کے ایک ممتاز عالم ہیں 'دکنی اُردو' کو نہ تو 'دکنی ہندی' (یادکھنی ہندی) کہتے ہیں اور نہ ہی اُردو کو ہندی کی 'شیلی' (اسلوب) قرار دیتے ہیں۔ وہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کو برابر کا درجہ دیتے ہیں ان کی نظر میں ادبی کھڑی بولی کا دو زبانوں میں فروغ ہوا ہے، ادبی کھڑی بولی اُردو اور ادبی کھڑی بولی ہندی جن میں سے اول الذکر کو تقدم زمانی حاصل ہے اور آخرالذکر بعد کا ارتقا ہے۔ اصل حقیقت یہی ہے جو ہندی کے عالم ودانشور دھیریندرورما نے بیان کی ہے لیکن اُردو سے وابستہ عالم گیان چند جین اُردو ادب کو ہندی کا پیش رو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کیا بوالعجبی ہے!

دھیریندرورما کے علاوہ ہندی کے دوسرے عالموں نے بھی ہندی پر اُردو کے زمانی تقدم کو تسلیم کیا ہے اور صاف لفظوں میں کہا ہے کہ انیسویں صدی سے قبل کھڑی بولی ہندی میں ادبی روایت کا فقدان تھا۔ شتی کنٹھ مشر جو بنارس ہندو یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اپنی عالمانہ تصنیف 'کھڑی بولی کا آندولن' (کھڑی بولی کی تحریک) میں لکھتے ہیں:

''یہ سب ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اتر بھارت میں ۱۹ویں شتابدی کے
پورو کھڑی بولی میں گدیہ ساہتیہ کی کوئی دھارا وا ہک پرمپرا تھی'' (ص ۶۲)۔
(یہ سب ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شمالی ہندوستان میں انیسویں صدی سے
قبل کھڑی بولی میں نثری ادب کی کوئی سلسلہ وار روایت موجود تھی۔)

یہاں ''کھڑی بولی'' سے مراد کھڑی بولی ہندی ہے۔ جب کہ شمالی ہندوستان میں انیسویں صدی سے قبل کھڑی بولی اُردو میں کم از کم ۱۵ نثری کتابیں تصنیف/ترجمہ کی جاچکی تھیں جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ 'کربل کتھا' (۳۳/۱۷۳۲ء) از فضلی علی فضلی، مرتبہ: مالک رام اور مختار الدین احمد۔

۲۔ 'قصۂ مہر افروز و دلبر' (۵۹۔۱۷۳۲ء) از: عیسوی خاں بہادر، مرتبہ: مسعود حسین خاں۔

۳۔ شرح 'رس چندرکا' (۱۷۵۲ء) از: عیسوی خاں بہادر

۴۔ 'نو طرز مرصع' (۷۵۔۱۷۷۴ء) از: میر محمد حسین عطا خاں تحسین، مرتبہ: نورالحسن ہاشمی۔

۵۔ 'تفسیر مرادیہ' (۷۲/۱۷۷۱ء) از: شاہ مراد اللہ انصاری۔

۶۔ 'قصہ احوال روہیلہ' (۸۱۔۱۷۷۴ء) از: رستم علی بجنوری۔

۷۔ 'ترجمہ قرآن' (۸۸/۱۷۸۷ء) از: شاہ رفیع الدین۔

۸۔ 'ترجمہ قرآن' (۹۱۔۱۷۹۰ء) از: شاہ عبدالقادر۔

۹۔ 'تفسیر رفیعی' (تفسیر سورۂ بقر) (۹۱/۱۷۹۰ء) از: شاہ رفیع الدین۔

۱۰۔ 'تفسیر القرآن' (۹۲/۱۷۹۱ء) از: شاہ حقانی۔

۱۱۔ 'عجائب القصص' (۹۳/۱۷۹۲ء) از: شاہ عالم ثانی، مرتبہ: راحت افزا بخاری۔

۱۲۔ 'قصۂ ملک محمد و گیتی افروز' (۹۴/۱۷۹۳ء) از: مہر چند کھتری مہر۔

۱۳۔ 'جذب عشق' (۹۸/۱۷۹۷ء) از: شاہ حسین حقیقت۔

۱۴۔ 'نو آئین ہندی' (۹۹/۱۷۹۸ء) از: مہر چند کھتری مہر۔

۱۵۔ 'سلک گہر' (۱۸۰۰/۱۷۹۹ء) از: انشاء اللہ خاں انشا، مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی۔

یہ سب شمالی ہندوستان میں دستیاب انیسویں صدی سے پہلے کی اُردو کی نثری کتابیں ہیں۔ان کے معرضِ وجود میں آنے سے بہت پہلے اُردو میں شاعری کا سلسلہ امیر خسرو (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵ء) کے ہاتھوں شروع ہو چکا تھا۔اس کے بعد چودھویں صدی سے دکن میں اُردو کے سلسلہ وار شعری و نثری نمونے ملتے ہیں اور اٹھارھویں صدی کے اختتام تک شمال اور جنوب دونوں علاقوں میں اُردو ادب کا وقیع سرمایہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ جب کہ اس دور کے کھڑی بولی ہندی کے ادبی نمونے بالکل دستیاب نہیں اور اگر بعض نمونے ملتے بھی ہیں تو ان میں یا تو اُردو کے نمونے شامل کر لیے جاتے ہیں یا وہ غیر مصدقہ ہوتے ہیں۔جین صاحب نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شمالی ہند کی اُردو کی مشہور نثری داستان 'قصۂ مہر افروز و دلبر' کے مصنف عیسوی خاں بہادر کو ہندی کا مصنف قرار دیا ہے۔ جب کہ 'قصۂ مہر افروز و دلبر' اُردو کی تصنیف ہے تو عیسوی خاں بہادر ''ہندی کے مصنف'' (ص ۱۴۹) کیسے ہو سکتے ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ جین صاحب نے اپنی کتاب کے ''ضمیمہ'' (صفحہ ۳۰۲ تا ۳۰۴) میں ''۱۸۰۰ء سے پہلے اُردو کی نثری کتابیں'' کے تحت اُردو کتابوں کی جو فہرست دی ہے

اس میں 'قصہٴ مہر افروز و دلبر' (عیسوی خاں بہادر) کو شامل نہیں کیا ہے۔ جین صاحب سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اُردو کی اتنی مشہور ادبی تصنیف کو جو شمالی ہند کی طبع زاد اُردو نثر کا بہترین نمونہ ہے اور جس کا سنہ تصنیف ۵۹-۱۷۳۲ء ہے، ۱۸۰۰ء سے قبل کی اُردو کی نثری کتابوں کی فہرست سے کیوں خارج کر دیا؟

جیسا کہ شتی کنٹھ مشر اور دوسرے ہندی عالموں نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ انیسویں صدی سے قبل کھڑی بولی ہندی میں ادبی روایت موجود نہیں تھی اور اس زبان میں نثر و نظم دونوں کا فقدان تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء سے قبل کھڑی بولی ہندی کا وجود ہی نہ تھا، اور جب زبان ہی نہ ہو تو ادب کیسے وجود میں آ سکتا ہے۔

ہندی کے ایک ممتاز عالم چندر دھر شرما گلیری کھڑی بولی کا رشتہ پورے طور پر مسلمانوں سے جوڑتے ہیں اور کھڑی بولی کو اُردو مانتے ہیں اور اسی کھڑی بولی/اُردو سے ہندی کا ارتقا بتاتے ہیں۔ اپنی کتاب 'پرانی ہندی' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندی گدیہ بھاشن للولال کے سمے سے آرمبھ ہوتی ہے...... پرانی ہندی گدیہ اور پدیہ کھڑے روپ میں مسلمانی ہے۔'' (پرانی ہندی ص ۱۰۸، بحوالہ اومکار راہی، 'کھڑی بولی'، ص ۲۷)
>
> (ہندی نثری زبان کا آغاز للولال سے ہوتا ہے...... پرانی ہندی نثر اور شاعری کھڑی بولی کی شکل میں مسلمانی ہے۔)

ہندی کے ایک اور عالم وشوناتھ پرساد مشر کو اُردو ہندی کے لسانی مسائل سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے 'ریختہ' کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے بغور مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ریختہ اور کھڑی بولی دونوں ایک ہیں اور ان میں صرف نام کے فرق کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہے۔ پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ ریختہ ایک ''اسلوبِ خاص'' کا نام ہے۔ اس کا ارتقا کھڑی بولی میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے ہوا ہے۔ یہی ریختہ آگے چل کر 'اُردو' بن گئی اور اسی کی بنیاد پر 'ہندی' بنائی گئی۔ بقول اومکار راہی:

> ''انھوں نے (وشوناتھ پرساد مشر نے) اپنے کتھن میں بجھوتا لانے کے لیے اور بھی سنسکت بھاشا میں کہا کہ اُردو سے بھید کرنے کے لیے دیشی بھاشا کا نام جس میں عربی فارسی کے شبدوں کا دھڑلے کے ساتھ پریوگ نہیں ہوتا تھا، ہندی، بھاکھایا

کھڑی بولی پڑ گیا'' (دیکھیے اومکار راہی، 'کھڑی بولی'، ص ۲۴)۔

[انھوں نے (وشوناتھ پرساد مشر نے) اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اور بھی پرزور الفاظ میں کہا کہ اُردو سے فرق پیدا کرنے کے لیے دیسی زبان کا نام جس میں عربی فارسی الفاظ کا آزادانہ استعمال نہیں ہوتا تھا، ہندی، بھاکھا یا کھڑی بولی (کھڑی بولی ہندی) پڑ گیا۔]

انیسویں صدی کے نصف دوم کے ممتاز ہندی ادیب و عالم بھارتیندو ہریش چندر بھی کھڑی بولی سے اُردو ہی مراد لیتے تھے اگرچہ وہ کھڑی بولی کو اگروالوں کی بولی کہتے تھے۔ وہ اپنی کتاب 'اگروالوں کی اتپتی' (اگروالوں کی پیدائش) کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ان کا (اگروالوں کا) مکھیہ دیش پچھموتر پرانت ہے اور ان کی بولی، استری اور پُرش سب کی کھڑی بولی ارتھات اُردو ہے'' (بحوالہ اومکار راہی، 'کھڑی بولی'، ص ۲۵)۔

ان کا (اگروالوں کا) خاص وطن شمال مغربی علاقہ ہے اور ان کی بولی، عورت اور مرد سب کی کھڑی بولی یعنی اُردو ہے۔

بھارتیندو کے اس قول سے جین صاحب کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا جو یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو صرف ہندو مرد ہی بولتے ہیں اور ہندو عورتیں اس سے مبرا ہیں نیز ''اُردو زبان ہندو گھروں میں بیٹھک کے کمرے سے آگے نہیں بڑھی۔'' ('ایک بھاشا......'، ص ۲۸) بھارتیندو ہریش چندر کھڑی بولی اور اُردو کو ایک زبان تسلیم کرتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتیندو اور اس دور کے دوسرے بہت سے ہندو عالم اور دانشور کھڑی بولی میں ہندی شاعری کے حق میں نہ تھے کیوں کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر کھڑی بولی میں ہندی شاعری کی گئی تو وہ اُردو ہی ہو جائے گی۔ بھارتیندو خود برج بھاشا میں ہندی شاعری کے زبردست حمایتی تھے۔

ہندی عالموں کے اقوال اور معروضی حقائق کی روشنی میں یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ کھڑی بولی ہندی اس وقت وجود میں آئی جب انیسویں صدی کی آمد آمد تھی۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور اس کے ایک عہدے دار گلکرسٹ کی ہدایت پر وہاں کے ''بھاکھا منشی'' للو جی لال نے اُردو کو، جو پورے شمالی ہندوستان میں پہلے سے جاری و ساری تھی، بنیاد بنا کر اور اس میں سے عربی فارسی الفاظ کو نکال کر اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے الفاظ رکھ کر دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ایک نئی زبان

اختراع کی۔ یہی زبان کھڑی بولی ہندی کہلائی۔ للو جی لال نے 'پریم ساگر' ۱۸۰۳ء میں اسی نئی زبان میں لکھی۔ فورٹ ولیم کالج کے ایک دوسرے منشی سدل مشر نے بھی اسی سال اسی زبان کا استعمال کرتے ہوئے چندراوتی کی کتھا 'ناسکیتو پاکھیان' کے نام سے لکھی۔ یہ دونوں کتابیں سنسکرت سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان میں جو لسانی طریقۂ کار استعمال کیا گیا وہ ایک نئی زبان کی تعمیر کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارتینڈو ہریش چندر نے بھی اپنی کتاب 'ہندی بھاشا' میں للو جی لال کی کھڑی بولی ہندی کو ''نئی بھاشا'' (نئی زبان) کہا ہے۔ جب کہ اُردو اس سے کئی صدیوں پرانی زبان ہے اور اس لحاظ سے اسے ہندی پر زمانی تقدم حاصل ہے۔

اس شق کی ابتدا میں جین صاحب کی کتاب 'ایک بھاشا......' سے ایک اقتباس پیش کیا گیا تھا جس میں انھوں نے اُردو ادب کو ہندی کا پیش رو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہندی پر اُردو کا زمانی تقدم ثابت کرنے کے لیے میں نے ہندی ادیبوں اور دانشوروں کے چند اقوال پیش کیے جس سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ اُردو زبان و ادب ہندی سے کہیں زیادہ قدیم ہے اور ہندی بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اب جین صاحب کی اسی کتاب سے میں ایک دوسرا اقتباس نقل کرنے جا رہا ہوں جو ان کے فکری اور ذہنی تضاد کو پوری طرح اجاگر کر دے گا۔ جین صاحب اس جھوٹ کو کہ اُردو ادب ہندی کا پیش رو قرار نہیں دیا جا سکتا زیادہ دیر تک نہ چھپا سکے اور بالآخر انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کر ہی لیا کہ اُردو ادب نے ہندی کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بیرونی مسلمان اپنے ساتھ نہ اُردو لائے تھے نہ کھڑی بولی...... ہندوؤں نے کھڑی بولی کو نظرانداز کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے اسے پسند کر کے اس میں عربی فارسی الفاظ بڑھانے شروع کیے اور وہی کھڑی بولی کا اُردو ادب کہلایا جس نے ہندی روپ کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا'' (ص ۱۵۸)۔

کیا اس قول سے ہندی پر اُردو کا تقدم زمانی ثابت نہیں ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ اُردو کی ادبی روایات بہت پرانی ہیں اور اس اعتبار سے ہندی پر اُردو کو بلاشبہ فوقیت اور زمانی تقدم حاصل ہے۔

جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا گیا ہے کہ پروفیسر گیان چند جین اُردو زبان و ادب کی ایک لائق احترام، اعلیٰ مرتبت اور برگزیدہ شخصیت ہیں۔ انھوں نے اُردو تحقیق و تاریخ کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اُردو کے علمی سرمایے میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اُردو کی سربلندی و سرخروئی تمام عمر ان کا شیوہ رہا

ہے۔ ان سب باتوں سے کسی اہل اُردو کو انکار نہ ہوگا۔ لیکن ان کی حالیہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب'' تصویر کا ایک دوسرا ہی رخ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہرگز یہ یقین نہیں آتا کہ اس کے مصنف گیان چند جین ہیں جو اُردو زبان اور اس کے ادب کے دانا، جویا، عالم اور منتہی ہیں۔ بالآخر یہی کہا جا سکتا ہے کہ جین صاحب کو اُردو اور اہل اُردو سے 'کبھی جو پیار، محبت اور لگاؤ تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے اگرچہ دعویٰ تو انھوں نے یہی کیا ہے کہ وہ اب بھی اُردو کے ویسے ہی ''شیدائی'' ہیں جیسے کہ تھے:

محبت، وفا، مہر کرتے تھے باہم
اٹھا دی ہیں وے تم نے اب ساری رسمیں (میر تقی میر)

(بشکریہ: ''قومی آواز''، نئی دہلی)

☆☆☆

'ذہنِ جدید' کا اضطراب

اب تک فرقہ پرست سیاست ہی ادب، ثقافت کو اپنے محاذوں پر سنگسار کرتی رہی تھی لیکن اب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ادب اور ثقافت میں خاص طور سے اُردو کی سیکولر لابی کو مسلم اور غیر مسلم ادبی اور ثقافتی لابیوں میں تقسیم کرنے کی کوششوں نے ایک واضح شکل اختیار کر لی ہے۔ اُردو میں پردہ داری کے ساتھ ایک دہائی سے جاری ان کوششوں کو اب اُردو کی سیکولر صفوں ہی سے تقویت دلائی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں اُردو محقق گیان چند جین کی فرقہ پرستی کے زہر میں گلے گلے تک ڈوبی ایک کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے عنوان سے دلّی کی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ کتاب اُردو کے ایک ایسے عالم محقق نے لکھی ہے جو زندگی بھر اُردو میں لکھتا رہا، اُردو ہی جس کا اوڑھنا بچھونا رہی اور جس کا سارا ادبی، سماجی مرتبہ، عزت و شہرت یونیورسٹیوں میں اس کی اُردو کی درس و تدریس والی سرگرمی کی دین تھی۔ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس سے ریٹائرڈ ہو کر ترکِ وطن کرنے والے گیان چند جین نے اپنی کتاب کا انتساب اس کتاب کے محرکات کے پس منظر میں پریم چند کے بیٹے ہندی ادیب امرت رائے اور اُردو نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ انتساب کی عبارت ہے:

> ''دشمنانِ ہندی کے معتوبِ اوّل امرت رائے۔ کاش کوئی اُردو والا تاریخ لسانیات میں ان کی انگریزی کتاب "A House Divided" کے برابر یا نصف یا کم از کم ایک چوتھائی علمیت کی کتاب تصنیف کر سکتا اور پدم بھوشن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، صدر ساہتیہ اکادمی، جن کی کتابوں 'امیر خسرو کا ہندوی کلام' (طبع دوم) اور 'ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں' (طبع دوم) نے بڑے بڑے محققوں کے ہوش اُڑا دیے ہیں اور وہ انھیں اپنا ہمسر ماننے پر مجبور ہیں۔''

سترہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کا پہلا تفصیلی محاکمہ شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا ہے۔ اُردو کی تاریخ اور اس کے لسانی پہلوؤں اور اس زبان میں لکھنے والے مسلم ادیبوں کو جس جارحانہ انداز میں ہندو دشمن اور

پاکستان بنانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اُردو لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کو ہندو ادیبوں کے تئیں ادبی نا انصافیاں، زیادتیاں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور برتری سے انکار کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے گیان چند جین نے جو بے سروپا تہمتیں لگائیں ہیں ان کو ایک ایک کر کے نہایت مدلل اور عالمانہ انداز میں رد کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا تفصیلی ردِعمل ظاہر کیا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ اہم بات ہے کہ فاروقی ایسی بہتان تراشیوں پر ایک سچے ادیب کی طرح مضطرب ہو اُٹھتے ہیں خواہ وہ گیان چند جین کی تازہ الزام تراشیاں اور ان کی فرقہ وارانہ سوچ ہو یا پھر ''ہنس'' کے مدیر راجندر یادو کا اُردو زبان و تہذیب کے خلاف معاندانہ اداریہ۔ فاروقی کے تفصیلی اور مدلل جواب کے بعد ہمیں مزید کچھ لکھنے اور اضافے کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ یہ کتاب ایک سوچی سمجھی سازش اور آر ایس ایس کی اُس سوچ کو تقویت اور معتبر ثابت کرنے کی نیت سے لکھی گئی ہے جس کا اظہار آر ایس ایس جیسی مسلم، سیکولر اور اُردو دشمن تنظیم آزادی کے بعد کھلے عام فرقہ وارانہ لہجے میں کرتی رہی ہے۔ اپنا وطن اور شہریت چھوڑ کر ایک غیر ملک کے شہری بننے والے گیان چند جین نے کتنی آسانی سے اُردو ادیبوں اور مسلمانوں پر ملک سے عدم وفاداری اور پاکستان کی طرف دیکھتے رہنے کا نہایت سنگین الزام لگایا ہے۔ فاروقی نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا (جس کے بارے میں 'ذہنِ جدید' برابر لکھتا رہا ہے) کہ پچھلی این ڈی اے سرکار کے زمانے میں اسی سیاسی مؤقف کا بول بالا تھا کہ ''بی جے پی کی جہاں جہاں سرکار ہے وہاں اُردو کے صرف غیر مسلم ادیبوں کو ہی ہر طرح کا فیض پہنچایا جائے''۔ اس کھلی پالیسی کو عملی شکل دینے میں ان لوگوں کا غیر معمولی ہاتھ رہا جو این ڈی اے کے زمانے میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں اُردو کے معاملے میں خود مختار بنائے گئے۔ انھوں نے ہی مسلم اور غیر مسلم ادیبوں میں گہری لکیریں کھینچیں۔ بدقسمتی سے اُردو اور مسلم دشمنی کے اس جال میں وہ سب اُردو ادیب پھنستے چلے گئے جو ادبی دنیا میں کمزور بنیادوں پر کھڑے تھے اور جو بعض غیر مسلم اُردو ادیبوں کی طرح اوسط سے بھی کم تخلیقی صلاحیت رکھتے تھے اور اس کی سرپرستی کے لیے پناہ گاہوں کی تلاش میں تھے۔ فاروقی سے ہم یہ اصرار کر کے کہنا چاہیں گے کہ وہ گیان چند جین کی کتاب کی اشاعت کو اُردو کے سلسلے میں آر ایس ایس کے موقف سے الگ کر کے نہ دیکھیں۔ گیان چند جین نے اپنے قیام ہندوستان کے دوران کبھی ایسا فرقہ پرستانہ فاشسٹ نواز لہجہ نہیں اپنایا جس کا عملی اظہار اس کتاب کے انتساب کیے جانے والے دوسرے صاحب کی موقع پرست زندگی میں وقفے وقفے سے واضح طور سے دکھائی دیتا رہا ہے۔ فاروقی سے ہم کہنا چاہیں گے:

ادھر اُدھر سے مقابل کو یوں نہ گھائل کر
وہ سنگ پھینک کہ بے ساختہ نشانہ لگے

فاروقی صاحب نے جانتے ہوئے بھی یہ پہلو نظر انداز کر دیا کہ فرقہ پرستی کے زہر میں ڈوبی اس کتاب کی اشاعت کو اچھا خاصا وقت گزر گیا مگر جن کے نام کتاب کا انتساب ہے اسے انھوں نے اب تک نہ تو "Disown" کیا اور نہ ہی کتاب کی مذمت میں ایک لفظ کہا یا لکھا۔ اپنی مستند زعفرانی پہچان کے باوجود انھوں نے تو (UPA) کے زمانے میں مغربی بنگال کی کمیونسٹ حکومت سے بھی اپنے لیے وہاں کے سب سے بڑے اُردو اعزاز کا اعلان کروالیا جب کہ سی پی ایم کے جنرل سیکریٹری نے کھل کر پارٹی ترجمان میں اُن کی سیاسی موقع پرستیوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں ساہتیہ اکادمی کے انتظام سے الگ رکھنے کی سفارش کی تھی۔

ہم چاہتے ہیں کہ فاروقی گیان چند کی کتاب کی اشاعت کے پس پردہ جو سیاسی محرکات کارفرما ہیں ان کو بھی اپنے نشانے کی زد پر لائیں کہ اب اُردو اور اس کی ثقافت پر ہندوتو کی آڑ میں تیر برسانے والوں کو کڑے لہجے میں جواب دینے کی ضرورت ہے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اُردو کے سلسلے میں فاروقی کا اخلاص بے پناہ ہے اور وہ اُردو زبان اور تہذیب کے لیے ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ اُردو دنیا کو اس کتاب کی خوب خبر لینی چاہیے کہ اب چپ بیٹھنے کے دن نہیں رہے۔

(بشکریہ: ذہن جدید، نئی دہلی، بھارت)

☆☆☆

ڈاکٹر خلیل طوق اُر
استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی۔ترکی

تیری ماں نے مجھے گالی دی ہوگی!

(ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب پر کچھ خیالات)

ایک میمنا کسی چشمے پر پانی پی رہا تھا۔اتفاق سے ایک بھیڑیا بھی پانی پینے آ گیا۔میمنے کو دیکھ کر بھیڑیے کے منہ میں پانی بھر آیا۔وہ سوچنے لگا کہ ''کھانے سے پہلے اس کے سر کوئی الزام بھی لگانا چاہیے۔''

غصے سے بولا: ''نالائق، تو نے سارا چشمہ گدلا کر ڈالا۔اب بتا تجھے کیا سزا دوں؟''

میمنے نے ڈر کر دھیرے سے جواب دیا: ''حضور، آپ تو اوپر کی طرف کھڑے ہیں۔بھلا گدلا پانی آپ کی طرف کس طرح جا سکتا ہے؟''

بھیڑیے نے منہ پھاڑ کر کہا: ''تیری بات ٹھیک ہی سہی مگر یہ تو بتا پچھلے سال تو نے مجھے گالیاں کیوں دی تھیں؟''

میمنے نے حیرت سے پوچھا: ''پچھلے سال؟''

بھیڑیے نے جھلا کر کہا: ''ہاں، پچھلے سال۔اب کیسا بھولا بنتا ہے۔کیا پچھلے سال تو نے مجھے گالیاں نہیں دی تھیں؟ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ اب بتا تجھے کیا سزا دوں؟''

میمنا بولا: ''مگر جناب، پچھلے سال تو میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔پھر بھلا گالیاں کیسے دے سکتا تھا؟''

بھیڑیا کھسیانا ہو کر کہنے لگا: ''اگر تو نے گالیاں نہیں دیں تو تیری ماں نے دی ہوں گی۔اس کی سزا تجھے ضرور ملنی چاہیے۔''

یہ کہہ کہ بھیڑیا میمنے پر جھپٹا اور اس بے چارے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا گیا۔

اس معروف کہانی کو پڑھنے کے بعد قارئین کرام کے ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ نامور دانشور، محقق اور زبان دان گیان چند جین صاحب کی تالیف، ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' سے اس کہانی کا کیا تعلق ہے؟ وہ اب میں بیان کرتا چلوں گا۔

تقریباً ایک دو ماہ قبل پونے میں مقیم میرے دوست سنجے گوڈبولے صاحب نے مجھے ایک کتاب عنایت فرمائی۔ کتاب کا نام تھا ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' اور کتاب کے مؤلف تھے ''گیان چند جین''۔ کتاب کے اوپر یہ دونوں عنوان دیکھ کر تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس کتاب میں اُردو اور ہندی جو کہ میرے نزدیک ایک ہی بھاشا کے دو روپ ہیں کے مشترکہ عناصر اور قربتوں کے بارے میں کوئی علمی اور تحقیقی معلومات پیش کی گئی ہوں گی لیکن کتاب کے شروع کے صفحات کے مطالعے کے بعد ہی میری خوشی افسوس میں بدلنے لگی۔ کتاب کے اوراق پلٹتے پلٹتے تو افسوس کے ساتھ ساتھ مجھے بڑی حیرت بھی ہونے لگی کہ ایک بڑے عالم شخص ایسی باتیں کیسے لکھ سکتے ہیں؟ نفرت اور دشمنی کی بات تو جاہل لوگوں کی خاصیت ہوتی ہے ایک باعلم دانشور کی نہیں۔ پر افسوس کے ساتھ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس میں علم کم اور دشمنی بہت زیادہ ہے۔ میں نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا اور کچھ عرصے بعد پہلے 'پرواز' اور پھر 'اخبار اُردو' میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب۔ گیان چند جین کی اُردو سے غداری'' اور 'اخبار اُردو' میں پروفیسر ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' اور محمد عارف اقبال کا مضمون ''اُردو دشمنی کے پردے میں'' میری نظر سے گزرے۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس طرح کے کاموں میں مجھے ٹانگ نہیں اڑانی ہے لیکن ترکی کے دوست پاکستان اور بھارت سے "romantic emotions" (دل بستگی) سے وابستہ ہونے والے ایک فرد کی حیثیت سے مجھ سے رہا نہیں گیا۔ چونکہ مذکورہ بالا مضامین میں گیان چند جین صاحب کی کتاب سے متعلق کافی وشافی معلومات درج کی گئی ہیں۔ لہٰذا ان کی کتاب کے حوالے دیے بغیر اس تالیف سے کیا نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ان پر ایک غیر جانبدار اجنبی کی حیثیت سے قارئین کرام کے سامنے اپنی رائے پیش کروں گا۔

سب سے پہلے یہ تالیف پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گیان چند جین صاحب نے ہندی کے کندھے پر بندوق رکھ کر اُردو، مسلمانانِ ہند بلکہ بذاتِ خود بھارت پر گولی چلادی ہے۔ یہ کس طرح ہے؟ اب میں وہ بتاتا چلتا ہوں۔

پہلی نظر میں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اس تالیف کا نشانہ اُردو اور مسلمانانِ ہند ہیں اور اس تالیف سے جو منفی اثرات پیدا ہوں گے ان سے پیدا ہونے والی مصیبتوں سے دوچار ہندوستان کے مسلمان ہی ہوں گے۔ یہ تو سچ ہے کہ ایسے نامعقول خیالات سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہے لیکن یہی خیالات ظاہر کرنے والے لوگ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں کہ وہ اس طرح سے ہندوستانی مسلمانوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ بھارت کے

مسلمانوں کوتو ویسے بھی ان کا خون بہانے کے لیے بے چین بعض شدت پسند گروپوں کی دشمنی سہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔اس میں گیان چند جین صاحب کی اس کتاب سے پیدا ہونے والی دشمنی کا کیا اضافہ ہوسکتا ہے؟ یہ امر کسی سے چھپا ہوا نہیں کہ وہ اقتصادی لحاظ سے ہندوستان کی سب سے پسماندہ اقلیتوں میں سے ہیں اس لیے ان کو اس میدان میں اور پیچھے ہٹانا کچھ ممکن نظر نہیں آتا۔ان کو مروانے، قتل کرانے اوران کے گھر بار جلانے کی بات ہوئی تو ان کو اس بات کی بھی پکی عادت ہے۔وقتاً فوقتاً ان کو قتل کیا جاتا ہے، ان کی بیویوں اور بچیوں کی عصمت دری کی جاتی ہے، ان کے گھر نذرِ آتش کیے جاتے ہیں جس طرح احمد آباد، گجرات میں ہوا ہے۔دراصل انڈیا کے مسلمان بہت کھلے دل والے ہیں کہ اب تک اپنے ملک سے بہت پیار کرتے ہیں کیونکہ جب بھی میں کسی ہندوستانی مسلمان سے ملتا ہوں تو اس کے وطن کے بارے میں پوچھنے پر وہ فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں۔

سو اس لحاظ سے گیان چند جین صاحب کو بھی اچھی طرح علم ہوگا کہ ان کی اُردو اور مسلم دشمنی سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگیوں میں کچھ بہت بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ہاں اگر امریکا میں بڑھاپے میں ڈانٹ ڈپٹ کے لیے مجھے کوئی بھی نہیں ملتا تو چلو میں مسلمانوں سے اس سلسلے میں کام لوں کہہ کر یا جوانی میں کسی مسلمان سے چشمک کی وجہ سے وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں تو وہ کچھ الگ بات ہے لیکن باہر سے موضوع کو جانچنے والے ایک فرد کے طور پر مجھے لگتا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر (میرا دل نہیں چاہتا ہے کہ باشعوری طور پر کہوں) وہ کسی اور کی نہیں بھارت کی ہی دشمنی کرتے ہیں۔

ذرا سوچ لیجیے، حال حاضر میں بھارت دنیا میں ایک بڑی اقتصادی طاقت کی حیثیت سے ابھر رہا ہے اور دن بہ دن ایک سپر پاور بننے کی طرف قدم زن ہے تو اس حالت میں اگر مسلم ہندو گروہوں کے درمیان کا فاصلہ اور گہرا ہو گیا اور دشمنیاں بڑھ گئیں اور دشمنی خانہ جنگی کی مہلک صورت اختیار کر گئی تو اس سے کس کو فائدہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس سے نہ مسلمانوں، نہ ہندوؤں اور نہ ہی بذاتِ خود بھارت کو کوئی فائدہ پہنچے گا۔فائدہ اسی کو پہنچے گا جو بھارت کی بھلائی نہیں چاہتا ہوگا کیونکہ ہندوستانی مسلمان دس بارہ آدمی نہیں کہ انھیں پکڑ کے جیل میں پھینکا جائے یا ملک بدر کیا جائے۔کروڑوں کی آبادی کو ایک سے دوسری گلی میں شفٹ کروانا چاہیں پھر بھی ملک اُلٹ پلٹ ہو جائے گا اور پھر سدھرنے سے نہیں سدھرے گا۔ہمسایہ ہمسائے کا گھر جلائے تو اس کا بھی گھر جلتا ہے جیسا کہ مینا اور چڑیا کی کہانی میں ہوا تھا۔وہ کہانی کچھ یوں ہے:

''ایک دن ایک مینا اپنے گھونسلے میں بیٹھتے ہوئے اسی پیڑ کی دوسری ڈال، جس پر اس

کا گھونسلا تھا، پر موجود چڑیا کا گھونسلا دیکھ کر دل ہی دل میں سوچنے لگی: ''اس چھوٹی سی حقیر چیز کی کیا وقعت ہے جو میرے گھونسلے کے پاس ہی گھونسلا بنائے رکھنے کی ہمت کی ہے۔ اس پیڑ پر تو برسوں سے میرے والدین اور ان کے بزرگ گھونسلے بنایا کرتے ہیں اور یہ درخت ہمارے پرکھوں کا ہے۔ اس کی یہاں کوئی جگہ نہیں۔ میں اس کے گھونسلے میں آگ لگا دوں تو پھر دیکھیے اس کا گھونسلہ بھی جل جائے گا اور اس کے بچے بھی مٹ جائیں گے اور اس کو خوب سبق حاصل ہوگا''۔ یہ سوچتے ہوئے مینا جا کر کہیں سے کوئی انگارا ڈھونڈ لائی اور اس نے چڑیا کے گھونسلے میں چھوڑ دیا۔ خود دل میں خوشی لیے ہوئے جنگل کی وسعت میں گھومنے پھرنے لگی۔ چہچہاتے ہوئے کافی دور جانے کے بعد دور دور سے اسے جنگل کے اس جانب جہاں اس کا گھونسلا تھا، سے اُٹھتا ہوا دھواں نظر آیا۔ دھواں دیکھتے ہی وہ اپنے بچوں کو یاد کر کے تیزی سے اُڑتے ہوئے واپس جانے لگی۔ جب وہ اس پیڑ، جس پر اس کا گھونسلا تھا، تک پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس حقیر چڑیا کا گھونسلا اور بچے تو جل گئے تھے لیکن ساتھ ساتھ اس کا اپنا گھونسلہ، اپنے بچے اور وہ پیڑ جس پر اس کا گھونسلا تھا، تک بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا یہاں تک کہ جس جنگل میں وہ رہتے تھے اس میں بھی آگ لگ گئی تھی! اب وہ رونے لگی پر کیا فائدہ؟''

اور رہی پاکستان کے بننے میں ہندوستانی مسلمانوں کے ہاتھ کی بات! آج کے ہندوستانی مسلمانوں سے اس بات کا کیا تعلق ہے وہ مجھے سمجھ نہیں آتا۔ گیان چند جین صاحب ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ اس طرح سلوک کرنا چاہتے ہیں جیسے اوپر والی کہانی میں بھیڑیے نے میمنے کے ساتھ کیا تھا: ''تو نے گالیاں نہیں دی تھیں تو تیری ماں نے گالیاں دی ہوں گی!'' یعنی ٹھیک ہے آج کے ہندوستانی مسلمانوں نے پاکستان نہیں بنایا تھا لیکن ان کے بزرگوں کے دل میں یہ خواہش تھی۔

کوئی بھی انسان اپنا گھر، اپنی دھرتی، اپنے آس پڑوس بآسانی چھوڑ کر نہیں جاتا اور اپنے ملک کا بٹوارا نہیں چاہتا جب تک وہ مجبور نہ ہو جائے۔ لیکن تمام نوع بشر کی یہ عادت ہے کہ اپنے گریبان میں جھانکے بغیر فوراً دوسروں پہ الزام لگانے لگتا ہے کیونکہ وہ انسان کی اپنی انا کے لیے بہت مناسب ہے۔ میں ہندوستانی تاریخ کا ایک اچھا قاری ہوں اور اسی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ بھارت کے تاریخ دانوں کو اور گیان چند

جین صاحب جیسے لوگوں کو پاکستان بنانے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں پر نکتہ چینی کرنے سے پہلے ذرا تاریخ کے صفحات کو پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ صدیوں سے ہندوستان میں پھیلے ہوئے اور ہندوستان کے لیے اپنی جانیں قربان کر دینے والے مسلمان کیوں ۱۹۴۰ء کے بعد کے پانچ دس سالوں میں ہندوستان سے علیحدگی اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے اور پھر کیوں ۱۹۴۷ء میں بھارت کی تقسیم کو روکنے کی خاطر مسلمانوں سے ٹکرانے والی سکھ قوم میں بھارت سے علیحدگی اختیار کرنے کی خواہشات نمودار ہوئیں؟ پاکستان بننے میں جتنا ہاتھ مسلمانوں کا تھا اتنا ہی ہاتھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہاتھ گیان چند جین صاحب کی طرح سوچنے والے اور مسلمانوں کو مجبور کرنے والوں کا تھا۔ اس لیے یہ ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں ہندوستان کے باشعور سیاستدانوں، سائنسدانوں اور عام لوگوں کو بغور اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے اور نئے نئے مسائل پیدا ہونے سے قبل ان کے بارے میں ترکیبیں نکالنی چاہئیں۔ تو تو اور میں میں کرنا چھوڑ کر متحد ہونا اور فرقوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا نہ صرف بھارت، بھارت اور پاکستان کی دوستی اور برادری کے لیے بلکہ تمام عالم انسانی کے لیے لازمی ہے۔

ہاں اگر ہندوستان کے کچھ بامقصد لوگ پچپن سال پہلے' مسلمانوں نے اور اُردو زبان ہی نے ہمارے ملک کی تقسیم کرادی' کہتے ہوئے اب تک روئیں گے اور مسلمانانِ ہند اور اُردو زبان سے بغض ونفرت کرتے رہیں گے تو ان سے ایک ترک کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر بھولی بسری باتوں پر افسوس کرنا عقلمندی ہوتا تو ہم ترک افسوس کر کر کے رویا کرتے۔ دراصل عثمانی سلطنت کے زمانے میں سعودی عرب سے لے کر یورپ میں آسٹریلیا تک اور شمال میں یوکرین سے لے کر افریقہ کے دور دراز علاقوں تک ہمارے زیر نگین تھے جو وہ یکے بعد دیگرے ہم سے الگ کر دیے گئے۔ اب ہم ان چیزوں کو پیچھے چھوڑ کر ان تمام ملکوں سے دوستی نبھاتے ہیں اور اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں ہمکاری کرتے ہیں جو کسی زمانے میں ہمارے ملک کے حصے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی بھلائی اور ترقی کے لیے بھولی بسری باتوں کو چھوڑ کر آگے مستقبل کی طرف گام زن ہونا چاہیے کیونکہ شدت شدت کی ماں ہوتی ہے اور ظالم بھی ایک نہ ایک دن مظلوم کے ساتھ اپنی شدت کی آگ میں لپٹ کر جل جاتا ہے اور دشمنی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ شکر ہے کہ ہندوستان کی اکثریت گیان چند جین صاحب جیسے لوگوں کی نہیں ہے ورنہ مسلمانانِ ہند کا، نہ ہی بھارت کا حال کچھ اچھا ہوتا!

☆☆☆

بھاگلپور (بہار)، بھارت

گیان چند جین کی اُردو سے غداری

''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب''

اُردو تحقیق کا ایک بڑا نام گیان چند ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر گیان چند ساری زندگی اردو کی کمائی کھاتے رہے۔ لیکچرر، ریڈر اور پروفیسر کے عہدہ پر پہنچے۔ کئی یونیورسٹیوں میں صدر شعبہ اُردو رہے۔ اُردو تحقیق اور تنقید کی کئی اہم کتابیں شائع کیں۔

مجھ سے ملاقات رہی ہے۔ ساتھ میں تصویریں بھی کھنچوائی ہیں۔ گیان چند نے مجھ پر مضمون بھی لکھا ہے۔ 'کوہسار' میں شائع شدہ متنوع اصناف پر بھی انھوں نے مضمون لکھا ہے۔ میں انھیں ذی علم اور سلجھا ہوا انسان سمجھتا تھا۔ حالانکہ اُردو کے معروف افسانہ نگار اور جرنلسٹ رضوان احمد نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ گیان چند بی جے پی اور سنگھ پریوار کے آدمی ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا۔

اب ۲۰۰۶ء میں گیان چند کی کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب''، شائع ہوئی تو اندازہ ہوا کہ اُردو کا یہ استاد اور قلمکار ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کس حد تک اُردو دشمن ہے۔

بڑے بزرگوں نے لکھا ہے کہ ذات کا اثر انسان کی سرشت سے ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ گیان چند ذات کے بنیا ہیں۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں انھوں نے اپنی ذات کا اثر دکھلا ہی دیا۔ بی جے پی اور سنگھ پریوار سے انھیں توقع سے کم ملا تو وہ امریکہ میں جا بسے۔ جہاں امریکہ کی شہ پر اسرائیل نے انھیں خرید لیا۔ امریکہ سے ایک دوست نے مجھے فون پر راز دارانہ انداز میں بتایا کہ دیگر مراعات کے ساتھ انھیں اس کتاب کے لکھنے پر ایک کروڑ روپیہ ضرور ملا ہوگا۔ میرے امریکی دوست نے قیاس سے یہ بات کہی ہے اس لیے ان کا نام ظاہر نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن کتاب میں جیسی زہر افشانی ہے اور بے ضمیری کا ثبوت ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ گیان چند ایک کروڑ سے کم پر نہیں بکے ہوں گے۔

سترہ ابواب پر مشتمل گیان چند کی کتاب میں نفرت اور صرف نفرت ہے۔ یہ نفرت اُردو سے ہے۔

مسلمانوں سے ہے۔ اسلامی تہذیب و آداب اور ثقافت سے ہے اور اُردو کے سبھی مسلمان قلمکاروں سے ہے۔
دو ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ اُردو میں زبان کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔

۲۔ تاریخ میں مسلمانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے وہاں کی زبان بالخصوص رسم الخط کو ختم کر کے اپنی زبان اور لپی (رسم الخط) کو ان پر مسلط کیا جائے۔ ہندوستان میں بھی اسی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی۔ سندھی، پنجابی، کشمیری وغیرہ کی لکھاوٹ پوری طرح بدل دی گئی۔

۳۔ تقسیم ملک سے پہلے ایسے فرقہ وارانہ خیالات کو اُردو والوں کا ہندوؤں سے پوشیدہ رکھنا کہ اُردو تحریک کا بنیادی مقصد پاکستان بنوایا ہے ایسی غداری ہے جس پر میں افسوس کرتا ہوں۔

۴۔ جب ہر ملک کے اہل اُردو شدت سے پاکستان نواز ہیں تو ممکن ہے ہندوستان کے مسلمان بھی ان کے ہم نوا ہوں لیکن ہندوستان میں ہندو راشٹریت کے خوف سے شاید مصلحت سے کام لیتے ہوں۔

۵۔ میں اپنے اُردو والے مسلمان دوستوں کی تحریریں دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے ان میں اب بھی وہی علیحدگی پسندی دکھائی دیتی ہے جو پہلے تھی۔ ابنائے وطن کے بارے میں ان کے جذبات وہی ہیں جو ہندوستان کے باہر کے اُردو والوں کے ہیں۔

۶۔ ہندوستان میں مسلمان اُردو والے اپنی کمر پر دو قومی نظریے کا بھاری گٹھڑ اٹھائے پھرتے ہیں۔ ایک عام ہندو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر کیوں رکھا جائے۔

۷۔ اُردو ادب میں غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کے دینی عقائد، معاشرے اور معاصر شخصیتوں پر اتنی سیاہی پوت دی گئی ہے کہ کوئی ہندی معاصر اسے قبول نہیں کر سکتا، وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ میرا ادب نہیں، کسی دوسری ملت کی چیز ہے۔

۸۔ ہندوستان کے مسلمان طلبہ اور اساتذہ کا اہل پاکستان سے کافی رابطہ رہتا ہے۔

۹۔ عام اُردو پڑھنے والے محمود غزنوی کے موید ہیں۔

۱۰۔ اگر آپ سرسید کی طرح اُردو کے محافظ ہیں تو یہ بھی جان رکھیے کہ اُردو کے تمام یا بیشتر ہندو ادیب اپنے سینے میں ایک راجہ شیو پرشاد بھی لیے ہوئے ہیں۔

تین سو سے زیادہ صفحے کی اس کتاب میں گیان چند نے جھوٹ کا من گھڑت پلندہ بکھیرا ہے۔ مندرجہ بالا دس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو کا اتنا بڑا نمک حرام شاید ہی کسی عہد میں پیدا ہوا ہوگا۔ ترشول چبھوتا ہوا یہ لہجہ کسی اُردو والے کا نہیں ہوسکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ ویدک تہذیب سے پراکرت نے جنم لیا جس سے اپ بھرنش وجود میں آئی۔ اس کے بعد شورسینی اپ بھرنش کے دھندلکے سے اُردو کی شعاع پھوٹی۔ یہ آزاد اور خود مختار زبان ہے۔ اس کی ادبی اور لسانی روایات کی تشکیل میں آریائی گھرانے کی ممتاز زبانوں اور دیسی بولیوں نے حصہ لیا اور ان سب کی آمیزش، جذب وادغام، اختلاط اور ترتیب نے اسے نکھارا۔ لشکری، ریختہ، ہندی، ہندوی، دہلوی اور اُردوئے معلّٰی کے نام سے موسوم ہونے والی اس زبان کی تمہید مولوی عبدالحق نے یوں بیان کی ہے:

> ”زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کرسکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا پودا ایک تناور درخت ہوجاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے، اُردو اس زمانے کی یادگار ہے جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے اور اہل ہند سے ان کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا۔ اس وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہونے لگا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی جس کا ان میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔“

اور یہ سان گمان میں ہرگز نہیں تھا کہ گیان چند جیسا شخص اُردو کی بیخ کُنی اس طرح کرے گا۔ اُردو تو ہمیشہ میل جول کی زبان رہی ہے، رواداری اور اپنائیت کی زبان رہی ہے۔ عالمی سطح پر اُردو سچ بولنے والوں کی زبان رہی ہے۔

جہاں تک ہندی زبان کی بات ہے جس کی حمایت میں گیان چند رطب اللسان ہیں۔ اس کی حقیقت ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے اپنی ہندی کتاب ”مانک ہندی کا رہتا سک ویاکرن“ میں اس طرح بیان کی ہے:

''ہندی بذات خود فارسی لفظ ہے کیوں کہ ہندوستان کی اکثر اشیاء کے لیے یہ لفظ ہندی اس وقت ایرانیوں بلکہ عربوں کی بول چال میں استعمال کیا جاتا رہا ہے جیسے تمر ہندی، تیغ ہندی، اسپ ہندی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں سنسکرت کے ساتھ ساتھ بولی جانے والی دیگر دیسی زبانوں کے متعلق مجموعی طور پر زبان ہندی 'زبان ہندوی' کا استعمال ہوا ہے''۔

اُردو کے بطن سے سامنے آنے والی ہندی کی صورت گیان چند کی نظر میں کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو اُردو کی من موہنی صورت سب کے لیے جاذب ہے۔ گیان چند تعصب کی عینک لگا کر اُردو کی مخالفت میں جس قدر چاہیں اشتہار بن جائیں اُردو علیحدگی پسندی کی نہیں، میل جول کی زبان تھی اور ہے اور رہے گی۔

گیان چند نے اپنی اس بکواس کتاب کا انتساب اُردو کے بہت بڑے مخالف امرت رائے اور اُردو کے بہت بڑے بہی خواہ گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے انتساب کے متعصبانہ الفاظ دیکھیے:

''انتساب بہ/ دشمنانِ ہندی کے معتوبِ اوّل/ امرت رائے
کاش کوئی اُردو داں تاریخی لسانیات میں ان کی انگریزی کتاب "A House Divided" کے برابر یا نصف یا کم از کم ایک چوتھائی علمیت کی کتاب تصنیف کر سکتا۔
اور/ پدم بھوشن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ/ صدر، ساہتیہ اکیڈمی
جن کی کتابوں، امیر خسرو کا ہندی کلام (طبع دوم) اور ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں (طبع دوم) نے بڑے بڑے محققوں کے ہوش اڑا دیے ہیں اور وہ انھیں اپنا ہمسر ماننے پر مجبور ہیں۔''

اُردو کے نام پر امریکہ اور اسرائیل سے روپے لینے کے بعد گیان چند صحیح اور رواں اُردو لکھنا بھول گئے ہیں۔ انتساب پڑھ کر اُردو والے گیان چند کی تحریر نہیں لگتی ہاں، اُردو دشمن گیان چند کی تحریر ضرور ہے جو لنگڑی اور لولی ہے اور جسے لکنت ہے۔

گیان چند کی کتاب پر اپنی رائے دیتے ہوئے شمیم طارق نے لکھا ہے کہ آخر عمر میں انھوں نے اُردو کے متعلق اپنی زندگی بھر کے مطالعے کا جو حاصل پیش کیا ہے اس نے ان کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیا ہے۔

اپنی کتاب میں انھوں نے اُردو اور اُردو والوں کے بارے میں جو رائے دی ہے، اس کا ایک نمونہ یہ ہے:

''فاتح اور مفتوح میں کہاں کا میل، کیا ہندو سومناتھ کے مندر توڑنے والوں، جزیہ لگانے والوں، ہندو کلچر کو تباہ کرنے والوں پر ملتفت ہوتے اُردو میل جول کی نشانی ہے یا ہندوستان کی زبان سے لگاؤ برتنے کی علامت۔''

گیان چند کا نقطۂ نظر کتنا غلط ہے اس کا اندازہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مندرجہ ذیل سطور کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ان سطور کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ گیان چند نے اپنی کتاب کو امرت رائے کے ساتھ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ہی معنون کیا ہے:

''اُردو جو مشترک ہندوستانی تہذیب کے تاریخی تقاضوں سے وجود میں آئی اور جس کا ڈھانچہ شمالی ہندوستان ہی کی دیسی بولی پر رکھا گیا تھا کس حد تک ہندوستانی ذہن کی آئینہ دار ہوگی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہ مشترکہ زبان سترہویں صدی تک دکن میں خاصی ترقی یافتہ ادبی زبان بن چکی تھی۔ اُردو کا نام اسے شاہجہان کے عہد میں ملا جب دہلی پایہ تخت بنا'' (ہندوستانی ذہن اور تہذیب اور غزل، صفحہ ۱۰۴)۔

کیا مندرجہ بالا اقتباس سے یہ نہیں ظاہر ہوجاتا کہ ڈاکٹر گیان چند ہندوستانی ذہن وتہذیب سے ہی نہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحقیق اور اُردو کے بارے میں مطمح نظر سے بھی ناواقف ہیں جن کے نام انھوں نے اپنی کتاب معنون کی ہے۔

محمد عارف اقبال نے صحیح اندازہ لگایا ہے کہ گیان چند کی اس کتاب کا مرکزی موضوع بلکہ اس کا "synopsis" ایک منصوبے کے تحت ان کو دیا گیا ہے۔ان پر دباؤ ڈالا گیا ہے۔جین صاحب کی نفسیاتی کشمکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نفسیات کی اصطلاح میں مفاہمتی ردعمل کے اظہار پر انھیں برسوں سے تیار کیا جارہا تھا۔ دراصل 'مفاہتی ردعمل' مایوسی کی پیداوار ہوتا ہے جو انسان کو علیحدگی کی طرف لے جاتا ہے۔نیز جب انسان اپنی عمر طبعی کے ضعف کے ساتھ زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو اپنے لاشعور کے تابع ہوجاتا ہے۔اپنی چالیس سالہ تحقیقی زندگی میں جین صاحب مختلف نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے نفرت اور محبت کی متنوع کیفیات سے نبرد آزما ہوئے ہوں گے۔انسان کا دل محبت اور نفرت کے جذبات کا ایسا سمندر ہے جس میں توازن قائم نہ رہے تو اس پر مایوسیاں حاوی ہوجاتی ہیں جو اسے منفی ردعمل کی طرف ابھارتی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ دل کے اس سمندر میں جتنے بھی بُعد پوشیدہ تھے جین صاحب نے یک طرفہ اپنی کتاب میں اگل دیے یا ان سے اُگلوا لیے گئے۔

☆☆☆

محمد عارف اقبال

اُردو دشمنی کے پردے میں

گزشتہ دنوں ہفت روزہ ہماری زبان میں امریکہ میں مقیم بزرگ محقق اور اُردو کے نامور ادیب و استاد پروفیسر گیان چند جین کی گرتی ہوئی صحت اور جسمانی طور پر معذوری کے ساتھ ان کی یادداشت کے متاثر ہونے کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس اُن کی تازہ تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے مطالعہ کے بعد ہوا۔ اس کی وجہ گیان چند جی کی بزرگی ہے۔ اگر کوئی کچا پکا انسان غلطی کرتا تو اسے نظر انداز بھی کیا جا سکتا تھا اور اسے تلافی کے مواقع بھی مل جاتے۔ ہمارے جین صاحب تو بزرگی کے اس درجے پر فائز ہیں جہاں انسان اپنے علوم اور تجربات کی بھٹی میں پک کر کندن بن جاتا ہے۔ اتفاق سے گیان چند جی نسلی طور پر اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جس کے پانچ اہم ورتوں (اصولوں) میں ''اہنسا'' کو اولیت حاصل ہے لیکن یہ ''اہنسا'' گاندھی جی والی نہیں بلکہ اسے جین مت کا بنیادی ستون کہا جاتا ہے۔ اس میں لفظ ''اہنسا'' کا مطلب صرف جسمانی طور پر جانداروں کو نہ مارنے یا تکلیف دینے تک محدود نہیں بلکہ خیالات اور گفتگو میں تکبر، تعصب، عدم احتیاط اور دنیاوی موہ مایا کے ساتھ لالچ کا شکار ہونا بھی عین خلاف ورزی تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح ستون ''ستیہ'' یعنی راست گفتاری میں سچ بولنے کے ساتھ ساتھ مبالغہ، عیب جوئی اور ہر طرح کی نامناسب گفتگو سے پرہیز جین مت کے اصولوں میں داخل ہے۔ سوئے اتفاق کہ جین صاحب تو مذہب اور مذہبی امور سے ہمیشہ بیزار رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنے مذہبی رویے پر گفتگو کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے: ''میں بڑی حد تک مذہب کا قائل نہیں لیکن میں دہریہ بھی نہیں، متشکک ہوں کہ شاید مذاہب سچ ہیں، شاید جھوٹ ہیں۔'' مذہب کے بارے میں جین صاحب کے اس اعلان سے ایک بات تو واضح ہے کہ وہ ''دہریہ'' نہیں بلکہ شک و ریب میں مبتلا ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جین صاحب کسی بھی مذہب میں وشواس نہیں رکھتے تاہم جلد ہی وہ کسی نتیجے تک ضرور پہنچ سکتے ہیں اس لیے اپنے نام کے ساتھ جین کا لاحقہ فی الحال ان کی مجبوری ہی ہو سکتی ہے۔ ستم یہ کہ ضعف کی وجہ سے متعدد بیماریوں نے ان کو اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ ان کا ذہن و دماغ شل ہوتا جا رہا ہے۔ حالیہ رپورٹ میں تو ڈاکٹر نے نتیجہ بیان کیا ہے لیکن مرض کا حملہ کب

ہوااور کتنے دنوں سے وہ ذہنی مریض ہیں، فی الحال اس پر اظہار خیال مشکل ہے۔

جین صاحب کی تازہ تصنیف کے مطالعے سے اس امر کا واضح اظہار ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مرکزی موضوع بلکہ اس کا "Synopsis" ایک منصوبے کے تحت ان کو دیا گیا ہے۔ ان پر دباؤ بھی ڈالا گیا اور جین صاحب کی نفسیاتی کشمکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نفسیات کی اصطلاح میں ''مفاہمتی ردعمل'' کے اظہار پر انہیں برسوں سے تیار کیا جا رہا تھا۔ دراصل ''مفاہمتی ردعمل'' مایوسی کی پیداوار ہوتا ہے جو انسان کو علیحدگی کی طرف لے جاتا ہے۔ نیز جب انسان اپنی عمر طبعی کے ضعف کے ساتھ زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو اپنے لاشعور کے تابع ہو جاتا ہے۔ اپنی چالیس سالہ تحقیقی زندگی میں جین صاحب مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے نفرت اور محبت کی متنوع کیفیات سے نبردآزما ہوئے ہوں گے۔ انسان کا دل محبت اور نفرت کے جذبات کا ایسا سمندر ہے جس میں توازن قائم نہ رہے تو اس پر مایوسیاں حاوی ہو جاتی ہیں جو اسے منفی ردعمل کی طرف ابھارتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دل کے اس سمندر میں جتنے بھی بُعد پوشیدہ تھے جین صاحب نے یک طرفہ اپنی کتاب میں اگل دیئے یا ان سے اگلوا لیے گئے۔

علم و تحقیق کی دنیا میں یہ امر حیرت سے غوطہ زن ہونے پر مجبور کرتا ہے کہ جین صاحب اپنی چالیس سال سے زائد عرصہ کو محیط علمی و تحقیقی تجربات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کریں گے کہ اس کی حیثیت مناظرے سے زیادہ کچھ نہ ہوگی۔ تاہم جن لوگوں کی علمی کم مائیگی کا ذکر انھوں نے کیا ہے اسے یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو کے ساتھ خود اس کے بیشتر نقادوں، ادیبوں اور شاعروں نے جو تماشے کیے ہیں وہ ایک الگ بحث ہے۔ اس موضوع پر اہل علم کی طرف سے یقیناً اظہار خیال کیا جانا چاہیے۔ اس کام کے جین صاحب بھی مستحق تھے، لیکن یہ کام اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب وہ کسی کے زیر اثر نہ ہوتے۔ اس کتاب پر تو یہ گمان ہوتا ہے کہ جین صاحب موجودہ دور کے ایک عام محقق ہیں جس نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس کے مطالعے کے دوران یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جین صاحب اب تشکیک کے دور سے نکل کر مذہب پر ایمان لے آئے ہیں اور ایک ایسے مذہب پر ان کا وشواس پختہ ہو گیا ہے جس کی جڑیں شمال سے جنوب تک ''ہندتو'' کی قدیم گپھاؤں کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ اب جین صاحب اُردو کے عظیم محقق نہیں رہے بلکہ ہندتو کے علمبردار اور پراچین کال کے کھوجی ہو گئے ہیں جہاں اپنے گن گن سے پریم کرنے کی بھاشا تو سکھائی جاتی ہے لیکن اپنوں سے الگ دکھائی دینے والوں کو کم تر بالفاظ دیگر بدتر تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے ''وشواس'' میں کبر، رعونت اور عصبیت کی آگ بھری ہوتی ہے جو ہمیشہ انتقام کے لیے اکساتی رہتی

ہے۔ جب کوئی کام انتقامی جذبے سے کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے دل کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اور لہجہ بدل جاتا ہے۔ ایسے میں انسان گہری باتیں کرنے کے بجائے سطحیت پر اتر آتا ہے، عقل مفلوج ہونے لگتی ہے اور تحقیق کے گھوڑے صرف ایک دائرے کے گرد چکر لگانے لگتے ہیں۔ اس صورت میں انسان حق و ناحق کے امتیاز کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے جب کہ اس کے پاس اپنی پسندیدہ چیزوں میں عیب تلاش کرنے کے لیے بھی وافر دلائل موجود ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو منوانے کے لیے کسی بھی کتاب کے اقتباسات کو اس کے سیاق وسباق سے کاٹ کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔ بہرحال جین صاحب نے جو کچھ کیا یا ان سے جو کچھ کروایا گیا اس کا خمیازہ تو اب اُردو والوں کو بھگتنا ہی ہوگا لیکن ان اُردو ادیبوں، شاعروں اور نقادوں پر کیا بیت رہی ہوگی جو اُردو کو ہمیشہ مذہب (اسلام) سے الگ رکھنے کی کوشش مین خود بھی مذہب سے اس طرح الگ ہوگئے جیسے کسی مریض کے منہ سے تھرمامیٹر کھینچ لیا گیا ہو۔ بعض مثنویوں کے حوالے سے جین صاحب کا اعتراض بھی بے محل نہیں لگتا۔ اُردو کے نام نہاد مسلمانوں نے جس ''رنگ رنگ تہذیبی تعیش'' کو رواج دیا ہے اور ہمارے اکثر اُردو شعرا نے اسلامی نام رکھ کر جس طرح کے ''امور'' انجام دیئے ہیں، اب ان بے سروپا ادبی قصوں کو بھی جین صاحب اُردو کے حوالے سے اسلام کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں حتیٰ کہ وہ ان بزرگوں کو جارحیت کا پیکر تصور کرتے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں امن وآشتی کو فروغ دیا اور جن کی زندگی زہد وتقویٰ سے عبارت رہی ہے۔

کاش جین صاحب بہ ہوش وحواس تعصب کی عینک نکال کر، اُردو دشمنی کے پردے میں اسلامی تعلیمات کو نشانہ نہ بناتے اور اپنی تحقیقی منصوبہ بندی کے ساتھ اس کتاب کو لکھتے تو شاید اس کی اٹھان ہی جدا ہوتی اور علمی وتحقیقی اعتبار سے بھی اسے اہم مقام دیا جاتا اور ان کے ''اہنسا'' کا بھرم بھی قائم رہ جاتا۔

(بشکریہ: ''اُردو بک ریویو'' بھارت)

سیّد ارشاد حیدر

الہٰ آباد، بھارت

'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کا ختم کلام

'ہماری زبان' کے شمارہ ۲۲ تا ۲۸ جون ۲۰۰۶ء میں گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کا 'ختم کلام'، جین صاحب کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے: ''میری حالیہ کتاب 'ایک بھاشا...... ' پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بڑا مفصل تبصرہ کیا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ 'ختم کلام' کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ میری رائے میں اس کی اہمیت متنِ کتاب سے کم نہیں۔''

مندرجہ بالا سطریں پڑھ کر حیرت ہوئی۔ کیا کتاب کے عنوان، انتساب، ۳۲ صفحات کی تمہید اور پوری کتاب میں اسی تمہید کی تفصیل سے بھی اُردو کے بارے میں جین صاحب کا موقف ابھی واضح نہیں ہوا؟ عام طور سے مصنف اپنا موقف کتاب کے پیش لفظ میں بیان کر دیتا ہے۔ گیان چند صاحب نے تمہید میں ہی اپنا موقف واضح کر دیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے کتاب کے عنوان، انتساب، تمہید اور اس تمہید کی وضاحت (یعنی مکمل کتاب) کو نظر میں رکھ کر تبصرہ کیا ہے۔ یہ پہلا تبصرہ ہے جسے ہند و پاک کے متعدد اخبارات و رسائل نے 'سبق اُردو' یا 'کتاب نما' سے نقل کر کے شائع کیا ہے۔ غلطی کرنا، غلطی کرنے والے کا ساتھ دینا یا غلط بات کے خلاف احتجاج نہ کرنا ایک ہی جرم مانا جاتا ہے۔ لہٰذا تمام اخبارات و رسائل اس تبصرے کو گیان چند جین کے خلاف اپنے اپنے احتجاج کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔

مذکورہ کتاب کی اشاعت سے قبل ضرور لوگ غلط فہمی میں تھے کہ گیان چند صاحب اُردو کے محب، اُردو کے ادیب اور اُردو کے استاد ہیں، لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد اب دنیا کے کسی اُردو والے کو کسی طرح کی کوئی غلط فہمی نہیں ہوسکتی۔ ہاں خود گیان چند البتہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ 'ختم کلام' کی اشاعت سے اُردو کے بارے میں اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا موقف کچھ مختلف شکل میں نمودار ہوگا۔

جین صاحب یہ اقرار کرتے ہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی پوری کتاب پر مفصل تبصرہ کیا

ہے۔ یعنی اس تبصرے پر کوئی اعتراض نہیں جو 'لکھا گیا' اعتراض اس پر ہے جو 'نہیں لکھا گیا' تو شمس الرحمٰن فاروقی نے 'ختم کلام' کا ذکر کیا تو اس لیے نہیں کیا کہ سب کچھ پوری کتاب میں شامل تھا پھر جین صاحب پر احسان کیا کہ اس کا ذکر ہی نہیں کیا کیوں کہ 'ختم کلام' میں بھی جین صاحب کا موقف وہی ہے جو پوری کتاب میں ہے۔ 'ختم کلام' میں تین باتیں کہی گئی ہیں، میں تینوں باتوں کی وضاحت کر کے جین صاحب کی غلط فہمی دور کیے دیتا ہوں:

(۱)

''میرا کام اُردو ہندی کا موازنہ نہیں۔'' (ختم کلام، گیان چند)

اسے کہتے ہیں آنکھ میں دھول جھونکنا۔ جین صاحب کی کتاب کا نام ہے 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ (اُردو رسم الخط اور ناگری لپی)، دو ادب (اُردو ادب اور ہندی ادب)'۔ شاید اسی لیے جین صاحب نے اپنے نوٹ میں (جو 'ہماری زبان' میں 'ختم کلام' کے ساتھ شائع ہوا ہے) اپنی کتاب کا نام صرف 'ایک بھاشا.....' لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں پورا ایک باب 'ہندی اُردو تنازع اور فرقہ وارانہ سیاست' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ موازنہ کیا گیا ہے اور اس طرح کے جملے لکھے گئے ہیں: ''ہندی کا مزاج وسعت کا ہے اور اُردو کا مزاج تنگ نظری کا، ہندی اپنا دائرہ زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہتی ہے، اُردو اپنا دائرہ تنگ سے تنگ کرنا چاہتی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب موازنہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اور موازنے کے نام پر ہندی کو اُردو پر فوقیت دینے کی فرقہ وارانہ غیر علمی کوشش نہیں تو کیا ہے۔

(۲)

''یہ تسلیم کہ اُردو ملک میں، بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔'' (ختم کلام، گیان چند)

میں ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ طالب علم کی حیثیت سے میں پوچھوں گا کہ یہ حملہ آور کون تھے؟ ان کے نام کیا تھے؟ وہ کس صدی میں آئے تھے؟ گیارھویں صدی میں یا اس سے قبل، وہ کون مخصوص حملہ آور تھے جنھوں نے اُردو کو فروغ دیا۔ لسانیات کے طالب علم کی حیثیت سے میں پوچھوں گا کہ ان حملہ آوروں کی آمد سے قبل ہندوستان میں کون سی زبان بولی جاتی تھی؟ اور ان حملہ آوروں کی آمد کے بعد ہندوستان میں کون سی زبان یا زبانیں رائج ہوئیں۔ جین صاحب کے پاس ان سوالات کے جوابات نہیں ہیں۔ یہ ہے تاریخ، تنقید اور لسانیات کا حشر۔ ایسا نہیں ہے کہ جین صاحب کو کچھ معلوم نہیں۔ جین صاحب سنگھ پریوار کی طرح (جو تاریخی حقیقت پر کم اور 'آستھا' پر زیادہ یقین کرتا ہے)، یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حملہ آوروں کی آمد سے قبل ہندوستان میں کھڑی بولی پہلے سے ہی موجود تھی۔ ان کی 'آستھا' ہے کہ اُردو مسلمان حملہ آوروں کی 'پیداوار' ہے۔ کیا وہ نہیں

جانتے کہ عہد غالبؔ تک تو اس زبان کا نام اُردو رائج نہ تھا کیوں کہ غالبؔ نے اپنی اُردو غزلوں کو ہندی غزلیں کہا تھا۔ یہ 'اُردو' نام تو انگریزوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔

(۳)

کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق ناخواندہ
(غالبؔ)

''اس میں فارسیت بڑھ گئی ہے، اب کوئی ایسی زبان نظم کرنے کی ہمت نہیں کرے گا''۔ (ختم کلام، گیان چند)

بہت خوب! مرزا غالبؔ نے فارسی لفظ استعمال کر کے یا تو کوئی گالی دی یا پھر کوئی جرم کیا جواب کوئی 'ہمت' نہیں کرے گا۔ اُردو نے مختلف زبانوں کے الفاظ چن کر انگوٹھی میں نگینوں کی طرح جڑ لیے ہیں۔ اُردو تو اُردو، ہندی میں بھی فارسی کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ناگری لپی میں 'انگریزی دواخانہ' لکھا ہر جگہ دکھائی دے گا، 'انگریزی اوشدھالے' نہیں۔ کہاں ہیں جین صاحب، فارسی الفاظ جنھیں جین صاحب گالی یا کوئی جرم سمجھتے ہیں، اُردو ہندی دونوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندی میں فارسی الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور اُردو میں زیادہ۔ جس شخص نے جعفر طاہر، عبدالعزیز خالد، عرفان صدیقی، ظفر اقبال اور کرشن کمار طور وغیرہ کا کلام پڑھا ہوگا وہ غالبؔ کے منقولہ بالا شعر سے بہت زیادہ فارسی آمیز اشعار، ان کے کلام میں دیکھ چکا ہوگا۔ یہ سب لوگ ہمارے ہم عصر ہیں اور جین صاحب کے دعویٰ کے خلاف آج بھی ایسی زبان لکھنے کی 'ہمت' کر رہے ہیں۔

گیان چند کو اب کوئی ذی شعور اُردو والا معاف نہیں کرے گا۔ جین صاحب خود تو ڈوبے ہی، اپنے ساتھ کمال احمد صدیقی، پروفیسر محمد حسن اور کتاب کے ناشر مجتبیٰ خاں صاحب کو بھی لے ڈوبے۔ ایک نام اور بھی پردۂ زنگاری میں ہے، جس نے کتاب کے بیک کور پر اس کتاب کا قصیدہ لکھا ہے۔ آج نہیں تو کل اُردو والوں کو ان صاحب کا نام بھی معلوم ہو جائے گا، وہ بھی ڈوبے۔ کمال احمد صدیقی فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے جہاں جہاں حملہ کیا وہاں کی زبان اور رسم الخط کو انھوں نے تبدیل کر دیا تو تمل، تلگو وغیرہ زبانیں اور ان کے رسم الخط کس طرح زندہ ہیں؟ یہ کمال احمد صدیقی کے لیے سوال ہے۔ دیکھنا ہے ان کی تحقیق کب مکمل ہوتی ہے اور انھیں اس سوال کا جواب کب ملتا ہے۔

☆☆☆

ہندوستانی کیا ہے؟

''ہندوستانی'' کا لفظ آج کل بھڑوں کا چھتا بنا ہوا ہے۔ اب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اس چھتے کو چھیڑا ہے تو اسے ڈنک سہنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

زبان کے معنوں میں ہندوستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہل زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اُپج ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے، جو سترھویں صدی سے اس ملک میں آنے شروع ہوئے، اُس زبان کو جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی تھی، اندستان، اندستانی اور بعد ازاں ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اُس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔

عجیب بات یہ ہے کہ کالج کے انگریز اُستاد تو اس زبان کو جس میں میر امّن کی ''باغ و بہار''، شیر علی افسوؔس کی ''آرائش محفل''، حیدریؔ کا ''طوطی نامہ''، طپش کی ''بہار دانش'' وغیرہ لکھی گئیں، ہندوستانی کہتے ہیں لیکن ان کتابوں کے لکھنے والے اپنی کتابوں کی زبان کو اُردوئے معلّٰی، ریختہ یا ہندی کہتے ہیں مثلاً میر امّن نے اپنی کتاب ''باغ و بہار'' یا ''قصۂ چہار درویش'' کو ایک عرضی کے ساتھ پیش کیا، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اُردوئے معلّٰی کی زبان میں باغ و بہار بنایا''۔ اسی عرضی کے آخر میں یہ شعر ہے:

سو اُردو کی آراستہ کر زباں
کیا میں نے بنگالا ہندوستاں

اسی کتاب کے دیباچے میں زبان کی تاریخ بیان کرتے وقت لکھتے ہیں: ''حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سُنی۔''

میر شیر علی افسوؔس ''آرائش محفل'' میں لکھتے ہیں کہ ''اس کے تمام مطالب کو اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔'' مرزا طپش ''شمس البیان'' میں اپنی زبان کو روزمرۂ فصحائے اُردوئے معلّٰی کہتے ہیں اور اپنی بہار دانش ہندی میں اس زبان کو ایک ہی شعر کے ایک مصرع میں تو ہندی زبان اور دوسرے میں اُردو لکھا ہے:

شرف اس نے ہندی زبان کو دیا

دیا نظم اُردو کو یہ مرتبا

اور چند اشعار کے بعد اسے ریختہ کہتے ہیں:

دقایق میں ہے ریختے کے تمام

حیدر بخش حیدری ''قصہ حاتم طائی'' کی زبان کو زبان ریختہ کہتا ہے۔ میر امن ''گنج خوبی'' میں گلکرسٹ کو ''اُردو کا قدرداں'' لکھتا ہے۔ مہر چند کھتری لاہوری اپنی کتاب ''نو آئین ہندی'' میں لکھتا ہے کہ اس نے ''قصۂ آذر شاہ'' اور ''سمن رُخ'' کو فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اپنی تصانیف میں ہندوستانی اور اُردو دونوں لفظ اسی ایک زبان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گارسان دتاسی کا بھی یہی حال ہے لیکن وہ زیادہ تر ہندوستانی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ بابو شیو پرشاد نے بھی ''جام جہاں نما'' کی زبان کو اُردو بتایا ہے۔ کلکتہ بیپٹسٹ مشن نے جو انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپا تھا اس کے سرورق پر لکھا ہے ''یونانی زبان سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا گیا'' لیکن اس کے نیچے انگریزی زبان میں "In the Hindustani Language" لکھا ہے۔ بابو کاشی ناتھ بسواس کرانی اپنی کتاب ''قصۂ سوسن مسمّی بہ گلدستۂ انجمن'' کے سرورق پر لکھتے ہیں: ''انگریزی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا۔'' ڈاکٹر ای جے لارنس ''رابن سن کروسو'' کے ترجمے اور مسٹر جمیس کورکورن اپنی ''تاریخ چین'' اور ڈاکٹر فریڈرک جان اپنی ''اصول تشریح'' کی زبان کو اُردو ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح دہلی کالج، علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی، مرزاپور سیریز کی جتنی کتابیں چھپیں ان سب پر اُردو ہی کا لفظ لکھا ہے۔

غرض وہ تمام کتابیں جن کے نام میں نے لیے ہیں اسی زبان میں ہیں جسے ہم آج کل اُردو کہتے ہیں، انگریز اسے ہندوستانی کہتے تھے۔ ہندوستانی سے ان کی مراد وہ صاف اور فصیح زبان تھی جو بول چال میں آتی تھی۔ یعنی ایسی زبان جو مقفّیٰ، مسجع اور پُر تکلف نہ ہو جس کا رواج اس زمانے کی بعض کتابوں میں پایا جاتا تھا۔ اُردو، ریختہ، ہندی اس زمانے میں ہم معنی لفظ تھے۔ چنانچہ مرزا جان طپش نے اپنی کتاب ''شمس البیان'' میں ہندی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ''ہندی عبارت از زبان موزوں دہلی است''، یعنی ہندی سے مراد دلی کی فصیح زبان ہے۔ جدید ہندی جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے نئے زمانے کی پیداوار ہے۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جنم لیا۔ دراصل یہ اُردو کا بچہ ہے۔ وہ اس طرح کہ عربی فارسی کے لفظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت لفظ بٹھا دیے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارا ادب، ہندوستانی کے لفظ سے خالی ہے۔ اُردو کے کسی مستند اہل زبان اور غالباً ہندی کے اہل زبان نے بھی اس لفظ کو زبان کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کیا۔

جب اس زمانے میں ہندی اُردو کے جھگڑے نے زور پکڑا اور دونوں فریق ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے تو انڈین نیشنل کانگریس نے رفع شر کے خیال سے ہندوستانی کا لفظ اختیار کیا اور اسی کو ہندوستان کی عام زبان قرار دیا لیکن کانگریس نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی اور نہ یہ بتایا کہ اس سے کیا مطلب ہے۔ وہ شاید اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ آج کل سیاسی لوگوں نے جہاں اور چیزوں کو سیاست میں سان لیا ہے، غریب زبان بھی ان کی نظر کرم فرما کا شکار بن گئی ہے۔

اب سوچ بچار کے بعد ہندوستانی کے یہ معنی قرار پائے ہیں کہ وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ سے پاک ہے۔ اصل میں ہندوستانی کی یہ تعریف ڈاکٹر گریسن کے بیان سے لی گئی ہے اور اس تعریف کو اکثر ان لوگوں نے قبول کر لیا ہے جو ہندوستانی کے حامی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زبان ہے بھی؟ اگر اس سے مراد وہ زبان ہے جسے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے انگریز ہندوستانی کہتے تھے اور ہمارے اس وقت کے ادیب ریختہ، ہندی اور اُردو سے موسوم کرتے تھے تو بے شک یہ ایک زبان ہے اور اب بھی ہندوستان میں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے اور اگر اس سے مراد وہ زبان ہے جو آج کل بعض جدت پسند حضرات نے گھڑنی اور ڈھالنی شروع کی ہے تو وہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہے اور اگر اس سے مراد وہ زبان لی جائے جو دونوں ہندی اُردو بولنے والوں میں مقبول ہو تو وہ ابھی وجود میں نہیں آئی۔ بول چال کی زبان کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن جہاں ادب کی سرحد آتی ہے تو وہ رہ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے ہندی ہندوستانی کا لفظ ایجاد کیا تھا، چونکہ بے جوڑ تھا، مقبول نہ ہوا۔

نتیجہ یہ کہ آسان اُردو کا نام ہندوستانی ہوا۔ آپ فرمائیں گے کہ آسان ہندی کو ہندوستانی کیوں نہ کہیں؟ ضرور کہیے، کیونکہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں، جدید ہندی اُردو ہی کا تو بچہ ہے۔ رہی یہ بات کہ زبان سادہ اور آسان ہو، تو بول چال میں تو عموماً سادہ ہی ہوتی ہے۔ یا جب بچوں یا معمولی پڑھے لکھوں کے لیے کوئی کتاب یا قصے کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو بھی زبان سادہ رکھنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ ہماری عادت ہی پر موقوف نہیں دنیا کی سب زبانوں کا یہی حال ہے۔ مگر جب کوئی اچھی نظم لکھنی ہوتی ہے یا علمی یا ادبی بحث آپڑتی ہے تو سادہ زبان کا نبھانا مشکل ہو جاتا ہے محض زبان کا آسان ہونا کافی نہیں۔ اس میں جان، اثر اور لطف بھی ہونا چاہیے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدی ہو۔ دوسرے ہر ایک کا طرز تحریر الگ ہوتا ہے۔ کسی کا کوئی رنگ ہے اور کسی کا کوئی ڈھنگ۔ یہ ہر ایک کے مزاج اور افتاد طبع پر منحصر ہے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو۔

اگر مجبور کریں بھی تو ممکن نہیں، وہ نیا ڈھنگ تو کیا اختیار کرے گا اپنا بھی بھول جائے گا۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ جو آج کل چاروں طرف ''آسان آسان'' کا پرچار کیا جا رہا ہے مجھے تو کچھ بے جا سا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں، جہاں چاہا اٹھایا رکھ دیا۔ اس کے گنوں کے پرکھنے والے مشاق ادیب ہی ہو سکتے ہیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اُٹھا کر دیکھیے ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔ اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجیے ساری لطافت اور نزاکت خاک میں مل جائے گی علاوہ اس کے آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں۔ یعنی ایک چیز جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے، دوسرا اسے آسان سمجھتا ہے۔ جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ دوسرے کے نزدیک مشکل ہے۔ اس سے آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے۔ وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بھی بے محل آ گیا تو ایسا ہی بُرا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ، البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور الجھا ہوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہندی یا ہندوستانی میں سنسکرت لفظ ملانے کی اس لیے ضرورت ہے کہ اسے بنگال اور جنوبی ہند کے لوگ سمجھ سکیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ جب بنگال اور جنوبی ہند میں جائیں تو ایسی ہی سنسکرت ملی زبان میں بات چیت یا تقریر کریں اور جب صوبہ سرحد اور پنجاب میں جائیں تو فارسی عربی ملی زبان میں تو ایسی صورت میں ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان کہاں رہی جس کے لیے یہ سب جتن کیے جا رہے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اس سنسکرت ملی زبان ہی کی وجہ سے جنوبی ہند والے ہندی یا ہندوستانی کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کو یہ بدگمانی ہے کہ ہندی کے حیلے سے سنسکرت زبان پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہم ان کی زبان اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں۔

ہماری زبان اگر زندہ زبان ہے تو اس میں نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے، خواہ وہ کسی زبان کے ہوں اس سے کوئی زندہ زبان نہیں بچ سکتی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ مدت سے رائج چلے آ رہے ہیں انھیں خارج کر دیں اور ان کی جگہ ڈکشنریوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے ڈول، بے ڈھنگے اور کرخت لفظ داخل کر دیں جن کے ادا کرنے میں زبان کئی کئی قلابازیاں کھائے اور کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، خواہ کسی زبان کے ہوں وہ اب ہمارے ہیں، غیر نہیں۔ انھیں غیر سمجھ کر نکالنا سراسر حماقت ہے۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنی زبان کے دوست نہیں، دشمن ہیں۔

نئے لفظوں کے داخلے میں بھی زبان کی فطرت اور ذوق کو بڑا دخل ہے۔ اندھا دھند اور زبردستی لفظ داخل نہیں کیے جاسکتے۔ جو بندھ گیا سو موتی۔ جو کھپ گیا وہ ہمارا اور جو نہیں کھپا سو غیروں کا۔

بہار گورنمنٹ نے ایک ہندوستانی کمیٹی بنائی ہے اور ہندوستانی زبان کی گرائمر، لغت اور مدرسوں کے لیے ریڈریں لکھوانی تجویز کی ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کے لیے ریڈریں اس زبان میں لکھنا تو کچھ مشکل نہ ہوگا لیکن اونچے درجوں کے لیے جہاں زبان کی ادبی شان بھی رکھنا ضروری ہوتی ہے کتابیں لکھنے میں مشکل پڑے گی۔ اس سے زیادہ مشکل اصطلاحات کے بنانے میں ہوگی۔ اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر اس نے بیچ کا کوئی ایسا رستہ نکال لیا جو مقبول ہو سکے تو یہ اس کی بڑی جیت ہوگی۔ کم سے کم آپس کی بات چیت اور کاروبار کے لیے بہت کارآمد ہوگی۔

اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جس زبان میں مَیں نے آج تقریر کی ہے یہی ہندوستانی ہے۔

ہماری تنقید کے لیے دو جملے دیے گئے ہیں۔ ایک جملہ یہ ہے:

''فیڈرل لچس لیچر کے لیے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلے میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی، اس کے بارے میں سر ان ان سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی'' اس جملے میں اگرچہ فیڈرل لچس لیچر، لا ممبر اور اسمبلی کے لیے انگریزی لفظ استعمال کیے گئے ہیں لیکن جملے کا مطلب صاف سمجھ میں آتا ہے۔ روشنی ڈالنا انگریزی محاورہ کا ترجمہ ہے لیکن اب ''روشنی ڈالنا'' اور ''روشنی پڑنا'' اُردو میں استعمال ہونے لگے ہیں اور ان کا مفہوم کسی دوسرے لفظ سے اس خوبی سے ادا نہیں ہوتا۔ جس طرح پہلے فارسی محاوروں کے ترجمے ہماری زبان میں داخل ہو گئے تھے اب بعض انگریزی محاوروں کے ترجمے داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں بشرطیکہ زبان میں کھپ جائیں۔ اس سے زبان میں وسعت ہوتی ہے۔

دوسرا جملہ یہ ہے:

''سنیکت پرلتیہ دیوستھاپکا پریشد میں ایک پرشن کا اُتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ان اُدیوگ دھندوں کی سوچی دی جن کی اُنتی کے لیے سرکار نے سہائتا دینا سویکار کیا ہے۔''

اس جملے میں سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہے اور مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہماری زبان نہیں۔ یہ سراسر بناوٹی زبان ہے۔

☆☆☆

علامہ نیاز فتح پوری

اُردو۔ ہندی تنازعہ

ہمارے صوبہ متحدہ گورنمنٹ نے اُردو ہندی کی زبانوں کی خدمت کے لیے ایک اکیڈمی قائم کی ہے اور خزانۂ حکومت سے سالانہ معقول امداد اس کو ملتی ہے' اس کا نظام کیا ہے اور اکیڈمی کیا تدابیر خدمت زبان کے لیے اختیار کر رہی ہے' اس کی تفصیل یا اس پر تنقید کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں۔ فی الحال میں ایک اور مسئلہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جس کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اکیڈمی کے دستور اساسی و نظم عمل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک جریدہ ایسے لٹریچر کے ساتھ پیش کیا جائے جو ایک طرف حقیقی معنی میں اکیڈمی کی شہرت و وقار کو قائم رکھنے والا ہو اور دوسری طرف واقعی خدمت زبان اس سے مقصود ہو' چنانچہ اب قیام اکیڈمی کے تقریباً چار سال بعد یہ تحریک بروئے کار آ رہی ہے اور ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء وہاں سے شروع ہو رہا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ جاری ہو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعد اشاعت' حدود تنقید کو تنگ کرنے کے لیے قبل اشاعت ہی ان مشوروں کو پیش کر دیا جائے جو اپنی توقعات کے لحاظ سے ہم پیش کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں کہ جب سے اُردو ہندی کی تفریق و نزع شروع ہوئی ہے اس وقت سے ایک خاص جماعت ارباب فکر ایسی پیدا ہو گئی ہے جو ان دونوں میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنے کی مدعی ہے اور جہاں تک اُردو انشاء کا تعلق ہے وہ چاہتی ہے کہ اس کو اس قدر سہل و آسان بنا دیا جائے کہ غیر مسلم یا غیر عربی و فارسی داں حضرات بھی بغیر کسی تکلیف کے آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ تجویز یا نیت بظاہر نہایت خوشنما اور دل پذیر معلوم ہوتی ہے لیکن ایک نگاہ غائر اس تجویز میں چند در چند نقائص محسوس کر سکتی ہے۔ اچھا اب آیئے' عملی نقطۂ نظر سے اس خیال کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ نتیجہ کس صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اگر اُردو انشاء کو سہل بنایا جائے' یعنی عربی' فارسی الفاظ ترک کر کے عوام کے لیے نہایت ہی آسان زبان استعمال کی جائے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ اُردو میں جو کچھ لکھا جائے اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھا جائے جسے عوام کی ذہنیت کہتے ہیں۔ یعنی اُردو میں سوائے معمولی قصے کہانیاں' داستانوں' افسانوں اور

بعض ابتدائی علوم کے مبادیات کے کسی اور سنجیدہ و دقیق صحبت پر گفتگو نہ کی جائے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اُردو بولنے اور لکھنے والی جماعت کو (جس میں عنصر غالب مسلمانوں کا سمجھا جاتا ہے) مطلقاً تربیت ذہن و دماغ کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو ہمیشہ سطحیات میں مبتلا رکھنا چاہیے تاکہ وہ بدستور جاہل بنے رہیں اور ان میں دقیق مسائل پر سوچنے اور خود اپنے اندر ذہن خلاق پیدا کرنے کی اہلیت نہ پائی جائے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ میں اس نتیجہ پر کیونکر پہنچا لیکن ادنیٰ تامل سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خیال کی بلندی و دقت از خود زبان کو بلند و دقیق بنا دیتی ہے۔ اگر ہم زندگی کے نہایت معمولی روز کے واقعات بیان کریں تو آسان زبان کافی ہو سکتی ہے لیکن اگر ہم علم الحیات، نفسیات وغیرہ دیگر علوم دقیقہ سے بحث کریں گے یا خود انشاء کے اندر نازک خیالی اور بلندیٔ تخیل سے کام لے کر زبان کو معانی جدیدہ اور نکات نادرہ سے آشنا کرنا چاہیں گے تو زبان خود دشوار ہو جائے گی اور ہم مجبور ہوں گے کہ عربی فارسی کے الفاظ اور ان کے ترکیبی فقروں سے کام لیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ہر موضوع کے لیے مخصوص زبان ہوا کرتی ہے، جو زبان ہم ایک افسانہ میں استعمال کرتے ہیں کیا نفسیات کے کسی مضمون کے لیے مناسب ہو سکتی ہے، کیا جس زبان میں ہم مذہبی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، وہ ایک سیاسی خطیب کے لیے موزوں ہے۔ الغرض اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معانی و مطالب کے اشکال کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی اشکال بڑھتا ہے اور اس پہ مشورہ دینا کہ اُردو کو نہایت سہل اور حد درجہ عوام پسند بنا دیا جائے۔ یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کو علمی بلند زبان بنانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

اس نوع کا مشورہ دینے والے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مسلمانوں کا ہے، جو فارسی عربی سے لگاؤ نہیں رکھتا اور جس نے اپنے گہوارہ ہی میں انگریزی ماحول کو دیکھا۔ دوسرا گروہ ہندوؤں کا ہے جو اُردو زبان میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کیا معنے؟ یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اُردو رسم الخط قائم رہے۔ اگر ہندوؤں کی یہ ذہنیت صرف اس بناء پر ہوتی ہے کہ ان کو عربی فارسی سے قدرتاً کوئی لگاؤ نہیں ہے تو وہ زیادہ قابل الزام نہ تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اس تحریک میں سیاسی غرض پنہاں ہے اور وہ ہندی کو ترقی دینے کے لیے جنگ کے ان تمام اصولوں سے کام لے رہے ہیں جو حصول مدعا کے لیے کسی نہ کسی نہج سے مفید ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ دس سال کے اندر ہندی لٹریچر نے جو صورت اختیار کی ہے وہ ایک ایسی قوی شہادت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو جماعت کے سامنے اُردو زبان کو سہل بنانے کی کوشش میں دونوں جماعتوں کا اتحاد خیال و زبان مقصود ہوتا، تو چاہیے تھا کہ وہ ہندی میں

بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے یعنی جس طرح وہ اُردو کو عربی فارسی کے الفاظ سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں اسی طرح وہ ہندی کو بھی سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے نا آشنا رکھتے لیکن کس قدر حیرت ہے کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنی زبان کی خصوصیات کو ترک کر کے اس کو ہندوستانی زبان بناؤ لیکن دوسری طرف جس وقت ہندی زبان کا مسئلہ ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کوئی دقیقہ اس کو دشوار بنانے کی کوشش میں نہیں اٹھا رکھتے اور اس کو ہندوستانی زبان بنانے کے بجائے دیو بانی بنانے میں انھیں مطلقاً کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اوّل اوّل جس وقت اُردو ہندی کی نزاع شروع ہوئی دنیا کو بتایا گیا کہ یہ صرف رسم الخط کی تبدیلی ہے اور انشا کے لحاظ سے ہندی میں اُردو سے کوئی فرق نہیں ہے لیکن بعد کو رفتہ رفتہ حجاب اٹھتا گیا اور یہ حقیقت آخرکار ظاہر ہو کر رہی کہ جس چیز کو صرف رسم الخط کا امتیاز کہا جاتا تھا اس میں نیتوں کا کھوٹ شامل تھا اور وہ امتیاز حقیقتاً مذاہب کا اختلاف تھا' تمدن و معاشرت کا اختلاف تھا اور اس عصبیت کا اختلاف تھا جو ایک مسلمان کے دل سے محو ہو سکتی ہے لیکن ایک ہندو جو مسلمان کو ہندوستان کا غیر مستحق باشندہ سمجھتا ہے کبھی اس سے منفک نظر نہیں آ سکتا۔

پھر آج ہندی کے رسالوں کو اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اُردو کو سہل بنانے کا درس دینے والے خود ہندی زبان کو مسلمانوں کے لیے کس درجہ ناقابل فہم بناتے جاتے ہیں اور اُردو کے وہ معمولی الفاظ جو حقیقتاً سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت رکھتے ہیں کس طرح ترک کیے جا رہے ہیں۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے؟ کیا صداقت اسی طرز عمل کی متقاضی ہے اور دونوں قوموں کو متحد دیکھنے کی آرزو اسی طریق کار سے پوری ہو سکتی ہے۔

مجھ سے زیادہ دونوں قوموں کے اتحاد کا شاید ہی کوئی حامی ہو لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کے لیے دونوں قوموں کو اپنی زبان کی خصوصیات بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ البتہ بجائے اس کے اگر اس امر کی تبلیغ کی جائے کہ دونوں جماعتیں دونوں زبانوں کا اتنا علم حاصل کریں کہ وہ ایک دوسرے کے علوم سے مستفید ہو سکیں تو بے شک میں اس کو ایک نتیجہ خیز بات کہہ سکتا ہوں۔ اس کے کوئی معنی نہیں کہ ہندو جماعت اُردو کو تو تہی مایہ بنانے کی کوششیں کرتی رہے اور ہندی کے باب میں وہ اصول کو ترک کر کے اختلاف زبان کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کرتی جائے۔

ہندو جماعت میں اوّل تو اُردو کے انشا پرداز بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ افسانہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے، لیکن گزشتہ دس بارہ سال کے اندر انھوں نے جس قدر تغیر اپنی اُردو میں پیدا کر لیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پریم چند اُردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں لیکن اب سے چند سال قبل کے افسانے ان کے دیکھیے اور پھر ان سے

مقابلہ کیجیے۔ ان کے موجودہ افسانوں کا تو معلوم ہوگا کہ زبان وخیال دونوں حیثیتوں سے ایک تغیر عظیم ان میں پایا جاتا ہے اور وہ ذہنیت جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ نولکشور پریس کی طرف سے جو اُردو کی ریڈرس تیار کی گئی ہیں ان کو ملاحظہ کیجیے کہ مسٹر پریم چند نے کس بے دردی کے ساتھ اُردو کو ذبح کیا ہے اور خیال وزبان دونوں اعتبار سے اس میں کس قدر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اوّل اوّل جب یہ ریڈیں لکھی گئیں تو ان کی زبان کافی سادہ تھی۔ لیکن تھی اُردو۔ مگر جب جناب پریم چند کے سامنے حک واصلاح کے لیے آئیں تو انھوں نے کوئی دقیقہ ان کی زبان کو مسخ کرنے کا اٹھا نہ رکھا۔ یقیناً پریم چند صاحب اُردو میں افسانہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں لیکن ان کو اُردو زبان کا ماہر یا صاحب نظر مصنف تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً نہیں سمجھ سکتے کہ اُردو کی خصوصیات کیا ہیں۔ عربی فارسی ترکیبوں پر اس کی معنوی خوبی کا کس قدر انحصار ہے۔ اگر وہ عربی فارسی کے جاننے والے ہوتے، اگر وہ بجائے افسانوں کے علمی یا تنقیدی مضامین بھی لکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ اُردو کو کسی طرح عربی فارسی سے بے نیاز نہیں بنایا جاسکتا جس طرح وہ خود اپنے ہندی مضامین کو سنسکرت کی ترکیبوں سے خالی نہیں کر سکتے۔ یہ میں نے اس لیے ظاہر کیا کہ اگر کوئی شخص جواب میں پریم چند صاحب کی انشا کو پیش کرے تو پہلے سے ہی اس کو میرا جواب رفع دخل معلوم ہو جائے۔

اس قدر تمہید و تفصیل کے بعد میں اب ہندوستانی اکیڈمی، اس کے ممبران اور رسالہ کے ایڈیٹر ان سے خطاب کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکیڈمی کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ اُردو کا جاری ہونے والا ہے وہ کس ذہنیت کے ماتحت شائع ہوگا اور ملک وقوم کو اس کی طرف سے کیا توقعات قائم کرنی چاہئیں۔

چونکہ خود مجھے بھی اکیڈمی کے ممبر ہونے کی عزت حاصل ہو چکی ہے اور میں اس ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں جو زبان کے متعلق وہاں کی فضا میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ زیر تجویز رسالہ کہیں غلط اصول پر نہ جاری کیا جائے اور مبادا وہ بھی سیاسی اغراض کا شکار ہو جائے۔ اس اندیشہ کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو دیا نرائن نگم سے بواسطہ جناب مشیر احمد علوی مجھ تک پہنچی ہے کہ اس رسالے کا نام صرف ہندوستانی ہوگا اور اس پر بجائے سہ ماہی کے تہ ماہی رسالہ درج کیا جائے گا (معلوم نہیں میں نے تہ ماہی لکھنے میں صحیح رسم الخط استعمال کیا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ اس کو تماہی لکھیں) مجھے روایت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ تجویز پروفیسر صدیقی صاحب کی ہے۔ میں پروفیسر صدیقی سے واقف نہیں اور غالباً میری طرح کوئی بھی ان کی خدمت زبان کے کارناموں سے آگاہ نہیں ہے لیکن پروفیسر صدیقی کی طرف سے اس تجویز کا پیش ہونا (محض اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں) قوم کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں ہوسکتی جبکہ معلوم ہے کہ وہ

اپنے مصالح مقامی کے لحاظ سے کبھی اس کی جرأت نہ کر سکتے تھے کہ ارباب اکیڈمی کے ہندو عنصر کے خلاف مزاج کوئی تجویز پیش کر سکیں۔ مسلمان لاکھ بیوقوف سہی لیکن زمانے نے ان کو اتنا باخبر ضرور کر دیا ہے کہ وہ اس نوع کی تحریک و تجویز کی اہمیت اور اس کی شاطرانہ چال کو سمجھ سکیں۔

حکومت کی طرف سے اکیڈمی کو جو امداد ملتی ہے وہ صرف ترقی زبان کے لیے ملتی ہے اور اس مقصد کے تحت میں کوئی اور غرض شامل نہیں ہے۔ پھر اصولاً صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ اُردو کی ترقی کیونکر ممکن ہے۔ اگر سہ ماہی کو تماہی کرنا علامت ترقی میں شامل ہے صرف اس وجہ سے کہ اس طرح فارسی لفظ سہ محو ہوتا ہے تو ہندی رسالہ میں بجائے کسی اور سنسکرت ترکیب کے سہ ماہی لکھنا چاہیے تا کہ وہاں سے سنسکرت عنصر کم کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندی رسالہ میں تو وہ تمام اخلاق روا رکھے جائیں جن کو یقیناً اکثر ہندو حضرات بھی نہیں پسند کر سکتے لیکن اُردو سے ان معمولی عربی فارسی کی ترکیبوں کو بھی نکال دیا جائے جو ہندو زبانوں پر بھی عرصہ سے رائج چلی آتی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ وطن کے بجائے اُردو میں جنم بھوم کیوں لکھا جائے۔ زیور کی جگہ بھوشن کیوں رائج کیا جائے۔ موسم' وقت کے بجائے سمے کا کیوں استعمال ہو۔ لیکن کی جگہ پرنتو کیوں لکھا جائے۔ کیا کوئی ہندو ایسا ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ وطن' زیور' موسم اور لیکن کا مفہوم نہیں جانتا اور روز کی زندگی میں بجائے ان الفاظ کے جنم بھوم' بھوشن' سمے اور پرنتو کا استعمال کرتا ہو' پھر جب مقصود یہ ہے کہ زبان کو کثیر الفہم بنایا جائے تو وہ الفاظ جاریہ کو قائم رکھنے سے حاصل ہوتا ہے یا ان میں غیر مانوس تبدیلی کرنے سے؟ میں پوچھتا ہوں کہ سہ ماہی میں کیا خرابی یا اشکال ہے جو اس کو تماہی بنایا جا رہا ہے اور اس سے مدعا کیا ہے؟

بہر حال میں ارباب اکیڈمی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُردو رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ارباب نظم ونسق میں سے تماہی ذہنیت رکھنے والے عناصر کو بالکل علیحدہ کر دیں کیونکہ یہ لوگ یقیناً اُردو کے بہی خواہ نہیں ہیں اور اس کو ان ہی خصوصیات کے ساتھ جاری کریں جو اس کو عام سطح سے بلند کرنے والی ہیں۔ یقیناً اس میں عام سطحی افسانوں کے علاوہ علمی و تنقیدی مضامین بھی درج کیے جائیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ ان مضامین کی جو زبان ہوگی وہ کسی طرح تماہی کی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی اور اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا ضرورتاً و مجبوراً استعمال یقیناً ہوگا۔ پھر جب اس کوشش کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا تو میں حیران ہوں کہ صرف سہ ماہی کو تماہی کر دینے سے جذبۂ اصلاح کیونکر پورا ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر وہ اکیڈمی کے رسالہ کو صرف بچوں کا کھیل اور ادنیٰ درجہ کے معمولی و سطحی مضامین کا مجموعہ بنانا چاہتے ہیں تو اس سے کوئی واسطہ نہیں خواہ اس کا نام

تماہی رکھیں یا ٹری ماسی پتر کا' البتہ اس وقت یہ مطالبہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ حکومتی امداد کا مصرف صحیح بھی ہے اور کیا جو رقم اُردو زبان کی ترقی کے لیے دی جا رہی ہے اس کو اس طرح فی الحقیقت ہندی زبان کی استواری میں صرف نہیں کیا جاتا۔

جو کچھ میں نے عرض کیا وہ بالکل خلوص نیت لیکن پوری آزادی رائے کے ساتھ ظاہر کیا ہے لیکن اگر اس کو عصبیت کے رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے، تو میں باوجود اپنی اس تمام جرأت رائے کے جو مذاہب و مسالک اور ملل واقوام کے باب میں ہر شخص پر ظاہر ہے اس کو عصبیت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا اور کبھی گوارا نہ کروں گا کہ اُردو زبان کو سیاسی اغراض کا نشانہ بنایا جائے اور اس کو ترقی دینے کی بجائے مسمار و منہدم کیا جائے۔ اُردو کی خدمت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ زبان:

سادگی پر جس کے مٹ جانے کی حسرت دل میں ہے

بعض ناحق کوش اور رمز شناس حضرات کی دوستی کس خطرہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو اکیڈمی کے وجود اور اس کی برکات سے بھی بحث کی جائے گی۔ ہر چند ہم اس وعدہ کی تکمیل کے لیے ابھی تیار نہیں لیکن چونکہ اکیڈمی کی گزشتہ سہ سالہ یا تسالہ رپورٹ (انگریزی میں) شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہنچ گئی ہے' اس لیے ضمناً وایجازاً ایک سرسری نگاہ اس پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔ یہ رپورٹ اوسط تقطیع کے ۱۳۱ صفحات پر شائع ہوئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف الحال شخص اس کو دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے وہ وہی ہے جو اکیڈمی کے ارباب نظم ونسق دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں لیکن ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنے والے کو زیادہ مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اس کی ترتیب کو ''خلوستان زار'' کے لیے بھی محل تنقید ونظر ہوس سے محفوظ رکھ سکتا۔

اس رپورٹ کا تقریباً نصف حصہ تو اس بیان پر مشتمل ہے کہ اکیڈمی کا وجود کیونکر عمل میں آیا' صوبہ کی حکومت نے کس قدر دلچسپی کا اظہار کیا' کون کون ممبر نامزد ہوئے' لائحہ عمل کیا مرتب کیا گیا' کتنے جلسے ہوئے' ان میں کیسی کیسی شاندار اور وزنی تجویزیں پیش ہوئیں' وغیرہ وغیرہ اور ظاہر ہے کہ جہاں تک الفاظ وترتیب الفاظ کا تعلق ہے یا جس حد تک اغراض و مقاصد کا بیان ہو سکتا ہے اس حصہ میں ایک جگہ بھی حذف واضافہ یا ترمیم واصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے بعد کا حصہ جس میں واقعات وعمل' اعداد وشمار کا بین ہے ہم کو بعض بعض مقامات میں کچھ ایسے خلاء ضرور نظر آتے ہیں جہاں نگاہ پہنچ کر خود بخود رک جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تفصیل سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔ میں اس وقت رپورٹ کے اس حصہ سے بحث نہیں

کرنا چاہتا جس کا تعلق تجربہ ماضی سے ہے اور نہ ان بعض کمیٹیوں کے اندرونی تار و پود کا ذکر کروں گا جنھوں نے بعض بالکل غیر مستحق کتابوں کو انعام دینے کے لیے حد درجہ چابکدستی سے کام لیا بلکہ صرف یہ دیکھوں گا کہ آئندہ جو کچھ وہاں ہونے والا ہے اس سے اُردو زبان یا اُردو اہل قلم حضرات کو کس قدر فائدہ پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے۔

اکیڈمی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے میرا تین سال کا گزشتہ تجربہ بتاتا ہے کہ محض پانسو روپیہ انعام کی توقع پر کوئی اچھی کتاب جو اکیڈمی کے شایان شان ہو نہ کبھی مرتب کی جا سکتی ہے اور نہ حصول انعام کے لیے پیش ہو سکتی ہے۔ اس کا سبب خواہ زر انعام کی کمی ہو یا کچھ اور۔ بہر حال یہ ایک واقعہ ہے جس سے غالباً اکیڈمی کے دیگر ممبران اور صدر و سیکرٹری کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ہندی کے شعبہ میں یہ شکایت محسوس نہ کی جاتی ہو لیکن شعبۂ اُردو کا تو یہ ایک تجربہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کامیابی کی صورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو صرف اکیڈمی خود ایک شعبہ تصنیف و تراجم قائم کرے یا ایسے لوگوں سے جو حقیقی معنے میں اس کے اہل ہیں معقول معاوضہ دے کر منتخب کتابیں ترجمہ کرائے یا خاص خاص موضوع کی تصانیف حاصل کرے۔

رپورٹ زیر بحث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے اور ترجمہ و تالیف کے لیے بعض حضرات کا انتخاب بھی عمل میں آیا ہے لیکن کس حسن تدبیر کے ساتھ، کس اصول تقسیم کی بنا پر اور کس لطف و مصلحت کوشی کو لیے ہوئے؟

سب سے پہلے مجھے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ ترجمہ کے لیے صرف انگریزی زبان کی کتابوں اور ان میں جان گالزوردی کے ڈراموں کو کیوں پسند کیا گیا۔ کیا اُردو یا ہندی کی ترقی کی بنیاد صرف ڈراموں ہی سے استوار ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف انگریزی کے عہد حاضر کے ڈراموں سے۔ اگر غیر زبانوں کی ادبیات ہی سے اُردو یا ہندی کی نجات ممکن ہے اور وہ ادبیات سنسکرت و عربی میں نہیں پائے جاتے یا جو کچھ ان سے لینا تھا وہ لیا جا چکا ہے تو میں دریافت کروں گا کہ فرانسیسی زبان کے تمثیل نگاروں میں سے کیورے (Curel)، برنسٹائل (Bernstein) اور ٹرسٹا برنارڈ (Trista Bernard) کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اطالوی ڈرامہ نویسوں میں سے ڈانشنزیو کی طرف کیوں توجہ مائل نہ ہوئی، کیا لطافت خیال اور نزاکت بیان کے لحاظ سے کوئی دوسری نظیر ایسی پیش کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر آپ دور حاضر کے کچھ زمانہ قبل چلے جائیں تو کیا روسی لٹریچر میں سے پوشکن (Pushkin) کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا یا اس کے بعد دوستوفسکی (Dostovsky) تورگنیف (Turgeniev)، طالسطائی (Tolstoly) چیکف (Chekov) اور گورکی (Gorky) کو نظر انداز کر سکتے ہیں،

جنھوں نے واقعہ نگاری کی دنیا میں ایک الہامی انقلاب پیدا کر دیا اور جن کے مقابل مغربی ممالک میں کوئی ملک لٹریچر میں واقعیت (Realism) پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بہر حال میں اصولاً اس کا مخالف ہوں کہ اُردو یا ہندی میں سب سے پہلے غیر زبانوں کے ادبیات منتقل ہونے چاہئیں کیونکہ کم از کم اُردو کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبیات میں وہ اس قدر فروتر نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے۔ اگر کوئی کمی بھی ہے تو چنداں قابل لحاظ نہیں کیونکہ اس وقت ضرورت اس کو علمی زبان بنانے کی ہے اور جو روپیہ ڈراموں' ناولوں اور افسانوں کے ترجمہ میں بے کار صرف کیا جاتا ہے، اسے زیادہ کام کی باتوں میں صرف ہونا چاہیے۔

اس رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جان گالزوردی کے چار منتخب ڈراموں میں تین ڈرامے اُردو ترجمہ کے لیے منشی دیا نرائن نگم کے سپرد کیے گئے ہیں اور ایک جگت موہن لال صاحب رواں کو مرحمت ہوا ہے۔ اگر مترجموں کا یہ انتخاب صرف اس لیے نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہیں تو ہم حیران ہیں کہ ان دونوں حضرات میں وہ کون سی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستان کی آٹھ کروڑ مسلمان آبادی میں سے کسی میں نظر نہیں آتیں۔ اگر کسی اُردو رسالہ کا اتنی مدت تک نکالتے رہنا کہ اس کا جوبلی نمبر شائع ہو سکے' کافی اہلیت جان گالزوردی کے ساتھ اُردو میں انصاف کرنے کا قرار دیا جا سکتا ہے تو مسٹر دیا نرائن نگم اور جگت موہن لال رواں سے باندازہ دو جوبلی و بہ مقیاس چار واوین زیادہ مستحق حضرات مسلمانوں میں بھی نکل سکتے تھے۔ اگر ادنیٰ سعی و کاوش سے کام لیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اُردو کی خدمت کے لیے کوئی ایک شخص بھی اکیڈمی کے ارباب نظم و نسق کو مسلمانوں میں ایسا نظر نہ آیا جو جان گالزوردی کے ترجمہ کرنے کا اہل ہوتا۔ معلوم نہیں اس مسئلہ میں ہم کو اپنے یہاں افراد قابل کے فقدان پر ماتم کرنا چاہیے یا اس ذہنیت کی داد دینا چاہیے جو آنکھوں میں خاک جھونکنے کی حد تک بھی اپنی عصبیت کی سکوں بخشی کی تدابیر سے کبھی شرم نہیں کرتی۔

یقیناً دیا نرائن نگم ایک اُردو رسالہ کے ایڈیٹر ہیں اور اگر زمانہ کے گزشتہ چند سال کے لٹریچر کو نظر انداز کر دیا جائے جو فی المعنی ہندو معاشرت و تاریخ' ہندو تہذیب و سیاست ہی کی تبلیغ و خدمت میں شمار کیا جائے گا تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ایک حد تک اُردو کی کچھ خدمت بھی انجام دی ہے۔ اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ منشی جگت موہن لال رواں کا مجموعہ نظم بہت پاکیزہ چیز ہے لیکن ان حضرات کی ان خدمات کا اعتراف اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اکیڈمی رسالہ زمانہ کی مستقل امداد کر دیتی یا رواں صاحب کو ان کے دیوان پر اسی طرح انعام دے دیتی جس طرح صفی کی مثنوی اور عروج کے مرثیہ کو دیا گیا ہے۔ لیکن یہ کیا ضروری تھا کہ

ڈراموں کا ترجمہ ان کے سپرد کر کے غریب گالسوردی اور اُردو، دونوں کو کشمکش میں مبتلا کیا جاتا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اُردو زبان میں مہارت تامہ یا بصیرت کاملہ ہندوؤں میں کسی طرح پیدا ہو ہی نہیں سکتی جس طرح ایک مسلمان ہندی زبان میں کبھی اس کے ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُردو زبان پر اسی شخص کو پورا عبور حاصل ہو سکتا ہے جو عربی فارسی کا ''قدر ضرورت'' سے زیادہ مطالعہ کر چکا ہو جس طرح ہندی کے صاحب نظر ہونے کے لیے سنسکرت یا ہندی بھاشا کا علم ضروری ہے۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم رہی ہندوؤں کو یا تو مجبوراً یا اس ذوق کے لحاظ سے جو عام طور پر اس وقت پیدا ہو گیا تھا فارسی تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی کیونکہ دربار دفتر کی وہی زبان تھی لیکن جس زمانہ میں اُردو کا رواج ہوا وہ دور حکومت برطانیہ کے آغاز کا تھا۔ جب اُردو سے زیادہ انگریزی جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو، جنھوں نے فارسی و عربی کا مطالعہ بقدر ضرورت محض مجبوری کی بناء پر کیا تھا اب انگریزی کی طرف متوجہ ہو گئے اور کچھ عرصہ فارسی عربی کا تھوڑا بہت ذوق جوان میں چلا آ رہا تھا رفتہ رفتہ فنا ہو گیا، اس میں شک نہیں کہ اس مجبوری میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا پڑا اور ان کو بھی انگریزی کی طرف مائل ہونا ضروری ہو گیا۔ لیکن وہ عربی فارسی سے نابلد نہ رہ سکتے تھے۔ کیونکہ ان کا مذہبی، تاریخی، قومی، معاشرتی، اخلاقی وادبی لٹریچر سب ان ہی زبانوں میں تھا اور سب سے پہلے حروف شناسی کے بعد ہی جو کتابیں ان کے سامنے رکھی جاتی تھیں وہ عربی فارسی کی ہوتی تھیں بلکہ اس وقت تک اکثر خاندانوں میں یہی رواج چلا آتا ہے۔

اس لیے وہ شخص جس نے اُردو زبان کا کچھ بھی غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے جاننے کا مدعی وہی ہو سکتا ہے وہ نہ صرف عربی فارسی کا جاننے والا ہو بلکہ اس کے اندر صحیح ذوق ان زبانوں کا پایا جاتا ہو اور لغوی واصطلاحی دونوں حیثیت سے فرق کو سمجھ سکتا ہو جو بہ ادنیٰ تغیر اعراب ولہجہ ایک لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتا مثلاً اسی لفظ تماہی کو لے لیجیے جو اصطلاح اُردو کے سلسلہ میں اکیڈمی کی سب سے پہلی اپج ہے۔ ان لوگوں نے سہ ماہی میں سے لفظ ''سہ'' کا ترجمہ بلا اختصار ''ت'' یا ''تے'' تو کر دیا لیکن غریب یہ نہ سمجھ سکے کہ اُردو زبان میں سہ ماہی اور تماہی دونوں کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیے۔ اُردو میں چھ ماہی کا استعمال ہوتا ہے لیکن صرف ان مراسم کے لیے جو کسی شخص کے مرنے کے بعد چھٹے مہینے ادا کیے جاتے ہیں، کبھی یہ لفظ اس مفہوم سے ہٹ کر استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ غالب کا شعر ہے:

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی کی
میری چھ ماہی سال میں دوبار

اس لیے اگر تماہی کا استعمال ہو سکتا ہے (حالانکہ اس وقت تک کہیں نہیں دیکھا گیا) تو اسی قسم کے مفہوم میں جو چھ ماہی کا ہے اور قیاس کی بنا پر وہی مفہوم اس کا متعین ہو سکتا ہے۔ پس اسی سے اندازہ کیجیے کہ محض ذرا سی ناواقفیت زبان کی وجہ سے ''اکیڈمی کے تماہی رسالہ'' کا مفہوم کس قدر مضحک، مہمل (اور شاید ''شگون بد'' بھی) ہو کر رہ گیا۔

یہی سبب ہے کہ آج ہندوؤں میں بہتر سے بہتر اُردو نظم ونثر لکھنے والا ایسا نہیں ہے جس کی تحریروں میں زبان، محاورہ ولغت کی غلطیاں نہ پائی جائیں۔ چہ جائیکہ منشی دیا نرائن نگم، جگت موہن لال صاحب کہ ان بیچاروں نے تو کبھی اپنی زبان دانی یا قدرت انشاء کا دعویٰ بھی نہیں کیا، اور نہ حقیقتاً ان کی زندگی کا کوئی ایسا ادبی کارنامہ موجود ہے جو انھیں کسی تاویل بعید ہی کے بعد کسی اُردو ترجمہ یا تالیف کا مستحق قرار دے۔ مجھے انتخاب کرنے والی کمیٹی کی جسارت پر اتنی حیرت نہیں ہے جس قدر خود ان حضرات کے ''تسلیم ورضا'' پر۔ اگر ان کا نام بغیر ان کی خواہش وتمنا کے اس خدمت کے لیے تجویز کیا گیا تھا تو خود ان کو اپنی اہلیت دیکھ کر اس سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ کیونکہ اُردو سے عدم واقفیت کسی نا قابلیت کا اظہار تو ہے نہیں کہ اس کو گوارا نہ کیا جا سکے اور اگر ہو تو بھی کیا ایسی نا قابلیت باعث فخر نہیں جس میں لارڈ ارون، وزیر ہند بلکہ خود ملک معظم برابر کے شریک ہیں۔
رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ جان گالزوردی کے ڈراما "Skingame" کا اُردو ترجمہ جو منشی جگت موہن لال صاحب نے کیا ہے شائع ہو گیا ہے لیکن اس وقت تک غالباً تبصرے کے لیے کہیں نہیں بھیجا گیا۔ اگر کسی وقت مل گیا تو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکوں گا۔ رپورٹ زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیڈمی نے حسب ذیل علوم وفنون کی تصانیف کا بھی اہتمام کیا ہے:

۱۔ فلکیات (Astronomy)

۲۔ جغرافیہ طبیعی (Physical Geography)

۳۔ ارتقا (Evolution)

۴۔ برقیات (Electricity)

۵۔ اجتماعیات (Sociology)

۶۔ انکشافات علمیہ (Modern Scientific Discoveries)

۷۔ فلاحت البناتین (Horticulture)

۸۔ حیات اجتماعیہ حیوانیہ (Social Life in Animals)

۹۔ ماکولات (Food)

۱۰۔ اجمالیات حکمیہ

۱۱۔ فلاحت (Agriculture)

ان گیارہ علوم میں سے صرف چار (نمبر ۵، ۶، ۸، ۱۱) پر چار کتابیں اُردو کی تجویز ہوئی ہیں اور سات ہندی کے لیے، اس تقسیم وعدم توازن کے لیے اگر کوئی سبب موجود تھا تو اس کو ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ کیا جن علوم پر اُردو کتابیں تصنیف نہیں کرائی جارہی ہیں وہ اُردو میں پہلے سے موجود ہیں اور کیا جن علوم پر ہندی کی تصانیف پیش نظر ہیں وہ ہندی میں پہلے نہیں پائے جاتے تھے؟

اسی کے ساتھ مصنفین کے نام کو چھپایا گیا ہے۔ حالانکہ ضرورت اظہار کی تھی تاکہ ان کی اہلیت کے لحاظ سے ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا۔ اگر یہ اخفا اتفاقی فروگزاشت نہیں ہے تو اُردو کے ارباب علم و فضل کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ان میں سے کسی کو ان علوم پر کوئی تصنیف مرتب کرنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔

علاوہ متذکرہ بالا علوم وفنون کے اور مباحث پر بھی اکیڈمی کے ممبران نے تصانیف مہیا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور ان کے لیے جو فہرست مصنفین و مؤلفین کی مرتب ہوئی ہے وہ بھی اکیڈمی کا راز ہے جس کا اظہار رپورٹ میں نہیں کیا گیا، حالانکہ اس کا اظہار کم از کم اس خیال سے ضروری تھا کہ لوگ اس کو ضمیر کی عدم جرأت یا اخلاقی کمزوری پر محمول نہ کریں۔

ان مباحث میں سے افراد تاریخ ہند کے سلسلہ میں (تین ہندوؤں کے مقابلے میں) صرف ایک محمد تغلق مسلمانوں میں قابل ذکر سمجھا گیا۔ اسی طرح لٹریچر میں چار ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف دو (غالب وانیس) کو لیا گیا ہے اور ابطال اقوام عالم میں سے صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کو۔ اس کے علاوہ تاریخ وفلسفہ وغیرہ میں کسی جگہ مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔

میں حیران ہوں کہ وہ کون سے اراکین اکیڈمی اور دیگر اسکالر تھے اور کس گوش و ہوش کے تھے جنھوں نے صرف انتخاب علوم بلکہ اُن کے ماتحت انتخاب مباحث میں اس قدر بے اصولی، پریشان خیالی، غیر موزونی اور محاورہ عوام میں ''بے تکے پن'' سے کام لیا۔

۲۹-۱۹۳۰ء میں اکیڈمی نے صرف ایک مسودہ ''دیلی کرسان رکمنی ری'' اشاعت کے لیے پسند کیا۔ معلوم نہیں اور مخطوطات موصول ہوئے یا نہیں، اگر ہوئے تو کتنے اور کس کس موضوع پر۔ اور ان میں سے صرف رکمنی والے مسودہ کو پسند کرنے کے کیا اسباب تھے؟ ان تمام امور کی طرف سے رپورٹ کے مرتب

کرنے والے نے بہت بامعنی سکوت اختیار کیا ہے۔

ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کی سالانہ رپورٹ اکیڈمی کے اسکالروں نے کانفرنس میں پڑھی تھی۔ اسی طرح اور مضامین اس موقع پر پڑھے گئے تھے لیکن وہ اب تک شائع نہیں کیے گئے۔ رپورٹ میں ان کی اشاعت کا سرسری وعدہ کر کے ٹال دیا گیا ہے۔ شائع شدہ کتابوں کی تعداد چودہ بتائی گئی ہے۔ سات کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے کہ پریس میں ہیں، چھ طباعت کے لیے تیار کی گئی ہیں اور آٹھ نظر ثانی کی منزل سے گزری ہوئی ہیں لیکن رپورٹ کے مرتب نے نہ انڈکس کی صورت میں نہ اصل رپورٹ میں کہیں ان کتابوں کی فہرست دی اور نہ بعید ترین اشارہ اس امر کی طرف کیا گیا ہے کہ وہ کس زبان و موضوع کی ہیں۔

اسی طرح رپورٹ میں تکمیل کے ساتھ کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ لیکچر دینے والوں کو کیا رقم دی گئی، انعام پانے والے اور مترجمین کون کون تھے اور کس کو کیا دیا گیا۔ اگر رپورٹ کے تسلسل میں اس کے بیان سے خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا تو انڈکس کی صورت میں اس تفصیل کو ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قابل افسوس ہے کہ گزشتہ تین سال کے اندر جو لیکچر دیے گئے ان میں سوائے بعض کے ابھی تک شائع بھی نہیں ہوئے یا اگر شائع ہوئے تو ان پر ارباب صحافت کو رائے زنی کا موقع نہیں دیا گیا۔ لائبریری کے متعلق جو روپیہ صرف کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہونی چاہیے کہ اُردو پر کس قدر رقم خرچ کی گئی اور ہندی کتابوں پر کتنی؟ اور ۲۸۶۷ ہندی کتابوں کے مقابلے اُردو کی کتابیں کیوں صرف ۱۹۲۶ فراہم ہوسکیں۔

الغرض یہ رپورٹ اپنی ترتیب و تفصیل کے لحاظ سے بہت حد تک نامکمل ہے اور باوجود کوشش اخفا کے بعض امور میں جو کہیں کہیں ''مترشح'' ہوگیا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ''ظرف'' کس چیز سے لبریز تھا؟

میں اخیر میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور جس کی اہمیت سے کوئی تعلیم یافتہ ہندو بے خبر نہیں' صرف رواداری چاہتا ہے لیکن خیر رواداری تو بہت بڑی چیز ہے' مسلمانوں کو ان کی زندگی کے ان حقوق سے بھی محروم کیا جارہا ہے جو ان کے عمران و تمدن کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

ایک طرف ہندو حضرات سیاسیات و قومیات میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملے رہنے کی بھی دعوت دے رہے ہیں۔ ''بھارت ماتا'' کے حقوق بھی دونوں جماعتوں پر یکساں ثبت کیے جاتے ہیں لیکن جب ان جذبات وطنیت کا تجزیہ کیا جاتا ہے، جب اس دعویٰ بلند بانگ کے بعد اعمال و افعال پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مکر و فریب ہے، خدع دریا ہے اور ہندو جماعت اب تک مسلمانوں کے وجود،

معاشرت، تہذیب، یہاں تک کہ مسلمانوں کی زبان و انشاء کو بھی ''آریہ برت'' کی ''پوتر'' فضا میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

دنیا کو معلوم ہے کہ میں کانگریس کے مقاصد و اغراض کا بہت بڑا حامی ہوں اور میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہی بتایا کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ابنائے وطن کے ساتھ وطنیت کے رشتہ کو مستحکم کرو اور مذاہب کو بالکل علیحدہ رکھو۔ کیونکہ ایک ایسے ملک کی ترقی جس میں مذہب کے لحاظ سے مختلف جماعتیں پائی جائیں، غرض مشترک اور مرکزیت صرف وطنیت کے جذبہ سے پیدا ہوسکتی ہے لیکن اسی دوران میں، اسی زمانۂ ہیجان و اشتداد میں جبکہ مسلم افراد بھی ہندوؤں کے دوش بدوش جیل میں جا رہے تھے یکساں صبر و تحمل کے ساتھ حکومت کی سختی کو برداشت کر رہے تھے یہیں لکھنؤ سے جہاں ہر ہندو اُردو لکھنے پڑھنے کا عادی ہے کانگریس کے دفتر سے جو لٹریچر شائع ہوتا ہے، جو اطلاعات آویزاں کی جاتی ہیں، ان میں غالب حصہ ہندی کا ہوتا ہے اور جو بیج (Badges) تیار کیے جاتے ہیں ان میں ایک لفظ بھی اُردو کا نہیں ہوتا اور ہندی میں بھی جو عبارت درج ہوتی ہے وہ یکسر ثقیل سنسکرت ہوتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشانہ عصبیت کوئی اور ہوسکتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ ناموزوں و نامناسب محل اس جذبۂ نفرت کے اظہار کے لیے کوئی اور ہوسکتا تھا۔ پھر یہ منظر صرف لکھنؤ اور دفتر کانگریس کی...... محدود نہیں رہتا بلکہ زبان کے مسئلے میں گاندھی آشرم اور آنند بھون کے اندر بھی وہی ایک آواز گونجتی ہوئی...... اور الہٰ آباد یونیورسٹی سے لے کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے اس ابتدائی سکول تک جہاں ایک صاحب اقتدار ہندو بھی سانس لے رہا ہے یہی کوشش کام کرتی ہوئی دیکھی جائے گی کہ اُردو تعلیم، اُردو رسم الخط، اُردو تصانیف، سب کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے، ڈاکخانے جایئے تو وہاں کا ہندو کلرک منی آرڈر فارم ہندی زبان ہی کا دے گا اور اگر اُردو فارم کی خواہش کی جائے گی تو اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ اُردو فارم نہیں ہیں، حالانکہ ایک غیر تقسیم شدہ انبار اُردو فارم کا دیمک کی نذر ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں جایئے۔ دفاتر کی سیر کیجیے، دکانوں سے معاملہ کیجیے، الغرض ہر جگہ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں کہیں کوئی ہندو کی ذات کام کر رہی ہے اُردو کے ساتھ بغض و عناد کا جذبہ یکساں طور پر کام کر رہا ہے اور ایک عام نفرت ہندوؤں میں اس کی طرف سے پیدا ہوگئی ہے۔

اس لیے اگر ارباب اکیڈمی جن میں غالب حصہ ہندوؤں کا ہے، اُردو کا حق تلف کرنے میں جسارت سے کام لے رہے ہیں، اگر وہ اُردو کے تراجم کا کام بھی ہندوؤں سے لینا چاہتے ہیں۔ اس خیال سے کہ وہ زیادہ بہتر طریق پر اُردو کو...... کر سکیں گے۔ اگر ہندوؤں کی اشاعت گاہوں سے اُردو کی ریڈریں مسخ شدہ

صورت میں نکل رہی ہیں تو جائے حیرت نہیں کیونکہ یہ سب اسی ایک مقصد کی تکمیل کی مختلف تدابیر ہیں جس کے ذریعہ سے پھر ہندوستان کے اس دور کو از سرِ نو زندہ کیا جانے والا ہے جسے عہدِ آخر میں مرہٹوں نے زندہ کرنا چاہا تھا لیکن بدقسمتی سے ''دولت مستعجل'' ثابت ہوا۔

کس قدر عجیب و غریب جسارت ہے، کتنی حیرت ناک جرأت ہے کہ ہندوستان کی ایک عام مشترک زبان رائج کرنے کے بہانے سے اُردو میں تو ہندی و سنسکرت الفاظ داخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جائے۔ ایک اُردو رسالہ کو بجائے سہ ماہی کے تماہی لکھنے کے لیے اکیڈمی اپنی پوری قوت صرف کر دے۔ لیکن جس وقت ہندی لٹریچر کا سوال سامنے آئے تو تماہی کے بجائے ''ترَی ماسی پتر کا'' ہی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر جب کوئی...... رہس لکھے تو اکیڈمی اس کو ایک نعمت و برکت سمجھ کر بغیر کسی تنقید و اعتراض کے شائع کرنے پر آمادہ ہو جائے خواہ اس کے ثقیل و نامانوس الفاظ خود ہندو جماعت ہی کے لیے ناقابل فہم معمہ کیوں نہ ہوں۔

یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ کس قسم کی آبلہ فریبی ہے۔ یہ کس نوع کی کورانہ ذہنیت ہے۔ اگر ہندوؤں کی عام جماعت اس کو نہیں سمجھ سکتی تو خواص کے پاس اس کا کیا جواب ہے اور خواص کو بھی جانے دیجیے۔ کم از کم اکیڈمی کے ممبران کو تو غور کرنا چاہیے کہ حکومت سے جو رقم اُردو کی ترقی کے لیے ملتی ہے اس کے صَرف صحیح میں بخل و عصبیت سے کام لینے کا انھیں کیا حق حاصل ہے؟

آخر یہ کیسی دستبرد ہے۔ یہ کس طرح کی قزاقی ہے۔ یہ کس نوع کا دماغی افلاس ہے جو ایسی رکیک و سخیف ...... ذلیل حرکات پر ہندوؤں کو آمادہ کیے ہوئے ہے۔ اگر مسلمانوں یا بہی خواہان اُردو نے اس طرف توجہ نہ کی اور...... سے کام نہ لیا تو یہ طوفان کسی طرح رک نہیں سکتا اور وہ وقت دور نہیں جب مسلمانوں کو پورے حقوق ہمسائیگی دینے کے اسباب میں ایک قوی سبب بھی بتایا جائے گا کہ ان کی زبان میں اُردو فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کا سواد و خط غیر ملکی ہے اور ان کی تحریر بجائے بائیں طرف کے داہنی طرف سے شروع کی جاتی ہے جس کو ہندو قوم کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

مجھے معلوم ہے کہ ہندو جماعت اس اظہار خیال پر بہت برہم ہوگی اور مجھے خود تکلیف ہے کہ میں کیوں ایسا لکھنے پر مجبور ہوا لیکن اس باب میں اپنی طرف سے میں ایک عذر پیش کر سکتا ہوں کہ:

از نالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار
شمع خموشم و ز سرم دود میرود

آخر میں نہایت ادب کے ساتھ میں اکیڈمی کے ارباب کار کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اُردو زبان......اس کے ناقص و ثقیل ہونے پر حکم نہ لگائیں کیونکہ ''جہل'' کو علم کے مسئلے پر بالکل ''غیر ہندو'' ہو کر نگاہ ڈالیں اور اگر ان کو اُردو سمجھنے میں کسی قسم کی زحمت ہوتی ہے تو جانچنے کا معیار کرنا قرین انصاف نہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے مدیران رسالہ کی جماعت میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے یہ دریافت کرنا ہے کہ انھوں نے اس عقدہ دشوار کے لیے ''مشکل کشائی'' کی کیا تدبیر سوچی ہے۔

(بشکریہ، نگار، نومبر ۱۹۳۰ء)

☆☆☆

اُردو میں فرعونیت

مسٹر نیاز فتح پوری اُردو کے ایک سربرآوردہ اخبارنویس ہیں، یعنی ان میں اشتعال انگیز تحریر کا خداداد ملکہ ہے اور ادعاء قوم پروری کے باوجود انتہا درجہ کے فرقہ وارانہ جذبات اور خیالات کے اظہار کی حیرت انگیز جرأت۔ جس فرد میں یہ دونوں ارکان مجتمع ہو جائیں اس کے کامیاب اخبارنویس ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ ادھر سرکار بھی خوش، خریدار بھی خوش اور ارباب نظر کا دائرہ انگشت بدنداں۔ ممدوح نے اُردو دنیا میں ایک طرز تحریر کی ایجاد کی جسے ژولیدہ نگاری کہہ سکتے ہیں اور شروع میں ''رقاصہ'' اور ''مغنیہ'' اور ''کیوپڈ'' اور اسی ذیل کے دیگر مجتہدانہ مضامین پر خامہ فرسائی فرماتے رہے۔ آپ آج کل انسائیکلوپیڈیا یا دیگر رسائل سے علمی مضامین کا بلاحوالہ ترجمہ کرتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کا شمار علما میں کیا جا سکتا ہے۔ آپ رسوم کے بت شکن ہیں اور طبقہ علماء میں اصلاح کے زبردست مؤید۔ وقتاً فوقتاً آپ اپنی آزاد خیالی کے اظہار کے لیے مذہبی حقائق اور اخلاقی مسائل پر چوٹیں کیا کرتے ہیں جس سے مجلس احباب میں اچھی چہل پہل ہو جایا کرتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے کوئی آپ کے اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ آپ گزشتہ تین سالوں تک ہندوستانی اکیڈمی کے ایک ممتاز رکن رہے مگر نئے انتخاب میں کسی وجہ سے نہ آ سکے۔ یہ تو ان کے اکیڈمی پر برہم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا کے فضل سے آپ اتنے تنگ دلی نہیں ہیں مگر شاید آپ کی عدم موجودگی میں اکیڈمی نے سراسر بے ضابطگیاں اور فرقہ پرستیاں شروع کر دی ہیں۔ اس لیے آپ کا آزاد قلم ادھر دو تین ماہ سے اکیڈمی کا بخیہ ادھیڑنے میں مصروف کار ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کا وجود اُردو ہندی ہر دو زبانوں کی تقویت و ترقی کے لیے عمل میں آیا اور دونوں ہی زبانوں کے کچھ ممتاز اصحاب اس کے رکن بنائے گئے۔ ہندی شعبہ میں کسی مسلمان اہل قلم کو نامزد نہیں کیا گیا کیونکہ اس صوبہ میں کوئی مسلمان ہندی نویس نہیں ہے، اُردو شعبہ میں دو ایک ہندو بھی نامزد کر دیئے گئے۔ اس لیے کہ حضرت نیاز چاہے ان کے وجود سے منکر ہوں پر اُردو میں ہندوؤں کی ایک معقول تعداد ہے۔ اکیڈمی چونکہ ایک ادبی جماعت ہے جہاں اس نے نظریات، تاریخ، اقتصادیات، معاشیات کی طرف توجہ کی وہاں ادبیات کو بھی نظرانداز نہیں کیا اور انگریزی کے

ایک مشہور و معروف ڈرامہ نویس کے چند ڈراموں کو ہر دو زبانوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندی ترجمہ کی خدمت میرے سپرد ہوئی۔ اُردو ترجمہ منشی دیانرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ اور منشی جگت موہن لال صاحب رواں کے سپرد کیا گیا۔ حضرت نیاز اس وقت اکیڈمی کے رکن تھے مگر تب انھوں نے ان تجاویز کے خلاف زبان کھولنا آئینِ مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اب آپ کا یہ اعتراض ہے کہ انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کیوں کیا گیا اور کیا اس کے لیے مسلمان اہل قلم نہ مل سکتے تھے۔ آپ کے خیال میں کوئی ہندو اُردو لکھ ہی نہیں سکتا چاہے وہ مدت العمر مشقِ سخن کرتا رہے اور مسلمان خلقی طور پر اُردو لکھنا جانتا ہے یعنی اُردو نویسی کا کمال وہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔ یہ دعویٰ اتنا لغو، لچر، مہمل اور حماقت آمیز ہے کہ اس کے جواب کی ضرورت نہیں۔ میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جس زبان کے ادیب اتنے کوتاہ نظر اور خود بیں ہوں اس کا خدا ہی حافظ۔ مسلمانوں پر یہ عام اعتراض ہے کہ انھوں نے ہندو شعراء اور مصنفین کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نسیم، سرشار بھی اُردو کے دائرہ کمال سے خارج کردیے گئے مگر ایسی دریدہ دہنی کی جرأت آج تک کسی نے نہ کی تھی۔ اس کا طرۂ امتیاز مسٹر نیاز کے سر ہے۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ اُردو زبان پر مقابلتاً مسلمانوں کے احسانات زیادہ ہیں لیکن یہ نہیں تسلیم کرسکتا کہ ہندوؤں نے اُردو میں کچھ کیا ہی نہیں۔ آج کروڑوں ہندو اُردو پڑھتے ہیں، لاکھوں لکھتے ہیں۔ ہزاروں اسی زبان میں اظہارِ خیال کرتے ہیں، خواہ نظم میں یا نثر میں اور اُردو کی ہستی ہندوؤں کی اعانت سے قائم ہے۔ پنجاب کے مسلمان پنجابی لکھتے اور بولتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان بنگالی، سندھ کے سندھی، گجرات کے گجراتی، مدراس کے تامل، اُردو بولنے والے ہندو یا مسلمان زیادہ تر اس صوبہ میں ہیں، کچھ پنجاب اور حیدرآباد میں۔ اگر اس امر کی تحقیق کا کوئی صحیح طریقہ ہو کہ کتنے ہندو اُردو بولتے ہیں اور کتنے مسلمان تو میرے خیال میں دونوں کی تعداد میں بہت زیادہ فرق نہ نظر آئے گا۔

یہ دوسری بات ہے کہ حضرت نیاز ہندوؤں کی اُردو کو اُردو ہی نہ کہیں۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کی اُردو کو اُردو نہ سمجھے تو وہ موردالزام نہیں ہوسکتا۔ اگر مسلمان اُردو میں عربی اور فارسی لغت ٹھونس کر اسے اسلامی رنگ دینا چاہتا ہے تو ہندو بھی اس میں ہندی اور بھاشا کے الفاظ داخل کرکے اسے ہندو رنگ دینے کا متمنی ہوسکتا ہے۔ اُردو نہ مسلمان کی میراث ہے نہ ہندوؤں کی۔ اس کے لکھنے اور پڑھنے کا حق دونوں کو حاصل ہے۔ ہندوؤں کا اس پر حق اولیٰ ہے کیونکہ وہ ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ہندی آب و گل سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور محض چند عربی اور فارسی الفاظ کے داخل کردینے سے اس کی ہیئت نہیں تبدیل ہوسکتی۔ حضرت نیاز چاہے کتنی ہی آنکھیں پیلی کریں مگر ہندو اُردو پر استحقاق سے دست بردار نہیں ہوسکتا اور نہ وہ اسے اپنے ڈھنگ پر

لکھنے ہی سے باز آ سکتا ہے۔ اسی طرح جیسے مسلمان اسے اپنے ڈھنگ پر لکھنے سے باز نہیں آتے۔ حضرت نیاز کہہ سکتے ہیں ہندو اُردو کا خون کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی کہہ سکتا ہے مسلمان اُردو کے گلے پر کُند چھری پھیر رہے ہیں۔ بٹوارہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان لکھیں مسلمان ناظرین کے لیے ہندو لکھے گا ہندو ناظرین کے لیے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہندو تصنیف و تالیف سے یک قلم کنارہ کش ہو جائیں اور مسلمانوں کی تصنیفات پڑھ کر تشفی کر لیں۔ وہ ثانوی درجہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ہر وہ تحریک جو اُردو زبان کی ترقی کے لیے عمل میں آئے اس میں ہندو اپنی حیثیت سے شریک ہونے کا حق رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بجز حضرت نیاز جیسے کوتاہ نظر اصحاب کے، ایسے مسلمان بہت کم ہوں گے جو ہندوؤں کے اس حق سے انکار کر سکیں۔ اکیڈمی کی جس سب کمیٹی پر اُردو ترجمہ کے لیے مترجموں کے انتخاب کا بار ہے اس میں کافی تعداد مسلمان صاحبان کی ہے۔ اگر وہ حضرات ہندوؤں کو اس حد تک نالائق نہیں سمجھتے جتنا نیاز صاحب سمجھتے ہیں اور بعض ہندو اہل قلم کی دیرینہ خدمات یا علمی ذوق کا اعتراف انھیں مناسب معلوم ہوتا ہے تو کسی کو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیے۔ مسٹر نگم کی اُردو خدمات سے انکار کرنا ایسی شرمناک ادبی فروگزاشت ہے جو حضرت نیاز سے ہی ممکن ہے۔

کون اندازہ کر سکتا ہے کہ مسٹر نگم نے زمانہ کی اشاعت میں کتنے نقصانات اٹھائے ہیں۔ اس پر خاندانی جائیداد ہی نہیں قربان کر دی بلکہ اپنی زندگی بھی اس کی نذر کر دی اور آج ایک تنگ دل اخبار نویس کو یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ اس پچیس سالہ ادبی خدمت کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ حضرت رواں اُردو کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے شاید حضرت نیاز بھی قدرداں ہوں مگر آپ کی قدردانی زیادہ سے زیادہ زبانی اعتراف تک جا سکتی ہے۔ مبلغات کا موقع آتے ہی وہ قدردانی مائل بہ تبخیر ہو جاتی ہے۔ میں حضرت نیاز کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ وہ اکیڈمی کے ارکان کا انتخاب زبان کی بناء پر نہیں، قومیت کی بناء پر کروائیں۔ اس وقت اگر کوئی ہندو مداخلت بیجا کرے تو اس کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑیں۔ لیکن جب تک انتخابات زبان کی بنا پر ہیں اور ہندو بھی اُردو لکھتے ہیں اس وقت تک وہ ہندوؤں کو عملی قدردانی کے دائرہ سے باہر نہیں رکھ سکتے۔ مگر یاد رہے کہ قومیت کی بناء پر حد سے ایک تہائی سے زیادہ رقم اُردو کے ہاتھ نہیں پڑ سکتی۔ اس تہائی میں تاریخی اہمیت اور وقار سب کچھ شامل ہے۔ یہاں تو ہندو مصنفین کے ساتھ اس قدردانی کا اظہار کیا جاتا ہے، ادھر ہندوؤں کو ہندی کے مسلمان شعراء کے ساتھ کتنی عقیدت ہے! رحیم اور جائسی وغیرہ شعراء کے کلام کے نئے نئے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسے اتنے شوق سے پڑھا جاتا ہے جیسے سُور یا تُلسی کا کلام۔ نصاب تعلیم میں

اسے ہندو شعرا کے صف بہ صف جگہ دی جاتی ہے۔ ہندو یا مسلمان ہونے کا کسی کو خیال ہی نہیں آتا۔ اُردو کے کسی ہندو شاعر کا کلام کسی مسلمان نے مرتب کیا ہو اس کی مجھے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ حال میں حضرت اصغر نے یادگار نسیم کی ترتیب دی ہے جس کا انھیں خمیازہ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس ادبی تنگ نظری اور نخوت کی بھی کوئی حد ہے۔

(زمانہ، دسمبر ۱۹۳۰ء)

☆☆☆

جاوید رحمانی
نئی دہلی، بھارت

پریم چند اور زبان کا مسئلہ

پریم چند کا زمانہ اُردو اور ہندی کیمونلائزیشن کے نقطۂ عروج کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہمارے بڑے بڑے اسکالروں نے زبان کے مسئلے کو بطور ہندو اور بطور مسلمان سوچنا شروع کیا اور نتیجتاً زبان کا مسئلہ جو پوری معروضیت چاہتا تھا، پندار کا مسئلہ بن گیا۔ بھارتیندو کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

''جو کہ ۱۸۷۱ء میں بہ بانگِ دہل کہہ رہا تھا کہ میری اور میرے گھر والوں کی بولی اُردو ہے، جو کہہ رہا ہے کہ مجھے یہ بنارس والوں کی پوربی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہی بھارتیندو جیسا تخلیقی فن کار ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن میں کہتا ہے کہ صاحب یہ فارسی رسم الخط کے سب چمتکار مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے ہیں، لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے۔ لکھتے بیس ہیں پڑھتے تیس ہیں۔ لکھتے کِس ہیں، پڑھتے ہیں کَس۔ اور انھوں نے لکھا ہے کہ ہر میجسٹی کی گورنمنٹ سے میری یہ درخواست ہے کہ اس پر غور کرے کیوں کہ ہمارے مذہب کا معاملہ ہے۔''[1]

یہ مسئلہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے سر اٹھا رہا تھا۔ شمال مغربی صوبوں میں سرکاری کام کاج کی زبان کے طور پر اُردو کے رواج کے فوراً بعد ہندو تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقے نے احتجاج کیا اور اگست ۱۸۴۰ء میں حکومت نے آسان زبان استعمال کرنے کی ہدایت متعلقہ محکموں کو دی اور ۱۸۵۶ء میں مالگزاری (revenue) کے جونیئر افسران کو ناگری رسم الخط سیکھنے کی ہدایت دی گئی۔[2] اور یہاں سے شعبۂ مال گزاری میں ہندی کو داخلہ ملا۔

سر سیّد نے یکم اگست ۱۸۶۷ء کو وائسرائے اور گورنر جنرل کو ایک میمورنڈم دیا جس میں موجودہ نظامِ تعلیم کو ناقص بتایا گیا، جس کی بنیاد انگریزی ذریعۂ تعلیم پر تھی۔ سر سیّد کے خیال میں ''یوروپین علوم وفنون اور

سائنس کی روشنی'' کو عام کیا جانا ضروری تھا اور اس کے لیے انگریزی نہیں بلکہ دیسی زبان زیادہ موزوں تھی۔ اس میمورنڈم پر دس افراد کے دستخط تھے جن میں سے چار یعنی اسر چند مکرجی، بدری پرساد، منولال اور راجا جے کشن داس غیر مسلم تھے۔

اس منصوبے کو برطانوی حکومت نے رد کر دیا، جس کی اطلاع ۵ر ستمبر ۱۸۶۷ء کو بیلی نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے صدر اور اراکین کو ایک خط کے ذریعے دی۔ حکومت نے اس تجویز کو اگرچہ رد کر دیا لیکن اس نے کلکتہ یونیورسٹی، بنارس انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری اور کئی دوسرے افراد سے اس سلسلے میں ان کی رائے بھی مانگی اور ۱۷ر فروری ۱۸۶۸ء کو بنارس انسٹی ٹیوٹ کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا جس میں سیّد احمد خاں اور بابو شیو پرساد بھی شریک تھے اور اس اجلاس میں بابو شیو پرساد نے بھی خاموشی اختیار کر لی اور صدر نے محسوس کیا کہ کوئی اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا اور اس اجلاس کو برخاست کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی اپنی کتاب 'ہندی اُردو تنازع' میں سرسیّد کے یکم اگست ۱۸۶۷ء کے میمورنڈم کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

> ''اس درخواست پر حکومت نے خاصی توجہ دی تھی، لیکن بعض دوسری باتوں کے ساتھ بڑی رکاوٹ یہ پیدا ہوگئی کہ بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اُردو کے مخالفین نے اخبارات میں اس بات کا مطالبہ کر دیا کہ اس مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اُردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔''[۳]

۱۸۶۸ء میں راجا شیو پرساد نے ایک کتابچہ 'میمورنڈم آن کورٹ کیریکٹرس' شائع کیا، جس میں فارسی اور اُردو تعلیم کی سرکاری سرپرستی کو ہندی کی ترقی میں سدِ راہ بتایا اور فارسی رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط کو عدالت میں رائج کرنے کا مطالبہ کیا۔[۴] اور یہ نئے یہاں تک پہنچی کہ راجا جے کشن داس (جو سرسیّد کے خاص دوستوں میں تھے) نے برطانوی حکومت کو ہندوؤں کے حق میں مسلمانوں کی حکومت سے بہتر قرار دیا اور لکھا:

> ''جب سے ہندوستان میں مسلمانوں کا تسلط ہوا اس وقت سے ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں ایسی سختی برتی گئی جس کے سبب سے ان کے دل نہایت افسردہ و پژمردہ ہو گئے اور ایسے سخت موانع پیش آئے کہ ان کا سلسلۂ مذہبی تمام درہم برہم ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ سنسکرت کا قدیمی علم صرف برائے نام رہ گیا اور اس پر

طرہ یہ ہوا کہ کاروبارِ عدالت بھی فارسی میں دفعتاً شروع ہو گئے، چناں چہ رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم سنسکرت ہندوستان میں کالعدم ہو گیا .... الغرض ایسی ایسی وجوہ سے بجائے روشن ضمیری واستعدادِ علمی کے ہندوستان میں تاریکی، جہالت طاری ہو گئی۔'' [۵]

حالانکہ سنسکرت کا سمٹنا مسلمان حکمرانوں کے جابرانہ رویّے کی وجہ سے نہ تھا بلکہ برہمنوں کی اجارہ داری کے سبب سے تھا جس کا اندازہ مشہور فرانسیسی سیاح برنیئر کے سفرنامے سے کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے لکھا ہے:

''یہ کتابیں جو مجھے بنارس میں دکھائی گئی تھیں اگر وہ بید ہی تھے تو بڑی ضخامت کی ہوتی ہیں اور یہ ایسی نایاب ہیں کہ میرے آقا کو باوجود بڑی تلاش اور شوق خریداری کے ایک کتاب بھی نہیں ملی۔ ہندو ان کو بڑی ہوشیاری سے چھپائے رکھتے ہیں کہ مبادا مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں۔'' [۶]

یہاں برنیئر نے آقا کے لقب سے نواب دانشمند خاں کو یاد کیا ہے، جس کی محفل میں برنیئر کے بقول ایسے ہندو پنڈت بھی آتے تھے جو داراشکوہ کی خدمت میں رہ چکے تھے اور دانشمند خاں ان سے ہندو فلسفے اور ان کی مذہبی کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں البیرونی، اکبر کے زمانے میں فیضی اور بعد میں شہزادہ داراشکوہ نے ہندوؤں کے مذہبی صحیفوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، لیکن برہمنوں نے جیسا کہ برنیئر کے بیان سے ظاہر ہے، اپنی مذہبی کتابوں کو چھپا کر کے رکھا۔ لیکن راجا جے کشن نے برہمنوں کے اس خوف کی جگہ مسلمان حکمرانوں کے جبر اور اُردو زبان کو اس کا ذمہ دار بتایا اور بقول ڈاکٹر مظہر مہدی:

''راجا جے کشن داس نے کہا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد وہ جبر و تشدد تو ختم ہو گیا جو صدیوں تک ہندوؤں پر روا رکھا گیا تھا اور ان کے لیے سازگار حالات بھی پیدا ہوئے لیکن وہ پورے طور پر ان سے مستفیض نہ ہو سکے جس کی بنیادی وجہ اس حکومت کا اُردو اور فارسی رسم الخط کو قبول کرنا اور حکومت کے دفاتر میں ان کا اجرا کرنا تھا، کیوں کہ اس زبان اور رسم الخط کو صرف روزگار پیشہ لوگوں نے اسی قدر سیکھا جتنی ان کو ضرورت تھی لیکن تاجروں اور کسانوں نے 'اس کو محض لغو و فضول جانا کیوں کہ وہ اس اجنبی زبان میں علم حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے جو ان کے مزاج اور

فطرت کے خلاف ہو۔'' ۷

اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۶۹ء تک زبان کا مسئلہ ہندو اور مسلم شناخت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ گویا کہ پوری طرح کمیونلائز ہو چکا تھا۔ ہندی کے نام نہاد علمبردار اُردو کی مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے انگریزی حکومت کو اپنے حق میں مسلمانوں کی حکومت سے بہتر بتایا۔ ''نینی تال انسٹی ٹیوٹ'' کا قیام ۱۸۶۹ء میں عمل میں آیا جس کی بنیاد ہی غالباً ہندی کی حمایت اور اُردو کی مخالفت کے خیال سے رکھی گئی تھی۔ ۲۸ راگست ۱۸۶۹ء کو اس کا ایک جلسہ ہوا جس میں بابو بودھی بلبھ پنت نے اُردو اور فارسی رسم الخط کی مخالفت میں تقریر کی۔ اس جلسے کی صدارت گنگا دت پنت نے کی اور اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ:

> ''اس ملک میں اُردو کا چلن مسلمانوں کی فتح کے بعد ہوا اور مسلم فاتحین نے اسے اپنی سہولت کے لیے رواج دیا۔ لیکن اب اس ملک کے حاکم انگریز ہیں جو نہ اُردو بولتے ہیں اور نہ ہندی، اس لیے یہاں اس ملک کی فطری زبان ہندی رائج ہونی چاہیے۔'' ۸

اس جلسے کی کارروائی کماؤں کے کمشنر کو بھی بھیجی گئی کہ وہ اس کو حکومت کے سامنے پیش کر دیں۔ اس جلسے میں تمام مسلمان اُردو کی حمایت کر رہے تھے اور تمام ہندو ہندی کی۔ گویا کہ زبان کا مسئلہ پوری طرح فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر چکا تھا۔

اس سلسلے میں مذہبی اور اصلاحی تنظیموں کی مداخلت نے مزید پیچیدگی پیدا کر دی۔ آریہ سماج نے بھی ہندی کی حمایت کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی تھے جن کی مادری زبان گجراتی تھی لیکن انھوں نے بھی ہندی کی حمایت کی اور جب ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کو سکولوں میں ذریعۂ تعلیم کی زبان کا فیصلہ کرنا تھا تو سوامی دیانند نے آریہ سماجیوں کو خطوط لکھے اور ہدایت دی کہ:

> ''وہ ہندی کی پُرزور حمایت کریں اور کمیشن کو میمورنڈم بھیجیں...... اگر یہ وقت ضائع ہو گیا تو پھر مستقبل میں یہ موقع ہاتھ نہیں آنے کا۔'' ۹

بلکہ انھوں نے 'ایک دیس، ایک بھاشا' جیسا نعرہ بھی دیا جو ظاہر ہے کہ کھلا فاشزم (Fascism) تھا۔ ہندی کے بیشتر حامی مثلاً بابو شیو پرساد، راجا جے کشن داس، راجا بھنگا اور بابو ہریش چندر اُردو سے ماہرانہ واقفیت رکھتے تھے لیکن ہندی کا سوال چوں کہ ہندی قومیت کے مسئلے سے وابستہ کر دیا گیا اس لیے یہ تمام لوگ اُردو کے سخت مخالف اور ہندی کے حامی ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں ہندی کے حامیوں نے ایجوکیشن کمیشن کو ۱۱۸ میمورنڈم دیے جن میں ۶۷ ہزار دستخط جمع کیے گئے تھے جب کہ اُردو کی حمایت میں 'ایک ایڈریس ایجوکیشن

کمیشن کو پیش کیا گیا' اور اس میں بھی یہ کہا گیا کہ:

''اُردو ہماری نہ مذہبی زبان ہے اور نہ قومی، اور نہ اسے (کذا؟) کسی غیر ملک سے درآمد ہی کی گئی ہے۔ اس نے ہندوستان میں جنم لیا ہے، اس کی پیدائش ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ کوششوں سے ہوئی ہے۔ یہ اس طرح بتدریج ہندوستان کی ورناکلر زبان بنی ہے۔'' [۱۰]

۱۸۹۳ء میں ناگری پرچارنی سبھا (بنارس) کا قیام عمل میں آیا، جس کے بانیوں میں گوپال پرشاد کھتری، رام نرائن مصر اور شیام سندر داس شامل تھے۔ ہندی کے نفاذ کے سلسلے میں ناگری پرچارنی سبھا نے سب سے اہم اور منظم تحریک کا رول ادا کیا۔ ۱۸۹۷ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے بھی ایک پمفلٹ 'کورٹ کیرکٹر اینڈ پرائمری ایجوکیشن' شائع کیا اور اس میں ہندی کی وکالت کی۔ ۹/مارچ ۱۸۹۸ء کو ہندو تعلیم یافتہ اُمرا کا ایک وفد مدن موہن مالویہ کی قیادت میں لیفٹیننٹ گورنر سر میکڈونلڈ سے ملا اور اس نے فارسی رسم الخط کی جگہ ناگری رسم الخط کے اجرا کا مطالبہ کیا۔ اور:

''۳۲ سال کی اس تحریک کے نتیجے میں سرکار نے ۱۹۰۰ء میں عدالتوں میں فارسی رسم الخط کے ساتھ ساتھ ناگری رسم الخط کے استعمال کی بھی اجازت دے دی۔'' [۱۱]

یہاں سے بظاہر اُردو اور ہندی کی کشاکش میں کچھ کمی آ گئی لیکن ایک قومی زبان کا مسئلہ بدستور بنا رہا۔ پریم چند نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تقریباً ۱۹۰۱ء سے کیا۔ 'بڑے گھر کی بیٹی' (۱۹۱۰ء) پہلی کہانی ہے جو پریم چند کے قلمی نام سے شائع ہوئی [۱۲]۔ پریم چند کی شہرت افسانہ اور ناول نگار کی حیثیت سے ہے لیکن انھوں نے مضمون نویسی سے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کیا [۱۳]۔ ان کے مضامین میں 'اُردو، ہندی، ہندوستانی' کے عنوان سے دو مضمون ملتے ہیں۔ اس مسئلے پر پریم چند نے اور بھی کئی جگہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ پچھلے سال پروفیسر گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' شائع ہوئی، اس کتاب نے اس موضوع کو ایک بار پھر ہوا دے دی ہے۔ گیان چند جین نے اس کتاب میں لکھا ہے:

''جن قصوں میں عاشق اور محبوبہ ایک ہی مذہب کے ہوتے ہیں ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا، لیکن جن صورتوں میں محبوبہ کا مذہب عاشق کے مذہب سے مختلف ہوتا ہے وہاں یہ قاعدہ ضروری ہے کہ عاشق مسلمان ہو اور محبوبہ اپنا دھرم چھوڑ کر مشرب با اسلام ہو جائے...... مثنویوں اور داستانوں میں غیر مسلم حسیناؤں کا عشق اور تبدیلیِ

مذہب، متفرق اشعار میں ہندو خواتین کو بے خوف چھیڑنا سب اس لیے جائز تھا کہ حکومت مسلم تھی۔،،[۱۴]

پریم چند کا ایک مضمون 'اُردو زبان اور ناول' ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا، اس میں پریم چند لکھتے ہیں:

''اُردو ناول نویس اب تک بجز سرشار کے تقریباً سب مسلمان تھے اور انھوں نے اپنی کتابوں میں اس ہندو جذبے کی مطلق پروانہیں کی جو مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئن کے تعشق سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ہندوستان ریویو میں ایک مسلمان نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ اکثر بنگالی ناولوں میں ہندو ہیرو اور مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا گیا ہے جسے پڑھ کر مسلمانوں کے خون میں جوش آ جاتا ہے۔ اُردو کے کئی مشہور ناولوں میں اس لغویت کی بالکل پروانہیں کی گئی۔،،[۱۵]

یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناول نگاروں کے حاشیۂ خیال میں بھی جو بات نہ رہی ہوگی پریم چند نے انھیں اس کا مجرم ٹھہرایا ہے اور گیان چند جین کے مذکورۂ بالا بیان کو پریم چند کے ان خیالات کی توسیع بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی قبیل کا ایک مضمون 'شرر و سرشار' بھی ہے جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون حکیم برہم کے مضمون کے جواب کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں 'شرر و سرشار' کے موازنے میں ہندو اور مسلمان کی رعایت صاف محسوس ہوتی ہے۔ اس مضمون کے جستہ جستہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''سرشار نے جتنی کتابیں لکھیں ان میں ایک بھی ایسی نہیں کہ جس کو مسلمان یا عیسائی یکساں دلچسپی سے نہ پڑھے۔ وہ سب مذہبی تعصبات سے بری ہیں۔ برعکس اس کے حضرت شرر کے ہیرو تو ہر حالت میں مسلمان ہوتے ہیں، مگر ہیروئن کبھی ہندو ہوتی ہے اور کبھی عیسائی۔ حضرت شرر تو فلاسفر ہیں، ان کے ذہن کو کم از کم اتنی رسائی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اس اشتعال کا اندازہ کرتے جو ہندو اور عیسائیوں کے دل میں ان کی بے عنوانی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں میں اتنی حسین، پُرعصمت مستورات نہیں ہیں جن کو ہیروئن بننے کا فخر حاصل ہو سکے۔ غالباً کوئی صاحب فرمائیں گے کہ بعض ہندو اصحاب نے بھی ہندو ہیرو سے مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا ہے مگر کیا ضرورت ہے کہ شرر بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ اکثر ہندو اصحاب منصور اور موہنا کو نفرت اور کراہت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں............ بہت کم ایسے ہندو ہوں

گے جوان (شرر) کے مداح ہوں بلکہ سرشار کے سامنے سر تعظیم خم کرنے والوں میں
اکثر مسلمان اصحاب ہیں۔ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو قومی اتحاد کی آڑ میں نفاق
کا بیج بوتے ہیں: ناول نویس کے لیے رسیلی، رنگین، چلبلی، شوقین طبیعت کا ہونا ضروری
ہے۔ بجائے اس کے حضرت شرر کو مجتہدوں کا جوش اور ملاؤں کا دل ملا ہے..........
انگریزی ناول کی کوئی خوبی ایسی نہیں جو سرشار کی تصانیف میں نہ پائی جائے..........
یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت سرشار کے رنگ میں لکھنے کی بہتوں نے کوشش
کی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی جیسے آزاد کی تقلید محال ہے اسی طرح سرشار کے بھی رنگ
میں لکھنا مشکل ہے حالاں کہ بعض ناول نگاروں نے شرر سے پالا مار لیا ہے۔ چنانچہ ان
کے ناولوں کی جتنی قدر ملک نے کی ہے، اس کی آدھی بھی شرر کے کسی ناول کی نہیں
ہوئی"۔ [۱۶]

یہاں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پریم چند کے سامنے شرر اور سرشار کی فنی خوبیاں اور خامیاں کم رہی ہیں اور ان کا مسلمان اور ہندو ہونا زیادہ۔ یہ مضمون ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ اگست ۱۹۱۲ء کا ایک خط دیا نرائن نگم کے نام ہے جس میں پریم چند لکھتے ہیں:

"نام ہندو بہت موزوں تھا مگر شاید اس نام کا کوئی پرچہ پنجاب میں نکلنے لگا ہے۔ رفتارِ
زمانہ سے بہتر نام مجھے نہیں سوجھتا .... اخبار کا نمونہ کامریڈ ہی ہو، پالیسی
ہندو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا اور اس کی کوشش فضول ہے..........
مجھے یقین ہے کہ پکا ہندو پرچہ جو اچھا کاغذ اچھی چھپائی دے اس کے لیے گنجائش
کافی ہے"۔ [۱۷]

یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو ایک خط دیا نرائن نگم کو لکھا گیا ہے، اس میں پریم چند لکھتے ہیں:

"اُردو میں اب گزر نہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح
ہندی لکھنے میں زندگی صرف کردوں گا۔ اُردو نویسی میں کسی ہندو کو فیض ہوا ہے
جو مجھے ہوگا"۔

اس خط کے تعلق سے اکثر کہا گیا ہے کہ یہ ایک 'وقتی ردعمل' ہے لیکن میں نے اتنے سارے بیانات اس لیے نقل کیے ہیں کہ میں اتنے سارے بیانات کو وقتی ردعمل نہیں سمجھتا۔ 'اُردو، ہندی، ہندوستانی (۱)' اپریل

۱۹۳۵ء کے 'زمانہ' میں شائع ہوا۔ اور 'اُردو، ہندی، ہندوستانی (۲)' آریہ سماج کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۶ء میں بطور خطبہ پیش کیا گیا۔ ان مضامین میں نسبتاً اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ اگر چہ وہ اُردو کو 'مقابلتاً ہندی سے کہیں زیادہ سخت گیر' بتاتے ہیں جو غلط ہے۔ ان مضامین میں ''اعلیٰ قومیت کا تقاضا'' وہ یہ بتاتے ہیں کہ اُردو میں کچھ ضروری ترامیم اور اضافہ کر کے اسے ہندی سے متصل کر لیں اور ہندی میں اسی طرح کے اضافے کر کے اسے اُردو سے ملا دیں اور اس مشترکہ زبان کو مستحکم کر دیں جو سارے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے۔''[۱۸]

'اُردو، ہندی، ہندوستانی (۲)' میں پریم چند نے جدید ہندی اور ہندی/ ہندوی کو ایک کر دیا۔ یہ غلطی بہت بعد میں پریم چند کے چھوٹے صاحبزادے امرت رائے نے بھی کی اور اُردو والے اسے عام طور پر امرت رائے کا ہی کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن یہ کارنامہ بھی ہمارے پریم چند کا ہے۔ اس خطبے میں موجود اس عبارت پر غور کریں:

> ''ہندی کو یہ گورو (اعزاز) پروان کرنے کا آشرے مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں نے ہی دلّی پرانت کی اس بولی کو جس کو اس وقت بھاشا کا پد نہ ملا تھا، ویوہار (استعمال) میں لا کر اسے دربار کی بھاشا بنا دیا۔ اور دلی کے اُمرا اور سامنت جن پرانتوں میں گئے، ہندی بھاشا کو ساتھ لیتے گئے .... دکھن کے بادشاہوں نے اکثر کویتائیں کہیں اور کویتا کو آشرے دیا۔ لیکن ہندی بھاشا کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں گزر گئیں۔''[۱۹]

گویا کہ ہندی بھاشا دکنی کی توسیع ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ پریم چند زبان کے مسئلے میں اس قدر معصوم تھے۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں:

> ''جس طرح ہندوؤں کی ہندی کا وکاس ہو رہا تھا، اسی طرح مسلمانوں کی ہندی کا روپ بھی بدلتا جا رہا تھا۔ لپی (رسم الخط) تو شروع سے ہی الگ تھی، زبان کا روپ بھی بدلنے لگا۔ مسلمانوں کی سنسکرتی (تہذیب) ایران اور عرب کی ہے۔ اس کا زبان پر اثر پڑنے لگا۔ عربی اور فارسی کے لفظ اس میں آ کر ملنے لگے۔ یہاں تک کہ آج ہندی اور اُردو دو الگ الگ سی زبانیں ہو گئی ہیں۔''[۲۰]

اس اقتباس کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ جدید ہندی کی تاریخ کو زبردستی پھیلا دیا گیا ہے اور ایک نسبتاً نومولود زبان کو خاصی قدیم دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح بظاہر تو انھوں نے اُردو اور ہندی میں سے

کسی ایک زبان کی حمایت کا خطرہ مول نہیں لیا لیکن ہندی کی زبردست حمایت بھی کردی۔ حالاں کہ جدید ہندی کو اُردو کی ہم طرح بخشنے کا ہی تو سارا جھگڑا ہے۔ دوسری اور نہایت قابلِ اعتراض غلطی یہ ہے کہ ''مسلمانوں کی تہذیب ایران اور عرب کی ہے۔'' اس بیان کی روشنی میں لامحالہ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ پریم چند یا تو تہذیب کے مفہوم سے واقف نہیں تھے یا مسلمانوں سے۔ ایرانیوں کو تو ہندوستانی فارسی تک قبول نہیں کہ یہ ان کے خیال میں بہت ہندوستانی ہے۔ [۲۱] اور کوئی زبان یا اس زبان کی شاعری اپنے ذخیرۂ الفاظ سے نہیں پہچانی جاتی بلکہ اپنے طرزِ احساس سے پہچانی جاتی ہے۔ اور تہذیب طرزِ احساس پر قائم ہوتی ہے ذخیرۂ الفاظ پر نہیں۔ اب یہ ایک الگ اور طولانی بحث ہے کہ ذخیرۂ الفاظ بھی بہر حال طرزِ احساس کی پشت پناہی کرتا ہے۔

بنارسی داس چترویدی کے نام ایک خط ہے جو ۳ر جون ۱۹۳۰ء کو لکھا گیا ہے، اس میں پریم چند لکھتے ہیں:

> ''میری رچناؤں کا انوواد مراٹھی، گجراتی، اُردو، تامل بھاشاؤں میں ہوا ہے۔ سب کا نہیں۔ سب سے زیادہ اُردو میں اس کے بعد مراٹھی میں۔'' [۲۲]

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند اپنے آخری زمانے میں یا تو خود کو ہندی کا ادیب سمجھنے لگے تھے یا ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ یہاں یہ بتانا بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 'سرسوتی' ہندی تحریک کا زبردست علمبردار رسالہ تھا اور خالص ہندی کا مدعی بھی۔ اس کے مدیر مہاویر پرساد دویدی کے بارے میں مشہور ہے کہ مصنف انھیں کیسی بھی تحریر روانہ کرتا، دویدی جی اس کی اصلاح کر کے اس کے اسلوب کو اپنی مفروضہ جدید ہندی کے مطابق کر دیتے تھے۔ اسلوب کی یکسانیت کے سبب 'سرسوتی' اول تا آخر ایک ہی آدمی کے قلم سے لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا اور پریم چند نے اپنی کئی تحریریں اس میں بغرضِ اشاعت بھیجیں۔ جن احباب کو یہ اصرار ہو کہ پریم چند کو ہندی کا حمایتی ان کی گزشتہ خدمات اور اُردو دانی کے صلے میں نہ کہا جائے، ان کے لیے میرا جواب یہ ہے کہ بابو شیو پرساد، راجا جے کشن داس اور بابو ہریش چندر بھی اُردو میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے بلکہ ہندی ناقدین کی ایک جماعت تو بابو شیو پرساد کی تمام تحریروں کو اُردو ہی بتاتی ہے جو ناگری اسکرپٹ میں لکھی گئی ہے۔ [۲۳] ہم اس انتہا پسندی سے کام نہ لیں تو بھی انھیں اُردو کی کئی کتابوں کا مصنف تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن جب ہندی قومیت کا سوال اٹھا تو یہ تمام لوگ اُردو کے مخالف ہو گئے اور ہندی کے پُر جوش مبلغ۔ میں پریم چند کو ان سے صرف اس قدر مختلف سمجھتا ہوں کہ پریم چند ہندی کے حمایتی تو تھے لیکن انھوں نے اُردو کی مخالفت کا خطرہ بھی مول نہیں لیا۔ اصل میں ان بیانات کے اتنے طولانی تجزیے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی

کہ ہمارے یہاں خواہ مخواہ ہر شخص کو سیکولر ثابت کرنے کا چلن کچھ ایسا زور پکڑ چکا ہے کہ پریم چند کو بھی اکثر سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ جب کوئی انگریزی یا فرانسیسی شاعر یا مصنف عیسائیت اور یہودیت کا نہ صرف حامی بلکہ پُر جوش مبلغ ہوتے ہوئے بھی بڑا شاعر اور ادیب ہو سکتا ہے (ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی مثال سامنے کی ہے) تو اُردو شاعر یا ادیب کو ہم اس حق سے کیوں محروم رکھیں۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ اُردو کو اگر سیاسی جدید ہندی کی طرح فسطائی طریقے سے فتویٰ بازی (Canonisation) کا شوق نہیں تو پریم چند اُردو کے ہی ادیب ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جب کوئی مسلمان اُردو کی حمایت کرنے کے باوجود سیکولر ہو سکتا ہے تو کوئی ہندو ہندی کی حمایت کرنے سے کمیونل کیوں ٹھہرے؟ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں اُردو جیسی ترقی یافتہ زبان کو چھوڑ کر کے ہندی جیسی ان گھڑ زبان کو اختیار کرنا اپنی ترجیح کا مسئلہ کم تھا اور کمیونلائزیشن کا زیادہ۔ لیکن مجھے اس پر یہ اعتراض ہے کہ محبت کے لیے شرط دیوانگی ہوتی ہے خوبصورتی نہیں۔ ہم اگر 'باغ و بہار' کے قصے کی طرف رجوع نہ کریں تو بھی ہمارے زمانے میں ایسے لوگ بآسانی مل جائیں گے جو ایسی صورتوں پر مرتے ہیں جن پر جینے کا تصور بھی شاید ہمیں مار ڈالے۔

دوسرے یہ کہ اگر ہم نے اس کو کمیونلزم فرض کر ہی لیا ہے تو کسی کا سیکولر یا کمیونل ہونا اپنی پسند کا مسئلہ ہے۔ زندگی بسر کرنے کے یہ دو راستے ہیں اور ہر شخص کو آزادی ہے کہ ان میں سے جس کا چاہے انتخاب کر لے۔ اپنی ترجیح کی حد تک میں کسی کے سیکولر ہونے کو زیادہ پسند کرتا ہوں لیکن اگر کوئی کمیونلزم کو چنتا ہے تو اسے برا بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں یہ واضح کر دوں کہ کمیونلزم میں تشدد کو میں شامل نہیں سمجھتا اور جہاں تشدد شامل ہو جائے وہاں کمیونلزم کی جگہ دہشت گردی لے لیتی ہے۔

پریم چند کا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' کی قطعی تاریخ معلوم نہیں لیکن یہ ۱۹۰۶ء تک بہر حال شائع ہو چکا تھا۔ اس ناول پر تبصرہ 'زمانہ' کے اکتوبر نومبر ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔[۲۴] یہ خاصا کمزور ناول ہے لیکن پریم چند نے اس ناول کو مختلف زبانوں میں چار مختلف ناموں سے شائع کرایا۔ یہ چار نام تھے 'پرتگیا'، 'پریما'، 'ہم خرما و ہم ثواب' اور 'بیوہ'۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اس ناول سے پریم چند کی اس جذباتی وابستگی کی توجیہ یہ کی ہے:

> ''اس ناول میں خود پریم چند کی اس عہد کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے بھی ایک لڑکی سے محبت کی تھی جس کا اعتراف آخر عمر میں انھوں نے شورانی دیوی سے کیا ہے۔ اور جب پریم چند اس لڑکی سے شادی کرنے میں کامیاب نہ ہوئے

تو انھوں نے شورانی دیوی (ایک بیوہ) سے بیاہ کرلیا۔ اس طرح ان کا یہ اقدام بھی 'ہم خرما و ہم ثواب' کے مصداق کہا جا سکتا ہے۔''[۲۵]

یہ ناول پریم چند کی زندگی سے ایک اور سطح پر حیرت انگیز مماثلتیں رکھتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو امرت رائے ہے جو آریہ سماجی بھی ہے۔ اور پریم چند کے چھوٹے لڑکے کا نام بھی امرت رائے ہے جو اس ناول کی اشاعت کے تقریباً پندرہ سال بعد (۱۹۲۱ء میں) پیدا ہوئے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پریم چند کے بیٹے امرت رائے نے ۱۹۸۴ء میں "A House Divided The Origin and Development of Hindi / Hindavi" لکھی اور اس کتاب میں انھوں نے اُردو کے تعلق سے جو معاندانہ رویہ اختیار کیا وہ ان سے تقریباً ۱۰۲ سال پہلے کے ان آریہ سماجیوں کی یاد تازہ کر دیتا ہے جنھوں نے سوامی دیانند سرسوتی کے اشارے پر ۱۸۸۲ء میں اُردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کی تھی۔

اس طرح یہ ناول پریم چند کی نجی زندگی سے کئی سطحوں پر بڑی زبردست اور معنی خیز مماثلتیں رکھتا ہے جس پر حیرت ہے کہ ناقدین نے توجہ نہیں دی۔

حواشی

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی ،زبان تو ایک ہی ہے: شمس الرحمٰن فاروقی محو گفتگو جلد اول، مرتب: رحیل صدیقی، نئی دہلی: رعنا کتاب گھر، ص ۲۴۰۔

۲۔ ڈاکٹر مظہر مہدی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو ہندی تنازعہ، غالب نامہ، جولائی ۲۰۰۴ء، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ص ۲۲۲، ۲۲۳۔

۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ہندی اُردو تنازع، ۱۹۷۷ء، کراچی: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۱۰۳۔

۴۔ ڈاکٹر مظہر مہدی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو ہندی تنازعہ، جولائی ۲۰۰۴ء، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۲۲۵۔

۵۔ ایضاً ص ۲۲۶۔

۶۔ تنویر احمد علوی، ہندوؤں کے مذہبی قوانین اور علوم وفنون: تجسس سے تجزیے تک، ۲۰۰۲ء، دہلی: شاہد پبلی کیشنز، ص ۱۷۶۔

۷۔ ڈاکٹر مظہر مہدی، انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو ہندی تنازعہ، جولائی ۲۰۰۴ء، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۲۲۶۔

۸۔ ایضاً ص ۲۲۷۔

۹۔ ایضاً ص ۲۳۰۔

۱۰۔ ایضاً ص ۲۳۲، ۲۳۳۔

۱۱۔ ویر بھارت تلوار، راجا شیو پرساد ستارۂ ہند ۲۰۰۵ء، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ص ۵۴۔

۱۲۔ شمیم حنفی، پریم چند کے منتخب افسانے، ۲۰۰۶ء، دہلی: انجمن ترقی اُردو (ہند)۔

۱۳۔ عتیق صدیقی، مضامین پریم چند، ۱۹۸۱ء، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ص ۱۴۔

۱۴۔ گیان چند جین، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب، ۲۰۰۵ء، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص ص ۱۸۹، ۱۹۳۔

۱۵۔ پریم چند، اُردو زبان اور ناول: مضامین پریم چند، ۱۹۸۱ء، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ص ۲۳۰۔

۱۶۔ پریم چند، شرر و سرشار: مضامین پریم چند، ۱۹۸۱ء، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ص ص ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱۔

۱۷۔ مدن گوپال، پریم چند کے خطوط، جون ۱۹۶۸ء، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ۴۴، ۴۵۔

۱۸۔ پریم چند، اُردو ہندی ہندوستانی (۱): مضامین پریم چند، ۱۹۸۱ء، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ص ۱۹۷۔

۱۹۔ پریم چند، اُردو ہندی ہندوستانی (۱۱): مضامین پریم چند، ۱۹۸۱ء، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ص ۲۰۲۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۲۔

۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اُردو غزل میں ہندوستانی ذہن کی عکاسی، اکتوبر ۲۰۰۴ء، الٰہ آباد: شب خون۔

۲۲ مدن گوپال، پریم چند کے خطوط، جون ۱۹۶۸ء، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ۲۰۵۔

۲۳ ویر بھارت تلوار، راجا شیو پرساد ستارۂ ہند ۲۰۰۵ء، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ص ۵۷۔

۲۴ مدن گوپال، کلیات پریم چند (۱)، جولائی ستمبر ۲۰۰۰ء، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان۔

۲۵ قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحیثیت ناول نگار، ۱۹۷۷ء، علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ص ۱۴۷۔

☆☆☆

اُردو۔ ہندی۔ ہندوستانی

سُندرلال جی کا خط مہاتما گاندھی کے نام

پہلی اگست کے ہریجن سیوک میں مَیں نے آپ کا لیکھ (مضمون) غلط فہمیوں کی گُتھی پڑھا تھا۔ اسی وقت آپ کو کچھ لکھنے کا مجھے خیال ہوا۔ تب سے اب تک کئی بار یہ خیال ذہن میں آیا لیکن کئی سببوں سے سنکوچ (جھجک) کر کے رہ گیا۔ حال میں ایک دوست نے مجھے لاہور کے اُردو روزانہ انقلاب کا ۳۰ مئی کا پرچہ لا کر دیا جس میں 'اکھل بھارتیہ ساہیہ پریشد کے ناگپور اجلاس کے بارے میں مولانا عبدالحق کا لمبا خط چھپا ہے۔ ظاہر ہے یہ خط آپ نے دیکھا ہے اور جن کترنوں کو سامنے رکھ کر آپ نے اپنا لیکھ (مضمون) لکھا ہے۔ ان میں یہ خط بھی رہا ہوگا۔ محض اپنا فرض سمجھ کر میں آج یہ لمبا خط لکھ رہا ہوں' آپ کے لیکھ (مضمون) کی نیچے لکھی ہوئی باتوں کی طرف میں آپ کا دھیان لانا چاہتا ہوں۔

۱۔ ''اُردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا''۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ نام اسی طرح خود بخود اس سے پہلے کی ہندی یا ہندوی کے ساتھ بہت سے ایسے عربی' فارسی' ترکی شبدوں (لفظوں) اور محاوروں کے میل سے بنی ہوئی زبان کے لیے رائج ہونے لگا جو لشکری لوگوں میں بولے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بالکل قدرتی تھا۔ کسی بھی خاص مطلب سے کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا۔ اس کے بعد عرصہ تک اس نئی ملی جلی اور مروجہ زبان کے لیے ہندی اور ہندوی شبد (لفظ) بھی استعمال ہوتے رہے' یہ دونوں نام بھی مسلمانوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں ہی نے پہلے پہل اس زبان کو جو ان سے پہلے ہندوستان کی راجدھانی کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ ہند سے ہندی یا ہندوی کہنا شروع کیا۔ اسے اپنایا اور اسے ترقی دی۔ بعد میں جب اس زبان میں فارسی' عربی' ترکی سے کچھ شبد

(لفظ) اور محاورے مل کر اس کا روپ (شکل) بدلا تو ہندی نام کی جگہ صرف اُردو نام کا استعمال ہونے لگنا بھی ایک قدرتی چیز تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں فارسی میں (اُردو) لشکر یا لشکر گاہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے دلی میں 'اُردو بازار' تھا۔ جہاں اس نئی زبان نے شکل اختیار کی۔ مشہور شاعر غالب نے ۱۸۵۷ھ کے بعد کی دلی کی بربادی کو بیان کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے: ''دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے چلے جاتے ہیں' واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا! اُردو بازار نہ رہا' اُردو کہاں' دلی کہاں' واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے' چھاؤنی ہے۔

۲۔ ہندی اور اُردو ان دونوں شبدوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور ان کے مصدری معنی کچھ بھی ہوں' اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آج یہ دونوں نام ہندوستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں اور ان کے دو صاف الگ الگ مروجہ معنی ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنانا چاہتے ہوں انھیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس سچائی کو محسوس کر کے بھی آپ نے خود کچھ سال پہلے ہندوستانی شبد (لفظ) کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا۔ پھر اب وہ حالت بدل گئی۔

- آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر ''اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اُردو والے)' بھاشا (زبان) کا دیا کرن (قواعد) بھی بدل دیتے ہیں''۔ مجھے اور بھی دکھ اور حیرانی ہوئی۔ پچھلے پانچ' سات سو برسوں کے اندر اندر کی ہندوستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اچھی کھوج گزشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ہے شاید کسی دوسرے نے نہیں کی۔ اس کے علاوہ اگر آپ اُردو ہندی دونوں کے ودوان (عالم) منشی پریم چند سے دریافت کر لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے۔ مجھے خود کم سے کم اٹھائیس سال سے آج کل کی اکثر ہندی (اس شبد) (لفظ) کا استعمال میں مروجہ ہی معنی میں کر رہا ہوں۔ مصنفوں سے اس معاملہ میں کافی شکایت ہے۔

شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندوستانی کے کسی بھی

ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ الہٰ آباد کے تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ پنڈت (کاشمیروں کو چھوڑ کر) جب اپنے گھروں میں بات چیت کرتے ہیں۔ ''ہمرے دوارے اِک مہرارو کھڑی با'' (ہمارے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے) بنارس کے پنڈت تو اور بھی عجیب زبان بولتے ہیں جس کو نہ میں سمجھتا ہوں، نہ لکھ سکتا ہوں۔ ان الہٰ آبادی اور بناری زبانوں کا ویا کرن (قواعد) ہندی یا اُردو کے ویا کرن سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ کشمیری بلاشبہ خالص ہندوستانی بولتے ہیں لیکن اگر ان کی بول چال کی زبان کو اُردو یا ہندی دونوں میں سے ایک نام دینا پڑے تو وہ اُردو ہے ہندی نہیں۔ اگر آپ کسی ان پڑھ کشمیری بڑھیا کو پکڑ کر اسے کسی اُردو اخبار کا ایک کالم پڑھ کر سنائیں، اور پھر اسی طرح مضمون پر کسی ہندی سماچار پتر (اخبار) کا ایک کالم سنائیں تو جتنا اُردو اخبار سے اس کے پلے پڑ سکے گا اتنا ہندی سماچار پتر سے نہیں پڑے گا۔ برخلاف اس کے آج کل کی اُردو بلاشبہ کچھ مقاموں کی بول چال کی زبان ہے۔ لکھنؤ، دلی میرٹھ، مرادآباد اور آس پاس کے کچھ علاقوں میں بھی خالص اُردو بولی جاتی ہے۔ دلی، میرٹھ کی مہترانیاں بھی خالص اُردو بولتی ہیں۔ لکھنؤ اور دلی کی زبانوں میں بھی فرق ہے لیکن وہ اتنا باریک ہے کہ بڑے سے بڑے ودیشی یا دیگر صوبوں کے عالم بھی کبھی کبھی اسے نہیں پکڑ پاتے۔

آپ کی اجازت سے میں اپنے ہی گھر کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ میری دادی مہابن کی رہنے والی تھیں جو برج کا مرکز ہے اور ان پڑھ تھیں۔ ماں دلی کی تھیں اور صرف ناگری حروف پڑھ سکتی تھیں۔ میرے گھر میں ٹھیک یہی زبان بولی جاتی تھی، جس میں مَیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محض دو باتوں میں فرق تھا۔ ایک تو سنسکرت شبدوں کی جگہ اُردو فارسی سے زیادہ عام فہم الفاظ تھے اور دوسرے وہ زبان زیادہ بامحاورہ تھی، میری زبان ادھر ادھر گھومنے اور ہر طرح کی چیزیں پڑھنے کی وجہ سے کھچڑی ہوگئی ہے۔ میری ان پڑھ دادی رِن نہیں سمجھتی تھی قرضہ سمجھتی تھی۔ بڑھائی کی بجائے ان کی زبان پر مبارکباد زیادہ چڑھا ہوا تھا اور منش، جیو، پرتھوی، دشا وغیرہ کی جگہ آدمی، زبان، زمین اور حالت لفظوں کا استعمال کرتی تھیں۔ یہی زبان میری ماں کی زبان تھی۔

اگر اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچی ہے کہ ہندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ہے، اُردو ہے۔ یہاں میرا مطلب کھڑی بولی ہندی سے ہے۔ برج بھاشا یا اودھی تو ویا کرن (قواعد) کے خیال سے ہندی اُردو سے بہت دور ہیں۔ اسی لیے مولانا عبدالحق نے ناگپور میں آپ سے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں ہیں۔ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ آج کل کی ہندی زیادہ تر کتابی اور بناوٹی زبان ہے۔ کچھ تو فرقہ وارانہ جذبہ اور زمانۂ قدیم کی طرف جانے کی خواہش کچھ ایک قومی زبان تعمیر کرنے کا خیال اور کم سے کم شروع میں ایک حد درجہ تک حکام کے خودغرضانہ اشارے اور ان کی مدد۔ ان تمام چیزوں کے سہارے پچھلے تیس چالیس سال سے ملک میں رائج کی جارہی ہیں، اس کے مقابلہ میں اُردو ایک زیادہ قدرتی اور زندہ زبان ہے، ہیں دونوں اس ملک کی پیدائش۔ رہا سوال ویا کرن (قواعد) کا۔ آج کل کی ہندی کو اپنا ویا کرن اور ڈھانچہ ظاہر ہے، اُردو ہی سے لینا پڑا۔ اودھی یا برج بھاشا ایک آٹھ سو سال پہلے کی ہندی سے نہ تو اپنا ویا کرن لے سکتی ہے اور نہ وہ چل سکتا ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس وقت اُردو اور ہندی کا ویا کرن (قواعد) اور ڈھانچہ ایک ہی ہے اور ایک ہی ہونا چاہیے اور اس سے کبھی آئندہ ایک ہندوستانی زبان کے جنم کی امید ہو سکتی ہے لیکن ہندی کے کچھ ایسے ودوان (عالم) جو گھروں میں الٰہ آبادی، بنارسی، اودھی وغیرہ بولتے ہیں یعنی جن کی مادری زبان نہ ہندی ہے نہ اُردو، کئی طرح سے ہماری اس ہندوستانی زبان کے بنے بنائے ویا کرن کو خراب کر رہے ہیں مثلاً تذکیر و تانیث میں یہ لوگ اکثر سنسکرت لغت سے شبدوں کے تذکیر و تانیث کا پتہ لگا کر ہندی میں اسی طرح رائج کرنے کی خلافِ قدرت کوشش کرتے ہیں اور بھی کئی چیزیں ہیں لیکن ان میں ان کی وضاحت میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہماری زبان ایک اعلیٰ زندہ زبان ہے جو ہزاروں سال میں آہستہ آہستہ اس روپ تک آئی ہے اور آئندہ بھی بدلے گی لیکن سنسکرت وہ نہیں ہے نہ اس کا دیا کرن سنسکرت ویا کرن ہے۔ سنسکرت میں تین وچن (صیغے) ہیں۔ ہندی میں

دو، سنسکرت میں ماتا اور پتا دونوں کے لیے ایک (گھتی) سے کام چل جاتا ہے۔ ہندی میں ہم دو علیحدہ علیحدہ فعل استعمال کرتے ہیں وغیرہ۔

ہاں کچھ مصنف ہر زبان کے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ویا کرن کے قاعدوں سے بندھنا نہیں چاہتے۔ ان میں کچھ اعلیٰ مرتبے کے ہوتے ہیں جنھیں ایسا کرنے کا اختیار بھی دیا جا سکتا ہے مثلاً ہندی میں مرحوم پنڈت بالکشن کرشن بھٹ۔ لیکن اگر یہ قصور ہے تو جہاں تک مجھے معلوم ہوتا ہے ہندی یا اُردو کا کوئی قدیم یا حال کا ادیب اس معاملہ میں شاید اتنا قصوروار نہیں ہے جتنا مرحوم بھٹ جی۔

اُردو کے بہت سے ادیب اُردو لفظوں کی فارسی' عربی جمع کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ یہ رواج اتنا ہی غلط کہا جا سکتا ہے جتنا ہندی میں سمیک روپین لکھنا یا پاخانہ کی جگہ شوچالیہ لکھنا۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اُردو میں فی زمانہ کافی ادیب اس طرح کے ہیں جو اس رواج کی کھلی مخالفت کرتے ہیں لیکن پھر بھی وکیلوں کی جگہ وکلاء لکھنے سے ہمارا ویا کرن (قواعد) اتنا نہیں بدلتا جتنا وایو (ہوا) بہہ رہی ہے، کی جگہ وایو بہہ رہا ہے کہنے سے۔ اس لیے کیونکہ سنسکرت میں وایو مذکر ہے۔

۴۔ آپ نے لکھا ہے''مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی۔ ہندوستانی کے بجائے صرف ہندوستانی یا ہندی اُردو کے پیرلوگ (استعمال) کا پرستاؤ (لحاظ) رکھا تھا۔ مجھے تو ان دونوں میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بھارتی ساہتہ پریشد اپنے جنم (پیدائش) کو نہیں بھول سکتا...... اسی لیے شبد (الفاظ) کا رکھنا ضروری ہو گیا۔

اگر بھارتی ساہتہ پریشد ہندی ساہتہ سمیلن کا ایک بچہ ہے اور اسی طرح اس سے کام کرنا چاہیے تو آپ کی باقی بات تو ٹھیک ہے۔ پھر تو یہی غنیمت ہے کہ آپ کے اثر سے انھوں نے محض ''ہندی'' کی جگہ ہندی ہندوستانی رکھنا منظور کر لیا اور اگر جس زبان میں وہ استعمال کریں وہ سچ ہندوستانیت کے کچھ نزدیک آوے تو خوش قسمتی کی بات ہو گی۔ لیکن مولانا عبدالحق کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمی اس بارے میں ہو گئی۔ جو اُردو ادیب وہاں آئے تھے وہ غلط امیدیں باندھ کر آئے تھے۔ میں بڑے سنکوچ (جھجک) کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ شاید انھیں دعوت دینے میں بھی بے احتیاطی

ضرور ہوئی۔ ملک کی بڑی یہی خوش قسمتی ہوئی۔ اگر آپ کی رہنمائی میں کئی ایسی ہندوستانی ساہتہ پریشد قائم ہوسکتی ہے جو اپنے رسالوں اور کتابوں میں ہندوستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتی اور جس کی چیزیں ناگری اور فارسی دونوں حروف میں نکل کر ہندی اور اُردو دونوں کے پڑھنے والوں کو آہستہ آہستہ ہندوستانی زبان کی طرف لائیں۔

باپو جی! میں نے عبدالحق صاحب کے خط اور آپ کے لیکھ (مضمون) دونوں کو ملا کر پڑھا۔ جو شکوک اس خط سے پیدا ہوتے ہیں آپ کے لیکھ (مضمون) سے وہ رفع نہیں ہوتے۔ میں آپ سے پرارتھنا (التجا) کروں گا کہ آپ پھر ایک مرتبہ اس خط کو دیکھیں اور اگر ہو سکے تو آپ بھی اس کے شبہوں کو رفع کریں۔ جس طرح سے انھوں نے واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس میں غلطی ہوسکتی ہے۔ ان کی رائے بھی کم سے کم میں تو ہر بات میں ماننے کو نہیں تیار ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خط دکھے ہوئے دل سے اور نیک نیتی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ان کے شکوک رفع ہونے چاہئیں تھے۔ میں صرف ایک مثال دوں گا۔

اس خط کے مطابق آپ نے کہا تھا:

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

اگر ریزولیشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو سمجھا گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ گجرات کے مسلمان اُردو کو اپنی مذہبی زبان کہتے ہیں۔ میں یہ بھی اندازہ کرسکتا ہوں کہ جب سے اُردو ہندی کا یہ بدقسمت جھگڑا چلا دوسرے صوبوں میں اُردو کے بہت سے مسلمان مبلغ اُردو کو اپنی مذہبی زبان کہہ کر اس کی تبلیغ کرتے ہوں گے۔ یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ خالص ادبی سوال فرقہ وارانہ سوال بن گیا۔ لیکن ان باتوں سے واقعات نہیں بدل سکتے۔ اُردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے اور نہ کبھی تھی۔ وہ محض اس ملک کے لاکھوں رہنے والوں کے حق میں ہندو مسلمان عیسائی اور جین سب شامل ہیں۔ قدرتی اور مادری زبان ہے۔ اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا مسلمانوں نے اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اس پر ویسا ہی فخر ہے جیسا کہ مسلمانوں کو ہوسکتا ہے۔ ہندی میں تو رامائن بھی ہے جسے کم سے کم شمالی ہند کے لاکھوں ہندو اپنی ویسی ہی مذہبی کتاب مانتے ہیں جیسی کسی دوسری کتاب کو۔ اُردو میں تو مسلمانوں کی کوئی اس طرح کی کتاب بھی نہیں ہے۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہو کہ شمالی ہند میں کم سے کم ہزاروں ہندو گھر ابھی تک

ایسے ہیں جہاں دسہرے کے دن پوجا کے وقت پورب کا بردا اور پچھم کا گھوڑا، اُتر کا تیر اور اور دکھن کا چیریاان سے ملتے جلتے الفاظ کاغذ پر اُردو حرفوں میں لکھے جاتے ہیں۔اب اگر اس طرح کے لوگوں کو دھرم سے گرا ہوا کہہ کر علیحدہ کر دیا جائے یا مہلک تنگ خیالی کے اثر میں ہم ان طریقوں کو بدلنے کی کوشش کریں تو دوسری بات ہے۔

یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اُردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔اگر ہم اُردو کو قرآن کے حرفوں میں لکھنے کی کوشش بھی کریں تو معمولی حرفوں کی شکلیں تو کافی بدل ہی جاویں گی۔ہمیں پڑوسی کو فروسی لکھنا پڑے گا۔چاند کو جاند اور گائے کو کائے' یا غائے' کھانا کو کانا وغیرہ۔آج کل کے فارسی حروف، جن میں ہندوستانی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ نئی علامتیں جوڑ کر اُردو لکھی جاتی ہے، عربی حروف (خطِ نسخ) سے صدیوں پہلے کی ایجاد ہیں۔دونوں میں تو مشابہت بھی ہے لیکن مشابہت تو گجراتی' بنگلا اور ناگری حرفوں میں بھی کافی ہے۔آوازیں تو بالکل وہی ہیں۔اس کی بنا پر یہ کہنا تو شاید ٹھیک نہ ہوگا کہ گجراتی اور بنگالی رگ وید کے حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔

یہ بات الگ ہی رہی کہ کسی خاص کتاب کے حروف میں لکھے جانے کی وجہ سے بھی کوئی زبان کسی خاص جماعت کی زبان نہیں بن جاتی۔

اوپر کے اقتباس کی باقی باتیں بھی اسی طرح حقیقت کے خلاف ہیں۔

اُردو ادب سے واقف اور اس کے پریمیوں میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تھوڑے بہت ہندو تک بھی ہیں جنھیں اس بات پر قدرتی دکھ ہوتا ہے کہ اس اُردو ہندی کے سوکو بھی خالص فرقہ وارانہ شکل دی جاوے۔آپ کی طاقت اس بارے میں بہت ہے اور میری عاجزانہ پراتھانہ (التجا) ہے کہ آپ اس غلط میلان کو ہو سکے تو روکیں۔

اس کے علاوہ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو کے مسلمان ادیبوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دل سے آپ کی زندگی کے مقصد کی قدر کرتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنے کرانے کی بھی کوشش کرتے رہے ہیں۔بہت سے ایسے ہیں جو اگرچہ اپنی اخلاقی کمزوری کے وقت یا کسی دوسری وجہ سے سیاسی تحریک میں مناسب حصہ نہیں لے سکتے تاہم اپنے میدان میں قومی اتحاد کو قائم کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں جی جان سے کوشش کرتے رہے ہیں۔اُردو رسالوں میں ودوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں (لفظوں) کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ایک مسلم اُردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔آپ کو تعجب ہوگا۔ودوان (ذی علم) اڈیٹر نے جواب دیا''میں حجازی اُردو سے اپنے رسالے کو

ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔'' اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالے میں نہیں ہو رہا ہے۔ لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اُردو نظم و نثر دونوں کے کچھ نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کے کانووکیشن اڈریس میں نقل کیے تھے جنھیں آپ اگر جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالہ میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ اُردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا جسے اگر جوں کا توں چھاپ دیں تو محض اُردو پڑھ سکنے والا اسے اُردو پڑھ کر اُردو ہی سمجھے۔ آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سندر (خوبصورت) ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا دونوں سمجھتے تھے لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ وہ چیز نہیں ہے۔

مولانا سلیمان ندوی جیسے وِدوان (ذی علم) جنھوں نے اپنی یوم النبی ﷺ کی چھپی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمد ﷺ کے سوامی محمد ﷺ لکھا ہے۔ برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اُردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہیے بلکہ اُردو کی جگہ اسے ہندوستانی کہنا چاہیے۔ رسم الخط کا سوال علیحدہ ہے۔ ان قابل تعریف کوششوں کی کچھ جھلک آپ کو عبدالحق صاحب کے خط میں بھی مل سکتی ہے۔ یہ سب کچھ کافی حد تو آپ ہی کے پریم (محبت) اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا۔ مگر ناگپور سے اب نہ جانے کیا ہوا بہت سے اس طرح کے سچے اور سنجیدہ مسلمان کام کرنے والوں کے دل بھی شکوک اور مایوسی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جو اپنے دکھ کو اپنی زبان تک بھی لانا نہیں چاہتے۔

خط بند کرنے سے پہلے رسم الخط کی بابت بھی اپنا خیال آپ کے سامنے رکھ دوں۔ بہت دنوں سے لوگ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں۔ مثلاً بابو راما نند چیٹر جی وغیرہ۔

میں ۳۶ء کے شروع تک اس کے خلاف رہا لیکن اب کچھ رائے بدلتی جا رہی ہے۔ دلیلوں میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔

آپ کا خادم

سندر لال

۵۶ چک، الٰہ آباد، ۲۴-۹-۳۶

مہاتما گاندھی کا خط سندر لال جی کے نام

بھائی سندر لال

تم نے لکھا سو اچھا ہی کیا۔ مولوی صاحب کا لیکھ میں نے نہیں پڑھا۔ کچھ حصہ میرے دیکھنے میں آیا تھا۔ مولوی صاحب کا لیکھ (مضمون) مجھے بھیجو۔

میں نے جو کچھ کیا وہ بالکل نرمل ہتیو (نیک نیتی) سے کیا ہے۔ میں جو ۱۹۲۰ء میں تھا۔ وہی اب پھر ہوں۔ میرا پریتن (کوشش) ایک شبد کا یوجنا (تقرر) ہے۔ اس لیے میں نے ہندوستانی شبد (لفظ) کانگریس میں پرچلت (جاری) کرایا ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اندور میں دیاکھیا (تشریح) ٹھیک کروائی۔ اکھل بھارت سمیلن میں ایک قدم آگے بڑھا۔ اس میں بھی ہیتو (مقصد) یہی تھا۔ ہندو مسلمان کی بولی کو ایک جاننا اور ایک کرنا۔

تمھیں نے بتایا کہ اُردو نام کا خاص کارن (وجہ) ملن تھا۔ ایسا کہنے کا جھاو نہیں تھا (یعنی میرا مطلب کسی کو برا کہنے کا نہیں تھا)۔

دیاکرن (قواعد) کی بات بھی تمھیں نے سوکھرت (منظور) کی ہے۔ ہندی لیکھک (مصنف) دوسرے ڈھنگ کی غلطی کرتے ہیں۔ اس سے میری بات مہیا (غلط) نہیں ہوتی۔

جو غلط فہمیاں چل رہی ہیں وہ دور ہوئی ہیں۔ کیونکہ اس کے لیے ایک بھی کارن (وجہ) نہیں ہے۔ میں اُردو کا تیاگ (چھوڑنا) چاہتا ہی نہیں ہوں۔ اس کی میرے پاس کافی قدر ہے۔

ہر روز میں کچھ نہ کچھ اُردو پڑھتا ہوں۔ کچھ مسلمان بھائی بہنوں کو اُردو میں خط بھی لکھتا ہوں۔ مجھے ڈھیریہ (اطمینان) ہے۔

میرا خیال ہے میں نے تمہارے سب پرشنوں (سوالوں) کا اتر (جواب) دیدیا ہے تو بھی اگر کچھ شک رہا ہے تو آئندہ دیکھا جائے گا۔ اتنا بھی بڑی بھیر (مشغولیت) میں لکھ رہا ہوں۔

سے گاؤں۔ وردھا

۲۸۔۹۔۳۶ء

ایک چیز چھٹ گئی ہے۔ میرے واکیہ (فقرے جو ادھرت (اقتباس) کیے ہیں وہ بھاشا (زبان) میری نہیں ہے کہاں سے نکالے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد محمود کا خط پنڈت جواہر لال نہرو کے نام

بلاشبہ ہندوستان میں مسلمانوں کی درآمد اپنے ساتھ نو بنو مشکلات اور تازہ بہ تازہ مسائل لے کر آئی لیکن جہاں اُن کی آمد سے یہ جدید مسائل اور مشکلات رونما ہوئیں وہیں ہر شعبۂ حیات میں ملک کو اکثر مفید چیزیں بھی حاصل ہو گئیں، ہندو ذہنی طور پر اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے، لیکن اُن میں نظم واتحاد کی بہت بڑی کمی تھی، مسلمانوں نے ہندوستان کو طاقتور بنایا، اتحاد و تنظیم جن کی اُسے سخت ضرورت تھی عطا کیے اور اس طرح ملک کو اس قابل بنا دیا کہ وہ عہد جدید کا مقابلہ کر سکے۔

اپنی آمد کے کچھ عرصے بعد ہی مسلمانوں نے گاؤ کشی کے معاملہ میں ہندوؤں کے قومی اور گہرے جذبات کا احساس کر لیا تھا اور مسلمان حکمرانوں نے ابتدا ہی سے اس کے امتناع یا کم از کم اس کو محدود کرنے کے لیے قدم اُٹھا لیا تھا جس کو اپنے استحکام کے لیے اُن کی پہلی تحریک سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک مشترکہ نظم و نسق کو متعارف کرنے، ذات پات میں ترمیم کرنے، مشترکہ نظم مالیات اور تعمیرات، تصویر کشی اور موسیقی کے تعارف اور سب سے آخر میں ہندوستان کو ایک ایسی مشترکہ اور قابل خدمت زبان عطا کرنے کر کے جو جزیرہ نما کی مختلف نسلوں کے مابین رسل ورسائل اور تعلقات قائم رکھنے کا ایک عمدہ ذریعہ تھی۔ مختصر یہ کہ اخلاقی، سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسبِ حال ہو۔ یہ اُن لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہلِ ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا۔

کوئی اسے اچھا سمجھے یا بُرا ہندو اور مسلمان کو اِس ملک میں ساتھ ساتھ رہنا ہے۔ اس لیے ہر دو کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ ایسے تمام ذرائع ڈھونڈھ نکالیں جن میں ملک کے سود و بہبود کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ رہ سکیں۔

ماضی وحال

ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان نے مسلمانوں کی درآمد سے پیدا شدہ مسائل کے حل کرنے کی

زبردست جدوجہد کی، اور بڑی حد تک وہ کامیاب رہا، لیکن ہند جدید نے جس کا پیشہ قوم پرستی ہے۔ صرف سنجیدگی کے ساتھ اِن مسائل کو حل کرنے کی کوئی کوشش ہی نہ کی، بلکہ اُس کی مساعی اُس مقام سے بھی قدم پیچھے ہٹا رہی ہیں جس پر عہد وسطی کی حکمرانوں نے قبضہ پالیا تھا۔ ایک مشترکہ معاشرت کی نشوونما کی گئی تھی اور ہندوستان کی موجودہ معاشرت نہ تو ہندوؤں کی معاشرت ہے نہ مسلمانوں کی۔

یہ یقیناً ازمنۂ وسطی کے بہترین ہندو اور مسلمان دماغوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے جو فارس کی معاشرت اور زبان سے اثر پذیر ہوئے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ ''فارس مشرق کا فرانس تھا جو اپنے ہمسایوں کو اپنی معاشرت اور زبان سے آشنا کر رہا تھا۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے یہ ایک مشترکہ اور بیش بہا ''میراث'' ہے۔ جب مسلمان اس ''مشترکہ میراث'' کا تحفظ کرنے کے لیے چلاتے ہیں تو وہ کسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ہندو یہاں قدیم ہندوستانی یادگاروں کا ایک ذخیرہ رکھتے ہیں لیکن مسلمان ہندوستان میں صرف چند چیزیں ''بطور مشترکہ میراث'' رکھتے ہیں، جس پر اُنھیں فخر ہے کیونکہ اپنے تمام ہم مذہب انسانوں سے ان کے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور یہ ایک وجہ مزید ہے جو اُنھیں اُس کی مضبوط گرفت پر مجبور کرتی ہے۔ کیا ہم بھی فی الحقیقت اس کے تحفظ کی کوئی کوشش کر رہے ہیں؟ میں یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اِس کا تحفظ کریں اور اس میں وسعت کی اور زیادہ کوشش کریں۔ ہماری جدوجہد یہ ہے (جو ممکن ہے غیر ارادی ہو) کہ ہم اُس قابلِ احترام بنیاد کو سرے ہی سے ڈھا دیں جو ہمارے اسلاف کے ہاتھوں ڈالی گئی تھی۔

ہمارا نصب العین

سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اِس سمت میں قدم اُٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترکہ قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اِس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ ''اقوام'' بستی ہیں، کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ''ہر قوم'' علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کر دیا کرے۔؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اِس وقت تک کی کوششیں اس کے برعکس بالکل ناکام رہی ہیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اسی حل کی تائید کی تھی لیکن اُن کے نزدیک مسلمانوں کو ایسے حل کی بنا پر نقصان

اٹھانے کا اندیشہ تھا کیونکہ اُن کی آبادی منتشر ہے۔ اس لیے نہ تو مشترکہ دولت ہند میں ان کی آواز زیادہ مؤثر ثابت ہو سکے گی نہ مادی اور انسانی امداد میں ہی اُن کا حصہ رسد کچھ قیمتی ہوگا، اس لیے ڈاکٹر اقبال کی خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کو ہند ہندی اور ہند مسلم دو حصوں میں منقسم کر دی جائے۔

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اُسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال سے ہمیشہ نہ صرف ایسی راہ پر چلنا چاہیے بلکہ ہمارے پیشے اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے۔ بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیے ایک مضرت ہے لیکن اس کا کوئی چارہ کار نہیں اور چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کر لینا چاہیے۔

اہم مشکلات اور دشوار مسائل

مجھے اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ مسلمان ہر دو حل کے فوائد حاصل کر لینا چاہتے ہیں اور مضرتوں کے قبول سے انکار کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں ہے۔ غالباً اس سے بدتر ہی ہے۔ وہ اکبر اعظم کے عمل کردہ حل کی تبلیغ تو کرتے ہی ہیں لیکن فی الحال یہ اُن کا مقصود نظر نہیں ہے۔ بعض مشہور لیڈر تو لفظِ ''قوم'' سے مراد صرف ہندوؤں کو تصور کرتے ہیں اور ہر شعبۂ زندگی میں ارادتاً یہ کوشش جاری ہے کہ معاشری یکسانیت جس حد تک بھی باقی ہے ختم کر دی جائے۔

مسلمانوں کے لیے یہ امر بالکل فطری ہے کہ وہ ان چیزوں پر جن کی نشو و نما اور ترقی میں اُن کا حصہ ہے فخر کریں۔ جب گنگا اور ہمالیہ کا نام لیا جاتا ہے تو ایک ہندو کا دل فرطِ جوش سے دھڑکنے لگتا ہے کیونکہ اس کے پیشِ نظر عہدِ ماضی کے چار ہزار سال آ جاتے ہیں لیکن ایک مسلمان صرف اپنے ملک کے دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت پر فخر کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ اس نے گذشتہ چار ہزار سال کی تاریخ کو خود تعمیر نہیں کیا ہے لیکن تاج یا ہندی ہندوستانی یا اُردو کے اظہار پر (یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ازمنۂ وسطیٰ کی اِن قدیم یادگاروں کو کس نام سے یاد کیا جائے'') ایک مسلمان بلند جذبات افتخار محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ چیزیں اُسے اپنے اُس حصۂ عمل کی یاد دلاتی ہیں (جو اُس نے مشترکہ فنِ تعمیر اور ایسی زبان کی نشو و نما کے لیے جو ملک کی بہبودی سے متعلق ہو) انجام دیا ہے۔ یہ جذبۂ افتخار اُس کو ہندوستان سے دائمی طور پر وابستہ کر دیتا ہے۔

اگر یہ جذبۂ فخر و افتخار اُس سے چھین لیا جائے تو وہ ایک گمنامی میں کھو جاتا ہے اور خود کو ایسا محسوس کرتا

ہے کہ وہ ایک اجنبی یا ایسا شخص ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور یہاں کوئی مشترکہ تعلقات کی کڑی اس کے لیے موجود نہیں۔ اس لیے رفاقت اور ہمدردی کے لیے اُسے دوسری جانب نگاہ ڈالنی چاہیے۔ البتہ اُس کے اندر جتنا یہ جذبۂ افتخار پیدا کیا جائے گا اُسے اتنا ہی ہندوستان کے لیے ذمہ دارانہ احساسِ رفاقت اور ہم وطنوں سے محبت پیدا ہوگی، آپ کو شاید یاد ہوگا کہ ۱۹۳۱ء میں ورکنگ کمیٹی کے جلسہ منعقدہ بمبئی میں جبکہ کانگریس کا جھنڈا مسئلہ متنازعہ تھا میں نے پوری طاقت کے ساتھ اپنے قومی نشان میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے نظریہ کی تائید کی تھی، باوجودیکہ اس کے سوا میں تمام دیگر امور میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا شدید مخالف ہوں لیکن یہی نظریہ تھا جس کے پیشِ نظر میں نے نشانِ کانگریس پر فرقہ وارانہ نمائندگی کے لیے زور دیا تھا۔

قضیہ ہندی اور اُردو

ایک متحدہ قومیت کی تعمیر کے لیے تاریخی اتحاد بے انتہا ضروری ہے اور اس ضرورت کے لیے لامحالہ اس تاریخی اتحاد کی یادگاروں کا قائم رکھنا بھی لازمی ہے۔

موجودہ ہندی، ہندوستانی یا اُردو کا قضیہ اس وقت ایک زیرِ بحث سوال ہے۔ آپ کی اِس واقفیت سے کہ مسلمانوں کے (اس بنا پر) کتنے شدید احساسات پیدا ہو گئے ہیں مجھے تھوڑا سا تعجب ہوگا۔ براہِ نوازش اس کی بنیاد فرقہ وارانہ میثاق کی روشنی میں نہ دیکھیے۔ اُس قضیہ میں تو ایسا افتراق پرورانہ عنصر بھی شامل تھا جس کو حکومت کے سیاسی پروپیگنڈے کی حمایت حاصل تھی۔

لیکن یہ عنصر اپنے اندر اصلیت موجود رکھتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے اندر حقیقی اور دلسوز غم وغصہ کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ انھیں یہ یقین ہو چلا ہے کہ ایک ایک کر کے وہ تمام رشتے توڑے جا رہے ہیں، جو طویل تاریخی اتحاد کی پیداوار تھے اور اس طرح اُن کو ملک کے عام نظام سیاسی سے علیحدہ ہٹانے کی کوشش جاری ہے۔ یقیناً ہندوؤں میں معاشرت قائم کی بحالی کے لیے ایک پُرزور تحریک شروع ہوگئی ہے اور موجودہ سیاسی تنازعات نے اُسے اور تقویت دے دی ہے۔ مسلمانوں کو اپنی علیحدہ روی کا خود ہی مشکور ہونا چاہیے جس کے ردِعمل میں یہ نتائج رونما ہوئے اور ہندوؤں کے ہر شعبۂ حیات میں یہ ردِعمل بوجوہ احسن نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی طریقہ سے زبان وادب کے حلقوں میں بھی یہ ردِعمل اپنا اثر کیے بغیر نہ رہا ہے اور ایک عام رغبت بڑھتی جا رہی ہے جو مصنوعی طور پر ہماری زبان کو سنسکرت نما بنانے کی کوشش ہے اور ایک انسان کو اپنے اُن رفقاء کار کی

زبان سمجھنے میں بھی دقتیں پیش آتی ہیں جن کے ساتھ وہ سالہا سال رہا ہو۔ خصوصاً جبکہ وہ ایسی رغبت و میلان کے زیرِ اثر بول رہے ہوں۔

مسلمانوں کا عذر گناہ

اگر یہ حالت بغیر کسی مزاحمت کے ترقی کرتی رہی تو چند سالوں ہی میں ہمسائے ایک دوسرے کی زبان سمجھنے کے لیے ترجمان رکھنے پر مجبور ہوں گے لیکن یہ حالت قابلِ رشک و حسد نہ کہی جا سکے گی، ایک آدمی کو ایمانداری کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس باب میں پہلا گناہ خود مسلمانوں کی جانب سے کیا گیا ہے کیونکہ وہ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن اُس کو جائز بھی کہا جا سکتا ہے، اُن دنوں میں اسباب کا تقاضا ہی یہ تھا کہ مغلق اور مشکل زبان جس میں بڑے بڑے عربی الفاظ ہوں بولی جائے اُن اسباب کے خاتمہ کے بعد بھی غیر ارادی طور پر انھوں نے جاری رکھا لیکن انہوں نے عمداً ایسا ہر گز نہیں کیا او عصر حاضر میں تو ایک مخلصانہ کوشش اس امر کی جاری ہے کہ آسان ترین زبان استعمال کی جائے لیکن ناگپور ہندی کانفرنسوں کے بعد یہ قضیہ معراجِ کمال کو پہنچ گیا۔

ضروری شکایات

سب سے پہلی شکایت تو خود نام ''ہندی اتھو۔ ہندوستانی'' کے متعلق جو کہ نیا نام رکھا گیا ہے۔ کسی حالت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری زبان کا یہ تسمیہ خوشگوار نتائج پیدا کرنے کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ ہم سب سے پہلے شک و شبہ کی فضا میں یہ تشریح کرتے ہیں کہ لفظ ''اتھو'' اس کا ذمہ دار ہے، دوسرے یہ لفظ ''اتھو'' خود ایک مشترکہ نہیں ہے۔ تیسرے یہ ایک طویل اور غیر عالمانہ نام ہے۔

ذاتی طور پر میں صرف ''ہندی'' کو بجائے ہندی ہندوستانی'' کے پسند کروں گا کیونکہ یہ مختصر اور شیریں ہے۔ صرف ''ہندی'' اپنے اندر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا لیکن مسلمان کہتے ہیں کہ لفظ ہندی کے معنی سنسکرت زبان کے ہیں۔ اسی طرح اُردو کا مفہوم فارسی آمیز زبان پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے مفاہمت کے طور پر ''ہندوستانی'' لفظ کو خود مہاتما جی کی رہنمائی میں بطور مشترک زبان کے قبول و اختیار کر لیا گیا تھا۔

اس کے بعد وہ کون سی وزنی اور معقول ادبی وجوہ ہیں جو نام کی اس تبدیلی کا باعث ہوئیں؟ کچھ نہیں صرف جذباتی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہر جماعت اور فرقے کے جذبات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا موجودہ حالت میں ایک منظم مقاطعہ وسیع پیمانے پر برابر جاری ہے۔ اگر ایک فارسی یا عربی کا لفظ مشترکہ طور پر بولا اور سمجھا جاتا ہے تو اس کا مقاطعہ صرف اس بنیاد پر نہ ہونا چاہیے کہ یہ مسلمانوں سے نسبت رکھتا ہے۔

تیسری شکایت زبان کو سنسکرت بنائے جانے کے متعلق ہے ''ہنا'' جس کو ''ہندی اتھو ہندوستانی'' کا ایک نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جو سنسکرت نہیں جانتے۔

بابو راجیندر پرشاد کا خطبہ

ہندی سمیلن ناگپور کے اجلاس میں بابو راجیندر پرشاد کا خطبہ ادب کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ لوگ اُس کو بغیر پڑھے اُس پر بیجا نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ رسم الخط اور نام کے سوال سے فی الحال قطع نظر کر کے آسان زبان کے استعمال کرنے کے لیے اُن کی طاقتور استدعا ہماری سپاس گزاری کی مستحق ہے۔ انھوں نے ایک لفظ یا محاورہ کی آزمائش کے لیے بھی مشترکہ استعمال کے سوا کسی چیز کو مقدم نہیں بتایا۔

چوتھی شکایت یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اُردو کو مسلمانوں کی مذہبی زبان کہتے ہیں جبکہ حقیقتاً یہ زبان جسے ہم سب بالائی ہندوستان میں بولتے ہیں اُن متحدہ کوشش کا نتیجہ ہے جو ایک ہندوستانی ماحول میں کی گئی ہیں۔

پانچویں شکایت مسلمانوں کی یہ ہے کہ ایک متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر کے نظریہ کو بتدریج خارج کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ یہ اُن لوگوں کی جانب سے ایک عجیب شکایت ہے جنھوں نے خود اپنے افتراق پرورانہ مسلک کی بنیاد پر ہندوؤں میں یہ ردعمل پیدا کیا ہے۔ وہ قومی کانگریس میں شرکت سے بھی انکار کرتے ہیں اور اُن لوگوں پر یہ اثرات بھی نہیں ڈالنا چاہتے کہ وہ اس مشترکہ بار کو اپنے کاندھوں پر اُٹھالیں جو لوگ اُن کی موجودگی میں اُن کے دماغ سے نہیں سوچتے اور اُن کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ بہرحال یہ جس قدر بھی عجیب معلوم ہو ہم اس نکتہ چینی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

بعض تجاویز

۱۔ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ پہلا رسم الخط سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا زبان سے جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے۔ میں کوئی خاص تجویز پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس مسئلے پر میں اپنے شدید اور گہرے اختلافات کا احساس رکھتا ہوں کہ مجھے اس کی خوبیوں اور خامیوں کے متعلق کچھ کہنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ آنے والی نسلوں کے قوتِ فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔ اندریں اثنا ہر

دو رسم الخط رائج رہنے کی اجازت ہونی چاہیے، وہ باقی رکھے جائیں۔ ترقی ونشو ونما کریں اور ہر آدمی آزاد ہو کر جس رسم الخط کو پسند کرے استعمال کرے۔ قومی اداروں اور شعبہ ہائے حکومت میں دونوں رسم الخط تسلیم کیے جائیں۔

۲۔ جب تک کوئی معقول قومی یا ادبی وجوہ نہ پیدا ہوں۔ (لیکن مجھے ایسی وجوہ نظر نہیں آتیں) لفظ ''ہندوستانی'' بطور مفاہمت کے کم از کم اس وقت تک کے لیے اختیار کیا جائے جب تک موجودہ مجرمانہ اختلافات مکمل طور پر عوام کے ذہن سے دُور نہیں ہو پاتے اور لفظ ''ہندی'' کو زبان کے لیے نہیں بلکہ ''اہلِ ہند'' کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علیحدہ علیحدہ ''مذہبی اقوام'' ہیں۔ اسی لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔

۳۔ مہاتما جی اور آپ سب اس اصرار اور کوشش میں درماندہ نہ ہو جائیں کہ آسان زبان استعمال کی جائے۔ ایک لفظ کو اختیار کرنے کے واسطہ ردو قبول کا فیصلہ بھی وہی ہونا چاہیے جس کے متعلق بابو راجیندر پرشاد مشترکہ استعمال کی تلقین فرما چکے ہیں۔

۴۔ ایک مختصر سی کمیٹی اس ضرورت کے لیے مقرر کی جائے کہ وہ ایک مشترکہ معیار کی لغت تیار کرے جس کے بعد اس مسئلے میں تمام اختلافات کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی لغت تیار فرمالی ہے۔ اُسی لغت کی پہلے آزمائش کی جائے اور اگر وہ حسبِ ضرورت کافی نظر آئے تو اُسے اختیار کر لیا جائے۔

ایک استدعا

اگر ایک مختصر سی کانفرنس کسی مرکزی مقام پر ان تمام نقطہ ہائے نگاہ کے حامیوں کی طلب کی جائے تو کیا میں یہ توقع کروں کہ آپ اپنی موجودگی سے اُس موقع کی زینت اور عزت فرمائیں گے۔

اس اہم اور مخصوص مسئلہ سے قطع نظر کر کے اس کا وقت بھی آ گیا ہے کہ کانگریس اپنی خاص توجہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اور سیاسی تربیت کی بیداری پر صرف کرے۔ مجھے اس کی مشکلات کا اندازہ ہے۔ مجھ سے بہتر یہ کون جانتا ہے کہ کانگریس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بعض اوقات صرف مسلم رائے عامہ کی

تائید حاصل کرنے کے لیے اپنے وجود تک کو معرضِ خطر میں ڈال دیا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ شاید ا
فرقہ پرورانہ کشمکش اور اس اعتبار سے فروتنی ایک تلخ جام پینے کے بعد مہاتما جی عارضی طور پر عملی سیاست سے
علیحدگی اختیار کر چکے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کانگریس مسلمانوں کو اُن کی قسمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ جنگ
آزادی کے بہترین سپاہی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ایک مرتبہ اُن کے احساسات بیدار ہو جائیں اور ان کی دل
گہرائیوں تک اثر کر جائیں آج بھی ایک شخص مسلمانوں سے جو ہرا زادی کے نام پر اپیل کر سکتا ہے۔

اعتراف

لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ابھی کسی قابل ستائش درجہ تک ان کے احساسات کو بیدار نہیں کیا گیا ہے اور یہی واقعہ اس کا مظہر ہے کہ اُن کے دماغ کی پشت پر کوئی طاقت کام کر رہی ہے وہ غالبًا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کے معنی اُن کے لیے دوسری آقاؤں کی تبدیلی کے ہیں۔ وہ اس چیز کو غلطی سے ایسا تصور کرتے ہیں یا صحیح طور پر یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ اگر یہ غلط ہے (اور جیسا میں سمجھتا ہوں کہ غلط ہے) تو یہ شُبہات اُن کی سیاسی تربیت سے دور کیے جانے چاہئیں۔ مہاتما جی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ وہ بہشت میں جانا بھی بغیر مسلمانوں کے پسند نہ فرمائیں گے لیکن وہ اُن کی نجات سے اس درجہ مایوس نظر آتے ہیں (اور حقیقتاً ایک معمولی رہنما ان اسباب کے ماتحت ایسا کر سکتا تھا) کہ انہوں نے بہشت ارضی کی جانب مسلمانوں کی رہنمائی کو یکسر ترک کر دیا ہے، مگر وہ نہ ایک معمولی انسان ہیں نہ ایک معمولی رہنما، نہ کانگریس ایک معمولی سیاسی ادارہ ہے اور ایسی صورت میں آپ کو مسلمانوں کی نجات سے مایوس نہ ہونا چاہیے، میں کسی اتحاد کانفرس یا ایسی نوعیت کی کوئی دوسری تقریب کی تجویز نہیں کر رہا ہوں۔

☆☆☆
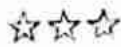
پنڈت جواہر لال نہرو کا خط ڈاکٹر سید محمود کے نام

بھائی محمود۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے اس جھگڑے کی طرف متوجہ کر دیا جو ہندی اُردو کے بارے میں کچھ دنوں سے ملک میں ہو رہا ہے۔ اس بحث کا ذکر تو میں برابر سنتا تھا لیکن دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اب تک اس کی طرف توجہ نہ کر سکا تھا۔ اب بھی میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سوال پر بہت زیادہ جوش کا اظہار کروں۔ اس لیے کہ اس زمانے میں جب دنیا پر سخت مصیبت کے دن گزر رہے ہیں اور خود ہمارے ملک کے کروڑوں بسنے والوں کی بلکہ تہذیب اور تمدن کی موت اور زیست کا سوال چھڑا ہوا ہے، اُردو ہندی کا مسئلہ مجھے تو اتنا زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتا، میں تو وہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ جو لوگ اس سوال پر اتنے جوش کا اظہار کرتے ہیں ان کو دنیا کے بڑے اور اہم مسائل کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ اشرفیاں تو لٹتی جاتی ہیں اور کوئلوں پر مہر ہو رہی ہے۔

اپنے ملک کے مسائل کو میں بالکل دوسری طرح سے دیکھتا ہوں۔ میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم وہ کش مکش ہے جو آج کل ترقی اور رجعت پسندی کے درمیان جاری ہے۔ ہر جگہ یہ کش مکش ایک نئے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ سپین اور فلسطین میں بھی اور ہندوستان میں بھی۔ آج کل جو کچھ سپین میں ہو رہا ہے۔ وہ دنیا کے لیے بلکہ خود ہندوستان کے لیے بھی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے اس سے اتنی ہی تکلیف ہوئی ہے جتنی اس کوشش سے جو برطانوی سامراج فلسطین کے عربوں کو کچلنے کی کر رہا ہے۔ یہ سب اور ہندوستان کی جنگ آزادی مجھے تو ایک ہی تصویر کے کئی رخ معلوم ہوتے ہیں اور اس عظیم الشان تصویر کے بدلتے ہوئے مناظر کے مقابلے میں وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جن میں ہم الجھے ہوئے ہیں مجھے بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں۔

اب ہندوستان کو لیجیے۔ یہاں سب سے بڑا مسئلہ افلاس اور بے روزگاری کا ہے۔ تمام دوسرے مسائل اس کے ماتحت ہیں اور ان پر الگ الگ غور نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو اسی طرح سوچتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہی صحیح طریقہ ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ نقطۂ نظر بہت سے لوگوں کا نہیں ہے اور خاص کر کے وہ لوگ جو ہندی اُردو کے مسئلے پر اس قدر لکھتے اور بولتے ہیں، اس سے بہت دور ہیں۔ زبان، ادب اور تمدن اسی وقت پھل پھول سکتے ہیں جب قوم ترقی کر رہی ہو اور اس کو اتنی آزادی ہو کہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دے سکے۔

بھوکے اور ننگے غلاموں کے لیے ایک ایسے سطحی تمدن کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جو ان تک پہنچتا ہی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے دوست اس مسئلے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔

میرے لیے ایک اور مشکل بھی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو لوگ اس سوال پر غور کر رہے ہیں وہ بے تعصبی سے یا علمی انداز میں اس سے بحث نہیں کرتے بلکہ ان کے دماغ شبے اور تعصب سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کو تو نکتہ چینی اور نیتوں پر شبہ کرنے سے فرصت ہی نہیں ملتی اور انھیں تو ہر جگہ سازش ہی نظر آتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ خود میری نیت پر بھی بعض لوگوں کو اعتماد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے میں اب تک اس مسئلے پر اپنی رائے ظاہر کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ اس لیے کہ جب میری نیت ہی مشتبہ ہے تو جو کچھ میں کہوں گا اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ لوگ جو کچھ میرے بارے میں کہتے ہیں اس کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہو جاتی ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں خود گاندھی جی کی نیت پر سخت حملے ہو رہے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اُردو کو مٹا دینے کی ایک گہری سازش میں شریک ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر مجھے کسی چیز پر یقین ہے تو وہ گاندھی جی کی نیک نیتی اور ہر معاملے میں راست گوئی کی عادت ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ میں بہت سی باتوں میں ان سے اختلاف رکھتا ہوں اور میں نے اکثر اس اختلاف کو ظاہر بھی کیا ہے لیکن مجھے ان کے بے مثل خلوص پر پورا ایمان ہے اور میں ان کی عظیم الشان خدمات کا اعتراف کرتا ہوں۔ میرے خیال میں تو ایک مشترک زبان کی جو کچھ خواہش اس ملک میں نظر آتی ہے اس کے پیدا کرنے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ یہ بڑی حد تک انھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کانگریس میں بھی اور اس کے باہر بھی لوگ یہ ماننے لگے ہیں کہ ملک کی مشترک زبان ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ باوجود اس کے کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اس چیز کا مجرم ٹھہراتے ہیں جس کے خلاف انھوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے۔ بہرحال ذاتیات سے اب میں زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ ہم جس مسئلے پر غور کر رہے ہیں اس کا ذاتیات سے اگر کچھ تعلق ہے تو اتنا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ صاف کر دینا چاہیے کہ کانگریس یعنی قوم پرست ہندوستان کا اعتقاد اس مسئلے میں کیا ہے؟ ہمارے دستور اساسی میں یہ بات صاف صاف لکھی ہوئی ہے کہ ملک اور کانگریس کی زبان ہندوستانی ہے اور یہ بھی صاف کر دیا گیا ہے کہ ناگری اور اُردو دونوں رسم الخط باضابطہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی کی ''بنیادی حقوق'' والی تجویز میں یہ موجود ہے کہ ''اقلیتوں اور مختلف لسانی رقبوں کے تمدن، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی۔'' اس سے زیادہ صاف اعلان اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہماری رائے ہے کہ ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کو جو قدیم ہیں اور جن کا ادب ترقی کر چکا ہے اپنے علاقوں میں ترقی کرنے

کے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں۔ اپنے علاقوں میں یہی زبانیں اصلی اور عام ہوں گی۔ یہ زبانیں ہندوستانی، بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلگو، کناڈی، ملیالم، اوڑیا، آسامی، سندھی وغیرہ ہیں۔ اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ ہندوستانی ان سب زبانوں کو دبا دے لیکن شمالی ہند کے ایک بہت بڑے رقبے میں ہندوستانی کی مختلف صورتیں رائج ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس تمام علاقے کے لیے جہاں تک ممکن ہے زبان کا ایک معیار مقرر کریں اور اسی کے ساتھ ہندوستانی کو تمام ملک کے لیے ایک لازمی ثانوی زبان کی حیثیت دیں تا کہ یہ مختلف علاقوں کو ایک رشتے میں منسلک کر سکے۔ کوئی دوسری زبان یہ کام نہیں کر سکتی اور میرا خیال ہے کہ آخر کار ہندوستانی سے ہی یہ کام لیا جائے گا۔ میں انگریزی یا دوسری غیر ملکی زبانوں کا مخالف نہیں ہوں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ ان زبانوں کو سیکھنا چاہیے تا کہ ہم دنیا سے تعلق قائم رکھ سکیں اور جدید خیالات سے واقف ہو سکیں لیکن یہ زبانیں ملک میں عام نہیں ہو سکتیں۔

ہندوستانی قومی زبان ہو کر رہے گی لیکن اس وقت اس کی کئی صورتیں رائج ہیں۔ ہم عام طور پر جب اُردو اور ہندی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کچھ تو رسم الخط ہوتا ہے اور کچھ فارسی اور سنسکرت کا تعلق لیکن اس سے زیادہ اہم فرق شہری اور دیہاتی زبان کا ہے۔ ہم اس سلسلے میں دیہاتی رقبے کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ہماری قومی تحریکوں کا مرکز اب تک شہری رہے ہیں۔ ایک حد تک تو یہ صورت آئندہ بھی قائم رہے گی اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ شہروں کے بلند تمدنی معیار کو زیادہ پھیلنے کا موقع ملنا چاہیے لیکن جب دیہاتی رقبے میں تعلیم پھیلے گی تو شہروں کا یہ غلبہ قائم نہیں رہ سکتا اور ہماری زبان میں بھی لازمی طور پر تبدیلیاں ہوں گی۔ اس میں یہ نفاست اور درباریت تو باقی نہیں رہے گی لیکن زندگی اور قوت بیان میں ضرور اضافہ ہوگا۔ زبان کا اصلی معیار تو اسی وقت قائم ہوگا جب حکومت کی طرف سے عام تعلیم کا انتظام ہو۔ ہماری کوششیں تو بس اتنا کر سکتی ہیں کہ ایک خاص قسم کی فضا پیدا کر دیں۔ اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ اکثر لوگ اس کی شکایت کرتے ہیں کہ اُردو اور ہندی ایک دوسرے سے دور ہوتی جاتی ہیں۔ یہ رجحان ضرور موجود ہے اور کچھ افراد اس کو بڑھا بھی رہے ہیں لیکن اصلی سبب کو میرے خیال میں انفرادی کوشش سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بنیاد زیادہ گہری ہے۔ ہم لوگ جب مشترک سادہ زبان کا ذکر کرتے ہیں جس کو ہم مفرس یا سنسکرت آلودہ زبان کے مقابلے میں آگے بڑھانا چاہتے ہیں تو دراصل ہمارا مطلب کیا ہوتا ہے؟ ایک مبتدی بھی اس سے ناواقف نہیں کہ دہلی اور ناگپور یا بہار کی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی نہیں بلکہ لکھنؤ شہر اور آس پاس کے دیہاتوں کی زبان میں بھی بہت فرق ہے۔ پھر یہ عوام کی مشترک اور سادہ زبان آخر ہے کیا؟ ہم میں سے ہر

شخص یہ سمجھتا ہے کہ خود اس کی زبان یا اس کے گروہ کی زبان معیاری ہے اور اگر اس سے ذرا سی مختلف زبان بھی استعمال ہوتی ہے تو وہ خفا ہو جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی جہالت یا کم علمی پر نادم ہو وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ وہ ایک چیز کو سمجھ نہیں سکتا۔ عوام کی مشترک اور سادہ زبان تو ایک بہت ہی محدود زبان ہے۔ غالباً اس میں دو ہزار سے زیادہ الفاظ نہ ہوں۔ روز مرہ کی عام ضرورتوں کے لیے تو یہ زبان کافی ہے لیکن جب ہم زندگی کے کسی مسئلے سے بحث کرنے لگتے ہیں خواہ وہ سیاسی ہو یا تمدنی' معاشی ہو یا معاشرتی تو یہ سادہ زبان بالکل کام نہیں دیتی۔ اس وقت ہمیں اس کی حد سے باہر نکل کر ضروری الفاظ اور فقروں کی تلاش کرنی پڑتی ہے جن میں ہم غیر معمولی خیالات کو ادا کر سکیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو یا تو فارسی کی طرف جانا پڑتا ہے یا سنسکرت کی طرف۔ اس طرح بظاہر ایک ہی زبان کی دو مختلف صورتیں ہو جاتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتی جاتی ہیں۔ یہ دراصل زبان کی زندگی کے آثار ہیں اور ہمیں انھیں دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس پہلی اٹھان کے بعد جو دونوں کی الگ الگ ہو رہی ہے یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتی جائیں گی۔ اس لیے کہ بجز اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں' حالات انھیں مجبور کر دیں گے اور جب عوام پڑھنے لگیں گے تو وہ سادگی کا بھی مطالبہ کریں گے اور یک رنگی کا بھی۔ ہمیں چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے اس کیفیت کو پیدا کرنے میں مدد دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ہم اپنی تمام طاقت اس ترقی کو روکنے میں صرف کر دیں محض اس وجہ سے کہ یہ ترقی مختلف راستوں پر ہو رہی ہے۔ ہمیں ایک مالا مال اور گوناگوں زبان کی ضرورت ہے جس میں قدیم زبانوں کے عناصر بھی ہوں اور جدید زبانوں کے بھی۔ جدید ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں ہمارے ملک کی زبانیں ابھی خام ہیں اور جدید خیالات کی باریکیوں کو اس وقت تک ادا نہیں کر سکتیں جب تک ان میں اور ترقی نہ ہو۔ اس لیے ان میں جتنے الفاظ بڑھیں اتنا ہی اچھا ہے۔ ہمیں یہ نہ چاہیے کہ اپنی محدود واقفیت کی وجہ سے زبانوں کی ترقی کو روک دیں۔ دراصل جس چیز کو روکنے کی ضرورت ہے وہ اُردو اور ہندی دونوں کا وہ رجحان ہے جو ان کو درباری اور آورد سے بھرے ہوئے انداز بیان کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس میں بلند آہنگی تو ضرور ہے لیکن زندگی بہت کم ہے اور اس کا عوام تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم عوام کو سامنے رکھ کر لکھنا اور بولنا شروع کریں تو لازمی طور پر ہماری تقریروں اور تحریروں میں زور اور سادگی پیدا ہوگی۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اُردو اور ہندی کی انتہائی خود پسندی اور ایک دوسرے سے الگ ہونے کے رجحان کو روکا جا سکتا ہے۔

میں نے رسم الخط کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہا ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق

ہے یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ ہندوستانی کے لیے اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط کو ہر جگہ تسلیم کرنا اور ترقی دینا چاہیے۔ یہ محض ایک سیاسی سمجھوتا نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں بلکہ قومی ترقی کا بنیادی اصول ہے۔ میں تو ذاتی طور پر ہر زبان اور رسم الخط کو، جو موجود ہے، ترقی دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ بچوں کی صحیح تعلیم اسی زبان اور اسی رسم الخط میں ہو سکتی ہے جو ان کے گھر میں رائج ہو۔ جب میں سنتا ہوں کہ لوگ کسی زبان یا کسی رسم الخط کو مٹا دینا چاہتے ہیں تو مجھے یہ بات بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ قومی ترقی کے اصول سے بالکل ناواقف ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے ہیں کہ زبانوں کا اس ترقی میں کیا حصہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اہل روس کی مثال قابل لحاظ ہے۔ انھوں نے اپنے وسیع ملک کے مختلف حصوں میں اس مسئلے کو بہت اچھی طرح حل کیا ہے۔ وہ ہر مقامی زبان کو ترقی دے رہے ہیں بلکہ انھوں نے تو یہاں تک کیا ہے کہ بعض خانہ بدوش قبیلوں کی زبانوں کے لیے جو لکھی نہیں جاتی تھیں مناسب رسم الخط ایجاد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے ہر حصے میں تعلیم نے عجیب و غریب ترقی کی ہے۔ میں تو یہ بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر شمالی ہند کے کسی شہر میں کافی تعداد ایسے بچوں کی ہو جو تامل یا جنوبی ہند کی کسی اور زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو حکومت کو ایسے مدرسے قائم کرنے چاہئیں جن میں وہ زبان ذریعہ تعلیم ہو۔ میری یہی رائے ہر زبان اور ہر رسم الخط کے بارے میں ہے۔ ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ کسی زبان یا رسم الخط کو دبانے کے بجائے اس کو بڑھانے کی کوشش کریں۔ جہاں تک ہندوستانی کا تعلق ہے ہمارا لازمی طور پر یہ فرض ہے کہ اس علاقے میں جہاں ہندوستانی رائج ہے دونوں رسم الخط کو پوری ترقی کا موقع دیں۔ ان میں سے کسی رسم الخط کو دبانا میرے خیال میں غلط اور مضر ہے۔ دوسرے علاقوں میں حکومت کو چاہیے کہ جہاں رسم الخط کی مانگ ہو وہاں اس کی تعلیم کا انتظام کرے۔ اس خیال کی بنا پر مجھے یہ معلوم کر کے حیرت اور تکلیف ہوتی ہے کہ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں ناگری رسم الخط کو سرکاری طور پر دبایا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہار میں بعض لوگ اُردو رسم الخط کو مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ رویہ بھی میرے خیال میں بالکل غلط ہے۔ ہمیں یہ چاہیے کہ دونوں رسم الخط کو ترقی کرنے کی پوری آزادی دیں تا کہ جہاں کے لوگ جس کو پسند کریں اسے اختیار کر لیں۔

افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سی چیزیں فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے اور نہ معلوم کیوں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی مخصوص زبان ہے۔ میں اس کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں میں اُردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور بچپن سے اسی کو بولتا آیا ہوں۔ بدقسمتی سے میری تعلیم ایسی ہوئی کہ مجھے نہ اُردو پر کافی قدرت حاصل ہے اور نہ ہندی پر لیکن اس کے

یہ معنی نہیں کہ اُردو میری زبان نہیں رہی۔ اس وجہ سے میں تو اس مسئلے کو سراسر لسانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ دوسرے لوگ بھی اس کو اسی نظر سے دیکھیں اور اس کو فرقہ وارانہ مسئلہ نہ بنائیں۔ اس سلسلے میں ہندو یا مسلم تہذیب کا ذکر کرنا میرے خیال میں ایک غیر متعلق بحث کو چھیڑنا ہے۔

ہم جس وقت مشترکہ زبان کے مسئلے پر غور کرتے ہیں اس وقت ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مشترک زبان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کا ایک معجون مرکب تیار کیا جائے۔ اس قسم کی بناوٹی زبان کو ہم بالکل رائج نہیں کر سکتے اور اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو ''اسپرانٹو'' یا ''دولا پک'' کا ہوا ہے۔ ہندوستانی کو متعین کرنے میں جنوبی ہند کے ان علاقوں کی بحث نہیں چھیڑنی چاہیے جن میں ہندوستانی نہیں بولی جاتی۔ یہ مسئلہ تو صرف شمالی ہند میں طے ہوگا اور اس کی صورت یہی ہے کہ ہندی اور اُردو کے میل سے ایک مشترک زبان فطری طور پر بنے اور ترقی کرے۔ اگر اس ترقی کو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ذریعے سے ایک خاص رنگ دینے کی کوشش کی گئی تو اس پر یقینی ناکامی ہوگی۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ کوشش ضرور کر سکتے ہیں کہ اس معیاری ہندوستانی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں جو رشتہ یا مشترک الفاظ ہیں ان کو معلوم کریں تاکہ دوسرے علاقوں میں ہندوستانی کی تعلیم میں آسانی ہو۔ میں نے ناگپور میں بھارت ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں یہ کوشش کی تھی کہ ان دونوں طریقوں میں جو بنیادی فرق ہے اس کو واضح کر دوں لیکن غالباً میں اپنا مطلب واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہاں اکثر لوگ ایسے مسائل میں الجھے ہوئے تھے جو مجھے بالکل سطحی معلوم ہوئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ناگپور میں ان چند باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا اس لیے کہ اس مجمع میں مَیں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا تھا اور جو لوگ اس جلسے کی جان تھے ان سے مجھے کسی قسم کا لگاؤ نہیں تھا۔ میں پہلی دفعہ اس قسم کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور مجھے تو صرف اس سے دلچسپی تھی کہ ہندوستان کے مختلف ادبوں میں ایک قسم کا تعلق پیدا ہو جائے تاکہ مشترک خیالات کو ان میں پھیلنے کا موقع ملے اور وہ عوام کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگیں۔ میں چاہتا تھا کہ ہمارے ادیب ان مسائل پر غور کرنے لگیں جو یورپ کے ادیبوں کو درپیش ہیں اور مجھے امید تھی کہ یہ پریشد ایسی انجمن کی شکل اختیار کرلے گا لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہاں بہت ہی حقیر چیزوں سے بحث ہوتی رہی مثلاً ہندی، ہندوستانی یا اسی قسم کے لفظی جھگڑے۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ مشترک زبان کا نام ہندوستانی ہی رہے اور میں نے یہ کہا بھی لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی کہ یہ بحث دوسرے تمام مسائل پر غالب آ گئی۔ اس کانفرنس میں ایک بڑی تعداد جنوبی ہند کے ادیبوں کی تھی۔ ان کو یہ خوف تھا کہ کہیں ہندوستانی ان پر بالکل چھا نہ جائے لیکن باوجود اس خوف

کے وہ شریک ہوئے۔ لازمی طور پر ان کا تعلق ہندوستانی سے صرف سنسکرت کے ذریعے سے ہو سکتا تھا اس لیے کہ وہی ایک مشترک رشتہ ہے۔ ہندی کے متعلق تو وہ کچھ نہ کچھ سوچ سکتے تھے لیکن لفظ ہندوستانی انھیں بالکل اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی اس دقت کو گاندھی جی نے محسوس کیا اور انھوں نے یہ بات کہی کہ وہ چاہتے تو یہی ہیں کہ جنوبی ہند والے ''ہندوستانی'' کو قبول کر لیں لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کو خوشی سے قبول کریں ضرورت ہے کہ شمالی ہند سے ان کا تعلق اور بڑھے۔ اس لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ فی الحال ایک نہایت ہی بھونڈا نام یعنی ''ہندوی اتھوا ہندوستانی'' استعمال کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ جنوبی اور مغربی ہند کے ان ادیبوں کو جو ابھی تک ہچکچا رہے تھے اور ہر چیز کو مشتبہ سمجھتے تھے جہاں تک ممکن ہو اس مطمح نظر کی طرف کھینچیں کہ 'ہندوستانی' ہندوستان کی مشترک زبان ہونی چاہیے اور اس کے لیے جو سب سے زیادہ مناسب صورت ان کو معلوم ہوئی وہ انھوں نے اختیار کی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بات صاف کر دی کہ وہ کسی اصولی چیز کو ہاتھ سے نہیں دے رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ہندی کے معنی بھی یہی ہیں کہ اس میں دونوں رسم الخط اور زبان کی دونوں قسمیں شامل ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے یہ بات ساہتیہ سمیلن کے جلسے میں بالکل صاف کر دی تھی۔ چنانچہ جب ہم ناگپور پریشد سے بحث کریں تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ شمالی ہند کے ہندی اور اُردو کے ادیبوں کا جلسہ نہیں تھا بلکہ اس میں غالب عنصر جنوبی اور مغربی ہند کے ادیبوں کا تھا اور ان کی رائے کا لحاظ کرنا وہاں ضروری اور لابدی تھا۔

یہ خط بہت لمبا ہو گیا اور جلدی کی وجہ سے ممکن ہے میں اپنے خیالات کو اتنا واضح نہ کر سکا ہوں جتنا میں چاہتا تھا لیکن اس سے تم کو یہ اندازہ تو ضرور ہو جائے گا کہ میری اس مسئلے میں کیا رائے ہے؟ اگر تمھاری خواہش ہوگی تو اس مسئلے کے کسی خاص رخ کو میں پھر زیادہ وضاحت سے بیان کر دوں گا۔ صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں ہندو یا مسلم تہذیب کا جو ذکر آتا ہے تو مجھے بہت حیرت ہوتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے حالات اور جدید قوتوں کی کارفرمائی سے ہم لوگ کتنے ناواقف ہیں۔ تم نے شاید 'میری کہانی' کا وہ حصہ پڑھا ہو جس میں میں نے اس مسئلے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے سر محمد قبال سے اس بارے میں چند سوالات کیے تھے لیکن مجھے اب تک ان سوالوں کے جواب نہیں ملے ہیں۔ مجھے ہت خوشی ہوگی کہ اگر تم یا کوئی اور ان کا جواب دے دے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں لوگوں کے یالات بہت پریشان اور الجھے ہوئے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کی ضرورت ہے۔

دنیا میں بہت سی قومی تہذیبیں ہیں اور ان میں سے اکثر مذہب سے متاثر ہوئی ہیں لیکن حقیقت میں

ان کی بنیاد قومی ہے۔ اپنے اپنے زمانے میں ہر قومی تہذیب نے اپنی پڑوسی قوموں کی تہذیبوں پر اثر ڈالا ہے اور اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ملکوں میں مخلوط تہذیبیں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایک طاقتور قومی تہذیب ہے لیکن اس پر دوسری اتنی ہی طاقتور تہذیبوں کا اثر پڑا ہے۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ مختلف رجحانات ہندوؤں یا مسلمانوں سے مخصوص ہیں۔ یہ درحقیقت ہم لوگوں کی مشترک میراث ہیں اور آج کل ان پر مغرب کی سائنٹیفک تہذیب کے تمدنی اور دیگر رجحانات بہت شدت سے اثر کر رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی ہندوستان کو سیاسی، معاشی اور تمدنی لحاظ سے متحد ہونے سے نہیں روک سکتی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ رجحان تمام دنیا میں پایا جاتا ہے۔ باوجود جنگ اور کش مکش کے ایک عالمی تہذیب پیدا ہو رہی ہے جو قومی تہذیبوں کو نہ تو مٹا دے گی اور نہ بالکل ایک ہی رنگ میں رنگ دے گی بلکہ ان سب کو ایک رشتے میں اس طرح منسلک کر دے گی کہ ان کا تنوع باقی رہے۔ ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک متحد قوم پیدا ہو جس کے مختلف عناصر میں ایک مضبوط تمدنی رشتہ ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ تمدنی امتیازات کے بارے میں پوری رواداری بھی موجود ہو بلکہ ان امتیازات کو بڑھنے کا موقع دینا چاہیے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان میں ایک بے رنگ یکسانیت پیدا ہو جائے بلکہ ہمیں تو ایک وسیع اور مختلف النوع زندگی کی ضرورت ہے جس میں قوت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ اس سے آگے بڑھ کر ہمیں چاہیے کہ ایک مشترک عالمی تہذیب اور امن و آسائش کے لیے جدوجہد کریں۔ اس لیے کہ موجودہ ابتری اور بے امنی کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے۔

ایک بات اور قابل غور ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب کبھی اس قسم کے نام نہاد تمدنی مسائل سامنے آتے ہیں تو اس جھگڑے میں وہ لوگ پیش پیش نظر آتے ہیں جو سیاست میں سخت رجعت پسند ہیں۔ یہ کیفیت کسی بات کا پتا دیتی ہے جس کی طرف توجہ کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ سیاسی رجعت پسندی سے تمدنی ترقی کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر کوئی دل سے ہندوستان میں تمدنی ترقی کا خواہاں ہے تو یہ لازم ہے کہ وہ اس ملک کی سیاسی آزادی کے لیے بھی بیتاب ہو اور اس کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہو۔

اس خط کی طوالت کی معافی چاہتا ہوں۔

تمھارا

جواہر لال نہرو

☆☆☆

ڈاکٹر اطہر فاروقی
نئی دہلی، بھارت

ہندوستانی کے حوالے سے گاندھی جی کا دفاع بڑا مشکل کام ہے

''ہماری زبان'' نئی دہلی شمارہ نمبر ۲۰ برائے ۲۲ تا ۲۸ مئی ۲۰۰۳ء میں پروفیسر گیان چند جین کا مضمون ''مہاتما، اُردو اور قرآن کے حروف کا قضیہ'' زبان کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے ایک مخصوص زاویے سے دلچسپی کا حامل ہے کہ اس میں ''ہندوستانی'' کے حوالے سے گاندھی جی کے دفاع کی بے وجہ اور بڑے بھونڈے انداز میں کوشش کی گئی ہے۔ گیان چند جین کا شمار اُردو کے قابل ذکر محققین میں ہوتا ہے اور یونیورسٹیوں کی سطح پر اُردو کے طالب علموں کو اُردو تحقیق کے جو اصول پڑھائے جاتے ہیں ان کی روشنی میں اس مضمون پر محض اس لیے بھی پی ایچ ڈی ہوسکتی ہے کہ یہ ایک بڑے محقق کا لکھا ہوا ہے اور اُردو میں اچھے موضوعات کا یوں بھی قحط ہے کہ یونیورسٹیوں میں برسرِ کار اُردو اساتذہ بقول شمس الرحمٰن فاروقی جہلا کی چوتھی نسل ہیں، طلبہ کی تو بات ہی چھوڑ دیجیے۔ گیان چند جین نے گاندھی جی کے دفاع کی کوشش جس نیت سے بھی کی ہو مگر ہندوستان میں زبان کے تنازعات کی تاریخ کے طالب علم کے طور پر اس مضمون کے بارے میں راقم الحروف اپنی معروضات قارئین کی خدمت پیش کرنا چاہتا ہے۔

مجھے نہیں لگتا کہ ''ہندوستانی'' کے حوالے سے گاندھی جی اور کانگریس کے منفعل رویے کے دفاع میں ایک واقعے سے بحث کرنے والے مضمون سے گاندھی جی اور کانگریس کی اس لسانی پالیسی کا دفاع ممکن ہے جو ہندی کو پورے ملک پر تھوپنے کے لیے فسطائی حدود میں داخل ہوگئی تھی۔ ہندی فسطائیت کی براہ راست ضرب اُردو پر پڑی۔ گیان چند جین سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر ۱۹۴۷ء تک آتے آتے گاندھی اور کانگریس کی کوئی دلچسپی واقعی ''ہندوستانی'' میں بچی تھی تو پھر آئین ہند میں دفعہ ۳۵۱ کیسے شامل ہوگئی جو شمالی ہند کی بشمول دیگر زبانوں کے ''ہندوستانی'' کو بھی ''ہندی'' کا اسلوب قرار دیتی ہے۔ سارا جھگڑا تو اُردو کو ہندی کا اسلوب

یعنی ''شیلی'' قرار دینے کا ہی تھا جس میں بہر حال ہندی والوں کو فتح نصیب نہ ہو سکی۔

میرے ذہن میں واضح طور پر گیان چند جین کی تصویر، اُردو کے ایسے حامی کی نہیں جسے اُردو سے جذباتی وابستگی ہو، مجبوری میں ایک زبان پڑھنا اور بات ہے۔ اُردو کے بعض غیر مسلم اہل قلم کا معاملہ اب یہی ہے کہ اُردو ان کے لیے مجبوری میں پڑھی گئی زبان ہے۔ گیان چند جین کے علمی کام کا بھی میں معترف ہوں مگر اس کا تعلق محنت سے ہے، جب کہ اُردو بہ نام ہندی کی لڑائی میں گیان چند جین بہت ہوشیاری سے ہمیشہ ان ہندی والوں کے ساتھ کھڑے نظر آئے جنھیں کئی سو برس پہلے مسلمانوں اور پھر انگریزوں کی غلامی کے بعد وہ اُردو قابل قبول ہی نہیں تھی جس کا خلقیہ اُردو کے خلاف تحریک چلانے والوں کے بقول ''مسلم'' تھا۔ اگر اُردو کی گیان چند جین کے لیے واقعی کوئی قدر تھی تو کیا انھوں نے اپنے بچوں کو اُردو پڑھائی؟

گیان چند جین نے اُردو کی اساس پر حملہ کرنے والی سب سے خطرناک کتاب "A House Divided" کے لیے اس کے مصنف امرت رائے کو اُردو کے خلاف جو مواد فراہم کیا اس کا اعتراف خود مصنف نے کتاب میں کیا ہے۔ عرصے تک شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو اس کا افسوس رہا کہ "A House Divided" کا مدلل جواب اُردو والوں نے نہیں لکھا۔ اب فاروقی صاحب کی کتاب ''اُردو کا ابتدائی زمانہ'' نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

گیان چند جین نے گاندھی جی کے دفاع میں ایک ایسی دلیل بھی دے ڈالی جس سے اس کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ گیان چند جین نے ایک جگہ کہا ہے کہ وہ گاندھی جی کی زبان سے متعلق ہر موقف سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ گاندھی جی نے بول چال کی زبان سے متعلق لکھا ہے اور حکومت کے دفتروں کو چلانے میں (زبان سے متعلق) جو مسائل سامنے آتے ہیں، ان پر غور نہیں کیا۔ یہاں گیان چند جین بہت شاطرانہ طریقے سے یہ کہہ رہے ہیں کہ موجودہ سنسکرت آمیز ہندی ہی دفتری زبان ہو سکتی ہے۔ جب کہ اُردو کے خلاف ہندی تحریک کے حامیوں کا عوام کے سامنے مؤقف یہ تھا کہ دفتروں اور عدالتوں میں استعمال کی جانے والی اُردو بہت دقیق اور فارسی آمیز ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس فارسی آمیز اُردو کی جگہ جو سنسکرت آمیز ہندی ملک پر تھوپی گئی وہ کتنے لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے؟ دفتروں اور عدالتوں میں رائج اُردو اپنی فصاحت کی وجہ سے اس طرح مذاق کا موضوع کبھی نہیں تھی جس طرح ہندو مڈل کلاس موجودہ ہندی زبان کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ گیان چند جین نے امرت رائے کے بیٹے آلوک رائے کی کتاب ہندی نیشنلزم (اورینٹ لونگ مین ۲۰۰۱ء) دیکھی کہ نہیں۔ مضمون میں اس کا کوئی ذکر نہیں، نہ ہی کوئی آہٹ ہے۔ وہ یہ کتاب دیکھ لیتے تو انھیں یہ افسوس ضرور ہوتا کہ "A House Divided" لکھانے کی ان کی محنت پر کافی حد

تک پانی پھر گیا۔

آئینِ ہند کی آٹھویں جدول میں شامل زبانوں میں ہندوستان کی بیشتر علاقائی زبانوں کو نمائندگی دینے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس فہرست میں شمالی ہند کی وہ زبانیں شامل نہیں ہیں جنھیں ہندی ہڑپ کر جانا چاہتی ہے۔ اُردو بھی آئین ہند کی آٹھویں جدول کی اس فہرست میں شامل ہے۔ آئین کے ماہرین اس فہرست میں شامل علاقائی زبانوں کو ہی قومی زبانیں مانتے ہیں۔ شمال کی جن زبانوں کو ہندی کے حامیوں نے ابتداً ہندی کی شکلیں کہہ کر اور ہندی نیشنلزم یعنی ہندو نیشنلزم کی علامت بنا کر اقتدار پر قابض ہونے کا جو نقشہ بنایا تھا وہ اب ٹوٹ رہا ہے۔ شمال کی علاقائی زبانیں (جنھیں ''بولیاں'' بھی اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے علیحدہ وجود پر مصر نہ ہوں) وہ بھی اب آہستہ آہستہ آٹھویں جدول میں شامل ہونے کے لیے پر تول رہی ہیں اور شمالی ہند میں برہمن قوتوں کا زوال (کانگریس جن کی سب سے طاقتور علامت تھی) اس نئے نظام کا علامیہ ہے جو سماجی انقلاب کے راستے سے آ رہا ہے۔ گیان چند جین کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں فسطائیوں کے روحانی پیشوا اور جن سنگھ کے بانی شیاما پرساد مکھرجی کانگریس ہی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔

(بشکریہ: ''ہماری زبان'' نئی دہلی)

☆☆☆

غلام احمد پرویز

اُردو زبان اور رسم الخط کا مسئلہ

مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لیے ہندو پوری قوت سے سرگرم عمل ہے اور اس کے لیے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی پرسکون روانیوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدان سیاست میں ایک ''متحدہ قومیت'' کی تشکیل کا حسین تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج وعواقب کو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ''بدیشی حکومت کے خاتمہ'' کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلاف مذاہب چونکہ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے راستہ میں روڑہ اٹکاتا ہے اس لیے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیان عالم پر فوقیت رکھتا ہے۔ چونکہ بچوں کے قلب ودماغ کو ''تنگ نظری اور تعصب'' کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے۔ اس لیے درسگاہوں میں ایک ایسے مذہب کی تعلیم کی تجویز کی جارہی ہے جو اکبر کے دین الٰہی یعنی دور حاضرہ کے برہمو سماج کے خطوط پر متشکل ہے۔ اہمسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی جگہ اہمسا کا فلسفہ حیات جنت قلب ونظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو ''روٹی'' کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آئند ''سنبوسہ'' بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے اُردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لیے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لیے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ کی اہمیت

مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے، کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک

زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے، اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے، اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

یہ ایک ''تنگ نظر'' مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ ''کشادہ ظرف'' ہندو بھی اس کے موید ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

''ایک قوم کے لیے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں ...... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو۔ جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔''

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں:

''رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک نا قابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے۔'' (میری کہانی، جلد اول ۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیے اور انھیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجیے کیوں کہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔

''استاددان ازلی''

ہم ''واردھا اسکیم'' والے مضمون میں بتا چکے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو مٹانے کے لیے ہندو کس طرح انگریز کے قدم بقدم چل رہا ہے۔ اس لیے کہ بساط سیاست کی تمام

چالیس ہندو نے انگریز ہی سے سیکھی ہیں۔ انگریزوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دے کر جو کاری ضرب لگائی تھی اس کا نتیجہ آپ اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے غلاموں کی زبان (ورنیکلر) کو بحکم نہیں مٹایا اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے زندہ رہنے کا حق اسی طرح دیا، جس طرح ''مذہبی آزادی'' کا حق عنایت کیا ہے بلکہ اسی طرح کراچی کے ریزولیوشن میں ''بنیادی حقوق'' کے سلسلہ میں کانگریس کی طرف سے یہ حق دیا گیا ہے۔ انگریزوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ ذریعۂ تعلیم کو بدل دیا اور جدید زبان جاننے والوں کے لیے ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی مدت نہیں مگر آپ نے دیکھا اس سو سال کے اندر اس پالیسی نے کیا نتائج پیدا کر دیئے۔ ہم انگریزی پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات اپنی زبان سے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے اپنی تہذیب وتمدن سے اور اپنے خیالات سے بیگانہ ہو گئے۔ انگریزی زبان اور انگریزی قوم کے خیالات ہمارے دل ودماغ کی انتہائی گہرائیوں میں گھس گئے اور اس پالیسی نے ہمیں اندر سے بدل دیا (جسے قرآن کریم ''تغیر نفس'' کہتا ہے کہ جس کے بدلنے سے ساری قوم بدل جاتی ہے) گویا وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے پیش نظر میکالے اور اس کے رفقا کار نے یہ شاہ ضرب تجویز کی تھی یعنی ''اس زبان کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہو گی۔'' ذرا اپنے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل ودماغ کی ساخت کو ملاحظہ فرمایئے وہ کس قدر مغربی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ انگریزوں نے مذہبی آزادی کو برقرار رکھا۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن میں مداخلت نہیں کی لیکن ایک زبان کے بدل دینے سے قوم کی قوم کو ان کے مذہب اور تمدن سے اس قدر بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بنا دیا کہ عیسائی مشنریز (پادری) ہزار برس بھی مسیح کی منادی کرتے رہتے تو یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ ہماری حالت آج یہ ہے کہ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی نگاہ سے ہیں، کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کی قوت سماعت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے ذریعۂ ادراک سے ہیں۔ ہم بالکل ''ہز ماسٹرز وائس'' بن گئے ہیں ایک انگریز مسلمان ہو کر بھی ''انگریز'' ہی رہتا ہے لیکن ایک تعلیم یافتہ مسلمان مسلمان کہلاتے ہوئے بھی ''مسلمان'' نہیں ہوتا۔ یہ قلب ونظر کی تبدیلی کس چیز نے پیدا کرا دی؟ یہ ذہنیت کس نے بدل دی؟ صرف ایک زبان کی تبدیلی نے اور وہ تبدیلی بھی جبری تبدیلی نہیں۔ آپ کی زبان کو مٹا کر نہیں، ہنسی خوشی، آپ کی پوری آزادی برقرار رکھتے ہوئے مدرسوں میں عربی، فارسی، اُردو کی تعلیم کی باقاعدہ اجازت دیتے ہوئے تعلیم کو اختیاری رکھتے ہوئے (یعنی جس کا جی چاہے بچے کو پڑھائے نہ جی چاہے نہ پڑھائے) آپ کے رسم الخط کو

برقرار رکھتے ہوئے! سمجھے آپ کہ زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔

''شاگردانِ رشید''

ہندوستانی قومیت کے معمار بھی ان ہی کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنی قومیت کو بنانے اور دوسروں کی قومیت کو بگاڑنے کی تدابیر بھی ان ہی سے سیکھی ہیں۔ انگریز چونکہ غیر ملکی تھا اس لیے اس کے نظر فریب مصالح مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن یہ چونکہ اسی ملک کے لوگ ہیں اس لیے ان کے لیے وہ انقلاب پیدا کر دینا آسان ہے جس کی جرأت ان کے استاد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس ''وطن کی مشترکہ فلاح و بہبود'' کا دعویٰ ایک ایسا کارگر حربہ ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو مکمل فریب دے سکتے ہیں (اور دے رہے ہیں) اور کوئی ان کو ٹوکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ اس میں ٹوڈی، رجعت پسند، سامراج پرست کے گھناؤنے القاب سننے کی ہمت نہ ہو۔ انگریز یہاں ''متحدہ قومیت'' کا تصور پیش نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ ایسا کرنے سے ان کی اقلیت یہاں کی اکثریت میں گم ہو جاتی لہٰذا انھوں نے حاکم و محکوم کے فرق کو محفوظ رکھا لیکن اس کا تلخ نتیجہ آج ان کے سامنے ہے۔ ہندو اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی اکثریت کو الگ حاکم قوم کی شکل میں ممیز کر کے اقلیتوں کے دل میں محکومیت کے نفرت انگیز احساس کو زندہ رکھے جو بالآخر حاکم قوم کے خلاف انقلابی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیے یہ بات زیادہ مصلحت آمیز سمجھتا ہے کہ ایک متحدہ قومیت کے جاذب نظر تصور کو پیش کر کے اقلیتوں کو اکثریت کی زنبیل میں لپیٹ لے اور ان کا رنگ و بو قائم نہ رہنے دے۔ اقلیتیں یہ سمجھ کر خوشی خوشی اکثریت کے اندر جذب ہو جائیں کہ ہم جمہوری حکومت کی مشینری کا ایک جزو لاینفک بن رہی ہیں گو کہ حقیقت یہ ہو کہ مشینری ان کو اس انداز سے پیس کر رکھ دے کہ آئندہ ان کی طرف سے کوئی خطرہ ہی باقی نہ رہے یعنی یہ اپنا الگ قومی تشخص کھو کر اکثریت کے اندر ہی جذب ہو جائیں۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری مخلوط انتخاب، مخلوط پرچم، مخلوط نام، مخلوط تعلیم اور اس کے بعد مخلوط زبان اسی مخلوط قومیت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں جن سے مقصد وحید یہ ہے کہ مسلمانوں کی اہم اقلیت جو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی حالت میں اکثریت کی حکومت کے لیے خار چشم کا حکم رکھتی ہے، اکثریت کے اندر جذب ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی زبان کا مٹانا نہایت ضروری ہے اور اس کے لیے آج ہندو پوری سرگرمی سے مصروف جدوجہد ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم ''واردھا سکیم'' والے مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ آزادیٔ ہند کے سب سے

بڑے علمبردار مہاتما گاندھی نے ''سیاست'' سے الگ ہو کر خالص ''اصلاحی'' تحریکوں کو اپنا نصب العین زندگی بنا رکھا ہے۔ ان میں اچھوتوں کی اصلاح اور ہندی کی ترویج اہم تحریکیں ہیں۔ خدا ان کردہ ان کا مقصد یہ نہیں کہ اُردو زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹا ڈالیں۔ ان کا مقصد تو صرف اس قدر ہے اور کس قدر پاک مقصد ہے کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی ''قومی زبان'' بنا دیں۔ اگر اس کا نتیجہ عملاً وہی نکلتا ہو جو اُردو زبان کے مٹانے کا ہو سکتا ہے یا اس سے اُردو زبان ''خود بخود'' مٹ جائے تو اس میں مہاتما جی کا کیا قصور۔ اس لیے کہ کانگریس کے شعبہ اسلامیات کے انچارج ڈاکٹر اشرف صاحب ہم کو ایک سرکاری کمیونک میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور ان کا یہ فعل ''فرقہ پرستی'' نہیں۔ ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور ''فرقہ پرستی'' ہے۔

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور وہ دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے (''ہریجن'' بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء) مگر بات وہ ہندو ''فرقہ پرست'' ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیش نظر ہے اس کی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک ٹھیٹھ ''قوم پرست'' کو اختیار کرنا چاہیے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک ''قومی زبان'' کا نام ''ہندوستانی'' رکھتے ہیں مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لے جاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام ''ہندی'' ہو جاتی ہے۔

مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''صرف ہندی زبان میں جس کا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اُردو بھی پڑ گیا اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے۔'' (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبہ اطلاعیات سیاسی و معاشی اعلامیہ)

اسی رجحان کے تحت ''ہندی ہندوستانی'' کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اس کا نام ''ہندی اتھوا ہندوستانی'' (ہندی یعنی ہندوستانی) ہو گیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساہتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ مدراس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اس کے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبہ اطلاعات سیاسی و معاشی

کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ''فرقہ پرستی'' کے برخلاف ''قوم پرستی'' کس طرح کام کرتی ہے۔

''میں نے آج نہیں بلکہ ۳۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اُردو آ جائے جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے ''ہندی'' اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اُردو اور دیونا گری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اُردو اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔ اس کے بعد بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا زمانہ لیجیے جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اس کے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی، مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور مخالفت کی مگر میں ان کی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اُردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ ''ہندی'' لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد و مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو ''ہندی'' نام سے یاد کیا ہے۔ پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حد بندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟ اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہاں تک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی سے لاگ کھا سکتی ہیں جن میں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔''

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی ''قومی زبان'' کے ارتقا کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو قومیت ہند کے اس معمار اعظم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ''ہندی'' کے دامن کو پھیلا کر ''اُردو'' کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اُردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سی تبدیلی نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام ''ہندی'' سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اُردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان، سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح ''ہندی'' کا دامن اُردو کو ساتھ لیے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرہ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اُردو اس طور پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سر دست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیوشن کے کھلونے سے اُردو والے دل بہلاتے ہیں جب ''قوم پرستی'' بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہوگا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائے گا۔ ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھیے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں برپا کرتے ہو؟ پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں۔ صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ازراہ کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا یہی بھوجن جو تم کھاتے ہو پتل پر رکھ کر کھانے لگو۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں اور فائدہ یہ ہے کہ یہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمھارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے اس سے تمھاری اجنبیت دور ہو جائے گی، جب پرمیشری داس صاحب اس معقول تجویز کو بھی مان لیں تو ان کو زیادہ نہ چھیڑو آہستہ آہستہ انھیں اسی راستہ پر بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دھرم چند (جو شاید پہلے قمرالدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے اگر یہ چل نہ چلی جاتی) خود بخود شدھ پیدا ہوں گے بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لیے شنکراچاریہ آف شاردھا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہندی زبان

مہاتما گاندھی نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں اس واقعہ سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانہ میں خود مسلمان بھی اُردو کو ہندی کے نام سے تعبیر کرلیا کرتے تھے اس لیے اگر اب ہندوستان کے مشترکہ زبان کا نام ''ہندی'' رکھ دیا جائے تو یہ گویا اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ یہ دلیل بظاہر کس قدر خوش آئند اور محکم ہے اور کتنی انصاف پر مبنی ہے! لیکن جن حضرات کی نگاہ تاریخ کے اوراق پر ہے انھیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی کہ مہاتما جی نے حقیقت کو کتنے باریک ''چلمنی پردہ'' میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مسلمان قواعد زبان کی رو سے ہند کی ہر چیز کو یائے نسبتی کے ساتھ ہندی کہتے تھے، (جسے عرب سے عربی، فارس سے فارسی، اسی طرح ہند سے ہندی) اس وقت یہاں کی مروجہ زبان کے مقابلہ میں کوئی اور زبان ایسی تھی ہی نہیں، جسے اصطلاحاً ایک الگ نام رکھانے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ زبان جسے آج کل کی اصطلاح میں ''ہندی'' کہتے ہیں بعد کی پیداوار ہے اور خالص ہندوانہ ذہنیت کی پیداوار۔ ارباب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آخیر تک اُردو کے مقابلہ میں کسی اصطلاحی ''ہندی'' زبان کا چرچا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں للوجی نے پریم ساگر نامی کتاب لکھی۔ یہ ناگری رسم الخط میں تھی اور اس میں اُردو اس قسم کی استعمال کی گئی تھی، جس سے فارسی کے عناصر فی الجملہ خارج کر دیے گئے تھے، اور ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے تھے۔ یہ تھی ہندی کی کتاب یعنی اُردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان جسے اصطلاح میں ہندی کہا گیا۔ چونکہ اس زبان کا رسم الخط فارسی رسم الخط (یعنی مسلمانوں کے رسم الخط) سے مختلف تھا، اور سنسکرت کے رسم الخط (یعنی ہندوؤں کی قدیم زبان کے رسم الخط) کے مطابق۔ نیز اس میں عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس لیے ہندوؤں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لینے لگے، مسلمانوں کے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی، اس لیے انھوں نے اس تحریک کی طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن ہندو تو بساط سیاست کے بڑے گھرے شاطر واقع ہوئے ہیں، مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ ۱۸۶۹ء میں اس نے ایک خاص منظم صورت اختیار کرلی جبکہ ۶ دسمبر کو بابو سرود پرشاد نے یہ مطالبہ پیش کردیا کہ الہٰ آباد انسٹی ٹیوٹ کی روئیداد اُردو کے بجائے ہندی میں لکھی جائے اس وقت کچھ ارباب بصیرت مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور سرسید، سید وارث علی، خان بہادر میر سید محمد، فدا حسین اور منصور احمد وغیرہ

حضرات نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، جلوۂ طور میرٹھ اور اودھ اخبار لکھنؤ میں اس کے خلاف مضامین لکھے۔ مسلمانوں کا چونکہ دور انحطاط تھا اس لیے ان کی مساعی قلم وقرطاس کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں بلکہ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی لیکن ہندو اپنی دوسری تحریکوں کی طرح اس تحریک کو بھی منظم طریق پر آگے بڑھاتے رہے اور پوری استقامت کے ساتھ اسے جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اب وہ اسے ایک قومی تحریک کا خوشنما لباس پہنا کر میدان عمل میں لے آئے ہیں۔ ہندو ان تمام تحریکوں کو کم وبیش نصف صدی سے آتش خاموش کی طرح اندر ہی اندر سلگاتے چلے آرہے ہیں اور مسلمانوں کو اس وقت ہوش آیا ہے جبکہ وہ پوری حدت اور تمازت کے ساتھ شعلہ بار ہو چکی ہیں، پھر چونکہ ہندو ان تمام تحریکوں کو منظم طریق پر چلا رہے ہیں نہ کہ ہنگامی انداز سے اس لیے انھوں نے ایک ''مشترکہ مقصد'' یعنی ''حصول آزادی کے لیے متحدہ قومیت کی تشکیل'' کی کشش کے ماتحت کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور اس طرح سے ان خالص ہندوانہ تحریکوں کو ''قومی'' تحریکوں کا لیبل لگا کر میدان سیاست میں لیے آرہے ہیں۔ ۱۸۶۹ء-۱۸۷۴ء میں چونکہ ایک طرف سرسیّد اور منصور احمد وغیرہ مسلمان تھے اور دوسری طرف بابو شیو پرشاد اور نوین چندر راؤ وغیرہ ہندو۔ اس لیے ہندوؤں کی تحریک ترویج ہندی خالص ہندوانہ تحریک تھی۔ لیکن آج چونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ ڈاکٹر اشرف اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں، اس لیے آج وہی تحریک قومی تحریک بن گئی ہے اور اس کی مخالفت کرنے والے خود مسلم قومیت پرست حضرات کے نزدیک انتہائی نفرت انگیز انقلاب کے مستحق ہیں یہ ہیں بساط سیاست کی گہری چالیں!!

ہندو ذہنیت کا مظاہرہ

جب یہ تحریک اس زور اور قوت کے ساتھ پھیلائی جانے لگی تو مسلمانوں کی وہ جماعت جس کی دیدہ ور نگاہیں ''متحدہ قومیت'' اور مشترکہ زبان کے فریب کو بے نقاب دیکھ چکی تھیں، اس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہا کہ یہ محض ایک ادبی اور مجلسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان کی ملی اور جماعتی موت وحیات کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ تو کانگریس کا ہندوانہ سیلاب بلا چاروں طرف سے اوپر امنڈ آیا۔ مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے خود تسلیم کیا ہے کہ ایک قوم کی تہذیب وتمدن کو مٹانے کے لیے یا برقرار رکھنے کے لیے زبان کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا ہے لیکن جب اس اہمیت کا احساس کرتے ہوئے مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس طرز عمل کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی زبان

کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو انھی پنڈت جی نے فتویٰ صادر فرمادیا کہ "فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں۔"
(میری کہانی جلد دوم ص ۳۰۰)

اللہ اکبر! وہی رسم الخط جس کے بدل جانے سے خود پنڈت جی کے "الفاظ" میں یہ اندیشہ ہے کہ الفاظ کی شکلیں بدل جائیں گی، آوازیں بدل جائیں گی، خیالات بدل جائیں گے، قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جائے گی اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جائے گا جو مردہ ہو چکی ہے۔" جب اس کے تحفظ کے لیے مسلمان آواز بلند کریں تو یہ جھگڑا احمقانہ بن جاتا ہے! یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو۔"

اس لیے اگر مسلمان اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہیں تو وہ فرقہ پرست ہیں:

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے، اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھاتا جارہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی......... ایک علیحدگی پسند حامی زبان کو اوپر سے کھرچو تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے، بلکہ زیادہ تر تم اسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے" (یہ پنڈت جی کا ایک مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اُردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے)۔

ان تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابل نفرت "فرقہ وارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اس کو اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں نہیں بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اس کے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے شدید ترین الفاظ......... "فرقہ پرستی"۔ "رجعت پسندی"، "سامراج پرستی" وغیرہ، پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا دراصل ان کی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے۔ جب تک یہ زبان ایک علیحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور

اس میں وہ الفاظ اور اسالیب بیان موجود ہیں، جو اسلامی ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہوسکتی اور نہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہوسکتے ہیں، جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں ''علیحدگی پسندی'' کے رجحان کو فرقہ پرستی جیسے گھناؤنے القاب سے یاد کر کے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے خلاف نفرت پیدا کریں۔ اس لیے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام آبادی کو ایک ''قوم'' بنانا اور جداگانہ قومیتوں کو فنا کر دینا ہے۔ ان کے نزدیک ''سیاسی رجعت پسندی'' یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور ''سیاسی ترقی پسندی'' یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس ''ایک قوم'' میں جذب ہو جائیں جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لیے منجملہ دوسری تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک ''مشترک قومی زبان'' پیدا کی جائے اور ہر ایسی زبان کو مٹا دینے یا کم از کم مسخ کر دینے کی کوشش کی جائے جو کسی قوم کی جداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے۔

یہی نصب العین ہے جس کو پیش نظر رکھ کر ''ہندوستانی'' زبان کا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ آخر منزل مقصود پنڈت جی کے نزدیک یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں ''علیحدگی پسندی'' کے رجحان کو مٹا دیا جائے لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ، دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالو گے تو شکار ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لہٰذا سردست اس کی حفاظت کا اطمینان دلاؤ اور پہلے الفاظ اسالیب بیان میں ''علیحدگی پسندی'' کا رجحان دور کرنے کی کوشش کرو، جب اُردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی ہو کر ہندی الفاظ سے بھرپور ہو جائے، جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیب بیان اور خود حقیقت بیان میں تغیر پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہو گیا۔ اس کے بعد دیکھیں گے مستقبل نے اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی ''علیحدگی پسندی'' کا رجحان مٹا دیا جائے گا اور ''مشترک قومی زبان'' کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ پالیسی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں:

> ''اس لیے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں (رسم الخطوں) کو پوری آزادی حاصل رہے۔ اگرچہ یہ ان لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا جنھیں دونوں کو سیکھنا پڑے گا اور یہ ایک حد تک علیحدگی پسندی کے لیے بھی مددگار ہوگا مگر ہمیں ان ہی

نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، کیونکہ ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے...... مستقبل ہمارے لیے کیا کچھ لائے گا، اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سر دست دونوں کو باقی رہنا چاہیے" (پنڈت جی کا مذکورۂ بالا مضمون)"۔

میں اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اُردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آ کر رہیں گی۔ خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی۔ جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اس قدر طاقتور رہیں افراد ان کی مزاحمت نہیں کر سکتے، یہاں قوم پرستی ہے اور ایک متحد ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اس کی فتح ہو کر رہے گی...... اگر چہ ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کریں گے جو اس وقت قائم ہے مگر ہم کو وحدت قائم کرنے والوں کی اس عمل میں مدد دینی چاہیے" (مضمون مذکور)۔

یہاں آ کر پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے راستے مل جاتے ہیں۔ اگر چہ پنڈت جی علیحدگی کے رجحان کو سخت قابل نفرت سمجھتے ہیں اور مہاتما جی کے طرزِ عمل میں علیحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل نمایاں ہے، اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیے تھا، بلکہ انھیں "فرقہ پرست" اور "سیاسی رجعت پسند" کہنا چاہیے۔ مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے اور دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف دو علیحدہ راستوں سے چل کر ایک مقام پر مل جاتے ہیں اس لیے دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اس چیز کا مجرم ٹھہراتے ہیں جس کے خلاف انھوں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے" (جامعہ، مورخہ اکتوبر ۱۹۳۶ء ص ۹۰۳)۔

کھلی ہوئی 'فرقہ پرستی' کے مقابلہ میں "قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے، آپ علانیہ پرندوں کے لیے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسے گا۔ دام ہم رنگ زمین ہونا چاہیے، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیے اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو، آپ کی مدد پر ہونا چاہیے، تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے۔ پھر دیکھیے کہ پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے، ہندوستان کی مشترک فلاح و بہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھایئے، اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوش حالی کا دانہ پھیلایئے اور ایک نقیب چھوڑ دیجیے جو اطراف و نواح میں

اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کی طرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائے گا کہ ہمارے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بے روزگاری کا ہے اور جو دانہ بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجیے)۔ اسی سوال کو حل کرنے کے لیے بکھیرا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اسی طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔

اثرات

ترویج ہندی کی تحریک کو ''قومی تحریک'' کی شکل اختیار کیے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے نتائج واثرات اس قدر واضح اور بیّن طور پر سامنے آچکے ہیں کہ اگر ہندونوازی کی پٹی کو آنکھوں سے اتار کر دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان اس خطرے سے انکار کر سکے جو مستقبل قریب میں اس راستہ سے ان کی تہذیب وتمدن کو مٹانے کے لیے ایک سرکش و بے باک طوفان کی طرح بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کی چند مثالیں بیان کریں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کانگریس کا (جو ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی نمائندگی کی مدعی ہے) اس باب میں لفظی دعویٰ کیا ہے، تاکہ اس کے بعد اچھی طرح سے معلوم ہو سکے کہ دعویٰ کیا ہے اور عمل کیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مسلمانوں کو جب کبھی ہندوؤں کے کسی طرز عمل کے خلاف شکایت پیدا ہوتی ہے تو ہندوؤں کی مدافعت اور بریت میں حضرت مولانا آزاد جھٹ گواہوں کے کٹہرے میں تشریف لے آتے ہیں اور مسلمانوں کو موردِ الزام اور ہندوؤں کو حق بجانب قرار دینے میں پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ زبان کے مسئلہ میں بھی جب مسٹر جناح نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوؤں کی روش کو مفادِ اسلامی کے خلاف ثابت کیا تو حضرت مولانا کی طرف سے ایک طول طویل بیان اخبارات میں شائع ہو گیا جس کے دوران میں وہ فرماتے ہیں:

> ''میں مسٹر جناح کو یقین دلاتا ہوں کہ انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ سنا ہے، وہ بالکل غلط ہے اگر وہ حقیقت حال معلوم کرنے کی ذرا سی کوشش بھی کریں گے تو ان کو اپنے الزامات پر افسوس ہوگا۔ کانگریس کی قرار دار، نہ صرف قرارداد، بلکہ اس کا عمل بھی ذمہ دار مسلمان جماعتوں اور حامیانِ اُردو کے مطالبات کے بالکل مطابق ہے اور فی الحقیقت وہی مسئلے کا ایک ہی صحیح حل ہے یعنی وہ صاف وسلیس اُردو جو شمالی

ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے، قومی اور ملک کی باہمی صوبائی زبان کے طور پر تسلیم کی جائے اور دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط تحریر کتابت کے لیے استعمال کیے جائیں۔

یہ زبان ایک اور یکساں ہے اور دونوں رسم الخط میں لکھی جاسکتی ہے اور ہر شخص جس رسم الخط کو چاہے اختیار کرسکتا ہے۔ حکومت دونوں رسم الخط کے لیے آسانیاں مہیا کرے گی۔ اس نے سادہ اُردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ تجویز کیا ہے تاکہ دونوں رسم الخط پر حاوی ہو جائے۔

مسٹر جناح کہتے ہیں کہ کانگریس جو قومی جماعت ہونے کی مدعی ہے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میونسپل اور گورنمنٹ سکولوں میں ''ہندی'' کو لازمی قرار دے لیکن ''ہندی'' سے ان کی کیا مراد ہے۔ کیا ان کی مراد اس سے وہ زبان ہے جو صرف دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو میں ان کو بتاؤں گا کہ کسی کانگریسی حکومت نے دیوناگری رسم الخط کو لازمی قرار نہیں دیا۔ یہ صرف ''ہندوستانی'' زبان ہے جو لازمی قرار دی جائے گی۔ رسم الخط اختیاری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اُردو ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ دیوناگری ہو۔

میں مسٹر جناح کی توجہ واردھا اسکیم کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین کا بورڈ بروئے کار لا رہا ہے۔ اس نے اساتذہ کی تعلیم میں اس امر کو لازمی قرار دے دیا ہے کہ وہ دونوں رسم الخط کی تعلیم حاصل کریں اور دونوں کی تعلیم دینے کے قابل ہوں تاکہ ہر طالب علم اس رسم الخط میں مدرس سے تعلیم حاصل کر سکے، جس کو وہ پسند کرتا ہے۔''

ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

کیا مسٹر جناح کی مراد ''ہندی'' سے وہ زبان ہے جس میں جان بوجھ کر سنسکرت کے غیر مانوس اور عجیب و غریب الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے جن کو لوگ عام طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر ان کی مراد یہ ہی ہے تو میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ بالکل گمراہ کن ہے۔

ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کانگریس جس زبان کو رواج دے رہی ہے، وہ اُردو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، وہ اُردو جو سادہ و سلیس ہو اور عربی فارسی اور سنسکرت کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ سے مبرا ہو (زمزم ۳۸۔۶۔۱۳)۔

اس بیان کی رو سے حضرت مولانا نے مسلمانوں پر واضح کرنا چاہا ہے کہ کانگریس کی قرارداد اور عمل کی رو سے:

۱۔ قومی زبان وہ صاف اور سلیس اُردو ہوگی جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔

۲۔ زبان ایک ہی ہوگی البتہ وہ اُردو اور ناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی۔

۳۔ اس مشترکہ زبان کا نام ''ہندوستانی'' ہوگا۔

۴۔ اس میں عربی، فارسی، سنسکرت کے نامانوس اور غیر معروف الفاظ نہیں ہوں گے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھتے جایئے کہ اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ خارج کر کے پوتر بھارت ماتا کی دیو بانی کو شدھ کرنے والے مولانا آزاد وہی آزاد ہیں جو کبھی الہلال کے مدیر تھے، اور اُردو کے متعلق جن کا اس وقت خیال یہ تھا کہ:

''اُردو، فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے ماتحت ہے۔ اس کا کوئی خاص علمی لٹریچر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبان پر ہیں۔ سب کی سب عربی ہیں پس اُردو کے تراجم علوم میں الفاظ عربیہ کا استعمال ناگزیر اور اس لیے سند کے لیے اُردو بول چال نہیں بلکہ عربی لغت اور اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب (ہے)...... (ہم) اُردو میں جب کسی علم و فن کو لکھیں گے تو چونکہ اُردو اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیر اثر اور بکلی ماتحت ہے اس لیے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑے گا'' (الہلال ۱۷۔ ستمبر ۱۹۱۳ء)۔

ادبی پہلو کے علاوہ اُردو زبان میں عربی الفاظ کے استعمال کے متعلق حضرت مولانا کے نزدیک ایک اہم پہلو اور بھی تھا۔ فرماتے ہیں:

''لوگ معترض ہیں کہ مصطلحات اُردو کے لیے عربی کی مراعات استحقاق پر میں کیوں

زور دے رہا ہوں، یہ کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ حتی الامکان عربی ہی کے الفاظ اُردو کی ادبیات علمیہ میں استعمال کیے جائیں لیکن شاید یہ نکتہ ان کی نگاہوں سے مخفی ہے کہ صرف عربی ہی نہیں، بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لیے ایسے ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے.......... اصطلاحات حدیثہ کا سوال جانے دیجیے۔ مسلمان آج تمام اطراف عالم میں پھیلے ہیں، ان کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ہے لیکن مصطلحاتِ دینیہ اور علمیہ اب تک ایک ہیں اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ پھر کوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئندہ کے لیے اس سے سلب کرلیا جائے...... عربی ام لغت اسلامیہ ہے۔ زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کافی اسباب و سامان اپنے پاس رکھتی ہے۔" (الہلال مورخہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء)۔

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ عربی کا وہ استحقاق جو تیرہ سو سال سے مسلم چلا آتا ہے، آج اس کے سلب کرنے کا مجرم کون بن رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ام لغت اسلامیہ کی آغوش سے اس کے بچوں کو چھین کر انھیں پراچین تہذیب کیا ناتھ آلیہ (یتیم خانہ) میں داخل کر رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان سے عربی و فارسی کے الفاظ خارج کر کے اطراف عالم کے مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لیے منقطع کرنے کی فکر کر رہا ہے؟

اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

کہہ دیا جائے گا کہ اُردو سے محض عربی و فارسی کے "غیر معروف" اور "نامانوس" الفاظ خارج کیے جائیں گے تمام الفاظ نہیں لیکن یہ فرمائیے کہ وہ کون سی کسوٹی ہوگی جس پر یہ پرکھا جائے گا کہ فلاں لفظ "غیر معروف ہے" اور فلاں معروف و مانوس۔ جن کے ہاتھ میں وہ کسوٹی ہوگی ان کی تو آج ہی سے یہ روش شروع ہوگئی ہے کہ وہ الفاظ جو صدیوں سے زیر استعمال ہیں اور جن کو بچہ بچہ جانتا ہے انھیں بھی غیر معروف قرار دیا جا رہا ہے۔ صوبہ متحدہ کو کون نہیں سمجھ سکتا لیکن وہاں کانگریس حکومت کی وزارت کے ایک زبردست رکن نے یہ تجویز بھی پیش کردی ہے کہ یہ غیر مانوس لفظ ہے۔ اس کی جگہ "جٹ صوبہ" کا مانوس لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ معلوم نہیں "صوبہ" کی جگہ ان کو کوئی "مانوس" لفظ کیوں نہ مل سکا یا مثلاً صوبہ متوسط میں "مدرسہ" جیسے غیر معروف لفظ کی جگہ "ودیا مندر" کا مانوس لفظ سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح خدمت، استقبال،

انصاف، بنیاد، عورت، مرد، جیسے غیر مانوس الفاظ کی جگہ سیوا، سواگت، نیاؤ، نیو، استری، پرش جیسے مانوس الفاظ بدل کر لائے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ لیکن صرف کی جگہ بھی پرنتو اور کیول نے لے لی ہے۔ غیر معروف و نامانوس الفاظ کو اُردو سے خارج کر کے جدید ہندوستانی زبان کی کیا شکل بنائی جارہی ہے۔ اس کے لیے یوپی کے ایک کانگریس پرست کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:

> ''اگر مولانا ابوالکلام آزاد جو کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہیں۔ اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ کانگریسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں، تکلیف فرما کر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں اور ان تقریروں کو سنیں جو ہندو ممبروں اور ہندو وزرا کی طرف سے ادا ہوتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ضبط نہ کرسکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہوجائیں گے۔''

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہندو عوام بھی پچاس فی صدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان اور اسی رسم الخط میں قلمبند کی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جارہا ہے۔ یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لیے استعفا دینے پر مجبور ہوئے کہ دفتر کانگریس سے جو اطلاع اور جو اعلان شائع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے در آں حالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم الخط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اُردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شائع کیے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ جس وقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئے گا تو سب سے پہلے اس چیز کو محو کیا جائے گا جو مسلمانوں کے قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے'' (نگار اگست ۱۹۳۸ء)۔

ان واقعات سے مولانا آزاد کے دعویٰ کی اس حقیقت کو بھی معلوم کر لیجیے کہ ہندوستانی زبان اُردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی۔ یہ باتیں تو وہ ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہیں لیکن ان کوششوں سے زبان میں جو تبدیلی غیر محسوس طور پر واقع ہورہی ہے اس کا اندازہ غور اور تدبر کا محتاج ہے۔ آپ کسی سینما ہال میں جائیے اور سنیے کہ وہاں فلم میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ کس دیش کی بھاشا ہے۔ حالانکہ تماشائیوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی ہے یعنی ہندی کا پروپیگنڈا اس روپے سے ہوتا ہے جس کا بیشتر حصہ

خود مسلمانوں کی جیب سے جاتا ہے یا کسی شام ریڈیو کے پاس بیٹھ کر سنیے کہ غیر محسوس طور پر زبان کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ مقررین کو چھوڑیے، خود براڈ کاسٹنگ سٹیشن (محطہ نشر الصوت) سے (جو محکمہ ابھی مرکزی حکومت کے ماتحت ہے) جو خبریں نشر کی جاتی ہیں ان میں بھی سواگت، سیوا اور سماج جیسے الفاظ بلا تکلف استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ان کے مطبوعہ پروگرام میں بھی مجلس کی جگہ سبھا کا لفظ آ چکا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ صوبہ متوسط میں مدرسہ کی جگہ وِدّیا مندر کا نام سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد سے دریافت کیا گیا کہ صاحب! آپ تو فرماتے تھے کہ اُردو زبان سے عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ نکالے جائیں گے۔ یہ مدرسہ کون سا غیر معروف لفظ ہے جس کی جگہ وِڈّیا مندر جیسا مشہور و معروف لفظ تجویز کیا گیا ہے تو اس پر آپ نے فرمایا کہ مسلمان اسے بیت العلوم کہہ لیا کریں۔ جھگڑا ختم ہوا۔ سرکاری نام تو وِدّیا مندر ہی رہے گا۔ لیکن یہی سوال جب مسٹر شکلا سے کیا گیا جو وِدّیا مندر سکیم کے روحِ رواں ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ:

> ''وِدّیا مندر اپنے اندر کئی کشِشیں رکھتا ہے۔ صوبہ کی ننانوے فی صدی آبادی کے لیے یہ روحانی وجدان کا ذریعہ اور ان کے جذبۂ خیر کو ابھارنے کا باعث ہوگا (وِدّیا مندرا سکیم بحوالہ انقلاب مورخہ ۲۹۔ جولائی ۱۹۳۹ء) آپ نے دیکھا کہ ایک نام کی تبدیلی سے کسی قوم کے بچوں کے جذبۂ روحانی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ تو تھا ہندو بچوں کے جذبات کا احترام لیکن اسی صوبہ میں دادر کی میونسپل کمیٹی نے اُردو سکول کا نام اُردو وِدّیا مندر رکھ دیا تو مسلمانوں نے اس تبدیلی نام کے خلاف احتجاج کیا۔ کونسل میں سوالات ہوئے تو ان کے جواب میں وہی مسٹر شکلا فرماتے ہیں کہ نام بے شک بدل دیا گیا ہے لیکن نام کے بدل دینے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے کسی فرقہ اور مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود ہے۔ (مسلم لیگ مؤرخہ ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۶ء) یعنی اُردو لفظ کی جگہ ہندی لفظ کا استعمال ہندو بچوں کے لیے روحانی وجدان کا ذریعہ اور جذبۂ خیر ابھارنے کا موجب ضرور بن جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے بچوں کو اس سے کوئی روحانی کاوش نہیں ہوتی۔ یہ ہے مسلمانوں کے جذبات کا احترام!!! اور اس پر مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ ''مسلمانوں کی شکایات وِدّیا مندر کے نام سے عبث ہیں'' (انقلاب بابت ۲۹۔ جولائی ۱۹۳۶ء)۔ خدا جانے

حضرت مولانا کے نزدیک ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی کوئی شکایت بھی معقول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ایسا ہوتا ہے کہ جب سے وہ الگ ہو کر کانگریس میں جا ملے ہیں، مسلمانوں کی قوم، سب باتیں نامعقول اور بے جا کرنے لگی ہے۔

انجمن ترقی اُردو (دکن) نے اپنے کچھ مبلغ صوبہ متوسط میں بھیجے کہ وہ بچشم خویش وہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان میں سے ایک مبلغ، سید شیر علی حاتمی نے الٰہ آباد میں ایک تقریر کے دوران میں بتایا کہ صوبہ متوسط میں ابھی سے یہ حالت ہو چکی ہے کہ مانڈ ہونا ضلع چھندواڑہ کے سکول میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ہر صبح پرارتھنا کرنی پڑتی ہے، سامنے سرسوتی کا بت لا کر رکھ دیا جاتا ہے، سب بچے اس بت کے سامنے گیان اور ودیا پراپت ہونے کی پرارتھنا کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان بچے کو آپ سلام کریں تو جواب میں وہ ''نمستے'' اور ''جے رام جی'' کی ہی کہے گا (انقلاب مؤرخہ ۱۰۔ جولائی ۱۹۳۸ء)۔

یہ بھی واضح رہے کہ ودّیا مندر کی سکیم کی رو سے وہاں بچوں کو ہندی لازمی طور پر سکھائی جاتی ہے (ایضاً)۔ اس واقعہ کو سامنے رکھیے اور مولانا آزاد کے بیان پر پھر ایک نگاہ ڈالیے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ کوئی رسم الخط جبری نہیں ہوگا۔

یہ تو تھا ہندی ترویج کا معاملہ لیکن اس کے ساتھ ہی اُردو کی تخریب کے متعلق بھی وہاں کچھ کمی نہیں کی جا رہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اُردو (دکن) اپنے ایک بیان میں رقم طراز ہیں:

> ''اب کانگریس حکومت کی نظر عنایت ملاحظہ ہو۔ اس زریں عہد میں ضلع بیتول کا واحد اُردو مدرسہ ہندی سکول میں ضم کر دیا گیا ہے۔ آٹھنیر کا اُردو سکول توڑ دیا گیا ہے اور کونر یہ کے ورنیکلر سکول سے اُردو کو نصاب سے خارج کر دیا گیا'' (انقلاب ۲۲۔ جولائی ۱۹۳۸ء)۔ اور اس پر مولانا آزاد مسلمانوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ شور مچاتے ہو۔

......☆......

پھر مولانا آزاد کا بیان ہے کہ زبان ایک ہی ہوگی البتہ دو مختلف رسوم الخط اُردو اور دیوناگری میں لکھی جائے گی لیکن عمل اس پر یوں ہو رہا ہے کہ یو پی کی کانگریسی حکومت کے ماتحت کتب قوانین کے جو تراجم ''ہندوستانی'' میں شائع ہو رہے ہیں ان میں جو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، ان کی زبان اور ہوتی ہے، اور جو اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں ان کی اور (نگار بحوالہ احسان ۱۱۔ جولائی ۱۹۳۸ء)۔

پھر حضرت مولانا نے کانگریس کا یہ فیصلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس مشترکہ زبان کا نام ''ہندوستانی'' ہوگا لیکن ہم مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ اس بات پر بڑی شدت سے مصر ہیں کہ زبان کا نام ''ہندی اتھوا ہندوستانی'' ہوگا اور جب مولوی عبدالحق صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو مہاتما جی کا اصرار اور بھی بڑھ گیا اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس میں سے ''ہندی'' کا لفظ نکال کر صرف ''ہندوستانی'' نام رکھنا کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ چنانچہ ان کے نزدیک اس کا نام ''ہندی اتھوا (یعنی) ہندوستانی'' ہی ہے، یعنی اصل نام تو ہندی ہے! البتہ اسی کو عرف عامہ میں ''ہندوستانی'' بھی کہہ لیا جاتا ہے۔ مہاتما جی سے کسی نے نہیں کہا کہ لفظ ''ہندی'' پر اصرار فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ڈاکٹر اشرف ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ انھیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے البتہ اس کے خلاف کچھ کہنا یہ فرقہ پرستی ہے۔ اگر کہیں مسٹر جناح یہی طرزِ عمل اختیار کرلیں اور کہہ دیں کہ اس زبان کا نام اُردو یعنی ''ہندوستانی'' رکھا جائے تو آپ دیکھیں کہ کس طرح شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے، رجعت پسندی ہے، ٹوڈیت ہے۔ علیحدگی کا رجحان (Separatist Tendency) ہے متحدہ قومیت کی تشکیل کے خلاف ہے اور خدا جانے کیا کیا ہے۔

پھر مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ ان کے نزدیک ''ہندی اتھوا ہندوستانی'' وہ زبان ہوگی جو جنوبی ہند کی زبانوں سے قریب تر ہوگی اور اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں گے لیکن بایں ہمہ مولانا آزاد مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ جدید زبان صاف اور سلیس زبان ہوگی جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہیں ہوں گے یعنی مہاتما جی زبان کی گاڑی کو مدراس کی طرف لیے جا رہے ہیں اور مولانا صاحب مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ نہیں یہ تمھاری نگاہ کی تنگ نظری کا ثبوت ہے۔ تم یہی سمجھو کہ گاڑی لکھنو کی طرف آ رہی ہے اور جو شخص اپنی آنکھوں سے گاڑی کو دیکھ کر کہہ دے کہ نہیں صاحب یہ تو ہمارے سامنے مدراس کی طرف جا رہی ہے شمال اور جنوب کا فرق کوئی ایسا غیر محسوس فرق نہیں ہے جسے ہم یوں پہچان نہ سکیں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ تمہیں تعصب اور فرقہ پرستی نے اندھا کر دیا ہے۔ گاڑی شمال ہی کی طرف آ رہی ہے، خدا کرے کہ کہیں ان حضرات کو بھی وہی آنکھیں مل جائیں جن سے جمہور مسلمان دیکھتے ہیں پھر ان سے پوچھیں کہ گاڑی کدھر جا رہی ہے۔

کیا جانیے کیا کہتا کیا دیکھتا کیا کرتا
زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

......☆......

مسلمانوں کا طرزِ عمل

ہندوؤں کے متعلق تو آپ نے دیکھ لیا کہ وہ اُردو زبان کو ہندی بنا دینے میں کس برق رفتاری کے ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں کہ مسلمان اس باب میں کیا کہہ رہے ہیں (اور ہو بھی کیوں! انھوں نے مسلمانوں کی دوستی کا دم کس دن بھرا تھا جو ان سے اس قسم کی توقع کی جائے) لیکن اس کے مقابلہ میں اُردو کو شدھ کر دینے میں خود مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندوؤں کے مقصد کو قریب تر لانے میں اور بھی زیادہ ممد و معاون بن رہا ہے۔ مسلمان مقررین، مصنفین، جرائد و رسائل محض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر اب آہستہ آہستہ اس قسم کی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جس زبان کا آج سے دس برس پیشتر کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الٰہ آبادی کا وہ خط ہے جو انھوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا اور اب تو حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اُردو رسالوں میں وِدوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ ایک مسلم اُردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہو گا، وِدوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ: ''میں حجازی اُردو سے اپنے رسالہ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا'' اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے، کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے، لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اُردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنھیں اگر آپ جوں کا توں حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ اُردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں، مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا......
آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے سندر ملی جلی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ دونوں سمجھتے تھے لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ چیز نہیں

ہے۔" (رسالہ جامعہ، اکتوبر ۱۹۲۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے۔ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے۔ بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کردے۔ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے، ہاتھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جارہا ہے کہ مہاراج! ہم اُردو کا نام بدلے دیتے ہیں۔ ہم اس کے رسم الخط کو بھی درست کرلیں گے مگر ہم تو یہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی و فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے، آپ خود دیکھ لیجیے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت سے اس زبان میں داخل کر رہے ہیں، ہم آپ کے پرستاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سارے ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدھار کے لیے۔ پرنتو آپ سے کیوں اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجیے۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر "قوم پرستوں" پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت "اباسین" کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرہ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لیے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لیے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علیحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جارہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بین بین راستہ پیدا ہو جائے گا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جارہا ہے کہ "اُردو مسلمانوں کی زبان ہے" تو کیوں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے۔ ہماری زبان رہے گی اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

......☆......

یاد رکھیے زبان کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں جسے آپ یوں ہی ایک نظری بحث (Academic Discussion) قرار دے کر آگے گزر جائیں اور اُردو زبان پر تاریخی مقالات لکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ آپ نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ اُردو ہی ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار پا سکتی ہے۔ یہ بحث اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس لیے کہیں زیادہ قوت عمل کی محتاج۔ ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے اسلامی تمدن اور مذہب کا تیرہ سو سال کا ذخیرہ اولاً عربی زبان میں ہے۔ ہندوستان کا مسلمان سوائے عربی مکاتب کے چند

طالب علموں کے، اس ذخیرہ سے بالکل ناآشنا ہو چکا ہے اور اس لیے اپنے متعلق معلومات کے لیے مغرب کے مستشرقین کا محتاج ہے۔ وہ جس قسم کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔ پھر اس خزانہ کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بھی بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک کتب عربی اور فارسی کس درجہ مہمل ہو چکی ہیں۔ اس کا نظارہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کسی کباڑی کی دوکان پر دیکھیے۔ نادرۂ روزگار کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر ردی کے بھاؤ بکتے ہیں۔ جمع شدہ ذخیرہ یوں ضائع ہو رہا ہے اور آئندہ ایک کتاب بھی ان زبانوں میں یہاں نہیں چھپتی، چھپے کس کے لیے؟ عربی اور فارسی یوں ختم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ تھوڑا سا سرمایہ علمی اُردو میں منتقل ہوا تھا۔ اب جس وقت آزاد ہندوستان کی زبان ہندی (یا براہ فریب نگاہ ہندوستانی) ہوگئی تو آپ دیکھیں گے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں اُردو کا تمام ذخیرہ اس طرح آثار قدیمہ والوں کی نذر ہو جائے گا جس طرح آج عربی اور فارسی کا ہو چکا ہے اور جب کوئی قوم اپنے اسلاف کے سرمایہ علمی سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی تہذیب، تمدن، لٹریچر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انگریزوں نے یہاں پہنچ کر نہ تو انگریزی کو بالجبر رائج کیا۔ نہ عربی اور فارسی کو جبراً سکولوں سے خارج کیا لیکن ایک سو سال کے عرصہ میں جو کچھ تبدیلی یہاں ہوگئی۔ وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنی زبان پر غیروں کی زبان کے غالب آ جانے سے قوم کی ذہنیت بدل گئی اور قوم کی قوم علمی سرمایہ کی اس متاع گراں بہا سے تہی دامن ہوگئی جو صدیوں سے اس کے لیے مایہ ناز تھی۔

......☆......

رسم الخط کا مسئلہ

پھر مسلمان کے لیے رسم الخط کا مسئلہ اس سے بھی اہم ہے۔ اُردو کا رسم الخط دائیں سے بائیں طرف، عربی رسم الخط ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندی رسم الخط (بائیں سے دائیں طرف) سنسکرت کا رسم الخط ہے۔ آپ کا رسم الخط تمام عالم اسلامی کے ساتھ آپ کا تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات جسے پان اسلام ازم کا ہوّا بنا کر ڈرایا جاتا ہے، ہندوؤں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھٹکتے رہے ہیں۔ یہ تمام ''معصوم کوششیں'' جو بتدریج اُردو رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط کی ترویج کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی ہیں دراصل اسی جذبہ کا مظاہرہ ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو باقی عالم اسلامی سے الگ کر کے انھیں ہندی قومیت میں جذب کرنے کے لیے ہر ہندو کے دل میں موجزن ہے۔ یہ اتنا بڑا خطرہ ہے کہ اگر ہندوستان کے

مسلمان بروقت آگاہ نہ ہوئے اور قومیت پرست مسلمانوں کے ہمدردی سے لبریز بیانات پر بھروسہ کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ اپنی اصل سے اس طرح کٹ جائیں گے جس طرح فصل خزاں میں ایک شاخ درخت سے ٹوٹ کر گر پڑتی ہے اور جس کے لیے پھر کبھی مژدہ بہار نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے مصیبت تو یہاں خود اپنوں کی لائی ہوئی ہے۔ سی پی میں اگر ہندی کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے تو مسلمانوں کو اس سے اتنی ہی شکایت ہوسکتی ہے کہ کانگریس باوجود قومی جماعت کے ادعا کے خالص ''فرقہ ورانہ'' اقدام کر رہی ہے لیکن سینۂ مسلم کا ناسور تو اس وقت رستا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ دہلی کے جامعہ اسلامیہ میں، جو ایک آزاد اسلامی درس گاہ ہونے کی مدعی ہے، ابھی سے ہندی کی تعلیم جبری کر دی گئی ہے۔ جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کا کیا شکوہ!!

......☆......

کہہ دیا جا سکتا ہے کہ ''تم نے انگریزی بھی تو سیکھی تھی جس کا رسم الخط اُردو سے مختلف تھا'' لیکن انگریزی سیکھنا تو غلامی کی لعنتوں میں سے تھا اگر آزادی کی برکات کا نتیجہ بھی وہی کچھ ہوا تو دونوں میں فرق کیا ہوا؟ پھر انگریزی، ہندوستان کی متحدہ زبان نہیں قرار دی گئی تھی، وہ حاکم قوم ہی کی زبان رہی تھی۔ اگر ہندو یہ اعلان کر دیں کہ ہندی ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے، جس کے ہاتھ میں نظام حکومت ہوگا اس لیے اقلیتوں کو یہ زبان بالجبر سیکھنی پڑے گی تو بات صاف ہو جائے۔ اس مقصد کو ''متحدہ قومیت کے مشترکہ مفاد'' کے نقاب میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟

پھر کہہ دیا جاتا ہے کہ ترکوں نے اپنا رسم الخط ترک کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے جو عربی رسم الخط سے مختلف ہے تو تم بھی ایسا کر لو گے تو کیا حرج ہوگا۔ سو اوّل تو ترکوں کے حالات ہم سے مختلف ہیں۔ ان کی حکومت اپنی ہے۔ زبان اپنی ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کن مصالح کی بنا پر رسم الخط بدلا ہے لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ترکوں کا ہر فیصلہ ہمارے لیے سند ہے؟ ہم اپنے فیصلے اپنے خیالات کے مطابق خود کریں گے۔ ہمارے فیصلے ہندو اکثریت کیوں کرے؟

بعض حضرات کو کہتے سنا ہے کہ ہم ہندی رسم الخط اختیار کر کے اپنا تمام لٹریچر ہندی میں منتقل کر دیں گے اور اس طرح اسے ہندوؤں تک پہنچا کر اپنے مذہب اور تہذیب کی تبلیغ کر سکیں گے۔ بگلہ پکڑنے کا یہ طریق ایسا ''استادانہ'' ہے جس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ آج جتنے ہندو اچھی طرح سے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں پوچھیے کہ وہ آپ کے اسلامی لٹریچر کو کتنا پڑھتے ہیں اور ان کے خیالات کو آپ نے کس حد تک

متاثر کیا ہے؟

پھر کہا جاتا ہے کہ اُردو میں اسّی فی صدی الفاظ ہندی کے ہیں اس لیے اسے ہندی میں تبدیل کر دینے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے! لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اُردو میں اسّی فی صدی الفاظ ہندی کے ہیں جو ہندوؤں کی آبادی کے تناسب سے بھی زیادہ ہیں تو اسی زبان کو قومی زبان کیوں نہ قرار دے دیا جائے۔ مسلمانوں کا تو اس میں پھر بھی بیس فی صدی ہی حصہ رہے گا لیکن ہندو تو اتنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو اسے سو فی صدی ہندوانہ بنانا چاہتا ہے اور رسم الخط وہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں اس کے سوا اور کوئی نہ سمجھے۔ معلوم نہیں حکومت حاصل کر کے یہ باقی دنیا سے کس رسم الخط میں خط کتابت کیا کریں گے؟ اُردو رسم الخط سے تو پھر بھی کم و بیش آدھی دنیا واقف ہے۔

......☆......

نمونہ ''ہندوستانی''

آخر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس ''ہندوستانی'' کا نمونہ بھی دکھا دیا جائے جو آپ کے آزاد ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے والی ہے۔ بھارت ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ یوں شروع ہوتا ہے:

> ''اس سبھا کا سبھا پتیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو وہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لیے کم سے کم دولیش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم جو کچھ ہو۔ میں آشاں کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور پھر بھوشیہ میں اپنا شیوا کیشتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لے کر کھنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔ تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیون نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں ددارا ہندوستان کی پتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں'' (رسالہ جامعہ، مؤرخہ مئی ۱۹۳۶ء)۔

یہ ہے وہ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق صاف و سلیس اُردو جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی

جاتی ہے۔

اس سے بھی دلچسپ ایک اور نمونہ ہے۔ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے ''ذریعہ تعلیم'' کے متعلق جو حکم حال ہی میں صادر فرمایا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستانی زبان کو سنسکرت سے بھرنے یا فارسی سے ملانے کے خلاف اکثر یورپین اور ہندوستانی فضلا نے آوازیں بلند کی ہیں جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں:

.... میں ان میں سے فقط دو حضرات یعنی پنڈت گردھر شرما اور مولانا وحیدالدین سلیم کے خیالات درج کرتا ہوں۔ پنڈت جی فرماتے ہیں:

''سنسکرت مایا بنا کر آپ نے بنگال۔ مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار کریں کنتو وہ کیول شکشتیو کی بھاشا (پڑھے لکھوں کی زبان) بن گئی۔ سروسدھارن (عوام) اسے بالکل نہ سمجھ سکے۔ تو کیا لابھ (فائدہ) ہوا۔ لابھ کیا بڑی ہانی (نقصان) ہو گئی........ ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد (الفاظ) ہی پرتھام لینی چاہیے۔ لیکن جب ان سے اوشکتا (ضرورت) پوری نہ ہو تب سنسکرت بھاشا سے سرل شبد (آسان الفاظ) لینے چاہئیں۔ (کلیم بابت اگست ۱۹۳۸ء)

یعنی پنڈت جی نے ہندوؤں کو نصیحت کی ہے کہ ہندی زبان کو ایسا سلیس لکھو کہ اس میں سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہ آئیں لیکن جس زبان میں انھوں نے خود یہ پیغام دیا ہے اس کے سمجھنے کے لیے مہاراج بکرماجیت کے کسی نورتن کی ضرورت ہے۔ یہ ہے نمونہ آسان اُردو کا جو آپ کی مشترکہ زبان بنے گی۔ مولانا آزاد ان باتوں کے متعلق کسی بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہندوؤں کے جی میں جو کچھ آئے کریں وہ معقول اور حق بجانب ہے۔ البتہ کبھی مسلمان کوئی شکایت کرے تو انھیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندوؤں کی صفائی پیش کر دیں۔ ان مثالوں کو شاید کوئی یہ کہہ کر مسترد کر دے کہ یہ کوئی سند تھوڑی ہیں؟ آیئے ہم آپ کو ایک ایسا نمونہ دکھائیں جس کے مستند ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو۔ صوبہ متحدہ کی کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیمات آنریبل سری سمپورنانند جی نے ایک تقریر کی جس کا ترجمہ ''ہندوستانی'' زبان میں فوراً گورنمنٹ کے محکمہ اطلاعات نے شائع کیا ہے۔ اس کے مستند ہونے میں تو کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکتا؟ ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کون سی زبان میں ہے۔ واضح رہے کہ یہ زبان اس لکھنؤ سے شائع ہو رہی ہے جو ہندوستان بھر میں اُردو کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تقریر مع عنوان یہ ہے:

''شکشا سنگٹھن تمت کے سمکش سنکیت پرانت کے شکشا سچیو مانئے شری سمپورنا نند جی کا دیا کھیان (پرکاش بھاگ سنکیت پرانتیہ گورنمنٹ)''

ادھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک بشستا ہے کہ شکشتر شمیا کے پرت لوگوں کا آکرشتر بیت وشدہ اور بیاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات ادھکاوش سے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس بشیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا ان بھون کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس حاسنک اور پدہارتک پرستھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو سماجک (راج) نیتک اور ارتھک ادہار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجون سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو دیاپی پرگت کو ہمارے سمکہ نش سندیہ ایک بسیس روپ دب میں ایشتھت کیا ہے اور ایک وشیس بھارتیہ سمیتہ بنادیا ہے۔ ذرا آواز دیجیے مولانا آزاد صاحب کو اور ان سے پوچھیے کہ ''یہ سلیس اُردو'' جسے جنتر منتر والوں کی اصطلاح میں ''لاعلم'' کہا جائے گا۔ شمالی ہندوستان کے کس شہر میں بولی جاتی ہے؟

☆☆☆

اُردو، ہندی، ہندوستانی کا مسئلہ

غالباً اس وقت ہمارے ملک میں کوئی تہذیبی مسئلہ اس قدر الجھا ہوا نہیں ہے جتنا کہ اُردو، ہندی اور ہندوستانی کا مسئلہ ہے۔ اُردو اور ہندی کے حامیوں میں ان دونوں زبانوں کی اصل، ان کی ترقی و فروغ، ان کی موجودہ حالت و کیفیت اور مستقبل میں ان کے ارتقا کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اُردو کے بعض طرف دار ہندی کے اور ہندی کے بعض جوشیلے مدعی اُردو کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہمارے ملک کی یہ بڑی بڑی زبانیں تنگ نظری، ضد اور شرارت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔

مثلاً آنجہانی پنڈت رام چندر شکل، جنھوں نے ہندی ادب کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے اُردو کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''وہ کھڑی بولی کا 'کرترم روپ' یعنی بگڑا ہو نقلی روپ ہے، اس کا اصلی روپ ہندی ہے۔''

ڈاکٹر دھریندر ورما، الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے صدر، لکھتے ہیں:

''چونکہ ہمارے حاکم اب بدل گئے ہیں (یعنی مسلمانوں کی جگہ انگریز ہندوستان کے حکمراں ہیں) اس لیے پہلے کے مقابلے میں اب اُردو کا مستقبل اتنا روشن نہیں رہا۔''

پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی فرماتے ہیں:

''اُردو کی تمام تر فضا اور روح بدیسی ہے، ہندوستانی نہیں۔''

اب اُردو کے حامیوں کی ہندی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی سنیے:

میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر 'ہمایوں' لکھتے ہیں:

''جدید ہندی ایک مصنوعی زبان ہے۔''

مولوی عبدالحق صاحب کا فرمانا ہے کہ:

''اُردو ہندی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔''

آپ کے نزدیک جدید ہندی، ہندو تعصب اور فرقہ پرستی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو بھی ہندی کے متعلق ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جسے ہندی کے نام سے چڑ ہے۔

جب ہندوستان کی ایک مشترکہ قومی زبان کا سوال اٹھتا ہے تو اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہندی کے حامی کہتے ہیں کہ ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہونے کا حق صرف ہندی کو ہے۔

اُردو والے اعلان کرتے ہیں کہ اُردو ہی اس ملک کی قومی زبان بن سکتی ہے۔

ہندی والے اُردو والوں کو اور اُردو والے ہندی والوں کو قائل نہیں کر سکتے۔

گاندھی جی نے حال میں ایک درمیانی صورت نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن خود کانگریس کے تمام لوگ اس معاملے میں گاندھی جی سے متفق نہیں ہیں۔ ایک طرف بابو پرشوتم داس ٹنڈن، سمپورنانند جی اور ہندی ساہت سمیلن کی اکثریت ہے۔ اس گروہ کا کہنا ہے کہ:

"ہمیں ڈر ہے کہ ہندوستانی کا مبہم نام دے کر ملک پر کہیں اُردو نہ ٹھونس دی جائے" (سمپورنانند جی کا بیان)۔

دوسری طرف جمعیت علما اور اکثر مسلمان کانگریسی ہیں جو گاندھی جی سے اس معاملے میں اتفاق نہیں کرتے۔ انھیں یہ ڈر ہے کہ ہندوستانی کے نام پر کہیں ہندی کا پرچار نہ شروع ہو جائے۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان گاندھی جی اور ان کے حمایتی کھڑے ہیں۔ اُردو کی حمایت کرنے والوں کی اکثریت بھی گاندھی جی کے تصور والی ہندوستانی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تہذیبی میدان میں گویا دو ایسے کیمپ بن گئے ہیں جو ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں اور یہ تہذیبی جنگ دن بدن زیادہ شدید ہوتی جاتی ہے۔

دونوں فریق صرف اپنے کو سچائی پر سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف انھیں صرف جھوٹ اور ضد اور تعصب نظر آتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ ٹھیک ہے جو اُردو والے ہندی کے متعلق اور ہندی والے اُردو کے متعلق سوچتے ہیں اور اگر ان دونوں زبانوں کی بنیاد مصنوعی اور غیر فطری ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کہ ان دونوں زبانوں کی دن بدن ترقی ہو رہی ہے اور ان کی مقبولیت عوام میں بڑھ رہی ہے؟ ان میں ہماری

قوم کے بہترین علمی، سیاسی، فلسفیانہ، مذہبی اور ادبی خیالات و جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے؟ ہندوستان کے ان علاقوں میں بھی جہاں دوسری زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں، اُردو اور ہندی کو لوگ شوق سے پڑھتے ہیں اور موقع پڑنے پر بولتے بھی ہیں۔ اُردو اور ہندی کو ہندوستان میں ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ بہت سے لوگ جو ہندوستان کی دوسری زبانیں بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں اُردو یا ہندی بولنا اور پڑھنا اپنا قومی فرض سمجھنے لگے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو اور اُردو کی دوسری انجمنیں کالی کٹ سے لے کر آسام تک اور چٹ گاؤں سے لے کر کراچی تک پھیل گئی ہیں۔ اسی طرح ہندی کو بھی سارے ہندوستان میں بہت زبردست مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک کسی زبان کی جڑیں کسی قوم کی تہذیبی اور روحانی روایات میں پیوست نہ ہوں اور جب تک اس کی بنیاد کسی ایسی زندہ بولی پر نہ ہو جو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ عوام میں بھی رائج ہو، اس وقت تک وہ عمومی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی اور ایک جمہوری اور ترقی پذیر سماج میں کلچر کے ارتقا کی آلۂ کار نہیں بن سکتی۔ چونکہ اُردو اور ہندی ایسی زبانیں ہیں اس لیے وہ ترقی کر رہی ہیں، اسی لیے کہ ان میں صلاحیت ہے کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے حصوں کی تعلیم کا ذریعہ اور وسیلہ بنیں۔ ان میں اس کی بھی صلاحیت ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف زبان بولنے والے علاقوں کے لوگوں کی مشترک زبان ہوں۔

اُردو کی ابتدا کیسے ہوئی؟

مسلمان جب ہندوستان میں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں آئے تو ان کا سیاسی مرکز وہ علاقہ تھا جو لاہور سے لے کر دہلی، آگرہ اور میرٹھ تک پھیلا ہوا ہے۔ گریرسن نے اس کو لسانی اعتبار سے مغربی ہندی کے علاقے میں شامل کیا ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ شاخیں ہیں: بانگرو، کھڑی بولی، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی۔ دِلّی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بانگرو اور کھڑی بولی بولی جاتی تھیں۔ باہر سے آنے والے مسلمان ترکی یا فارسی بولتے تھے۔ اب کھڑی بولی میں ترکی اور فارسی کے الفاظ ملنے شروع ہوئے۔ مسلمان حکمرانوں کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن زندگی اور حکومت کی ضرورتیں انھیں عام لوگوں کی زبان کا استعمال کرنے پر مجبور کر رہی تھیں، اسی طرح سے عام لوگوں کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی بات نئے آنے والوں کو سمجھا سکیں۔

حکمرانوں سے دور مسلمان صوفیوں اور فقیروں کا طبقہ تھا جو اپنا پیام اس ملک کے عوام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ لوگ عربی، فارسی اور ترکی کے عالم تھے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ اپنے روحانی پیام کو ہندوستان

کے عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہاں کے علومِ مذہبی اور فلسفیانہ خیالات کو جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور کے مسلمان علما اور صوفیا سنسکرت اور یہاں کی دوسری زبانوں کو سیکھتے اور پڑھتے تھے اور ہندوستان جیسے متمدن ملک کے مذہبی رجحانات سے متاثر بھی تھے۔ کھڑی بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے ابتدائی فقرے اور چند اشعار مشہور درویش اور صوفی بابا فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ بابا فرید خود اس زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ بابا فرید بارھویں صدی کے آخر ۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے اور آپ کا انتقال ۱۲۶۵ء میں ہوا۔ آپ کا مزار پاک پٹن میں ہے جو لاہور کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔
ظاہر ہے کہ مسلمان درویش اور مبلغ اپنے مذہبی وعظ یہاں کی ہی زبانوں میں کرتے ہوں گے۔ حافظ محمود شیرانی صاحب اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں شیخ اسمٰعیل لاہوری کی مجالس وعظ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو شریک ہوتے تھے یہ بھی تیرھویں صدی کی بات ہے۔ یہی صدی امیر خسرو کی بھی ہے جنھیں جدید اُردو اور ہندی کا جنم داتا مانا گیا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ امیر خسرو سلطانِ دہلی کے دربار سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ہمارے ملک کے بہت بڑے عالم، شاعر، ماہرِ موسیقی، درویش اور صوفی تھے اور حضرت نظام الدین اولیا کے محبوب مریدوں میں سے تھے۔ امیر خسرو نے جب خواجہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو اپنا لاکھوں روپے کا مال و زر غریبوں میں بانٹ دیا۔

خسرو کی مکریاں، پہیلیاں، دو سخنے، ڈھکو سلے ہماری زبان کی عوامی اصل کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ خسرو نے جو زبان استعمال کی وہ ان کی اختراع کی ہوئی نہیں ہے لیکن ان کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے اپنے آس پاس کی مروجہ عوامی زبان کو ایسی ادبی تخلیق کے لیے استعمال کیا جو عوام سے متعلق تھی اور جو عوام کے لیے تھی۔

یہی صوفی، فقیر، درویش اور شمالی ہندوستان میں رہنے والے عام لوگ جب مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ گجرات اور دکن گئے تو اس زبان کو اپنے ساتھ وہاں بھی لے گئے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی تھی اور دربار اور جاگیری طبقے سے متعلق جس قدر بھی ادب اور دیگر علمی یا مذہبی مضامین کی تخلیق ہوتی تھی اور ابھی تک ادبی درجہ حاصل نہیں کر سکی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کا تعلق عوام سے تھا، جو عوام تک اپنا پیام پہنچانا چاہتے تھے اور جو عوام پر روحانی اثر ڈالنا چاہتے تھے اس بولی کو استعمال کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو نثر کا سب سے پہلا رسالہ حضرت گیسو دراز بندہ نواز کا لکھا ہوا ہے۔
حضرت گیسو دراز بندہ نواز تعلیم و تبلیغ کے لیے دِلّی سے چل کر گجرات آ گئے اور آخر میں گلبرگ میں آ کر متوفی

ہوئے۔ آپ کا رسالہ ''معراج العاشقین'' غالباً ۱۳۹۸ء یعنی چودھویں صدی کے خاتمے پر لکھا گیا ہے۔ تقریباً ایک سو سال بعد (۱۴۹۵ء) حضرت شاہ میرانجی شمس العشاق کی شرح مرغوب القلوب ملتی ہے جس کی زبان معراج العاشقین کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ میراں جی کے صاحب زادے شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری نے نظم و نثر دونوں لکھیں جس کے نمونے ملتے ہیں۔ آپ کی وفات کی تاریخ ۱۵۸۲ء ہے۔ سترھویں صدی کے اوائل میں بھی صوفیا اور مشائخ کے لکھے ہوئے مذہبی رسالے اور نظمیں ملتی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملا وجہی کی قطب مشتری (۱۶۰۹ء) سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰۔۱۶۱۱) کی ابتدائی منظومات اور ۱۶۳۴ء میں تحریر شدہ سب رس کے پہلے، بابا فرید گنج شکر کے زمانے سے لے کر سترھویں صدی کے شروع تک یعنی تقریباً پانچ سو سال تک کھڑی بولی ہندی یا ہندوی کے نام سے صوفیا، مشائخ، فقرا، اپنی مذہبی تبلیغ کے لیے استعمال کرتے رہے۔

یہاں پر یہ امر بھی توجہ کے قابل ہے کہ اس زمانے میں ہمارے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک زبردست تحریک جاری تھی۔ تصوف کا فلسفہ ہمہ اوست اور ویدانت کے بھگتی کے تصور میں نہ صرف گہری مشابہت تھی بلکہ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دونوں اسلامی اور ہندو تصورات ایک دوسرے پر اثر انداز تھے۔ مسلمان اور ہندو صوفی اور بھگت ایک دوسرے سے ملتے تھے اور طریقت و معرفت کی جستجو میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

مثال کے طور پر حضرت گیسودراز کا رسالہ معرج العاشقین لیجیے۔ تصوف و معرفت کے مسائل کے سلسلے میں آپ نے جو اصطلاحیں اس رسالے میں استعمال کی ہیں وہ سنسکرت کی وہ اصطلاحیں ہیں جو اس زمانے کے ہندوستان میں ہندو سنت استعمال کرتے تھے۔ مثلاً نرگس، سکن وغیرہ۔

حالانکہ صوفیا و مشائخ کے رسالوں اور ان کی منظومات کی زبان ادبی اعتبار سے بلند درجے کی نہیں ہے لیکن اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالص ہندوستانی الفاظ بکثرت اور بغیر کسی جھجک کے استعمال کیے گئے ہیں ہندی چھند (بحروں) کا بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً شاہ برہان الدین جانم کی سکھ سہیلا ہندی چھند میں ہی لکھی گئی ہے۔

ان تمام باتوں کے مدنظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ اُردو کی ابتدا جب کہ اس کا نام ہندی یا ہندوی تھا، یہاں کی کھڑی بولی میں فارسی، ترکی اور عربی کے ان الفاظ کے ملنے سے ہوئی جسے باہر سے آئے ہوئے عام مسلمان

بولتے تھے۔

۲۔ اس زبان کی نحوی ساخت خالصاً ہندوستانی ہے۔

۳۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلی اور پھر جس علاقے میں گئی وہاں کے مقامی اثرات اس نے قبول کیے۔

۴۔ اس کی ابتدائی تحریری صورت حکمراں، مسلم امرا اور ارباب حکومت سے وابستہ نہیں ہے۔ ان کی زبان فارسی یا ترکی تھی۔ تحریری شکل میں اس کا استعمال پہلے دور میں مسلم صوفیوں اور فقیروں نے کیا۔ یہ خود فارسی اور عربی کے عالم تھے لیکن اپنے مذہبی پیام کو یہاں کے عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے یہاں کی ہی ایک بولی اختیار کی۔

۵۔ پھر بھی اس پر مسلم تہذیب کے اثرات حاوی ہیں اس کے ابتدائی دور کے تمام مصنف مسلمان ہیں۔ اس کی تمام ابتدائی کتابیں جن کا ذکر اوپر آیا اسلام سے متعلق ہیں۔ اس کا رسم الخط فارسی ہے۔ اس کی ابتدائی نثر پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔

ہندی کا ابتدائی دور۔ برج بھاشا اور اودھی

جس طرح کھڑی بولی مسلم اثر کے ماتحت ایک نئی شکل اختیار کر رہی تھی اس طرح ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی ابھر رہی تھیں۔ بھگتی کی تحریک ہندوؤں میں تیزی سے پھیل رہی تھی اور اس تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عوام سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے مبلغ عام لوگوں کی بولی استعمال کرتے تھے۔ اس طرح ہمیں نظر آتا ہے کہ بارھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان چندی داس نے سری کرشن کیرتن گن راج خان نے سری کرشن وجے بنگالی زبان میں لکھی، جنان ایشوری اور ایک ناتھ کی راماائن مرہٹی زبان میں لکھی گئی، آسامی زبان میں شنکر دیو نے بھگتی کے مضامین نظم کیے۔ ودیاپتی نے متھیلی میں جگن ناتھ داس نے اریا میں بھاگوت پران لکھا، تلسی داس نے اودھی میں رام چرت مانس، کبیر نے اودھی، برج اور کھڑی بولی ملی جلی سدھکڑی میں اور گرونانک نے پنجابی میں سکھیاں لکھیں، میرابائی نے راجستھانی میں اپنے گیت لکھے اور نرسنھا مہتا اور پدمنا بھا نے گجراتی میں بھگتی کے گن گائے۔

شمالی ہندوستان میں رام بھگتی کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے شاعر کبیر داس ہوئے ہیں۔ ان کی پیدائش بچپن میں ان کی تعلیم و تربیت، ان کی زندگی، ان کے فلسفۂ حیات اور ان کی موت کے متعلق جو

اختلافات ہیں وہ نہایت سبق آموز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک برہمن کے لڑکے تھے۔ جن کو ان کی ماں نے اپنی بدنامی کے خیال سے بنارس کے ایک گھاٹ کی سیڑھیوں پر چھوڑ دیا تھا۔ وہاں سے ایک مسلمان جولا ہے نے ان کو اٹھالیا اور اپنا بچہ بنا کر انھیں پالا۔ اس زمانے میں بنارس میں رام بھگتی فرقے کے بانی گرو رامانند کا قیام تھا۔ کبیر نے ان سے کسب فیض کیا۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ مشہور صوفی شیخ تقی کے آپ شاگرد تھے۔ کبیر ایک غریب محنت کش انسان کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے فلسفے میں رام سے مراد ایک ہمہ گیر الٰہی قوت ہے جس کی نظر میں ہندو مسلم سب ایک انسان ہیں۔ انھوں نے ہندو اور مسلم مذہب دونوں میں مردہ رسم ورواج کی سختی سے مخالفت کی اور دونوں کو ایمانداری، صلح، امن اور بھائی چارے کا سیدھا سادھا لیکن بہت پر اثر پیام دیا۔ کبیر کا جب انتقال ہوا تو ہندو ان کو ہندوؤں کی طرح جلانا چاہتے تھے، مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے اور آج مگھر میں کبیر کی جائے وفات پر دو علیحدہ احاطے بنے ہیں۔ ایک میں مسلمان مجاور ہیں دوسرے میں ہندو۔ شمالی ہند کے دیہاتوں میں لاکھوں ہندو اور مسلمان دیہاتی ان کے کلام کو اب بھی پڑھتے اور گاتے ہیں۔

کبیر حالانکہ بنارس اور گورکھ پور کے علاقے کے رہنے والے تھے جہاں کی زبان بھوج پوری اور اودھی ہے لیکن یہ بات غور کے قابل ہے کہ ان کی ساکھیوں کی زبان میں کھڑی بولی، راجستھانی اور جنوبی پنجابی کے اثرات بھی ہیں۔ مثلاً کبیر کے یہ بچن دیکھیے۔

کبیر من نرمل بھیا جیسا گنگا نیر

یا

کبیر کہتا جات ہوں سنتا ہے سب کوئے
رام کہے بھلا ہوئے گا، ناہیں تر بھلا نہ ہوئے

یا

آؤں گا نہ جاؤں گا، مروں گا نہ جیوں گا
گرو کے سبد، رم رم رہوں گا

ان بچنوں میں جیسا کہتا ہوں، سنتا ہوں، جاؤں گا، مروں گا، رہوں گا سب کھڑی بولی کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی میں ہی کھڑی بولی پھیلنے لگی تھی۔ دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر ایک طرف مسلمان صوفیا کے زیر اثر کھڑی بولی کی ایسی ادبی شکل ظاہر ہو رہی تھی جس پر

مسلم اثرات حاوی تھے تو اس کا ایک ایسا پہلو بھی تھا جس پر ہندو اثرات حاوی اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کبیر داس کی شاعری پر مسلم اثرات حاوی تھے تو اس کا ایک ایسا پہلو بھی تھا جس پر ہندو اثرات حاوی اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کبیر داس کی شاعری پر مسلم اثرات بھی ہیں۔ انھوں نے فارسی اور عربی کے الفاظ بھی اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام کی فضا ہندو ہے۔ ان کے چھند (بحریں) تمام تر سنسکرت کے ہیں۔ سنسکرت کے تت سم اور تد بھو الفاظ کا بھی وہ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں، اس کے علاوہ کبیر کا کلام ناگری رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔

سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں شمالی ہند میں اَودھی اور برج بھاشا کا بہت عروج ہوا۔ جدید ہندی کے ماخذ کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے ہمیں ان زبانوں کے ارتقا پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اَودھی زبان میں بلند اور ابدی حیثیت حاصل کرنے والوں میں سب سے پہلا نام ملک محمد کا ہے جو ضلع رائے بریلی کے قصبہ جائس کے رہنے والے تھے۔ ان کی مشہور نظم کا نام پدماوت ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو مثنوی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں چتوڑ کی رانی پدمنی، اس کے شوہر راجا رتن سین اور سلطان علاء الدین خلجی کے واقعے کو بنیاد بنا کر اور اس میں کافی اختراع کر کے ملک محمد نے تصوف کے فلسفے کو ایک افسانے کے روپ میں نہایت دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔ ملک محمد کی شاعری اور ان کے تخیل میں ہمیں ہندو مسلم کلچر کا امتزاج بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔ نرگن کا بھگتی تصور یہاں اسلامی تصوف سے پوری طرح مل گیا ہے۔ ملک محمد جائسی نے جو تلمیحات، استعارے اور اشارے استعمال کیے ہیں وہ سب کے سب بھگتی کے ہیں۔ انھوں نے خود ان تلمیحوں کے معنی مندرجہ ذیل الفاظ میں ہمیں بتائے ہیں:

تن چتوڑ، من راجا کی نھا
ہیا سن گھل، بدھی پدمنی چین ھا
گرد سُوا جئی پنتھ دکھاوا
بن گرو جگت کو نرگن پاوا؟
ناگ متی یہ دنیا دھندھا
بانچا سوئی نا راہی چت بندھا
راگھو دوت سوئی سیطانو
مایا علاوڈی سلطانو

جسم کو چتوڑ اور شعور کو راجہ بنایا۔ دل کو سن گھل کی مملکت اور عقل کو مثل پدمنی شناخت کیا۔ طوطا گرو پیر مرشد ہے جس نے راہ دکھائی بغیر مرشد کے دنیا کو کس نے لاصفات پایا۔ ناگ متی یہ دنیا دھندا ہے راگھو کا سفیر ہی شیطان اور مایا؟ (پُر فریب خواہشات کی دنیا) سلطان علاء الدین ہے۔

جائسی نے پدماوت شیر شاہ کے عہد حکومت میں لکھی یعنی ۱۵۴۰ء اور ۱۵۴۵ء کے درمیان۔ ان کے بعد یہ طرز کافی مقبول ہوئی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں شیخ عثمان نے اسی طرز کی ایک نظم چترادلی لکھی۔ ان کے بعد شیخ نبی (گیان دیپ) قاسم شاہ (ہنسی جواہر) نور محمد (اندراوتی) نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں اودھی زبان میں اسی قسم کی نظمیں لکھیں۔

ہندی ادب کی تاریخ میں اودھی زبان کی ان نظموں کو 'پریم مارگی (صوفی) شاکھا' کا نام دیا گیا ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ لسانی اعتبار سے ان نظموں کی کیا اہمیت ہے۔ پہلے تو یہ کہ حالانکہ ان کے لکھنے والے مسلمان تھے اور انھوں نے تصوف کے فلسفے کو ہندوستانی لباس میں پیش کیا ہے لیکن ان پر یہاں کے بھگتی فلسفے کا گہرا اثر تھا جو ان کی شاعری میں بھگتی کی تمام مروجہ اصطلاحوں کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حالانکہ ان نظموں میں مثنوی کی بحر استعمال کی گئی ہے لیکن بقول پنڈت رام چندر شکل کے ان میں:

''شرن گار، دیر آدمی کے وزنن چلی آتی ہوئی بھارتی یہ کا دیا پرم پرا کے انو سار ہی ہیں'' (ہندی ساہت کا اتہاس، صفحہ ۱۱۸)۔

(یعنی: عشقیہ، بزمیہ اور رزمیہ بیانات ہندوستانی شاعری کے روایات کے مطابق ہی ہیں۔)

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں اُودھی کے یہ مسلمان ادیب ایک ایسی روایت (یعنی: عشقیہ، بزمیہ اور رزمیہ بیانات ہندوستانی شاعری کی روایات کے مطابق ہی ہیں۔) کے حامل تھے جو کھڑی بولی کے اس طرز سے مختلف تھی جس کی نشو ونما مسلمان صوفی اور شاعر اسی زمانے میں دکن میں کر رہے تھے۔ دونوں میں ہندو اور مسلم تصورات اور کلچر کا امتزاج تھا۔ دونوں ہندوستانی تھیں لیکن ایک میں مسلمان تہذیب و تصور کا رنگ حاوی تھا اور دوسرے میں ہندو تہذیب و فلسفے اور تصور کا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جائسی اور ان کے پیرودُں کی زبان اودھ کے شہروں اور دیہات میں رہنے والے عوام کی زندہ بولی تھی جن کی بہت بڑی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔

شاعر اعظم گوسائیں تلسی داس جی کی شاعری میں یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو تصورات و

ادب کا ایک نرمل دھارا مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بڑی شان وشوکت سے بہتا رہا۔ تلسی داس جی برہمن تھے اور ہندو الٰہیات کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ سنسکرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے کاشی میں سنت رامانند کے شاگرد اور چیلے سنت نرہری سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی ذات میں شمالی ہندوستان میں رہنے والی ہندو قوم کے بہترین مذہبی فلسفیانہ، ادبی اور اخلاقی خیالات کا امتزاج ہوا تھا۔ چونکہ وہ ایک سچے شاعر اور ادیب تھے اس لیے انھوں نے اپنے بلند پایہ خیالات کے اظہار کے لیے عوام کی اُودھی زبان استعمال کی۔ انھوں نے اس زبان کو ہندوؤں کے بہترین اور بلندترین اخلاقی اور روحانی تصورات سے مالا مال کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری صدیوں کے گزرنے کے بعد آج بھی زندہ ہے اور شمالی ہندوستان میں رہنے والے ہندو خواص وعوام میں اب بھی بڑے شوق اور احترام سے پڑھی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی یا فارسی کے وہ الفاظ جو اودھی میں شامل ہو گئے تھے، تلسی داس نے بے تکلفی سے انھیں اپنی رامائن میں استعمال کیا ہے۔

اُودھی سے بھی زیادہ برج بھاشا کو ترقی ہوئی۔ برج کے سب سے بڑے شاعر سورداس جی ہوئے ہیں۔ یہ آگرہ ضلع کے رہنے والے تھے لیکن متھرا میں جا کر بس گئے تھے۔ وہاں یہ کرشن بھگتی فرقے کے رہنما بلبھ آچاریہ کے مقرب شاگردوں میں ہو گئے۔ سورداس سنت، شاعر اور ماہر موسیقی تینوں تھے۔ ان کا سارا کلام شری کرشن جی کی بھگتی میں لکھا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا کرشن جی کے متعلق گیتوں کے لیے خاص موزونیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ کرشن اور رادھے کے متعلق پریم اور برہ سے بھرے گیت ایک طرح سے معمولی انسانوں کے عشق ومحبت کی نشانیاں بن کر بہت تیزی سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ تین سو سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی تقریباً سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک برج بھاشا میں شاعری کا ایک زبردست اور ہمہ گیر دھارا بہتا رہا۔

برج بھاشا کے بڑے بڑے جید شاعر مغل بادشاہوں کے دربار میں شاہی شاعروں کی طرح موجود رہتے تھے۔ اکبر خود برج بھاشا میں شاعری کرتا تھا اور اس کے دربار کے مشہور امیر عبدالرحیم خان خاناں کا شمار برج کے بزرگ ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد مسلمانوں نے برج بھاشا میں، اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے۔ دلی کے ایک پٹھان رس کھان کے متعلق تو ہندی کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اپنی شیرینی اور لطافت کے لحاظ سے بعض مرتبہ وہ سورداس سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ انھیں کرشن جی سے بہت گہری عقیدت تھی۔ اسی سلسلے میں ان کا مشہور سویا ہے:

مانُس ہوں تو وہی رس کھان بَسون برج گوکل گانو کے گُوارن،
جو پسُو ہوں تو کہا بس میر و چروں نت نند کی دِھنے نو مجھارن،
پاہُن ہوں تو وہی رگر کو جو دُھرِ یوگرِ چھتر پُرن در بارَن،
جو کھگ ہوں تو بسے رَدَ گردَں مِل کالِندِی کول کومب کی ڈارن،

(یعنی: اے رس کھان اگر دوبارہ جنم لے کر میں انسان کے قالب میں آؤں تو میری یہی تمنا ہے کہ برج کے گوکل گاؤں کے گوالوں میں میرا گھر بنے۔ اگر مجھے حیوان کا جنم ملے تو میرا کیا اختیار ہے۔ اس حالت میں، مین یہی چاہوں گا کہ ہمیشہ نند (کرشن کے باپ) کی گایوں کے ساتھ ساتھ چرتا رہوں اگر دوسرے جنم میں پتھر ہی مجھے ہونا ہے تو میں اس پہاڑ کا پتھر ہوں گا جسے کرشن جی نے چھتری کی طرح اوپر اٹھا کر اندر کے طوفان سے لوگوں کو بچایا تھا۔ اگر پرندہ ہوں تو میں جمنا کے کنارے کدمب کی شاخوں میں بسیرا کروں)

برج بھاشا کے ان متعدد مسلمان شاعروں کے متعلق جدید ہندی کے پہلے بڑے ادیب بھارتیندو ہریش چندر نے بڑے جوش سے لکھا ہے:

'ان مسلمان ہری جنن پے کوٹن ہنڈن وارییے!'

(یعنی: ان مسلمان ہری کے بھگتوں پر کروڑوں ہندوؤں کو نثار کیجیے)

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں برج بھاشا میں بھگتی کی متصوفانہ شاعری کا رنگ پھیکا پڑ کر دربار کی وہ حسن و عشق کی شاعری شروع ہوتی ہے جس کا دائرہ خیال بہت محدود سا ہو جاتا ہے۔ برج بھاشا میں شاعری کے اس دور کو ہندی ادب کے مورخوں نے ''ریت کال'' کا نام دیا ہے۔

ریت کال کے شاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سنسکرت شاعری کے آخری دور کی مطابقت کرتے ہوئے انسان کے مختلف جذبات کو شاعری کی زبان میں ادا کرتے تھے اور اپنے اشعار اور نظموں کو سنسکرت کے اصول شاعری کے مطابق صنائع و بدائع سے مرصع کرتے تھے۔ اسی لیے اس شاعری کو ریت کے مطابق یعنی قدیم رسوم کی پابند شاعری کہا گیا ہے۔ ریت کال کے شاعروں نے بھارت منی کے بتائے ہوئے نو مختلف انسانی جذبات یا رسوں میں سے شرن گار رس کو خاص طور سے چنا تھا۔ اس رس کا تعلق وصل و فراق کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسرت و غم کے جذبات سے ہے۔ اسی لیے ریت کال کی شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ عشقیہ

شاعری پر محمول ہے۔

دو سو (۲۰۰) سال تک یعنی تقریباً ۱۶۵۰ء سے لے کر ۱۸۵۰ء تک ریت کال کے شاعر ہندوستان کے ہر ایک بادشاہ راجا، مہاراجا اور نواب کے درباروں میں ہوتے تھے۔ کیشو، چنتامنی، بھوشن، متی رام، بہاری، دیو، پدماکر اس دور کے بڑے بڑے شاعر ہیں۔ امرا کے درباروں سے منسلک ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں جنسی عیش پرستی کا رنگ غالب ہو گیا ہے اور ان کی اخلاقی سطح اس سے قبل کے دور کے سنتوں کی شاعروں سے بہت پست ہے جو عوام سے زیادہ قریب تھی، لیکن زبان کی ترقی کے اعتبار سے ہم اس دور کے ادب کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

پہلے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ برج بھاشا کا یہ ادب برج کے علاقے سے نکل کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیل گیا۔ راج پوت اور مرہٹہ اور وسطی ہندوستان کے ہندو راجاؤں اور امرا کے درباروں میں برج بھاشا ہندو تہذیب کا ایک وسیلہ اور آلہ بن کر پہنچی اور وہاں اس نے گھر کر لیا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے اپنی مقامی بولیاں چھوڑ دیں، اس کے یہ بھی معنی نہیں ہیں کہ برج بھاشا کے علاوہ وہاں دوسری زبانوں کو ادبی یا تہذیبی رتبہ حاصل نہیں تھا، لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ برج بھاشا کا یہ ادب غیر برج لوگوں کے لیے بھی تہذیب کا ایک آلہ تھا۔

دوسرے یہ کہ یہ ادب اپنی زبان، اپنی شاعری کے اصول، اپنی فضا کے لحاظ سے ہندوستان کی زندہ ہندو تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ یعنی یہ تہذیب ہر طرف سے اثرات قبول کر رہی تھی اور کئی صدیوں پر مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے اور میل جول سے اس میں ایک ہندو مسلم تہذیب کا امتزاج نظر آتا ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ ہندو روایات کا رنگ اس پر غالب ہے۔ اس وجہ سے اس کے زیادہ تر شاعر اور مربی ہندو ہیں اور وہ مسلمان بھی جو اس زبان اور طرز میں شاعری کرتے ہیں۔ ہندو اور سنسکرت طرز کو قبول کرتے ہیں۔ ریت کال کے شاعروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سنتوں کی شاعری کے مقابلے میں ان کے یہاں سنسکرت کی آمیزش زیادہ ہے۔ ان میں سے کئی سنسکرت کے بڑے بڑے آچاریہ تھے۔ ان کے لیے سنسکرت کے الفاظ کو اپنی شاعری میں ملا لینا بالکل ایک فطری سی چیز تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھوں نے فارسی اور عربی کے مروجہ لفظوں کو ترک کر دیا ہے۔ وہ بے تکلفی سے ان الفاظ کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی ہندو تہذیب کے غالب عنصر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اُردو کا ارتقا:

آیئے اب دیکھیں کہ اس زمانے میں کھڑی بولی کا ارتقا کس طرح ہو رہا تھا۔ سترھویں صدی میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی دکنی سلطنتوں میں کھڑی بولی نے اپنی دکنی شکل میں غیر معمولی ترقی کی۔ اس میں نہایت بلند پایہ ادب کی تخلیق ہوئی۔ صوفیوں اور مشائخ کے تکیہ سے نکل کر اسے دربار اور امرا کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ نظم کی اصناف میں مثنوی، غزل، قطعات اور لمبی لمبی خالص ہندی چھند میں چیزیں لکھی گئیں۔ یہی نہیں، نثر جو ادب وخیال کی بہت بلند ترقی کی نشانی ہے دکن میں شروع ہوئی اور اس نے بلند رتبہ حاصل کیا۔ دکن کے سولھویں صدی عیسوی کے ادیبوں میں وجہی، محمد قلی قطب شاہ، نشاطی، اور نصرتی دکنی اُردو کے اساتذہ میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اس اُردو پر دکن کی ہندو اقوام گجراتی، مرہٹی، تلنگی اور کناڈا کا اثر نمایاں ہے۔ پھر بھی اس پر مسلمانوں کی تہذیب وتصورات کا اثر غالب ہے۔ مغلوں کے حملے اور دکن کی فتح کے بعد اورنگ آباد کے مرکز سے ایک بار پھر شمالی ہند میں مروجہ کھڑی بولی کا اثر دکن کی اُردو پر براہ راست پڑا اور دکن کے سب سے بڑے شاعر ولی کے کلام میں یہ امتزاج صاف نظر آتا ہے۔ اسی سبب سے ولی کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ شمالی ہند کے دہلوی شعرا پر اتنا زبردست اور فیصلہ کن اثر ڈال سکے۔

ولی کے بذات خود دلی پہنچنے سے پہلے ان کی شہرت اور غالباً ان کا دیوان دلی پہنچ چکا تھا لیکن یہاں کے حالات دکن سے بہت مختلف تھے۔۔ امیر خسرو نے جس سلسلے کو شروع کیا تھا وہ دلی اور شمالی ہندوستان میں آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ یہاں فارسی کا دور دورہ مکمل تھا۔ اکبر کے زمانے سے مغلوں کے سرکاری دفاتر کی زبان فارسی ہی تھی۔ اکبر کے ہی زمانے میں تعلیم کا جو نظام قائم کیا گیا تھا اس میں بھی فارسی ذریعہ تعلیم تھی۔ علم وادب، فلسفہ ومذہب، تاریخ وفنون لطیفہ کی زبان فارسی تھی۔ شہروں میں ہی نہیں، دیہاتوں اور قصبوں کے مکتبوں میں بھی فارسی کا چرچا تھا۔ سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں یہاں کے علوم وفنون وادب و الٰہیات کے خزانوں کی کسی دوسری زبان میں اس طرح تخلیق نہیں ہوئی تھی جس طرح کہ فارسی میں۔ تمام وہ لوگ جو حکومت سے تعلق رکھتے تھے، تمام پڑھے لکھے لوگ (اور اس زمانے میں تعلیم آج کل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی) شاعر اور ادیب اور مصنف فارسی جانتے تھے اور اسی میں لکھتے تھے۔ ہندو راجاؤں کے درباروں کی زبان بھی فارسی ہوگئی تھی۔ تعداد کے اعتبار سے وہ ہندو جو فارسی جانتے، لکھتے اور پڑھتے تھے، مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے۔ ان میں سے فارسی زبان کے بڑے عالم پیدا ہوئے ہیں،

جن کے نام آج تک فارسی داں احترام سے لیتے ہیں۔ ان میں منشی مادھورام صاحب انشائے مادھورام اور ٹیک چند بہار، صاحب بہار عجم، چندر بھان برہمن اور مرزا منوہر توسنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فارسی کی اس مقبولیت اور اہمیت کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عام لوگوں کی روزمرہ بولی فارسی نہیں تھی۔ دلی اور اس کے اطراف کی کھڑی بولی نہ صرف عام لوگ بولتے تھے بلکہ دلی کے اونچے گھرانوں کے لوگ بھی بولنے لگے تھے۔ چنانچہ ولؔی جب اٹھارھویں صدی کے شروع میں دلی میں وارد ہوئے تو ان کا کلام لوگوں کی سمجھ میں بھی آیا اور لوگ محظوظ بھی ہوئے۔ اس لیے کہ وہ قریب قریب اسی بولی میں تھا جو دلی کے ہر گھر میں بولی جاتی تھی۔ جب سوؔدا کے استاد حاتؔم نے، ولؔی کے دیوان کو دیکھ کر طبع آزمائی شروع کی تو تاریخی اعتبار سے زمانہ اس کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ فارسی کو بے دخل کر کے اس سودیشی ہندوستانی بولی کو ادبی مسند پر بٹھایا جائے۔

دہلی میں اُردو کے پہلے شاعر حاتم، خاںؔ آرزو، ناجؔی، آبرؔو، تاباںؔ، سب کے سب فارسی کے شاعر اول تھے اور اُردو کے بعد کو۔ اسی لیے ہمیں نظر آتا ہے کہ ان کے کلام میں دکنی شاعروں کے مقابلے میں ہندی الفاظ کم ہیں، فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں زیادہ ہیں۔ فارسی سے اُردو میں تبدیلی کا ابتدائی دور کچھ ایسا ہی ہونا لازمی بھی تھا۔ اٹھارھویں صدی کے اُردو اساتذہ کے ہاتھوں دراصل یہ 'ریختہ' زبان پختہ ہوئی اور اس نے ایک مستقل ادبی حیثیت اختیار کی۔ مرزؔا مظہر جان جاناں، مرزا رفیع سودا، میر تقؔی، سوزؔ، میر دردؔ، شعرا کے اس بہت بڑے گروہ کے سردار اور رہنما ہیں جنھوں نے اُردو کو اس کی موجودہ صفائی، سلاست اور شیرینی عطا کر کے ہندوستان کی ایک بڑی زبان بنا دیا۔

میرؔ اور سوؔدا کا عہد اور اس سے بھی زیادہ ذوقؔ، غالبؔ مومنؔ اور لکھنو کے ناسخؔ، آتشؔ اور انیسؔ کا دور اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے وسط تک کا دور ہے۔ اس زمانے کی بعض خصوصیات لسانی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ مغل سلطنت کے انحطاط کے زمانے میں لکھنؤ، رام پور، عظیم آباد، مرشد آباد وغیرہ کے ایسے مرکز قائم ہوئے جہاں پر اس زبان کے بولنے والوں اور ادیبوں کا جسے اب لوگ رفتہ رفتہ اُردو کہنے لگے تھے اجتماع ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی کے ختم اور انیسویں صدی کے شروع میں شمالی ہندوستان کے شہروں میں اُردو بڑی تیزی سے پھیلی۔ استادوں کی تازہ غزلیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تبرک کی طرح لے جائی جاتی تھیں۔ جگہ جگہ غزل گو شاعروں کے گروہ پیدا ہو گئے تھے جو مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے، اس طرح گویا ان مقامات پر بھی جہاں کے عام لوگوں کی بولی، دلی اور آگرہ کی طرح اُردو نہیں تھی، یہ زبان پھیل

گئی۔ اوپر کے درمیانی طبقے کے اور پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان اسے پڑھنے بھی لگے اور اس میں شاعری کرنے لگے۔ شعر کے ذریعے سے یہ زبان عام لوگوں تک بھی پہنچی اور شہروں میں عام طور سے سمجھی جانے لگی۔ اوپر کے طبقے والے ہندو اور مسلمان اسے بولنے بھی لگے۔ جو لوگ صدیوں سے فارسی کی روایات میں ڈوبے ہوئے تھے ان کے لیے یہ کچھ مشکل نہ تھا۔ حالانکہ شمالی ہندوستان کے دیہاتوں میں اور ایک حد تک شہروں میں بھی، عام لوگ اپنی مقامی بولیاں بولتے تھے (مثلاً برج بھاشا، اَودھی، پوربی، متھیلی وغیرہ) حالانکہ ہندو راجاؤں کے درباروں میں پریاگ، کاشی، متھرا اور اجودھیا کے ہندو مرکزوں میں برج بھاشا میں شاعری برابر ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی۔ پھر بھی اس میں شک نہیں ہے کہ کھڑی بولی اُردو کی شکل میں شہروں کے اوپری ہندو مسلم طبقوں میں لکھی، پڑھی اور بولی جانے لگی اور عام ناخواندہ لوگ اگر اسے بولتے نہیں تو کم از کم سمجھنے ضرور لگے۔ منشیوں، مولویوں، معلموں، حکومت کے افسروں، زمینداروں، منصب داروں اور جاگیرداروں کے ذریعے وہ ہمارے دیہاتوں میں گھس گئی اور وہاں بھی لوگ اسے سمجھنے لگے۔ ہندوؤں نے بھی اس میں شاعری شروع کر دی اور اس کی ترویج میں بہت بڑا حصہ لیا۔

بعض لوگ اس دور کی اُردو پر یہ اعتراض کرتے ہیں (مثلاً بابو پرشوتم داس ٹنڈن، آنجہانی پنڈت پدم سنگھ شرما وغیرہ) کہ اس زمانے میں اُردو میں سے ہندی کے الفاظ بہت بڑی تعداد میں ترک کر دیئے گئے۔ فارسی کی ضرورت سے زیادہ اس ہندی یا کھڑی بولی میں آمیزش کی گئی اور اس طرح سے گویا اُردو والوں نے اُردو اور ہندی کے درمیان وہ علیحدگی شروع کی جس کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

میری رائے میں یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ متروکات کے سلسلے میں سب سے زیادہ اعتراض ناسخ پر کیا جاتا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ناسخ اور ان کے طرز کی اُردو تمام اُردو دانوں کے لیے اور ہمیشہ کے واسطے کوئی اٹل قانون کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر ایک طرف ناسخ ہیں تو دوسری طرف نظیر اکبرآبادی بھی ہیں جو عوام سے زیادہ قریب تھے اور جو دہلی اور لکھنؤ کے مشاعروں کے بنائے ہوئے قانون کا اپنے کو قطعی پابند نہیں سمجھتے تھے۔ ہندی کے الفاظ کو ترک کرنا تو درکنار، نظیر نے عام بول چال کے صدہا نئے الفاظ استعمال کر کے انھیں ادبی درجہ دے دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ ناسخ اور اس زمانے کے شعرا نے اُردو کو صاف کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ ٹھیٹھ ہندی یا سنسکرت آمیز الفاظ کو ترک کر دیا جائے۔ ان کی کدوکاوش کا مدعا الفاظ اور محاورں کا صحیح اور مناسب استعمال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جملوں کی بندش سست اور ڈھیلی نہ ہو اور یہ ایک بہت ضروری کام

تھا۔ اگر انھیں ٹھیٹھ ہندی یا الفاظ سے نفرت ہوتی تو ان میں سے ایک نے رانی کیتکی کی کہانی نہ لکھی ہوتی، جس میں فارسی، عربی اور گنوارو الفاظ کو ترک کر کے گویا خالص اُردو یا ہندی لکھی گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ اُردو میں فارسی اور مروج عربی الفاظ کے استعمال سے وطن سے مغائرت کا جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔ آٹھ سو سال سے شمالی ہندوستان میں فارسی کلچر کی سب سے بڑی زبان تھی۔ اب جو لوگ اور ان میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں، اپنے اس آٹھ صدی کے تہذیبی ترکے کو ہندوستان کی کھڑی بولی میں شامل کرتے ہیں، ایسا ترکہ جو اب بالکل ہندوستانی بن گیا تھا، وہ اُردو میں غیر ملکی فضا پیدا کرنے کے مجرم کس طرح کہے جا سکتے ہیں؟ انھوں نے تہذیب و تمدن کے ان شاندار درختوں کو جو صدیوں سے یہاں کی سرزمین میں پھل پھول رہے تھے، اُردو کے نئے لگائے ہوئے باغ میں منتقل کر کے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا۔ اس کا ثبوت کہ یہ ایک فطری اور ضروری عمل تھا یہ ہے کہ اُردو کے بعض ہندو اساتذہ کے کلام میں مسلمانوں کے مقابلے میں فارسیت زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً لکھنؤ کے پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم، میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے مقابلے میں زیادہ فارسی آمیز ہے۔

کھڑی بولی میں فارسی اور فارسیت کی آمیزش اس عہد میں اتنی ہی فطری اور لابدی تھی، جتنا کہ سور داس، تلسی داس اور بھوشن کی برج بھاشا میں سنسکرت کی آمیزش۔ دونوں اپنے اپنے روایتی تہذیبی مرکز سے کسب فیض کر کے اپنی اپنی زبانوں کا دامن وسیع کر رہے تھے۔

انیسویں صدی اور ہندی اُردو کا جھگڑا

انیسویں صدی میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور وہاں انگریز افسروں کے درس کے لیے اُردو اور ہندی میں فارسی اور سنسکرت اور عربی کتابوں کے ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں میر امن نے قصہ باغ و بہار و چہار درویش دلی کی صاف، شستہ اور سہل زبان میں لکھا۔ افسوس نے گلستان کا اُردو میں ترجمہ کیا اور قصہ حاتم طائی لکھا، سید حیدر بخش حیدری نے توتا کہانی، لکھی اور آگرہ کے رہنے والے ایک گجراتی برہمن للو لال جی نے تین کتابیں اُردو میں لکھنے کے بعد اپنی مشہور ہندی کی کتاب پریم ساگر لکھی۔ فورٹ ولیم کالج میں ہی بہار کے رہنے والے سدل مصر نے ہندی کی ایک دوسری کتاب میں ناسکیتو پاکھیاں، لکھی۔

ان دونوں ہندی کی کتابوں کی خصوصیات کیا تھیں۔ پہلے یہ کہ دونوں کھڑی بولی میں لکھی گئی تھیں۔ حالانکہ للو لال جی کی ہندی میں برج بھاشا کے اثرات نظر آ جاتے ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان دونوں

کتابوں کی زبان کو کھڑی بولی کہا جا سکتا ہے۔ دوسری خصوصیت اس ہندی کی یہ تھی کہ اس میں فارسی اور عربی کے مروجہ الفاظ حتی الامکان استعمال نہیں کیے گئے تھے۔ اگر ہم یہ خیال میں رکھیں کہ ابھی تک کھڑی بولی کی مروجہ شکل عام طور پر وہی تھی جو اُردو کی شکل میں نظر آئی تھی تو یہ چیز بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کھڑی بولی ہوتے ہوئے بھی اس میں سے فارسی اور عربی کے وہ الفاظ تک خارج کر دیئے جائیں جو عام طور سے بول چال میں رائج تھے اور جن سے للولال جی اُردو کے بھی ادیب ہونے کی حیثیت سے بخوبی واقف تھے۔ تیسری خصوصیت اس زبان کی یہ تھی کہ وہ ناگری رسم الخط میں لکھی گئی تھی۔

جس طرح ہندی کے طرف دار اُردو پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ناسخ اور دوسرے اُردو شاعروں نے ہندی کے الفاظ کو متروکات بنا کر اُردو کو غیر ملکی الفاظ سے بھر دیا اور اس طرح مشترکہ زبان کی جڑ پر کلہاڑی ماری، اسی طرح اُردو کے طرف دار کہتے ہیں کہ ساری خرابی کی جڑ للولال جی ہیں جنھوں نے انگریزوں کے قائم کیے ہوئے فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر ایسی نئی زبان گھڑنے کی کوشش کی جس نے ہندی اور اُردو کو جدا جدا کر کے ہمارے درمیان پھوٹ کا بیج بویا۔

حقیقت نہ یہ ہے اور نہ وہ۔

للولال جی کی ہندی دراصل اسی اَودھی اور برج بھاشا کے ادب کی ارتقائی شکل ہے جس کا غیر منقطع سلسلہ کبیر داس کے زمانے سے جاری تھا کبیر داس کے بھی پہلے شورسینی اپ بھرنش میں لکھی ہوئی ویر گاتھاوں پرتھی راج راسو، بسیل دیوراسو، کھمر ان راسو وغیرہ سے اس کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ شمالی ہندوستان میں ہندو تصورات، ہندو روایات اور ہندو مذہبی اور تہذیبی رجحانات کا ایک لگاتار سلسلہ ہے جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے شورسینی پراکرت کی اپ بھرنش سے جا ملتا ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے اس تہذیبی دھارے پر گہرے اثر پڑے، اس میں تبدیلیاں ہوئیں، پھر بھی وہ پوری آن بان کے ساتھ جاری رہا۔

لیکن اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر للولال جی نے برج بھاشا یا اَودھی میں کیوں نہیں لکھا؟ انھوں نے کھڑی بولی کیوں استعمال کی؟ اور کھڑی بولی استعمال کرنا تھی تو اس میں تبدیلی کیوں کی؟ للو لال جی کے کھڑی بولی استعمال کرنے کا سبب یہ ہے کہ اُردو کی شکل میں اسے عام مقبولیت ہو چکی تھی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کافی پھیل گئی تھی۔ اس لحاظ سے وہ برج بھاشا سے بازی لے گئی تھی۔ تمام پڑھے لکھے ہندو للولال جی اور سدل مصر، اس سے واقف تھے۔ لیکن اس کے علاوہ برج بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ اس لیے ایسے لوگوں کے لیے یہ کوئی مشکل اور غیر فطری امر نہ تھا

کہ وہ کھڑی بولی کے نحوی ڈھانچے میں جسے وہ جانتے اور بولتے تھے، ہندو تصور، مذہب اور روایات سے متحرک ہو کر برج بھاشا، اُودھی اور سنسکرت کے ادب میں ڈوب کر ایسی زبان لکھیں جو اس کی اُردو شکل سے، جو مختلف روایات کی حامل تھی بڑی حد تک علیحدہ ہو۔

ہندی ادب کے بعض تاریخ نگاروں نے اُردو والوں کے اس الزام سے بچنے کے لیے کہ ان کی کھڑی بولی کا یہ نیا استعمال مصنوعی اور غیر فطری ہے بہت سے دلائل پیش کیے ہیں جن میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندی کو اُردو سے کوئی تعلق نہیں اور سنسکرت آمیز کھڑی بولی کی روایات اُردو سے الگ اور مستقل طور پر صدیوں سے چلی آ رہی ہیں، مثلاً انھوں نے کہا ہے کہ اکبر کے زمانے میں گنگ گوی نے ناگری رسم الخط میں ایک رسالہ 'چند چھند برنن کی مہیما' لکھا جس میں کھڑی بولی کا ہندی روپ ملتا ہے۔ اس کے بعد رام پرشاد نرنجنی نے للولال جی سے ۳۲ سال پیشتر ایک کتاب 'بھاشا یوگ وشیسٹ' کے نام کی لکھی جس میں اسی قسم کی ہندی ملتی ہے۔ اسی طرح منشی سدا سکھ لال کی 'سکھ ساگر' اور انشاء اللہ خاں کی 'رانی کیتکی کی کہانی' بھی اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب کہ للولال جی کی 'پریم ساگر' لکھی گئی۔ اس سے یہ چیز تو یقینی ثابت ہو جاتی ہے کہ للولال جی کھڑی بولی ہندی نثر کے پہلے لکھنے والے نہیں ہیں، لیکن یہ نہیں ثابت ہوتا کہ انیسویں صدی کی جدید ہندی نثر کھڑی بولی کی اُردو شکل سے متاثر ہو کر پیدا نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں اس کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ تعصب کی اور بات ہے۔ پروفیسر سینتی کمار چیٹر جی اپنی کتاب 'انڈو آرینس اینڈ ہند' میں اس کی تصدیق کرتے ہیں:

> ''سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندی یا ہندوستانی کا پھیلنا، مرکزی مغل حکومت کا ہندوستان پر سب سے بڑا احسان ہے۔ یہ زبان دہلی دربار کے وقار کے ساتھ ہر جگہ پہنچ گئی۔ فارسی کسی قدر پیچھے ہٹ گئی۔ ہندی یا ہندوستانی جس میں کسی قدر فارسیت شامل تھی یا زبان اُردوئے معلیٰ یا درباری زبان ان لوگوں میں رائج تھی، جن کو دربار سے کچھ بھی تعلق تھا، خواہ وہ فوج کے لوگ ہوں یا سرکاری عہدوں پر فائز ہوں۔ مغل سلطنت کے مختلف صوبوں میں اٹھارھویں صدی میں یہی کیفیت تھی۔''

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جدید ہندی نے کھڑی بولی کا ڈھانچہ اُردو سے لیا لیکن اس میں ان الفاظ، بندشوں اور ترکیبوں کو اور ان خیالات اور ادبی روایات کی روح بھری جو ہندو تہذیب کے زیر اثر صدیوں سے اُودھی، برج بھاشا اور شمالی ہند کی دیگر عوامی بولیوں میں (مثلاً بندیلی، راجستھانی، متھلی میں)

برابر موجود تھیں اور جن کا مسلسل ارتقا ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا، بلکہ اس میں زبردست ترقی ہوئی تھی، خود مسلمانوں نے اس ترقی میں معتدبہ حصہ لیا تھا۔ وہ عوام جو شمالی ہند کے گاؤں گاؤں میں کبیر کے دوہے، تلسی کی رامائن، میرابائی اور سورداس کے گیت، آلھا اور اودل سننے اور سمجھنے کے عادی تھے، وہ طبقے جو برج بھاشا کی زبردست اور زندہ ادبی تحریک کو تین سو سال تک برابر آگے بڑھاتے رہے تھے، ان تمام لوگوں کے لیے جدید ہندی تعصب، فرقہ پرستی یا تنگ نظری کی پیداوار نہ تھی، وہ ان کے تہذیبی ارتقا کا منطقی نتیجہ تھی۔

انیسویں صدی کے وسط کے بعد یہ چیز اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ انگریزی عملداری کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے رہنے والے مختلف لوگوں میں قومی احساس بھی پیدا ہو رہا تھا۔ مثلاً راجا رام موہن رائے نے انگریز عیسائی مشنریوں کے حملے سے ہندو مذہب کو بچانے کے لیے ہندو مذہب کا ایک نیا تصور برہمو سماج کی شکل میں پیش کیا اور ان کی تحریک جدید بنگالی کلچر کے احیا کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بن گئی۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر ہندی ادب کی پہلی بڑی شخصیت بھارتیندو ہریش چندر نے بنارس سے اپنا ادبی رسالہ جاری کیا۔ بنگالی سے متعدد ڈرامے ہندی میں ترجمہ کیے اور اپنے اردگرد ہندی کے ادیبوں کا ایک ایسا گروہ بنایا جن کی تحریروں سے درمیانی طبقے کے پڑھے لکھے ہندوؤں سے وہ پست ہمتی دور ہوئی جو انگریزی غلامی کی وجہ سے اس ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔

بھارتیندو کے ڈراموں اور ان کی تحریروں میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ اگر ایک طرف قدیم ہندو دیومالا اور ہندو تاریخ کی قابل فخر ہستیوں کو اپنے ڈراموں میں پیش کر کے ہندوؤں کو ان کے شاندار ماضی اور ان کی بلند اخلاقی اور روحانی روایات یاد دلا کر ان کے سر کو اونچا کرنا چاہتے ہیں، تو دوسری طرف وہ ہندو سماج کی خرابیوں کے سخت نکتہ چیں بھی ہیں۔ بھارتیندو نے رجعت پرست پنڈتوں کا مذاق اڑایا۔ تعلیم نسواں کی حمایت اور جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیا۔ جدید ہندوستان میں قومی بیداری اور حب وطن کے ابتدائی مظاہر ہمیں اسی طرح کے نظر آتے ہیں، یعنی اپنی قوم کے احساس پستی کو دور کرنے کے لیے اسے اس کے شاندار ماضی کی یاد دلانے، دوسرے جدید دنیا میں سربلند ہونے کے لیے مغربی تعلیم حاصل کرنا اور اپنے سماج میں اصلاح کرنا۔

بھارتیندو کی تحریروں کی زبان پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس میں روانی اور زور کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ اپنی ہندی میں عربی اور فارسی کے مروج الفاظ بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریر ہندی

ہوتی ہے۔ اس میں سنسکرت کی آمیزش ہوتی ہے اور وہ برج اور اُودھی کی روایات کا بھی دامن نہیں چھوڑتی، اس لحاظ سے اس میں اور مروجہ اُردو نثر کے طرز میں کافی فرق ہے، لیکن للولال جی کی خالص فارسی اور عربی مروجہ الفاظ سے معرا ہندی یہ نہیں ہے۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہندو مذہب میں اصلاح کی دو اور تحریکیں بھی اٹھیں جن کا ہندی ادب پر اثر پڑا۔ ایک سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج کی تحریک جس کی باقاعدہ بنیاد ۱۸۷۰ء میں پڑی اور دوسری سناتن دھرم کے حلقے میں رہتے ہوئے مذہبی تجدید کی تحریک جن کے بہت بڑے مبلغ پنڈت شردھارام پھلوری تھے۔ ان دونوں تحریکوں کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ ہندی زبان کو زیادہ سے زیادہ ترویج دی جائے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے ہندی کو آریہ بھاشا کا نام دے کر اس کی ترقی کو ہر ایک ہندو کا مذہبی فریضہ قرار دیا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی شمالی ہند میں (خاص طور پر یوپی، بہار، راجستھان اور صوبہ متوسط کے ہندوستانی حصے میں) ہندو قومی بیداری کا جس کے مختلف پہلو مذہبی احیا اور تجدید، سوشل ریفارم اور جدید تعلیم ہیں ایک زبردست آلۂ کار بن گئی اور ان تمام تحریکوں کے ساتھ ساتھ اسے بہت ترقی ہوئی، سکولوں، کالجوں اور کچہریوں میں ہندی اور ناگری رسم الخط کے استعمال کا زبردست مطالبہ کیا گیا اور اسے کامیابی ہوئی۔ بیسویں صدی کے شروع میں ناگری پرچارنی سبھا قائم ہوئی اور اس کے چند سال بعد ہندی ساہت سمیلن کی بنیاد پڑی۔ اخبار اور رسالے بڑی تعداد میں شائع ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ برج بھاشا کو ترک کر کے کھڑی بولی ہندی میں شاعری بھی ہونے لگی۔

۱۹۲۰ء میں جب قومی بیداری کی ایک نئی لہر کانگریس اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں اٹھی تو اس کے بعد ہندوؤں میں ہندی کو اور بھی زیادہ فروغ ہوا۔ بابو میتھلی شرن گپت نے اپنی مشہور نظم 'بھارت بھارتی' اسی زمانے میں لکھی۔ یہ نظم ان گاندھیائی تصورات کی جو اس زمانے میں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں کو متحرک کر رہے تھے بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ پنڈت رام چندر شکل 'بھارت بھارتی' کے مصنف کے متعلق لکھتے ہیں:

''ہندی بھاشا جنتا کے پرتی ندھی کوی بے نسند یہہ کہے جاسکتے ہیں۔ بھارتیندو کے سمے سے سودیش پریم کی بھاؤنا جس روپ میں چلی آرہی تھی اس کا وکاس بھارت بھارتی میں ملتا ہے۔ ادھر کے راج نیتک آندولنوں نے جو روپ دھارن کیا اس کا آبھاس پچھلی رچناؤں میں ملتا ہے۔ ستیہ گرہ، اہنسا، منشویتہ داد، دشو پریم، کسانوں اور

شرم جیون کے پرتی پریم اور سم مان سب کی جھلک ہم پاتے ہیں'' (ہندی ساہت کا اتہاس ۶۸۷۔۶۸۶)۔

یعنی: یہ بلاشبہ اس عوام کے نمائندہ شاعر کہے جا سکتے ہیں جس کی زبان ہندی بھاشا ہے۔ بھارتیندو کے وقت سے حب الوطنی کا جذبہ جس شکل میں بڑھتا آ رہا تھا اس کا ارتقا 'بھارت بھارتی' میں ملتا ہے۔ پچھلی سیاسی تحریکوں نے جو شکل اختیار کی اس کا کچھ آغاز آخر کی تصانیف میں ملتا ہے۔ ستیہ گرہ، عدم تشدد...... انسان دوستی اور آفاقی محبت، کسانوں اور مزدوروں کی محبت اور عزت ان میں سب کی جھلک ہم پاتے ہیں۔

اس قومی بیداری کا نتیجہ ہے کہ ناول، افسانے، شعر و نظم، ڈرامے، تنقیدی مضامین اور کتابیں تاریخ، معاشیات، فلسفہ الٰہیات اور سیاسیات کا ایک بڑھتا اور پھیلتا ہوا تہذیبی سیلاب اس زبان کے ذریعے سے ہزاروں لاکھوں ذہنوں کو سیراب کر رہا ہے۔

اُردو، انیسویں اور بیسویں صدی میں

آیئے اب کھڑی بولی کی دوسری شکل اُردو پر ہم نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس کا ارتقا کس طرح ہوا۔

شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں، ہندوؤں کی طرح قومی بیداری اپنے ابتدائی دور میں تین شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ایک تو تجدید اور احیائے دین کی تحریک دوسرے سوشل ریفارم اور تیسرے جدید تعلیم کی تحریک۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے بھی تیرہ چودہ سال پہلے شاہ ولی اللہؒ دہلوی صاحب کے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ صاحب نے قرآن شریف کا پہلا ترجمہ اُردو میں کیا (۱۷۸۸ء)۔ آپ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے اس سے بھی زیادہ سلیس زبان میں دوبارہ قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اُردو میں اس کی تفسیر بھی لکھی۔ اسی تحریک سے وابستہ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ بھی تھے۔ ہم جانتے ہیں ان کے اور ان کے رفیقوں کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک جہاد جاری ہوئی جس میں ہزاروں مسلمان شریک ہوئے۔ یہ تحریک عام لوگوں کی تحریک تھی اس لیے اس کے رہنماؤں نے اس کے نظری اصول اُردو میں مذہبی رسائل کے ذریعے بیان کیے۔ حضرت اسمٰعیل شہید نے توحید، صراط مستقیم، تنویر العینین نام کے رسالے اُردو میں لکھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد علما کی یہ تحریک کچھ دنوں کے لیے دب گئی۔

یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ سر سید احمد خاں اپنی جوانی میں اس تحریک سے متاثر تھے اور انھوں نے بھی ان مخصوص عقائد کی حمایت میں جو وہابیت کے نام سے مشہور ہیں ایک یا دو رسالے لکھے۔

شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی بیداری دراصل سر سید احمد خاں کی اس تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے وابستہ ہے جو انھوں نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں شروع اور جاری کی۔ اُردو نثر کی جدید شکل تہذیب الاخلاق میں لکھنے والوں نے بنائی یا ان لوگوں نے جو دہلی کالج سے وابستہ رہ چکے تھے اور مغربی تہذیب اور ادب کے زیر اثر اُردو ادب کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد دہلی کالج سے نکلے تھے۔ اسی طرح مولانا حالی جنھیں آزاد کے ساتھ جدید اُردو نظم کا موجد کہا جا سکتا ہے، علی گڑھ کی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنا مسدس مدو جزر اسلام سر سید کے کہنے سے لکھا تھا۔

مسدس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے شاندار ماضی اور ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کو، سماجی اصلاح، تعلیم و تربیت کی ترغیب دینے کے لیے بہت مؤثر اور دلچسپ اور سلیس انداز میں بیان کیا گیا تھا۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب محض تعلیمی اور اصلاحی دور کا خاتمہ ہوا اور سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ آزادی کے خیالات بھی مسلمانوں میں پھیلنے لگے تب اُردو ادب نے ایک اور کروٹ لی اور شبلی، ظفر علی خاں، ابوالکلام اور آخر میں اقبال مسلمانوں کی نئی قومی بیداری کی ترجمانی کرنے لگے۔

اس بیداری کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں میں عام طور سے اُردو کو ترقی دینے اور اس کے تنگ نظر اور متعصب دشمنوں سے بچانے کا بھی زبردست جذبہ ان میں بیدار ہوا اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک کے ایک جزو کی حیثیت سے انجمن ترقی اُردو بھی قائم کی گئی۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ جدید اُردو کی ترقی، ہندوستانی مسلمانوں کی گزشتہ سو سال کی قومی بیداری سے وابستہ ہے اور اسی کے ساتھ ہوئی تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اُردو ادب کی ترقی میں ہندوؤں کا جو حصہ رہا اسے گھٹانا چاہتا ہوں یا اس کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا ہوں۔ رتن ناتھ سرشار، سرور جہاں آبادی اور چکبست جیسے ادیبوں کے نام معمولی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہمارے ادب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مجھے اس کا بھی پورا احساس ہے کہ اگر ہمارے دور جدید کا سب سے بڑا اُردو شاعر اقبال ہے، تو اسی عہد کا سب سے بڑا ناول نگار اور افسانہ نویس پریم چند ہے اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ اُردو کے ترقی پسند شاعروں میں اگر ایک طرف جوش ملیح آبادی جیسے استاد ہیں تو دوسری طرف فراق ہیں۔ کرشن چندر، اشک اور

بیدی کی حقیقی اہمیت ظاہر ہے۔

پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ وہ اشتراک جو اُردو کے ان ہندو اُردو دانوں اور ان کے علاوہ زمانہ گزشتہ اور حال کے اور بھی بہت سے غیر مسلم اُردو دانوں اور مسلم اُردو دانوں میں ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ہندو عام طور سے اُردو دان ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب کا غالب عنصر پہلے بھی اور آج، اور بھی زیادہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے اُردو ادب کے غالب حصے پر مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی چھاپ ہے۔ بالکل اسی طرح ہندی کے غالب عنصر پر ہندو تہذیب کے آثار نمایاں ہیں۔ یہاں پر میں یہ چیز صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جب میں ہندو تہذیب یا مسلم تہذیب کا نام لیتا ہوں تو میری مراد مذہبی فرق سے نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی تہذیب اس ملک کے مختلف حصوں میں مختلف شکلیں رکھتی ہے اور ان میں بے شمار باتیں مشترک ہیں۔ پھر بھی ان علاقوں میں جہاں اُردو یا ہندی عام طور سے بولی جاتی ہے، ہندو اور مسلم کلچر کا فرق ہمیں اُردو اور ہندی کی موجودہ ادبی شکلوں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

مشترک باتیں

اصل یہ ہے کہ اُردو اور ہندی، اپنی موجودہ ادبی اور تحریری شکل میں الگ الگ ہیں، حالانکہ ان کی نحوی ساخت بنیادی طور سے ایک ہے۔ اب یہ بحث کہ یہ دونوں ایک زبان کی دو شاخیں یا دو علیحدہ اور مستقل زبانیں ہیں، کچھ بے کار سی معلوم ہوتی ہے۔ علم لسان کی رو سے، جیسے کہ ڈاکٹر تاراچند صاحب اور بعض دیگر علما کا فرمانا ہے ان کو الگ الگ دو زبانیں کہنا غالباً صحیح نہیں ہے۔ بہر حال ان کا فرق ظاہر ہے اور اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ ہمارے کلچر کے دو متوازی دھاروں کی آئینہ دار ہیں۔ دونوں ہمارے ملک کی فطری اور تاریخی پیداوار ہیں۔ دونوں ہندوستانی ہیں۔ دونوں کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کا برابر حق ہے۔

تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں اُردو یا ہندی اس وقت بولی جاتی ہیں اُردو اور ہندی کی تعلیم جب عام لوگوں کو الگ الگ دی جائے گی تو رفتہ رفتہ ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اُردو بولنے والے ہندی بولنے والوں کی باتیں نہ سمجھ سکیں گے اور ہندی بولنے والے اُردو بولنے والوں کی باتیں نہ سمجھ سکیں گے؟ یا یہ ہوگا کہ سکول، کالج، یونیورسٹیاں تمام تعلیمی اور ادبی ادارے اُردو اور ہندی میں بٹ جائیں گے۔ ایک شہر اور ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کی بولی تک نہ سمجھ سکیں گے۔

اگر ہم اپنے کلچر کے معاملات کو حقیقت پسندی، انصاف اور باہمی مفاد کے اصول پر حل کریں تو ہرگز

اس قسم کی علیحدگی نہ ہوگی۔ سیاست کی طرح تہذیبی امور میں حقیقت کو اس کی مکمل اور مختلف شکلوں میں اور پہلوؤں سے دیکھ کر اور سمجھ کر ہی ہم ایسے نتائج پر پہنچ سکتے ہیں جو سب کو قابل قبول ہوں اور جس میں سب کا بھلا ہو۔ اُردو اور ہندی کے جو مختلف پہلو ہیں انھیں ہم نے دیکھ لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں کون سی باتیں مشترک ہیں۔

سب سے پہلے اُردو اور ہندی میں جو شے ہمیں مشترک نظر آتی ہے وہ ان دونوں کی بولیاں ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عام بول چال کی زبان بہت بڑی حد تک مشترک ہے۔ یہ زبان جسے عرف عام میں ہندوستانی کہتے ہیں۔ یو پی، دہلی، بہار، وسطی ہندوستان، راجستھان، حیدرآباد اور مشرقی پنجاب کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔ دیہاتوں میں جہاں (ہندوستان کی مختلف بولیاں لوگ بولتے ہیں) لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ سارے ہندوستان کے شہروں میں ٹوٹے پھوٹے انداز میں یہ سمجھ لی جاتی ہے۔ بمبئی، کلکتہ، احمد آباد کی کثیر آبادیاں اسے بول اور سمجھ لیتی ہیں۔ غیر ہندوستانی علاقوں کے بہت سے لوگ جو قومی جذبے کے ماتحت اُردو یا ہندی پڑھتے لکھتے ہیں اس مشترک زبان کو بول اور سمجھ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُردو اور ہندی ادب میں بھی بعض بعض جگہوں پر ہمیں اس کے نمونے ملتے ہیں، مثلاً نظیرا کبرآبادی اور حالی کے کلام کے بعض حصے اسے ہم چاہے سہل اُردو کہیں چاہے سہل ہندی۔ تیسرے یہ مشترکہ زبان ہماری بیشتر فلموں میں استعمال ہوتی ہے۔ چوتھے عام جلسوں میں تقریر کرتے وقت اچھے مقرر اس مشترک زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ گاندھی جی، جناح صاحب، پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد، مزدور تحریک سے تعلق رکھنے والے اکثر مقرر اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ پانچویں اُردو اور ہندی کی نحوی ساخت ایک ہے۔ دونوں کی بنیاد کھڑی بولی ہے، جو مدھیا پردیش کی شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے۔

مستقبل میں کلچر کا سوال

اُردو اور ہندی کی موجودہ پوزیشن، ان میں یکسانیت اور ان میں علیحدگی کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل میں، ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں جو اُردو یا ہندی، بولی کے علاقے ہیں (۱)۔ کلچر کا سوال کس طرح حل کیا جائے گا؟ ہم اس سوال کو سیاسی اور سماجی سوالات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔

---

(۱) میری مراد اس لسانی علاقے سے ہے جسے گریرسن نے مغربی اور مشرقی ہند کے علاقے میں شامل کیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سامراجی حکمران ہماری قوم کے اس اہم سوال کو حل کرنے سے قاصر ہی نہیں رہے۔ ان کے عہد حکومت میں کلچر اگر بڑھی ہے تو ان کی مخالفت کے باوجود اور ان کے خلاف جدوجہد کر کے۔ اس کی سب سے بڑی مثال عام تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ہماری قوم میں صرف پندرہ فی صد آدمیوں کا تعلیم یافتہ ہونا سامراجیوں کی کلچر دشمنی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ صرف ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان پوری طرح سے مہذب اور متمدن ہندوستان ہو سکتا ہے۔

اب اس علاقے میں عام تعلیم کا مسئلہ کس طرح حل کریں گے، جہاں اس وقت وہ ادبی زبانیں، ہندی اور اُردو رائج ہیں، لیکن جہاں کے لوگ عام طور سے ایک بولی سمجھ اور بول لیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جب ہم یوپی اور بہار کے ہر ایک دیہات اور شہر کے ہر ایک محلے میں اسکول کھولیں گے تو ان میں زیادہ تر ہندو بچے ہندی پڑھیں گے اور زیادہ تر مسلمان بچے اُردو پڑھیں گے۔ یہ ان کا جائز اور فطری رجحان ہے۔ ہمیں اس کا انتظام کرنا ہوگا۔ جوں جوں ہمارے ملک کے ہندوستانی بولنے والے علاقے میں تعلیم بڑھ رہی ہے ہمیں یہ نقشہ صاف نظر آنے لگا ہے۔ ایک سچی جمہوری حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ دونوں زبانوں میں تعلیم کا بندوبست کرے۔

لیکن ہماری زندگی کی ضرورتیں ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سہنے، ایک دوسرے کے خیالات و جذبات معلوم کرنے، ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہندو اور مسلم عوام کے مقاصد زندگی ایک ہوں گے۔ آزادی کی فضا میں خوشحالی کی مہذب اور پرامن زندگی بسر کرنا جس میں ہماری جسمانی، ذہنی اور روحانی طاقتوں کی بہترین نشوونما ہو سکے۔

اس لیے اُردو جاننے والوں کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ ہندی سے واقفیت حاصل کریں۔ ہندی جاننے والوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اُردو سیکھیں۔ جب ہم ایک دوسرے کے خیالات و جذبات سے واقف ہوں گے، ایک دوسرے کے ادب کے بہترین خزانوں سے بہرہ مند ہوں گے تو وہ مروجہ جہالت جو اُردو کے طرف داروں میں ہندی کی جانب سے اور ہندی کے حمایتیوں میں اُردو کی طرف سے آج موجود ہے، کم ہونے لگے گی اور وہ مضحکہ خیز حرکتیں جو آج کل کے بعض ہندی داں اُردو کے مروجہ الفاظ کو ترک کر کے کر رہے ہیں حماقت اور جہالت کی نشانی سمجھی جائیں گی، اسی طرح ہندی الفاظ پر ناک بھوں چڑھانے والوں کو لوگ قابل رحم غلامانہ اور متعصب ذہنیت کا شکار سمجھیں گے۔

اس طرح ہندی اور اُردو زبانوں کی ایک نئی تحلیل شروع ہوگی اور اس عظیم الشان زبان کے نقوش

ابھرنے لگیں گے جو اپنے میں اُردو اور ہندی کی تمام روایات کو ان کے تمام ادبی خزانوں، ان کی تمام لطافتوں اور شیرینیوں، ان کی وسعتوں اور گہرائیوں کو سموئے ہوئے ہوگی جو ہماری نئی تہذیب کا روحانی تاج محل کہلائے جانے کی مستحق ہوگی اور جسے ہم صحیح معنوں میں ''ہندوستانی'' کا نام دے سکیں گے۔

ہمیں کیا کرنا چاہیے

یہ خوش آئند مستقبل خود بخود وجود میں نہیں آئے گا۔ تاریخ مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے تقاضوں کو ہم اپنے عمل سے پورا کریں۔ ہمیں تہذیبی اتحاد کی اس مہم میں تنگ نظری، عصبیت اور رجعت پرست علیحدگی کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور انھیں شکست دینی ہوگی۔

ہندی کے طرف داروں میں جو لوگ اُردو کے وجود سے انکار کرتے ہیں، جو اُردو کو مٹانا چاہتے ہیں ہمیں انھیں سمجھانا ہوگا کہ اس طرح ہندی اور ملک دونوں کا نقصان ہے۔ ہمیں انھیں سمجھانا ہوگا کہ ہمارے ملک میں رہنے والے لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کی ذہنی تربیت اُردو کے ہی ذریعے ہو سکتی ہے اور اس لیے ہر ایک ہندوستانی کا قومی فرض ہے کہ اُردو کی ترقی کو اچھی نظر سے دیکھے اور حتی الامکان اس کام میں مدد کرے۔

بالکل اسی طرح ہمیں ان لوگوں کو بھی سمجھانا پڑے گا جو ہندی کی مخالفت کرتے ہیں کہ بے شمار ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہندی ہی ہو سکتی ہے اور اس لیے اس کی مخالفت کرنا اپنی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے۔

اُردو اور ہندی کی موجودہ علیحدگی کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ علیحدگی کم ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس وقت ہندی اور اُردو کا وہ لسانی علاقہ جو دونوں میں مشترک ہے، جسے سہل اُردو، سہل ہندی یا ہندوستانی کا نام دیا جاتا ہے قائم رہے اور اسے برابر بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

ہندی کے ترقی پسند ادیب اس رجحان کی مخالفت کریں جس کے ماتحت ہندی میں سے فارسی، عربی یا اُردو کے مروجہ اور عام فہم لفظوں کا استعمال ترک کیا جا رہا ہے۔ اُردو کے ادیب ٹھیٹھ ہندی یا سنسکرت تدبھو یا ایسے تتسم الفاظ جو مستعمل ہیں یا جو عوام میں بولے جاتے ہیں، ان کو اپنی زبان سے علیحدہ نہ کریں۔ مشترک سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر مشترک تعلیمی اداروں کے معلموں کے لیے ضروری ہو کہ دونوں زبانیں اچھی طرح جانتے ہوں۔ ہندی اور اُردو کے مستند علما علمی اور فنی اصطلاحوں کا مشترک لغت تیار کریں۔ جہاں کسی اصطلاح کے لیے ایک لفظ نہ ہو سکے وہاں ہندی اور اُردو دونوں کی اصطلاحیں لکھ دی جائیں۔ یہ لغت

اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں ہو۔ ایسا لغت تیار کیا جائے جس میں ہندی اور اُردو دونوں کے الفاظ ہوں اور دونوں زبانوں میں معنی دے دیے جائیں۔

ادیب دونوں زبانیں سیکھیں اور اس سلسلے میں ہم پریم چند، اشک، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال کی مثال پر عمل کریں، دونوں زبانیں جاننے سے ادیب بآسانی اپنی کتابیں اُردو اور ہندی میں شائع کر سکیں گے۔ اس میں ادبی اور مالی دونوں طرح سے ان کا فائدہ ہے۔

ہم سب کوشش کریں کہ فلموں، ڈراموں، تقریروں، اخباروں اور ریڈیو پر ایسی اُردو یا ایسی ہندی استعمال ہو جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آئے۔ ریڈیو پر سے اُردو اور ہندی دونوں نشر ہوں لیکن اُردو کو گھٹا کر ہندی نہ ہو اور ہندی کے بدلے اُردو نہ ہو۔ ساتھ ساتھ مشترکہ ہندوستانی کا بھی پروگرام ہو۔ اُردو ہندی کے پروگرام حتی الامکان سہل زبان میں ہوں۔

اُردو میں ہندی اور ہندی میں اُردو ادب کو مقبول بنانے کی کوشش کی جائے۔ اُردو کی چیدہ کتابیں ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہوں۔ تاکہ ہندی والے انھیں آسانی سے پڑھ سکیں۔ اسی طرح ہندی کی کتابیں اُردو رسم الخط میں شائع ہوں۔ مشکل الفاظ کے معنی دے دیے جائیں۔ ہندی اور اُردو کتابوں کے ترجمے بھی ایک دوسرے کی زبان میں چھپیں۔ جیسے پریم چند، اشک اور اختر حسین کی کتابوں کے ہوتے ہیں۔

ترقی پسند ادیب اُردو اور ہندی کے ادبی اور لسانی اداروں میں شریک ہو کر کام کریں۔ اگر ہندی کے ادیب ہیں تو کوشش کریں کہ ہندی میں اُردو کی مخالفت کے رجحانات ختم ہوں، اُردو کے ادیب ہندی کے خلاف تعصب کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ سب ایک دوسرے کی زبان سیکھیں اور تعصب کے سبب سے الفاظ کو خارج کرنے کے بجائے دوسری زبان کے نئے الفاظ کو اپنی زبان میں لے کر کھپا دینے کی کوشش کی جائے۔

ہندوستان کی بین الاقوامی زبان، ہندی اور اُردو دونوں ہوں جس کا جی چاہے جونسی زبان سیکھے لیکن یہاں بھی ایسی کوشش جاری رہے کہ ہندی اور اُردو کی مشترک چیزیں ابھریں۔

خاتمہ

اب آپ کو ایک چھوٹا سا لطیفہ سنا کر میں اس طولانی داستان کو ختم کرتا ہوں۔ تھوڑے دن ہوئے میں اپنے ان خیالات کا اظہار اُردو کے ایک بہت بڑے عالم سے، جن کا میں بے حد احترام کرتا ہوں، کر رہا تھا۔ انھوں نے مجھ سے ناراض ہو کر کہا: ''آپ دونوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں''۔ میں نے نہایت عاجزی کے

ساتھ انھیں جواب دیا: ''اس میں حرج کیا ہے؟''

کیا اُردو اور ہندی کی یہ گتھی جو دن بدن زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے کسی ایسے ہی طریقے سے حل ہو سکتی ہے جس سے اُردو یا ہندی کی نمو یا ترقی پر ضرب پڑتی ہو؟ صرف وہی حل کامیاب ہوسکتا ہے جو ان دونوں زبانوں کے وجود، ان کے جواز اور ان کی ضرورت کو تسلیم کر کے ایسی راہ نکالے جو متضاد نہ ہو اور جو ہماری تہذیب کے ان متوازی دھاروں کو اس طرح پھیلنے اور بڑھنے کا موقع دے کہ آگے چل کر وہ ایک دوسرے سے مل جائیں۔

☆☆☆

ہندوستان کی عالمگیر زبان اور اس کا رسم الخط

آج کل اخبارات میں اور بعض مجالس میں اس پر بہت بحث رہتی ہے کہ ہم اپنی ملکی زبان کو اُردو کہہ کر پکاریں یا ہندی یا اسے ہندوستانی کہنا بہتر ہوگا۔ میں اس بحث کو بیکار سمجھتا ہوں۔ جب ہندوستان کے اکثر حصوں میں دفاتر کی زبان فارسی تھی اور بہت سے پڑھے لکھے لوگ باہم خط و کتابت بھی فارسی میں کرتے تھے۔ اس وقت اس ملکی زبان کو ہندی کہتے تھے مگر وہ ہندی اس بولی کے لگ بھگ تھی جسے کبھی اُردو اور کبھی ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اس زبان کے لیے لفظ ہندوستانی اصل میں انگریزوں نے ایجاد کیا۔ میں ایک عرصہ دراز تک اُردو اور ہندوستانی کو متبادل سمجھتا رہا ہوں اور اپنی تحریروں میں حسب موقع کبھی ایک نام اور کبھی دوسرے کو استعمال کرتا رہا ہوں لیکن حال ہی میں بعض جماعتوں نے لفظ ''ہندوستانی'' کو ایسے نئے معنی دیے ہیں اور اس زبان میں اتنی کمی بیشی شروع کی ہے کہ ہماری زبان کی صورت بدل چلی ہے اور وہ آسانی سے پہچانی نہیں جا سکتی۔ اس سبب سے اب اس زبان کے اکثر ہوا خواہ اسے اُردو کے نام سے موسوم کرنا زیادہ درست سمجھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس بڑے جلسے میں اُردو کے متعلق اختلافی امور کو چھوڑ کر اس کی ترقی کی ایسی راہیں ڈھونڈیں جو ادبی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمارے آپس کے رابطۂ دوستی کو مضبوط کریں۔

پہلی بات جو آپ کی توجہ کے لائق ہے یہ ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں بہت سی زبانیں مروج ہیں ایک زبان ایسی ہونی چاہیے جو سب کی مشترکہ ہو۔ جس کے ذریعے سے شمال کے رہنے والے جنوب والوں سے اور مشرقی ہند کے رہنے والے مغرب والوں سے بآسانی تبادلۂ خیالات کر سکیں۔ اصولاً تو اس بات کو ہماری سیاسی جماعتیں بھی تسلیم کرتی ہیں مگر ملک کی بدقسمتی دیکھیے کہ جب اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع ہوئی تو اُردو کے حامی ایک طرف اور ہندی کے خیر خواہ دوسری طرف کھڑے ہو گئے جیسے رسہ کشی کے کھیل میں ایک گروہ دوسرے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسرا اپنی طرف وہی تماشہ بن گیا۔ ایک گروہ چاہتا تھا کہ زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ ہو اور دوسرا سنسکرت اور پرانی ہندی کے لفظ زیادہ دلانا چاہتا تھا اور اس بات کے درپے تھا کہ جو لفظ زبان میں بالکل کھپ چکے ہیں اور اس کا جزو بن گئے

ہیں، انھیں اس قصور پر نکال باہر کیا جائے کہ یہ ابتدا میں کسی باہر کے ملک سے آئے تھے۔ میری رائے میں یہ دونوں کوششیں نامناسب ہیں بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ جب ہمارا یہ دورِ جنوں ختم ہو جائے گا جس میں ہم ان دنوں مبتلا ہیں تو ہمیں نظر آ جائے گا کہ ہم اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے تھے۔

جو حضرات زبانوں کی نشوونما کے طریق سے باخبر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ زبانیں قدرتی طور پر بنتی اور بڑھتی ہیں۔ ہماری زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے وسیع دامن میں غیر زبانوں کے لفظ سمیٹ لیتی ہے۔ جب ملک میں فارسی کا رواج تھا تب اُردو نے فارسی سے اپنی وسعت حاصل کی اور اس میں عربی کے بہت سے لفظ بھی فارسی کے دروازے سے داخل ہوئے۔ جب سے انگریزی کا چرچا ہوا ہے، اس نے انگریزی الفاظ کو بھی بکثرت جذب کیا ہے۔ تعجب ہے کہ جو لوگ فارسی الفاظ کو نکال دینا چاہتے ہیں وہ انگریزی الفاظ کے متعلق کوئی ایسی تحریک نہیں کرتے حالانکہ بدیسی ہونے کے اعتبار سے انگریزی فارسی سے زیادہ بدیسی ہے۔ اوّل تو فارسی اور سنسکرت کا اصل ایک ہی ہے۔ دونوں زبانیں آریا خاندان کی رکن ہیں اور ان میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ دوسرے ایران ہمارا ہمسایہ ایشیائی ملک ہے اور انگلستان سات سمندر پار ہے۔ پس اگر ہندوستانی زبان انگریزی الفاظ کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ فارسی الفاظ سے گریز کرے۔ وہ غیر مانوس لفظ جو نہ ہندوؤں کے گھروں میں بولے جاتے ہیں، نہ مسلمانوں کے ہاں مروج ہیں اور صرف ان حضرات کی زبانوں پر ہیں جو ہماری زبان کو بدلنے یا بگاڑنے کی فکر میں ہیں، وہ عام بولی کا جزو نہیں بن سکتے اور نہیں بننے چاہئیں۔

ملکی زبان کا مفہوم

اپنی ملکی زبان کا جو مفہوم میں سمجھتا ہوں اس کو واضح کرنے کے لیے میں دو اہم جلسوں کا حال آپ کو سناتا ہوں، جہاں میری موجودگی میں مشترکہ زبان کے مسئلہ پر دلچسپ بحث ہوئی۔ ایک کو تو بہت دیر ہوگئی ہے مگر اس کا نقشہ اب بھی میری آنکھوں میں پھر رہا ہے اور دوسرا ابھی حال ہی میں ہوا تھا۔ پہلا کلکتہ میں تھا اور دوسرا لندن میں۔ کلکتہ کا جلسہ ۱۹۱۷ء میں ہوا، جب کانگریس کا سالانہ اجلاس وہاں ہو رہا تھا اور مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی وہیں تھا۔ ان سیاسی جلسوں کے ختم ہونے کے بعد گاندھی جی کی تحریک سے ایک بڑا جلسہ کسی دوسرے ہال میں ہوا۔ تلک صاحب آنجہانی صدرِ جلسہ تھے۔ گاندھی جی نے تقریر شروع کی اور فرمایا کہ میں تلک صاحب کو پوجنیک سمجھتا ہوں مگر مجھے ان سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے مرہٹی زبان کے سوا جس کے وہ

بڑے مصنف ہیں اور جو ان کی مادری زبان ہے اور انگریزی کے علاوہ جس کے وہ خوب ماہر ہیں، اپنی ملکی مادری زبان نہیں سیکھی۔ حالانکہ ملکہ وکٹوریہ نے انگلستان میں بیٹھے ہوئے اس کے سیکھنے کا شوق کیا تھا اور لارڈ ڈفرن نے وائسرائے کی حیثیت سے اسے سیکھنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ امید ہے کہ آئندہ سال انہی دنوں میں جب کانگریس کا جلسہ دہلی میں ہوگا تو وہ اپنا ایڈریس بجائے انگریزی کے ملکی زبان میں دیں گے۔ اس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو صاحبہ سے کہا گیا کہ وہ کچھ فرمائیں۔ انھوں نے یوں تقریر شروع کی۔

''جناب صدر جلسہ اور صاحبان مجلس''

اس پر کئی طرف سے آواز آئی (Hindi Please)۔ مسز سروجنی صاحبہ تن کے کھڑی ہوگئیں اور یہ الفاظ کہے:

''جو صاحبان یہ آواز بلند کر رہے ہیں وہ مجھے پہلے یہ بتا دیں کہ اُردو ہندی میں کیا فرق ہے؟''

یہ کہہ کر انھوں نے مجمع کو چپ کرا لیا اور روانی سے اُردو میں ایک عمدہ تقریر کر دی۔

اس کے بعد پنڈت مدن موہن مالویہ جی سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ کون نہیں جانتا کہ وہ جب چاہیں ٹکسالی اُردو بول سکتے ہیں اور جب چاہیں عالمانہ ہندی میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ سنسکرت کے بھی عالم ہیں مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ کلکتہ کے مخلوط جلسے میں جہاں ہندوستان کے ہر گوشے کے لوگ موجود تھے۔ عام فہم زبان ہی سمجھی جائے گی۔ انھوں نے زیادہ تر اُردو سے کام لیا اور اگر کہیں ٹھیٹھ ہندی لفظ استعمال بھی کیے تو وہ ایسے جنھیں اکثر لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر بعد کے سیاسی جھگڑوں کے سبب سے ہم میں سے بعض کی آنکھوں پر کسی دوسرے ملک کی عینک نہ لگ جاتی اور اس وقت کی تقریروں کے ریکارڈ لیے گئے ہوتے تو وہ جلسہ فیصلہ کن تھا کہ ہماری بولی کیا ہے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

لندن کا ایک جلسہ

دوسرا جلسہ جو لندن میں ہوا تھا وہ بھی اپنی جگہ خاص دلچسپی رکھتا ہے۔

جب میں ملازمت کے سلسلہ میں پانچ سال کے لیے انگلستان گیا تو میں نے اور چند دوستوں نے مل کر ایک سوسائٹی وہاں بنائی۔ جس کا نام ''ہندوستانی اسپیکنگ یونین'' رکھا گیا۔ اس میں ہندوستان کے ہر حصے کے رہنے والے شریک تھے۔ سب دہلی اور لکھنو کی بامحاورہ اُردو تو نہیں بولتے تھے۔ مگر جو کچھ بولتے تھے

اسے ہندوستانی کہنا غلط نہ تھا۔ کوئی ''ہماری بات'' کہتا تھا۔ کوئی ''ہمارا بات کہتا تھا'' کوئی سرحدی لہجہ میں گفتگو کرتا تھا۔ کوئی بمبئی کے لہجہ میں' تلفظ میں بھی کہیں کہیں فرق تھا۔ مگر سب ایک دوسرے کی بات بخوبی سمجھتے تھے۔

کوئی دو سال ہوئے جب پنڈت جواہر لال نہرو صاحب اور ان کی ہمشیرہ مسز وجے لکشمی پنڈت صاحبہ موسم گرما میں لندن میں تھے تو اس سوسائٹی نے انھیں دعوت دی کہ وہ کسی دن ہمارے جلسے میں ملکی زبان کے مسئلے پر تقریر کریں۔ انھوں نے یہ درخواست منظور کی اور تشریف لائے۔ پہلے نہرو صاحب نے تقریر کی اور پھر مسز پنڈت صاحبہ نے، نہرو صاحب کا لیکچر ایک گھنٹہ بھر کے قریب جاری رہا۔ ان کی زبان سادہ مگر فصیح اُردو تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ شمالی ہند اور خاص کر صوبجات متحدہ کی بولی وہی ہے جس میں وہ گفتگو کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض عربی فارسی جاننے والے اس میں بہت سے عربی فارسی الفاظ ملا دیتے ہیں اور سنسکرت جاننے والے کچھ سنسکرت کے الفاظ داخل کر دیتے ہیں مگر انھوں نے اپنے تجربہ کی بنا پر یہ بتایا کہ انگریزی ہندوستان کی مشترکہ زبان ایک محدود حلقے کے لیے بن سکتی ہے مگر عوام کے لیے کام نہیں دے سکتی اور عوام پر اثر ڈالنے کے لیے انھوں نے اسی زبان کو کار آمد پایا جس میں وہ تقریر کر رہے تھے۔ پچاس پچاس ہزار اور ایک ایک لاکھ آدمی کے مجمع کو مخاطب کرنے کا انھیں موقع ملا اور انھوں نے اسی بولی سے کام لیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ملک کے ان حصوں کے لیے بھی جن کی ''اپنی زبانیں اور ہیں اور جہاں بنگالی یا مرہٹی یا تامل یا تلنگی کا رواج ہے۔ یہی زبان مشترکہ بن سکتی ہے۔ وہاں کی اپنی زبانوں کی تعلیم کو درجہ اول ملنا چاہیے مگر ثانوی زبان کے طور پر یہ زبان سکھانی چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہاں کے لیے اسے جہاں تک ہو سکے، آسان بنا دیا جائے۔ بے شک انگریزی کے طور پر اگر اس کے بھی ہزار دو ہزار لفظ چھانٹ کر جن سے معمولی ضرورت کی گفتگو بآسانی ہو سکے، بے شک ہندوستانی کی بنا ڈالنی چاہیے۔

اس کے بعد مسز پنڈت صاحبہ نے ایک مختصر اور نہایت عمدہ تقریر کی۔ جس میں انھوں نے بتایا کہ گو بچپن میں اپنے گھر میں وہ اُردو ہی بولتی تھیں مگر اپنی پبلک زندگی کی ابتدا میں انہوں نے یہ دیکھ کر سنسکرت آمیز ہندی بعض حلقوں میں مقبول ہے، ایک جلسے میں انہوں نے اس طرز کی تقریر کی۔ وہاں اتفاق سے سر تیج بہادر سپرو بھی تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے تقریر کے اختتام پر انھیں شاباش دی اور کہا کہ تقریر بہت پر جوش تھی مگر افسوس کہ میں سنسکرت نہیں جانتا اور اس کو پورا سمجھ نہیں سکا۔ مسز پنڈت نے بیان کیا کہ اس نکتہ چینی کا ان پر بہت اثر ہوا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر تقریر سے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سن رہے ہیں وہ اسے سمجھیں اور اس سے اثر پذیر ہوں تو ایسی تقریر کا کیا فائدہ جو سر تیج بہادر کی قابلیت کے شخص کی بھی سمجھ میں نہ آئے۔ اس لیے اب

وہ سادہ اور عام فہم زبان کو پسند کرتی ہیں اور ان کے خیال میں اسی کا رواج ہونا چاہیے۔ ان کی تقریر بہت پسند کی گئی کیونکہ وہ اچھی اُردو کا اچھا نمونہ تھی۔ اس سے آپ کو یہ پتا چلتا ہے کہ دراصل ہماری زبان کیا ہے؟

اب رہ جاتا ہے حسن بیان کا معاملہ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر ترقی یافتہ یا ترقی کرنے والی زبان کا لٹریچر اس کے اعلیٰ ترین دماغوں کے خیالات کا نچوڑ ہوتا ہے اور استادان فن اپنے خون جگر سے ادبیات کے پودے کی آبیاری کرتے ہیں۔ امیر مینائی مرحوم نے خوب کہا ہے:

امیر اک مصرعہ ترتب کہیں صورت دکھاتا ہے!
بدن میں خشک جب شاعر کے ہوتا ہے لہو برسوں!

اس لیے حسن زبان اور حسن بیان کے فیصلے کے لیے جہاں تک ممکن ہو ہمیں زبان کے مسلم الثبوت استادوں کے قلم سے سند لینی چاہیے۔ انتخاب الفاظ کے متعلق ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مطلب کے اظہار کے لیے ایک فارسی لفظ ملتا ہے، ایک ہندی اور ایک انگریزی۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ زبان کا جزو ہیں اور درست لیکن ایک محل پر دوسرے سے مثال کے طور پر لفظ پروپیگنڈا کو لیجیے۔ ہم نے یہ لفظ انگریزی سے لیا ہے اور انگریزی نے لاطینی سے۔ ہندی لفظ پرچار تقریباً اس کے ہم معنی ہے۔ فارسی الفاظ نشر و اشاعت کا مفہوم بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ یہ دونوں لفظ فارسی میں عربی سے آئے ہوئے ہیں۔ اب ذرا ان تینوں زبانوں کے مترادف الفاظ کے محل استعمال کو دیکھیے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہیں کہ ''ملک میں یہ پروپیگنڈا کرنا چاہیے کہ موجودہ جنگ کے ذمہ دار ہٹلر اور مسولینی ہیں،، تو آپ اسی خیال کو ان لفظوں میں ظاہر کر سکتے ہیں۔ یہ ''پرچار کرنا چاہیے یا ہمیں اس خیال کی اشاعت کرنی چاہیے،، لیکن پروپیگنڈا اپنے لغوی معنوں سے تجاوز کر کے اصطلاحی معنی بھی رکھتا ہے، یعنی ایسے جھوٹے خیالات پھیلانا، جن کی اشاعت لوگوں کو دھوکہ دینے اور اصل حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے کی جائے۔ اس مطلب کو بیان کرنے کے لیے آپ کو نہ ''پرچار،، کام دیتا ہے نہ ''اشاعت،، بلکہ آپ کہیں گے ''فلاں وزیر کے خلاف جو اس کے مخالف کہہ رہے ہیں وہ محض پروپیگنڈا ہے۔ ان باتوں کی کچھ اصلیت نہیں، اس قسم کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ لازم آتا ہے کہ یہ سب لفظ زبان میں موجود رہیں اور لکھنے اور بولنے کے لیے ایک کھلا میدان رہے اور مناسب لفظوں کے انتخاب کے وقت ان کے راستے میں کوئی مصنوعی حدود یا رکاوٹ نہ ڈالیں۔

رسم الخط کا معاملہ

زبان کی بحث کے بعد رسم الخط کا معاملہ آتا ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی اس ملکی زبان کے لکھنے کے لیے کون سے حروف استعمال کرنے چاہئیں۔ جب کبھی حروف کے مسئلے پر بحث ہوتی ہے تو کوئی موجودہ اُردو حروف کی تائید کرتا ہے اور کوئی ناگری حروف کا حامی ہوتا ہے۔ پہلے گروہ میں زیادہ تر مسلمان ہوتے ہیں جو صدیوں سے ان حروف کے عادی چلے آئے ہیں۔ ناگری حروف کی موافقت زیادہ تر ہمارے ہندو بھائیوں کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ ان کی اکثر مذہبی کتابیں ان حروف میں ہیں اور جذباتی طور پر ان کی رغبت زیادہ ان حروف کی طرف ہے۔ ان دو مختلف خیال کے گروہوں کے سوا ایک تیسرا گروہ اور بھی کچھ عرصے سے یہ آواز بلند کر رہا ہے کہ ان دونوں ایشیائی حروف کو چھوڑ کر رومن حروف جن میں انگریزی لکھی جاتی ہے اختیار کر لینے چاہئیں اور انھیں ہندوستان کے مشترکہ حرف کی معزز جگہ دینی چاہیے۔ آیئے پہلے رومن حروف والی تجویز پر غور کریں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کسی قسم کے حروف سے بدیسی ہونے کی بنا پر تعصب جائزہ ہے تو رومن حروف زیادہ بدیسی ہیں۔ اگر تعصب سے قطع نظر کریں تو اصل کسوٹی جس پر حروف کی مناسبت کو پرکھا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ جن الفاظ کو ہم ادا کرنا چاہتے ہیں، ان کو یہ ادا کر سکتے ہیں یا نہیں، مثلاً آپ جانتے ہیں کہ آپ کی زبان میں حروف ت کی دو آوازیں ہیں۔ ایک ت اور ایک ٹ۔ رومن حروف میں ان دونوں کے لیے ایک حرف T (ٹی) ہے۔ جب آپ اُردو میں ''تم،، کہنا چاہیں جو خالص دیسی لفظ ہے تو رومن (TUM) ٹم لکھیں گے۔ بہت سے یوربین جو رومن حروف میں لکھی ہوئی اُردو پڑھتے ہیں اس لفظ کو ٹم پکارتے ہیں۔ آپ جب ''آتا،، کہنا چاہیں گے تو ''آٹا،، پڑھا جا سکے گا اور ''کاتا،، کہنا چاہیں گے تو ''کاٹا،، ہو جائے گا۔

اس قسم کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے واضح ہو سکتا ہے کہ رومن حروف اُردو کی بہت سی آوازیں اور بہت سے تلفظ کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ ایک وجہ ہی اس رائے کو قائم کرنے کے لیے کافی ہے کہ رومن حروف زبان کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس تجویز کے حق میں ایک اور دلیل سے بھی کبھی کبھی زور دیا جاتا ہے یعنی اگر ہندو مسلمان بدقسمتی سے دیر تک اپنی اپنی ضد پر اڑے رہیں اور کسی دیسی رسم الخط پر رضامند نہ ہوں تو یہ ایک راستہ راضی نامہ کا ہے کہ چلو نہ تم ہارے اور نہ ہم، رومن حروف پر راضی ہو جائیں مگر میری رائے میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ دونوں ہارے اور بری طرح ہارے اور دونوں نے فکر متحدہ قومیت

کے امکان پر ایک ضرب کاری لگائی۔ اس کے سوا یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ملک میں اُردو کی حرف شناسی تو انگریزی کے مقابلے میں بہت عام ہے اور اس کو جلد زیادہ عام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انگریزی کی حرف شناسی کو اتنے وسیع حلقے تک پھیلانے کے لیے بہت سا وقت درکار ہوگا۔ رومن حروف کے حق میں ایک اور بات بھی کہی جاتی ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ہمیں ہندوستان کے باہر کے بہت سے ملکوں کے حروف کے ساتھ اشتراک پیدا ہوتا ہے جس کے کچھ فوائد تجارت اور سیاحت وغیرہ کے نقطہ نگاہ سے ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ فائدہ خود اُردو حروف سے بھی حاصل ہے یعنی بیرون ملک کے ان ملکوں سے جن میں ان سے ملتے جلتے ہوئے حروف رائج ہیں۔ ایسا ہی تجارتی اور سیاحتی رابطہ پیدا ہو سکتا ہے، مثلاً ایران، افغانستان، عراق، عرب اور مصر وغیرہ۔ مانا کہ یہ ملک ایسے ترقی یافتہ نہیں جیسے کہ یورپ اور امریکہ کے بعض ملک ہیں۔ مگر یہ ہم سے زیادہ قریب ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان کے اور ہمارے تجارتی تعلقات اب سے بہت زیادہ ہوں گے۔ اس وقت ان حروف کے فائدہ کا یہ پہلو رومن حروف کے اس پہلو سے کسی طرح کم قابل وقعت نہ ہوگا۔ رسم الخط کے سلسلے میں بعض حضرات، رومن حروف کے حق میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب ملک ٹرکی میں غازی مصطفٰی کمال اتاترک مرحوم جیسے مقتدر مسلمان لیڈر نے ترکی حروف کو چھوڑ کر رومن حروف اختیار کر لیے اور انھیں ملک کی ترقی کا ذریعہ قرار دیا تو ہندوستان کے مسلمان اُردو کے لیے کیوں ان کی مثال کی پیروی نہیں کرتے اور کیوں انھیں اختیار کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس بارے میں باوجود اس تعظیم کے جو اتاترک مرحوم کے بہت سے کارناموں کی میری دل میں ہے، میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میری رائے میں انھوں نے اپنے حروف کو ترک کرنے میں غلطی کی۔ اگر وہ دوسرے حروف قبول کرنے سے پہلے دونوں حروف کی اندرونی خوبیوں کا باہم مقابلہ کرتے تو ظاہر تھا کہ عربی، فارسی، اُردو اور ترکی حروف میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ مختصر نویسی کا کام دیتے ہیں اور مختصر نویسی بھی ایسی جسے ایک دفعہ لکھنے کے بعد دوبارہ طویل نویسی کی حاجت نہیں۔ یہی ایک خوبی ان حروف کو رومن حروف پر ترجیح پانے کے قابل بناتی ہے، مثلاً آپ لفظ کانفرنس کو اُردو حروف میں لکھیے اور پھر رومن حروف میں آپ کو خود ہی نظر آ جائے گا کہ اس رسم الخط میں وقت کی کتنی بچت ہے اور لکھنے میں جو قوت صرف ہوتی ہے، اس کی کتنی کفایت، اگر کبھی وہ دن آ جائے کہ مغربی قوموں کے دماغ سے یہ کیڑا نکل جائے کہ ان کے دماغوں کو خدا نے دوسروں سے بہتر بنایا ہے اور وہ ایشیائی قوموں کی ان چیزوں کو جو حقیقت میں ان سے بہتر ہوں، پسند کرنے لگیں تو ممکن ہے وہ خود اس رسم الخط کو اپنے مطول خط پر ترجیح دینے لگیں۔ مزید برآں یہ معلوم رہے کہ اتاترک نے اس قسم کی جتنی اصلاحات کیں ان سے اس کا مقصد اپنی قوم کو یورپ کی قوموں کا

ہم رنگ بنانا تھا۔ وہاں خاص حالات سے سابقہ تھا جن کے باعث اصلاحات کا خیال ہوا۔ ان کے ملک اور قوم پر اہل یورپ کی طرف سے بار ہا اتنی زیادتیاں ہوتی رہیں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ترک اپنی وضع قطع اور خو بو سے یورپ کی عیسائی قوموں کو مسلمان نظر آتے ہیں، ان کی دشمنی قائم رہے گی۔ اس لیے اگر ظاہری شکل میں انھیں یہ نظر آئے گا کہ یہ لوگ اپنی پرانی حالت کو خود ہی بدل رہے ہیں اور یورپ کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں، ترکوں سے ان کی منافرت کم ہو جائے گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انھوں نے ٹرکی ٹوپی یا دستار کی جگہ یورپ کے نمونے کی ہیٹ پہننے کا حکم دے دیا۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کا کوئی قوم پرست یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ یہ کوئی ضروری اصلاح تھی یا حقیقی معنوں میں اصلاح تھی۔ اگر نہ تھی تو اسی سے سمجھ لیجیے کہ ترکی حروف کو یورپی ٹوپی پہنانا حقیقی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اب رہے ناگری حروف ان کو اُردو لکھنے کے لیے اختیار کرنے کے راستے میں ایک دقت یہ ہے کہ باوجود ملکی حروف ہونے کے وہ خود سارے ملک میں مروج نہیں۔ بنگالی، مرہٹی وغیرہ کے حروف ان سے ملتے جلتے ہیں مگر پھر بھی ہر بنگالی یا مرہٹہ ہندی خواں نہیں ہے اور نہ گجراتی جاننے والا ہندی داں ہے۔ تامل اور تلنگی تو ہندی سے بالکل جدا زبانیں ہیں اور ان کے حروف بھی الگ ہیں۔ اس لیے عمومیت کے لحاظ سے بھی ناگری حروف کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ اُردو کی بعض آوازیں ناگری حروف میں اچھی طرح ادا نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً بزاز ایک سیدھا سا لفظ ہے، اسے ہندی حروف میں اکثر بجاج لکھا جاتا ہے اور بجاج ہی بولا جاتا ہے۔ ایک اور مثال لیجیے اُردو میں ایک لفظ کسر ہے جو (ک۔س۔ر) سے مرکب ہے۔ اس کے معنی ہیں کمی اور لفظ قصر ہے جو ق۔ص۔ر کے ملنے سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں محل مگر ناگری میں کوئی ذریعہ ان دو لفظوں کو تمیز کرنے کا نہیں اور نہ رومن حروف میں یہ امتیاز ہو سکتا ہے۔ پس رسم الخط کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اگر مندرجہ بالا دلائل کو مدنظر رکھ کر اور باہم محبت کو بڑھانے کے لیے سب اُردو حروف کو قائم رکھنے پر متفق ہو سکیں تو بہتر، ورنہ زبان کو ایک رکھتے ہوئے حروف کو اختیاری کر دیں۔ جو جس کو پسند ہو استعمال کرتا رہے۔ عیسیٰ بہ دینِ خود موسیٰ بہ دینِ خود۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
علی گڑھ، بھارت

اُردو زبان کا تاریخی تناظر

اُردو زبان کی پیدائش، جائے پیدائش اور نشو و نما کے بارے میں اُردو کے عالموں، محققوں اور لسانیات دانوں نے اب تک کافی غور و فکر اور چھان بین سے کام لیا ہے جس سے اس موضوع پر اُردو میں لسانیاتی ادب کا ایک وقیع سرمایہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ اُردو کے جن عالموں نے اس موضوع پر تحقیقی نقطۂ نظر سے کام کیا ہے ان میں حافظ محمود خاں شیرانی، سید محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں، عبدالقادر سروری، شوکت سبزواری اور گیان چند جین کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ان سے پیشتر میر امن، سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی، محمد حسین آزاد، شمس اللہ قادری اور سید سلیمان ندوی جیسے اُردو کے ادیب و عالم بھی اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ ماضیِ قریب اور عہدِ حاضر کے بعض دیگر اہلِ علم و نظر بھی اُردو کے آغاز و ارتقا کے مسائل اور اس کے تاریخی تناظر پر غور و خوض کرتے رہے ہیں، مثلاً مولوی عبدالحق نے اپنے بعض خطبات میں، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی تصنیف ''کیفیہ'' میں، سید احتشام حسین نے ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' (خان بیمز) کے مقدمہ میں، جمیل جالبی نے ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (جلدِ اول) میں، سہیل بخاری نے ''اُردو کی زبان'' میں اور شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی حالیہ تصنیف ''اُردو کا ابتدائی زمانہ'' میں اُردو کی پیدائش، مرز بوم نیز اس کے تاریخی ارتقا اور تناظر کو اپنی فکر و تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔

اُردو کے ان تمام ادیبوں، عالموں، محققوں اور ماہرینِ لسانیات کے خیالات و نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو ایک مخلوط یا 'ملواں' زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد شمالی ہندوستان میں معرضِ وجود میں آئی اور اس پر دہلی اور اس کے آس پاس کی بولیوں کے نمایاں اثرات پڑے۔ ان میں سے مسعود حسین خاں اُردو کی پیدائش کو 'دہلی اور نواحِ دہلی' سے، حافظ محمود خاں شیرانی ''پنجاب'' سے، سید سلیمان ندوی ''وادیِ سندھ'' سے، اور سہیل بخاری ''مشرقی مہاراشٹر'' سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح محمد حسین آزاد کے

خیال کے مطابق ''اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے''۔ گیان چند جین کے نظریے کے مطابق ''اُردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے'' اور مسعود حسین خاں کی تحقیق کی رو سے ''قدیم اُردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔'' علاوہ ازیں شوکت سبزواری اس نظریے کے حامل ہیں کہ اُردو کا سرچشمہ ''پالی'' ہے۔ ان تمام عالموں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اُردو ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اس کا ڈھانچا یا کینڈا یہیں کی بولیوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ کا معتد بہ حصّہ ہند آریائی ہے، لیکن عربی اور فارسی کے بھی اس پر نمایاں اثرات پڑے ہیں۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے، کیونکہ اس کی پیدائش کے دونوں ذمہ دار ہیں۔

یہ تھے اُردو کے بارے میں اہلِ اُردو کے خیالات و نظریات۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غیر اُردو داں طبقے بالخصوص انگریزی اور ہندی کے بعض عالموں اور دانشوروں کی اس بارے میں کیا 'سوچ' رہی ہے اور وہ کس زاویے سے اُردو کے تاریخی تناظر پر غور کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں جن انگریزی مصنفین کی تحریروں کا جائزہ یہاں پیش کیا گیا ہے ان میں جارج اے۔ گریرسن، جان ایف۔ کئی، سینتی کمار چیٹرجی، امرت رائے، الوک رائے اور بال گووند مشر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ہندی مصنفین میں چندر دھر شرما گلیری، ایودھیا پرساد کھتری اور دھیریندر ورما کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۲)

اس امر کا ذکر یہاں بے جانہ ہوگا کہ شمالی ہندوستان کے جن علاقوں میں عرصۂ دراز سے اُردو زبان رائج تھی، ان ہی علاقوں میں تاریخ کے ایک مخصوص دور میں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی زمانۂ حال کی ہندی جسے ''ناگری ہندی'' کہتے ہیں، کا ارتقاعمل میں آیا۔ اس کے اسباب لسانی سے زیادہ فرقہ وارانہ (Sectarian) تھے جن کی جڑیں ہندو احیا پرستی میں پیوست تھیں۔ بعد میں ان ہی عوامل نے ''ہندی، ہندو، ہندوستان'' کے نعرے کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں کے مذہبی اکثریتی طبقے نے دیوناگری رسم الخط کی شکل میں اس نئی زبان کو تقویت دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جس کے نتیجے میں اُردو چشم زدن میں محض ایک طبقے کی زبان بن کر رہ گئی۔

اُردو کی بنیاد بلاشبہ کھڑی بولی پر قائم ہے۔ اس زبان کا باقاعدہ آغاز دہلی اور مغربی اتر پردیش (مغربی یوپی) میں ہوا، کیونکہ کھڑی بولی علاقائی اعتبار سے مغربی یوپی کی بولی ہے۔ مغربی یوپی کا علاقہ بجانب

شمال مغرب دہلی سے متصل ہے۔ اُردو بشمولِ دہلی ان ہی علاقوں میں بارھویں صدی کے اواخر میں معرضِ وجود میں آئی۔ تاریخی اعتبار سے یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی پر ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں کا سیاسی تسلط قائم ہوتا ہے اور ترکوں، ایرانیوں اور افغانوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ترکِ وطن کر کے دہلی میں سکونت اختیار کرلیتی ہے۔ اس دور میں دہلی میں سکونت اختیار کرنے والوں میں پنجابی مسلمانوں کی بھی ایک کثیر تعداد تھی کیونکہ یہ لوگ پنجاب سے ہی نقل مکانی کر کے دہلی پہنچے تھے۔ شمالی ہندوستان میں اس نئے سیاسی نظام کے قیام کے دور رس نتائج مرتب ہوئے اور یہاں کا نہ صرف سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوا، بلکہ اس کے اثرات یہاں کی سماجی اور تہذیبی و ثقافتی زندگی پر بھی پڑے۔ یہ تبدیلیاں لسانی صورت حال پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ چنانچہ بعض وجوہ کی بنا پر کھڑی بولی کو، جو دہلی کے شمال مشرقی خطے میں یعنی مغربی یوپی میں رائج تھی، تقویت حاصل ہوئی اور اس کا چلن نہ صرف دہلی کے گلی کوچوں، بازاروں، میلوں ٹھیلوں نیز عوامی سطح پر ہوا، بلکہ دھیرے دھیرے یہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی رائج ہوگئی۔ نو وارد مسلمانوں اور مقامی باشندوں (جن کی یہ بولی تھی) کے باہمی میل جول کی وجہ سے اس میں 'نکھار' پیدا ہوگیا۔ کھڑی بولی کے نکھار کا یہ زمانہ اُردو کا ابتدائی زمانہ ہے۔ کھڑی بولی کے اس نئے اور نکھرے ہوئے روپ یا اسلوب کو ''ہندی''، ''ہندوی'' اور ''ریختہ'' کہا گیا اور اسی کو بعد میں ''زبانِ اُردوئے معلّیٰ''، ''زبانِ اُردو'' اور بالآخر ''اُردو'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس لسانی عمل میں ہریانوی بولی نے تقویت پہنچائی جو کھڑی بولی کی طرح یعنی الف پر ختم ہونے والی بولی ہے۔ اگرچہ لسانی اعتبار سے دہلی ہریانوی بولی کے حدود میں واقع ہے، لیکن ہریانوی بنیادی طور دہلی کے شمال مغربی علاقے کی بولی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود حسین خاں قدیم اُردو کی تشکیل میں کھڑی بولی کے ساتھ ہریانوی کا بھی ہاتھ بتاتے ہیں۔ ہریانوی کے یہ اثرات بعد میں زائل ہوجاتے ہیں۔

یہ ایک لسانیاتی حقیقت ہے کہ ہر زبان اولاً محض ایک 'بولی' (Dialect) ہوتی ہے جس کا دائرۂ اثر و رسوخ ایک چھوٹے سے علاقے یا خطے تک محدود ہوتا ہے جب یہی بولی بعض ناگزیر اسباب اور تقاضوں کے ماتحت جن میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی و ثقافتی تقاضے شامل ہیں، اہم اور مقتدر بن جاتی ہے اور اس کا چلن عام ہوجاتا ہے اور یہ اپنی علاقائی حد بندیوں کو توڑ کر دور دراز کے علاقوں میں اپنا سکہ جمانے لگتی ہے تو 'زبان' کہلاتی ہے۔ پھر اس کا استعمال ادبی نیز دیگر مقاصد کے لیے ہونے لگتا ہے اور اس کی معیار بندی (Standardisation) بھی عمل میں آتی ہے جس سے یہ ترقی یافتہ زبان کے مرتبے تک پہنچ جاتی ہے۔ اُردو جو ایک ترقی یافتہ اور معیاری زبان ہے، اس کی تہہ میں یہی کھڑی بولی ہے اور یہی اس کی بنیاد اور اصل و اساس

ہے۔ ہند آریائی لسانیات کی روشنی میں یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اُردو کھڑی بولی کی ہی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے بعد میں اس پر نواحِ دہلی کی دوسری بولیوں کے اثرات پڑے۔ یہ ایک تاریخی اور لسانی حقیقت ہے کہ کھڑی بولی کے اس نئے اور نکھرے ہوئے روپ کو سب سے پہلے نو وارد مسلمانوں اور ان کے بعد کی نسلوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اسے نکھارا، سنوارا اور جلا بخشی جس سے یہ زبان اس لائق بن گئی کہ اسے ادبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے، چنانچہ اس زبان کا ادبی استعمال بھی سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی کیا۔

چونکہ کھڑی بولی کا اُردو کے ساتھ ماں اور بیٹی کا رشتہ ہے اور کھڑی بولی شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے، لہٰذا اس رشتے کی وجہ سے اُردو ایک ہند آریائی زبان قرار پاتی ہے۔ کھڑی بولی کا براہِ راست تعلق شورسینی اپ بھرنش یا مغربی اپ بھرنش سے ہے جو وسطی ہند آریائی دور (۵۰۰ قبلِ مسیح تا ۱۰۰۰سنہ عیسوی) کی آخری یادگار ہے۔ شورسینی اپ بھرنش (مغربی اپ بھرنش) بشمولِ دہلی اور پنجاب شمالی ہندوستان کے ایک وسیع علاقے میں رائج تھی۔ ۱۰۰۰سنہ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اس نے دم توڑ دیا اور اس کے بطن سے متعدد بولیاں معرضِ وجود میں آئیں جو ان ہی علاقوں میں رائج ہوئیں جہاں شورسینی اپ بھرنش بولی جاتی تھی۔ انھیں بولیوں میں سے ایک بولی 'کھڑی بولی' کہلائی جس کا ارتقا دہلی اور دہلی کے شمال مشرقی علاقے یعنی مغربی اتر پردیش (مغربی یو پی) میں ہوا جس نے بعد میں نکھر کر ایک نیا روپ اختیار کرلیا۔ کھڑی بولی کا یہی نیا اور نکھرا ہوا روپ ''ہندی'' اور ''ہندوی'' کہلایا جو ہماری آج کی ''اُردو'' کے قدیم نام ہیں۔ شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہونے والی دیگر بولیاں ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں رائج ہوئیں۔ جارج گریرسن نے اپنے "Linguistic Survey of India" [=لسانیاتی جائزہ ہند] میں ان پانچوں بولیوں کو ''مغربی ہندی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مغربی ہندی کسی مخصوص زبان کا نام نہیں، بلکہ ان ہی پانچوں بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ان کے علاوہ پنجابی اور گجراتی زبانوں کا تعلق بھی شورسینی اپ بھرنش ہے کہ یہ زبانیں بھی ۱۰۰۰سنہ عیسوی کے بعد شورسینی اپ بھرنش کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہیں۔

کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اسماء، ضمائر، صفات اور افعال بالعموم مصوتے a، یعنی الف [ا] پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً لڑکا، بیٹا (اسم)، میرا (ضمیر)، بڑا (صفت)، آیا، گیا (فعل)۔ ذیل کے دونوں جملے کھڑی بولی کے ہیں:

۱۔ ساون آیا۔

۲۔ میرا بڑا بیٹا دلّی گیا۔

چونکہ لسانیاتی اعتبار سے اُردو نے کھڑی بولی کا ڈھانچا اختیار کیا ہے، لہٰذا اس خصوصیت کی بنا پر یہ دونوں جملے اُردو کے جملے بھی کہے جائیں گے۔ اس کے علی الرغم شور سینی اپ بھرنش کی ایک دوسری بولی برج بھاشا میں، جس کا ارتقا دہلی کے جنوب مشرقی علاقے (متھرا، آگرہ، وغیرہ) میں ہوا، اسماء، ضمائر، صفات اور افعال بالعموم ایک دوسرے مصوتے o، یعنی [و] پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً لڑکو، بیٹو، میرو، بڑو، آیو، گیو، وغیرہ۔ کھڑی بولی کے مذکورہ دونوں جملے برج بھاشا میں یوں ادا کیے جائیں گے:

۱۔ ساون آیو۔

۲۔ میرو بڑو بیٹو دلّی گیو۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی مرحلے میں برج بھاشا کی ان شکلوں کو اختیار نہیں کیا۔ اُردو کی شناخت روزِ اول سے ہی اس کا کھڑی بولی پر مبنی ہونا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اُردو پر دیگر بولیوں کے اثرات پڑتے رہے ہیں، جیسے کہ قدیم (دکنی) اُردو پر ہریانوی (دہلی کے شمال مغربی علاقے کی بولی) کے اثرات مرتسم ہوئے لیکن اردو کا بنیادی ڈھانچا یا کینڈا جو کھڑی بولی پر مبنی ہے کبھی تبدیل نہیں ہوا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ کھڑی بولی کے نکھار کا زمانہ اُردو کا ابتدائی زمانہ ہے۔ یہیں سے کھڑی بولی، اُردو کی شکل میں اپنا نیا روپ اختیار کرتی ہے۔ کھڑی بولی کے اس روپ کو ہم اُردو کا ابتدائی روپ یا ''قدیم اُردو'' کہیں گے۔ ''ہندی''، ''ہندوی'' اور ''ریختہ'' سے بھی قدیم اُردو ہی مراد ہے۔ اُردو کا قدیم نام ''ہندی'' بعد کے دور تک یعنی بیسویں صدی کے اوائل تک رائج رہا (اگرچہ اس کا ''اُردو'' نام بھی استعمال ہوتا رہا)۔ اُردو کے مستند ادیبوں میں غالبؔ کے علاوہ اُردو کے کئی مستند ادیبوں اور شعرا نے بھی اُردو کے لیے ''ہندی'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

لہٰذا قدیم فارسی تذکروں، تاریخ کی کتابوں اور اس زمانے کی ادبی تصانیف میں مستعمل لفظ ''ہندی'' سے زمانۂ حال کی ہندی مراد لینا سراسر نادانی ہے۔ جس وقت ہماری آج کی اُردو کی ابتدائی یا قدیم شکل کے لیے ''ہندی''، ''ہندوی'' اور ''ریختہ'' جیسے نام رائج ہوئے تھے اس وقت زمانۂ حال کی ہندی یا دیوناگری ہندی کا کہیں وجود نہیں تھا۔ زمانۂ حال کی ہندی (جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے) درحقیقت انیسویں صدی کے اوائل کی اختراع ہے، جب کہ اُردو کے یہ نام بارھویں، تیرھویں صدی سے رائج ہیں۔ لہٰذا

موجودہ ہندی بولنے والوں کا یہ خیال یا عقیدہ کہ یہ ہندی قدیم زمانے سے موجود ہے، صحیح نہیں ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ اس کے ادب کا آغاز امیر خسرو (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) سے ہوتا ہے۔

اس امر کا ذکر یہاں بے جانہ ہوگا کہ لفظِ ''ہندی'' نہ تو ہندی الاصل ہے اور نہ سنسکرت نژاد۔ اسی طرح نہ یہ تدبھو اور نہ تتسم۔ یہ لفظ خالص فارسی ترکیب سے بنا ہے۔ نو وارد مسلمانوں نے جب یہاں سکونت اختیار کی تو انھوں نے اس ملک کو ''ہند'' کے نام سے یاد کیا۔ لفظ ''ہند'' کی تشکیل ''سندھ'' کی ''س'' کی ''ہ'' (ہائے ہوز) میں تبدیلی سے عمل میں آئی ہے، کیونکہ سنسکرت کے بعض الفاظ کی ''س'' فارسی میں ''ہ'' میں بدل جاتی ہے، مثلاً سنسکرت ''سپت'' فارسی 'ہفت' ('بمعنی 'سات') یا سنسکرت ''سپتاہ'' فارسی ''ہفتہ'' وغیرہ۔

سندھ اگرچہ ایک دریا کا بھی نام ہے، لیکن عہدِ قدیم میں سندھ سے شمالی ہندوستان مراد لیتے تھے جس میں پنجاب سے لے کر بنگال تک کا میدانی علاقہ شامل تھا۔ یہی لفظ ''سندھ'' فارسی میں ''ہند'' بن گیا جس کے آخر میں یائے نسبتی جوڑ کر ہندی (ہند + ی) بنالیا گیا۔ اس طرح لفظِ ''ہندی'' خالص مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ چنانچہ ''ہندی'' سے مراد ہند یعنی ہندوستان سے نسبت یا تعلق رکھنے والا یا ہند میں سکونت اختیار کرنے والا قرار پایا۔ یہی لفظ ہند میں بولی جانے والی بولیوں کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ جب مسلمانوں نے ۱۱۹۳ء میں دہلی پر اپنا سیاسی تسلط قائم کیا تو ان کا واسطہ یہاں کی کھڑی بولی سے پڑا جسے وہ دھیرے دھیرے اپناتے گئے۔ انھوں نے اسے ''ہندی'' اور کبھی کبھی ''ہندوی'' کہنا شروع کیا۔ بعد میں اسی زبان کو ''ریختہ'' بھی کہا گیا۔ ''ہندی''، ''ہندوی'' اور ''ریختہ''...... یہ اُردو زبان کے ہی مختلف نام ہیں جو قدیم زمانے میں پڑے۔ بلکہ جیسے جیسے یہ زبان ترقی کرتی گئی اور پھیلتی گئی، اس کے نام پڑتے گئے۔ علاقائی اعتبار سے بھی اس کے کئی نام پڑے، مثلاً ''دہلوی''، ''دکنی''، ''دکھنی''، ''گجری''، وغیرہ۔ یہ بات درست ہے کہ اس کا ''اُردو'' نام بہت بعد میں پڑا یعنی اٹھارہویں صدی کے ربعِ آخر میں، جب مصحفی نے یہ شعر کہا (اس سے پہلے اسے ''زبانِ اُردوئے معلیٰ یعنی 'شہرِ معلیٰ کی زبان' بھی کہا گیا):

خدا رکھے زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اس سے پہلے اُردو زبان کا وجود نہ تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ اُردو شمالی ہندوستان میں بارھویں صدی کے اواخر میں کھڑی بولی کی شکل میں معرضِ وجود میں آئی۔ نو وارد مسلمانوں اور ان کے بعد کی نسلوں کے لائق اعتنا سمجھنے سے یہ چمک اٹھی اور اس میں ادب بھی پیدا ہونے لگا۔

پھر جیسے جیسے یہ ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی اس کا ادبی سرمایہ وقیع تر ہوتا گیا۔ اس میں قطعی کسی شک وشبہ کی گنجایش نہیں کہ اُردو زبان زمانۂ حال کی ہندی سے قدیم تر زبان ہے کیونکہ اس کا ادبی استعمال آج سے سات سو سال قبل شروع ہو چکا تھا، جب کہ زمانۂ حال کی ہندی (کھڑی بولی ہندی/ ناگری ہندی/ اعلیٰ ہندی) کو پیدا ہوئے ابھی صرف دو سو سال ہوئے ہیں۔ اس لسانی حقیقت کا اعتراف بعض انگریزی اور ہندی مصنفین نے بھی کیا ہے جس کا ذکر اگلی شقوں میں آئے گا۔

(۳)

ہند آریائی لسانیات کے ممتاز عالم سنیتی کمار چیٹر جی اپنی تصنیف "Indo-Aryan and Hindi" [=ہند آریائی اور ہندی] میں کھڑی بولی کے اس نئے اور نکھرے ہوئے روپ کو جس کا ارتقا دہلی میں ۱۱۹۳ء میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد عمل میں آیا "modified Western Apabharamsa" [=ترقی یافتہ مغربی اپ بھرنش] کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اس دور میں شمالی ہند کے میدانی علاقوں کے عوام کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے موجود تھی:

> ''ترکوں اور ایرانیوں کے سکونت پذیر ہونے اور دہلی میں پہلی بار مسلم حکمرانی کے قیام کے بعد صرف ترقی یافتہ مغربی اپ بھرنش ہی شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں کے عوام کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے موجود تھی'' (ص ۱۹۶)۔

چیٹر جی ''ترقی یافتہ اپ بھرنش'' سے کھڑی بولی کے نکھرے ہوئے روپ کے علاوہ کوئی اور بولی یا زبان مراد نہیں لیتے، مثلاً شورسینی اپ بھرنش (مغربی اپ بھرنش) کی ایک دوسری بولی برج بھاشا کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ اسے سولھویں صدی میں اہمیت حاصل ہوئی، پھر بھی یہ مخصوص ادبی بولی رہی، عوامی بولی نہ بن سکی۔ چیٹر جی کھڑی بولی کے اسی نکھرے ہوئے روپ یا ''ترقی یافتہ مغربی اپ بھرنش'' کو "Hindusthani" [=ہندوستھانی] کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بارھویں...... تیرھویں صدی کے بعد کا زمانہ اس کی نشو ونما کے لیے نہایت سازگار تھا۔ چیٹر جی کی ''ہندوستھانی'' درحقیقت کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے جسے ہم ''اُردو'' کا قدیم روپ کہتے ہیں۔ زبان کی اسی شکل کو یعنی آج کی اُردو کے قدیم روپ کو ہی ''ہندی''، ''ہندوی'' اور ''ریختہ'' کہا گیا۔ چیٹر جی اپنی ''ہندوستھانی'' کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''یہ وقت کی ضرورت کے ماتحت معرضِ وجود میں آئی۔ خاص طور پر اس کی ضرورت مسلمان حکمرانوں کو تھی جو بدیسی تھے اور یہاں کی کوئی زبان نہیں سمجھتے تھے۔''

آگے چل کر اسی ''ہندوستھانی'' کے بارے میں چیٹر جی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''اسے کسی نے نئی زبان کی حیثیت سے شعوری اور باضابطہ طور پر ایجاد نہیں کیا: یہ تو مغربی ہندی کی a- الف[ا] بولیوں کے غیر محسوس ارتقا کا نتیجہ تھی، اور اسے اولین ہندوستانی مسلمانوں کی پنجابی زبان سے تقویت حاصل ہوئی تھی۔ یہ آگے چل کر دہلی کے بازاروں میں بولی جانے لگی کہ دہلی بانگڑو کے علاقے میں واقع ہے جہاں a۔الف[ا] بولی رائج ہے۔ یہ دہلی کے ترک حکمرانوں کے دربار یا لشکر میں ارتقا پذیر ہونے والی کوئی مصنوعی زبان نہ تھی۔ اس کا پہلا نام ''ہندی'' یا ''ہندوی'' (ہنذوی) تھا جس کا سیدھا سا مطلب ہے ہندوستان یا 'ہند کی (زبان)'، یا 'ہندوؤں کی (زبان)'۔ اس کا دوسرا نام ''زبانِ اُردو'' یعنی 'لشکر کی زبان' بہت بعد کی یعنی سترھویں صدی کے اواخر کی پیداوار ہے۔ اس زمانے میں دہلی کا مغل شہنشاہ دکن کی مسلم ریاستوں اور مراٹھوں کے خلاف پے در پے لشکر بھیج رہا تھا اور ان کی رہنمائی کر رہا تھا اور اسی کے ساتھ دہلی کی زبان دکن میں اپنا سکہ جما چکی تھی'' (ص ۱۹۷)۔

چیٹر جی کا ''زبانِ اُردو'' سے 'لشکر کی زبان' مراد لینا اگرچہ محلِ نظر ہے، لیکن وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ دہلی کی ہی زبان دکن پہنچتی ہے۔ دہلی کی اس زبان کو وہ ''ہندوستھانی'' کہتے ہیں اور اس کا پہلا نام ''ہندی'' یا ''ہندوی'' بتاتے ہیں اور اسی کا دوسرا نام ''زبانِ اُردو'' تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ چیٹر جی کے نزدیک ''ہندی'' یا ''ہندوی'' اُردو زبان کا ہی قدیم نام ہے اور یہی زبان (یعنی اُردو) ''ہندوستھانی'' ہے۔ چیٹر جی نے اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۰۶ پر اُردو کو شمالی ہندوستان کی ہندوستھانی کے مترادف مانا ہے اور اس کے لیے "Northern Hindusthani or Urdu" [= شمالی ہندوستھانی یا اُردو] کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دکن میں فروغ پانے والی ''ہندی'' (قدیم مفہوم میں) کو 'دکنی اُردو' کہا ہے جس کا آغاز ان کے خیال کے مطابق ''ہندوستھانی کی ہمسر'' کے طور پر ہوا اور جس میں ادبی روایت پندرھویں صدی سے شروع ہوئی:

''اس طرح دکنی اُردو یا ہندی ادبی روایت کا آغاز پندرھویں صدی میں ہندوستھانی کی ہمسر

کے طور پر ہوا اور یہ روایت پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہی، یہاں تک کہ شمال کی ہندوستھانی یا اُردو کے لیے راستہ ہموار کر کے اس کی روایت میں ضم ہوگئی'' (ص ۲۰۶)۔

اُردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں چیٹر جی کے یہ بیانات نہایت معقول ہیں اور تاریخی ولسانی حقائق پر مبنی ہیں، لیکن جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنی عالمانہ تصنیف "Indo-Aryan and Hindi" [= ہند آریائی اور ہندی] میں بڑے متضاد اور گمراہ کن نظریات پیش کیے ہیں اور اُردو کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہیں ہے۔ چیٹر جی کی مذکورہ کتاب کے یہ اقتباسات اگر چہ اب تک کے اُردو زبان کے ارتقا اور اس کے تاریخی تناظر کی نہایت صاف، واضح اور روشن تصویر پیش کرتے ہیں، لیکن حیرت ہوتی ہے جب وہ اسی کتاب میں اُردو کے مقابلے میں اچانک زمانۂ حال کی ہندی کو لا کھڑا کرتے ہیں اور ''ہندوستھانی'' کی اصطلاح کو، جسے وہ اُردو کا مترادف مانتے آئے تھے اچانک ''ناگری ہندی'' کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں اور اُردو کو ''ہندوستھانی'' کی محض ایک ''شکل'' قرار دیتے ہیں۔ وہ دکن میں ارتقا پانے والی اُردو کے پورے ادبی سرمایے پر خطِ تنسیخ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ سترھویں صدی کے خاتمے سے قبل ادبی زبان کی حیثیت سے اُردو کا کوئی وجود نہیں تھا۔ چیٹر جی کا یہ بیان علمی دیانت داری کے منافی ہے جسے اُردو زبان وادب کا کوئی بھی مورخ یا محقق تسلیم نہیں کر سکتا:

> ''ہندوستھانی کی اس اُردو شکل کا سترھویں صدی کے خاتمے سے قبل ادبی زبان کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں تھا'' (ص ۱۶۲)۔

یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ چیٹر جی نے اپنی اس کتاب میں شمال میں امیر خسرو (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) کی ادبی کاوشوں کا اور دکن میں اُردو کے ادبی سرمایے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ انھوں نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ''ہندوستھانی'' کو ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں دکن نے پہل کی اور شمالی ہندوستان کے لیے ایک نمونہ قائم کیا۔ چیٹر جی ''ہندوستھانی'' کا قدیم نام ''ہندی'' اور ''ہندوی'' پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں اور اس کا دوسرا نام ''زبانِ اُردو'' بھی مان چکے ہیں۔ امیر خسرو کے عہد کی زبان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پھر یہ بات دہرائی کہ اس زمانے میں دہلی کے آس پاس جس زبان کی نشوونما ہو رہی تھی اس کا اصلی نام ''ہندی'' یا ''ہندوی'' تھا جسے وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے لیے کبھی کبھی ''دہلوی'' بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ چیٹر جی نے اسی زبان کے لیے کہیں ''دہلوی اُردو'' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ چیٹر جی نے میراں جی، شاہ برہان الدین جانم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ امین الدین اعلیٰ، محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی اور میاں خوب

محمد چشتی جیسے دکنی مصنفین کی شعری ونثری تصانیف کے حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچادی ہے کہ دکن میں ''اُردو'' نے چودھویں، پندرھویں، سولھویں اور سترھویں صدی کے دوران ادبی زبان کی حیثیت سے نمایاں ترقی کی جس سے وہاں ایک "distinctive literary standard"[= ممتاز ادبی معیار] قائم ہوگیا۔ اس کے باوصف چیٹر جی کا یہ کہنا کہ سترھویں صدی کے خاتمے سے قبل ادبی زبان کی حیثیت سے ''اُردو'' کا کوئی وجود نہیں تھا، نہایت حیران کن ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں وَلی کی دہلی میں آمد اور ان کی اُردو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے چیٹر جی لکھتے ہیں کہ ''اس طرح ادبی زبان کی حیثیت سے ہندوستانی کی اُردو شکل وجود میں آئی''، لیکن چیٹر جی یہ بھول گئے کہ شمالی ہند میں اُردو شاعری کا آغاز ''ریختہ'' کی شکل میں وَلی کی دہلی میں آمد سے بہت پہلے امیر خسرو کے ہاتھوں ہو چکا تھا، اور اسی ریختہ کی روایت میں ۱۶۲۵ء سے قبل محمد افضل افضلؔ (م ۱۶۲۵ء) اپنی طویل مثنوی ''بکٹ کہانی'' (بارہ ماسہ) تخلیق کر چکے تھے۔ نیز روشن علی نے ۱۶۸۸ء میں ''عاشور نامہ'' کے نام سے واقعاتِ کربلا سے متعلق ایک طویل نظم لکھی تھی۔

چیٹر جی نے مزید حیرت میں ڈال دینے والی ایک اور بات کہی ہے۔ وہ اُردو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ صاف طور پر مسلمانی زبان ہے اور اپنے رجحان اور رویّے کے اعتبار سے بڑی حد تک غیر ہندوستانی ہے'' (ص ۲۲۴)۔

دکنی اُردو کے ادبی سرمایے کے بارے میں چیٹر جی یہ کہہ چکے ہیں کہ یہ ''ہندی ادبی روایت'' سے مملو ہے۔ چیٹر جی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دکن کے شعرا ''ہندو اسلوب'' میں، ''ہندی بحریں'' استعمال کرتے ہوئے، ''ہندو روایت'' کے مطابق شاعری کر رہے تھے، تو کیا یہ تمام چیزیں "extra-Indian" [= غیر ہندوستانی] ہیں؟ چیٹر جی کے الفاظ یہ ہیں:

> ''سولھویں صدی کے خاتمے سے پہلے ہی، شمالی ہند کے مسلمان دکن میں مذہبی شاعری کر رہے تھے جو ہندو اسلوب میں ہوتی تھی، جس میں دیسی ہندی بحریں استعمال کی جاتی تھیں، اور جس کے ذخیرۂ الفاظ کا معتدبہ حصہ سنسکرت اور پراکرت سے لیے گئے ہندوستانی الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں رسم الخط کے علاوہ سب کچھ ہندو روایت کے عین مطابق ہوتا تھا'' (ص ۲۰۵)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دکن کی اُردو شاعری نیز شمالی ہند کی بھی اُردو شاعری جس میں افضل کا بارہ ماسہ (''بکٹ کہانی'') بھی شامل ہے، ہندو روایات ورجحانات سے پُر ہے۔ اگر زمانۂ حال کے تناظر میں دیکھا جائے تب بھی اُردو میں سیکولر اقدار کی کمی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو ادب پر دوسرے مذاہب کے اثرات کے ساتھ ساتھ اسلام کے اثرات بھی پڑے ہیں، لیکن ہندو مذہب، ہندو فلسفے اور ہندو روایات واساطیر کا بھی اس پر نہایت گہرا اثر ہے۔ اس کے باوصف چیٹر جی کا یہ کہنا کہ اُردو ''غیر ہندوستانی'' ہے اصابتِ رائے اور انصاف پسندی کے تقاضوں کے منافی ہے۔ اسے چیٹر جی کی تنگ نظری اور تنگ خیالی پر ہی محمول کیا جانا چاہیے۔

چیٹر جی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُردو کو مسلمان اپنے ساتھ باہر سے نہیں لائے تھے، بلکہ یہ یہیں کی ایک بولی کی کوکھ سے پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی اور یہیں پروان چڑھی۔ اس کا ادبی ارتقا بھی اسی سرزمین پر ہوا۔ اس پر ''ہندو روایت'' کی گہری چھاپ پڑی۔ پھر یہ کیسے ''غیر ہندوستانی'' بن گئی؟

اُردو کو ''مسلمانی'' یا ''غیر ہندوستانی'' زبان قرار دینے کی چیٹر جی کی 'منطق' یہ ہے کہ ہندوؤں کو اُردو سے دستبردار کر کے ان کی ایک الگ زبان قائم کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے بالکل یہی کیا کہ ''ہندوستھانی'' کو عام اور مشترک زبان بتا کر اس کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا نام انھوں نے ''ہندو ہندوستھانی'' رکھا اور دوسری کا ''مسلمان ہندوستھانی''۔ ہندو ہندوستھانی کو انھوں نے ''ناگری ہندی'' یا ''سنسکرتی ناگری ہندی'' کے نام سے موسوم کیا اور مسلمان ہندوستھانی کو 'اُردو' کا نام دیا۔ ''ہندوستھانی'' کی یہ تقسیم چیٹر جی سترھویں صدی کے بعد سے شروع کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ''سترھویں صدی میں ہندو ہندی (یا ہندوستھانی) یا مسلمان ہندوستھانی یا اُردو بمقابلہ ہندی نام کی کوئی چیز نہیں تھی'':

> ''لہٰذا دورِ جدید میں ہندوستھانی نثری ذریعۂ تصنیف کی حیثیت سے اپنی جڑواں شکلوں میں، یعنی اعلیٰ ہندی (یا ناگری ہندی) اور اُردو کی شکل میں ۱۸۰۰ء کے قریب وجود میں آئی۔ سترھویں صدی میں ہندو ہندی (یا ہندوستھانی) یا مسلمان ہندوستھانی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، اور نہ ہی اُردو بمقابلہ ہندی تھی۔ دکن کے مسلمان مصنفین نے اس کی پرداخت کی، لیکن ذخیرۂ الفاظ جو نزاع کی بنیادی وجہ ہے، اب بھی بڑی حد تک ہندوستانی یا ہندو ہی تھا۔ ''ہندی' یا ''ہندوی' یا ''دہلوی' یا جسے بعد کے نام سے پکاریں تو ''ہندوستانی'' (''ہندوستھانی'') کہہ سکتے ہیں، ایک مشترک زبان کی

حیثیت سے رائج تھی، اور یہی زبان ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ میراث تھی'' (ص ۲۱۱ و ۲۱۲)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو بلا لحاظِ مذہب وملت مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے شمالی ہندوستان میں بیسویں صدی کے وسط تک رائج تھی اور اِس ملک کے سچے محبِ وطن ہندو بھی اُردو کو اپنی زبان کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ الوک رائے نے جو منشی پریم چند کے پوتے اور امرت رائے کے بیٹے ہیں اپنی حالیہ تصنیف "Hindi Nationalism" [= ہندی قومیت] میں صفحہ ۱۱۳ پر پنڈت جواہر لال نہرو سے متعلق ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو کو اپنی اور اپنے اجداد کی زبان ''اُردو'' بتانے میں قطعی کوئی تامل نہیں تھا۔ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب دستور ساز اسمبلی میں زبان کی بحث زوروں پر تھی اور یہ طے کیا جانا تھا کہ دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈول میں کن زبانوں کا اندراج کیا جائے۔ پنڈت نہرو نے ڈرافٹنگ کمیٹی کے ایک رکن ایم۔ ستیہ نارائن سے کہا کہ وہ زبانوں کی ایک فہرست تیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کی بارہ بڑی زبانوں کی فہرست تیار کر کے پنڈت نہرو کو پیش کر دی۔ نہرو جی نے اس فہرست کو کمیٹی میں پیش کرنے سے پہلے اس میں ایک تیرھویں زبان 'اُردو' کا اضافہ کر دیا۔ جب ان کے ایک ہندی دوست نے ان سے پوچھا کہ یہ اُردو کس کی زبان ہے، تو پنڈت نہرو غصّے میں آ گئے اور انھوں نے کہا:

''یہ میری اور میرے باپ داداؤں کی زبان ہے!''

اس پر ان کے ہندی دوست نے فوراً جواب دیا:

''برہمن ہوتے ہوئے اُردو کو اپنی زبان کہتے ہو، شرم نہیں آتی''۔

نہرو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بالآخر دستور ساز اسمبلی میں بشمولِ اُردو آٹھواں شیڈول منظور کر لیا گیا۔

اس سے قبل سر تیج بہادر سپرو نے ۱۲۔ فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں ''یومِ چکبست'' کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اُردو کے بارے میں یہ الفاظ کہے تھے:

''مجھے اُردو زبان سے محبت ہے۔ میں اس کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور اپنے ہندوستان کی زبان! مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ اُردو میری مادری اور قومی زبان ہے''۔

انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ......

''میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوسکتا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، بلکہ جتنا دعویٰ مسلمانوں کو اُردو پر ہوسکتا ہے اتنا ہی ہندوؤں کو بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اُردو دراصل ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی اور اس اتحاد کی واحد یادگار ہے'' (منقول از عرضِ حال، ''یادِ چکبست'')۔

ماضیِ قریب کے ایک اور ہندو محبِ وطن پنڈت آنند نرائن ملا نے تو ایک بھرے اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ......

''میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں، مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا''۔

آخر یہ سب وطن پرست ہندو ہی تھے جو اُردو کو اپنی زبان بتاتے تھے، لیکن چیٹر جی اُردو کو مشترکہ زبان بتانے سے گریز کرتے ہیں اور اسے ''مسلمانی زبان'' بتاتے ہیں۔

چیٹر جی اُردو کو ''مسلمانی زبان'' کہنے کے علاوہ ''مسلمان ہندوستھانی'' بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ فارسی وعربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور فارسی عربی الفاظ کے استعمال کو ترجیح دیتی ہے۔ ان ہی دونوں باتوں کی وجہ سے یہ ''ہندو ہندوستھانی'' یا ''ناگری ہندی'' سے مختلف ہو جاتی ہے۔ چیٹر جی کے نزدیک ہندی اُردو نزاع کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ان کے خیال میں یہ ''بدیسی عناصر'' ہیں جن کی وجہ سے ''قوم پرستانہ یا وطن پرستانہ مزاج رکھنے والے اور سنسکرت سے محبت کرنے والے ہندو سوچ سمجھ کر ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی سنسکرتی ہندی کی طرف مائل ہونے لگے۔'' (ص ۲۱۴) ہندوؤں کی احیاء پرست تنظیموں اور گروہوں، مثلاً آریہ سماج، برہمو سماج، شدھی ہندو سنگٹھن اور ہندو مشن وغیرہ نے اس رجحان کو تقویت دی۔ ادھر ناگری پرچارنی سبھا، جس کا قیام ۱۸۹۰ء میں بنارس میں عمل میں آیا تھا، ناگری ہندی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہی۔

ان تنظیموں اور تحریکوں کے در پردہ جو ذہنیت کام کر رہی تھی اس سے سنیتی کمار چیٹر جی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انھوں نے اسی متعصبانہ ذہنیت کے ماتحت ایک عام فہم، مانوس اور چلن میں آئے ہوئے لفظ ''ہندوستانی'' کا 'شدھی کرن' کر کے اسے ''ہندوستھانی'' بنالیا جس میں نہ صرف ثقالت اور غرابت پائی جاتی ہے بلکہ مصنوعی پن بھی ہے۔ چیٹر جی 'ہندوستانی' (اور اسی کے ساتھ لفظِ 'ہندوستان') کو بدیسی لفظ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ''نہایت بوجھل ترکیب'' ہے، پھر کہتے ہیں کہ یہ خالص فارسی لفظ ہے اور عام طور پر اس کا مطلب ہوتا ہے ''ہندی کی مسلمان شکل یعنی اُردو'' چیٹر جی نے لفظِ ''ہندوستان'' میں شامل فارسی

''ستان'' (بمعنیٰ 'جگہ') کی ''ت'' کو ''تھ'' سے بدل کر اسے سنسکرت ''ستھان'' کی شکل دے دی جس سے یہ لفظ ''ہندوستھانی'' بن گیا۔ اس گھڑے ہوئے، بے تکے اور بھونڈے لفظ کو انھوں نے ''ہندوستانی'' کی ہندیائی گئی شکل قرار دیا۔ ایک جگہ چیٹر جی نے خود ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''ہندوؤں نے اسے فوراً ہندیا کر ہندوستھانی کر دیا''۔ ہندوستھانی کی وہ دو شکلیں بتاتے ہیں، ایک ''ہندو ہندی (یا ناگری ہندی)'' اور دوسری ''مسلمان اُردو۔''

چیٹر جی نے لفظِ ''ہندوستھانی'' گھڑ تو لیا لیکن شاید انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس میں لاحقے کے طور پر اب بھی فارسی کی 'یائے نسبتی' موجود ہے، یعنی ہندوستھان + ی = ہندوستھانی۔ چیٹر جی عوام الناس کو یہ مشورہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندیائی گئی شکلوں ''ہندوستھان'' اور ''ہندوستھانی'' کو اختیار کر لیں، خواہ ان کا استعمال غیر ملکی نژاد شکلوں 'ہندوستان' اور 'ہندوستانی' کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو'' (ص ۱۴۰)۔ ہم سب یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ چیٹر جی کے اس مشورے پر کتنا عمل ہوا اور آج کس لفظ کو قبول عام حاصل ہے اور کون سا لفظ تاریخ کے دھندلکے میں گم ہو کر رہ گیا۔ (چیٹر جی نے یہ مشورہ آج سے تقریباً ۶۵ سال قبل دیا تھا۔)

(۴)

تاریخ کے ایک موڑ پر شمالی ہندوستان میں احیا پرست طاقتیں کافی سرگرم ہو جاتی ہیں۔ اس ذہنیت کے شکار لوگ لسانی عصبیت کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ بنیاد پر زبان کی تقسیم یہیں سے شروع ہوتی ہے اور طریقۂ کار یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اس زبان کو جو روزِ اول سے ہی فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، ناگری حروف (یا دیوناگری رسم الخط) کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک الگ زبان ہے۔ اس نئی اور غیر فطری زبان کا نام ''اعلیٰ ہندی'' یا ''ناگری ہندی'' رکھا جاتا ہے۔ چونکہ اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے، لہٰذا جب اس نوزائیدہ زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا تو اس کا قواعدی ڈھانچا وہی رہا جو اُردو کا تھا۔ اسی بنیاد پر اسے ''کھڑی بولی ہندی'' بھی کہا گیا تاکہ اسے اودھی، برج بھاشا، راجستھانی اور دوسری بولیوں سے ممیز کیا جا سکے۔ دیوناگری رسم الخط اس سے پہلے انھیں بولیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اُردو کو دیوناگری رسم الخط کا جامہ پہنانے کے علاوہ اس میں سے عربی فارسی کے الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رکھ دیے گئے۔ اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے سے جو ایک علیحدہ زبان بنائی گئی اسے دھیرے دھیرے

ہندوؤں کی اکثریت نے اپنالیا۔ اُردو اپنی جگہ پر اسی طرح سے قائم رہی، لیکن اس کے بولنے والوں اور اسے اپنی زبان کہنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی گئی جس سے اِسی سرزمینِ ہند میں جو اس کی مرزبوم تھی، یہ اقلیتی زبان بن کر رہ گئی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے اس نئی زبان کو ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جانے لگا۔ چیٹر جی کے مطابق ''اس خالص کھڑی بولی ہندوستھانی کے پہلے ہندو مصنف منشی سدا سکھ تھے جنھوں نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں 'بھگوت گیتا پُران'' کا ترجمہ 'سُکھ ساگر' کے نام سے نثر میں کیا اور اس کے لیے انھوں نے دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جو برج بھاکھا اور اودھی کے لیے پہلے سے مستعمل تھا، اور علمی الفاظ کے لیے سنسکرت کی جانب رجوع کیا'' (ص ۲۱۱)۔ اس کے بعد ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جہاں للو جی لال اور سدل مشر نے ''اعلیٰ ہندی'' میں نثری تصانیف لکھیں۔ اور یہ سب کچھ انگریزوں کی سرپرستی میں اور انھیں کی ہدایت پر ہوا۔ ایک انگریز مصنف فرینک ای۔ کئی (Frank E. Keay) نے اپنی کتاب "A History of Hindi Literature" [= ہندی ادب کی تاریخ] میں اس حقیقتِ حال کو یوں بیان کیا ہے:

''جدید 'اعلیٰ ہندی' اُردو میں سے فارسی اور عربی الفاظ کو خارج کر کے اور ان کی جگہ پر سنسکرت یا ہندی کے خالص ہندوستانی نژاد الفاظ رکھ کر بنائی گئی'' (ص ۴)۔

اسی کتاب میں وہ مزید لکھتا ہے:

''للو جی لال ایک برہمن تھے جن کے خاندان کا تعلق اصلاً گجرات سے تھا، لیکن جو عرصۂ دراز سے شمالی ہندوستان میں سکونت اختیار کیے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہدایت پر انھوں نے سدل مشر کے ساتھ مل کر جدید ''اعلیٰ ہندی'' کی تخلیق کی۔ شمالی ہندوستان میں، جیسا کہ ہم نے دیکھا، بہت سی بولیاں بولی جاتی تھیں لیکن جو لوگ فارسی سے واقف نہیں تھے وہ شائستہ ذریعۂ اظہار کے طور پر اُردو کا استعمال کرتے تھے۔ اُردو کا ذخیرۂ الفاظ بڑی حد تک فارسی اور عربی زبانوں سے مستعار تھا جن کا خصوصی تعلق اسلام سے تھا۔ ہندی بولنے والوں کے لیے ایک ایسی ادبی زبان کی شدید ضرورت تھی جو ہندوؤں کی زیادہ مطلب برآری کرا سکے۔ اس کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ اُردو کو لے کر اس میں سے فارسی یا عربی الاصل الفاظ نکال دیے گئے، اور ان کی جگہ پر سنسکرت یا ہندی الاصل الفاظ رکھ دیے گئے'' (ص ۸۳)۔

ہندوؤں میں اس نئی زبان کے استعمال کے بارے میں کئی (Keay) لکھتا ہے:

''للوجی لال کی ہندی درحقیقت ایک نئی ادبی زبان تھی۔ یہ 'اعلیٰ ہندی'، یا جسے 'معیاری ہندی' بھی کہتے ہیں، کافی مقبول ہوئی۔ ادبی زبان کی حیثیت سے اسے شمالی ہندوستان کے لاکھوں لوگوں نے اپنایا۔ شعری تصانیف اب بھی برج بھاشا، یا اودھی، یا دیگر قدیم بولیوں میں لکھی جاتی رہیں، کیونکہ اعلیٰ ہندی کو شاعری کے لیے زیادہ استعمال نہیں کیا گیا۔ لیکن چونکہ اس سے پہلے ہندی میں نثری تصانیف کا بڑی حد تک فقدان تھا، اس لیے اس کے بعد سے نثری ادب کی وسیع پیمانے پر تخلیق عمل میں آئی'' (ص ۸۳و۸۴)۔

جارج اے۔ گریرسن (George A. Grierson) نے بھی اپنے "Linguistic Survey of India" [= لسانیاتی جائزہ ہند] کی نویں جلد کے حصۂ اول میں یہی بات کہی ہے۔ لیکن اس نے بالکل صاف لفظوں میں یہ حقیقت بیان کردی ہے کہ للوجی لال کو ''پریم ساگر'' لکھنے کے لیے گلکرسٹ نے ہی جوش دلایا تھا۔ گریرسن کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''پریم ساگر'' کی زبان اُردو سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فارسی الفاظ کی جگہ للوجی لال نے ہندآریائی الفاظ رکھ دیے ہیں۔ گریرسن لکھتا ہے:

''لہٰذا یہ ہندی، یا جسے کبھی کبھی 'اعلیٰ ہندی' بھی کہتے ہیں، بالائی ہندوستان کے ان ہندوؤں کی نثری ادبی زبان ہے جو اُردو کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے اور اس کا رواج گزشتہ صدی کے آغاز سے انگریزوں کے زیرِ اثر شروع ہوا۔ اُس وقت تک جب بھی کوئی ہندو نثر لکھتا تھا اور وہ اُردو کا استعمال نہیں کرتا تھا، تو اپنی بولی، اودھی، بندیلی، برج بھاکھا وغیرہ میں لکھتا تھا۔ للولال نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے جوش دلانے پر معروف کتاب 'پریم ساگر' لکھ کر سب کچھ بدل ڈالا۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے کہ جہاں تک کہ نثری اجزا کا تعلق ہے یہ عملاً اُردو میں لکھی گئی ہے اور اس زبان کے لیے مصنف جہاں فارسی الفاظ استعمال کرتا، وہاں اس نے ہندآریائی الفاظ رکھ دیے'' (ص ۴۶)۔

بعض ہندی دوست یہ سمجھتے ہیں کہ گریرسن اور دوسرے انگریز عالموں نے جان بوجھ کر یہ 'غلط فہمی' پھیلائی ہے کہ اُردو میں سے عربی وفارسی الفاظ کو نکال کر اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے الفاظ رکھ کر 'جدید ہندی'

کی تعبیر کی گئی ہے، لیکن ایسی ''موجودہ مصنوعی ہندی'' کے بارے میں انصاف پسند ہندو دانشوروں کی بھی وہی رائے ہے جو گریرسن اور دوسرے انگریز عالموں کی ہے۔ ہندی کے ایک ممتاز عالم اور دانشور رایودھیا پرساد کھتری کا بھی یہی خیال ہے جس کا خلاصہ شتی کنٹھ مشر نے اپنی کتاب ''کھڑی بولی کا آندولن'' میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''برج بھاشا میں تمام ملکی وغیر ملکی الفاظ کے ملنے سے اُردو کا ارتقا عمل میں آیا۔ اور اُردو میں سے عربی فارسی کو جان بوجھ کر چھانٹنے نیز ان کی جگہ پر سنسکرت کے ٹھیٹھ الفاظ رکھنے سے موجودہ مصنوعی ہندی کا ارتقا ہوا ہے'' (ص ۱۶۷)۔

کھتری کی یہ رائے کہ برج بھاشا میں دیگر زبانوں کے الفاظ کے ملنے سے اُردو بنی، اگرچہ صحیح نہیں، تاہم جدید ہندی کے ارتقا کے بارے میں ان کا نظریہ حقیقت پسندانہ ہے۔

ایک اور ہندی مصنف چندر دھر شرما گلیری نے بھی اپنی کتاب ''پرانی ہندی'' میں واضح الفاظ میں یہ بات دہرائی ہے کہ زمانۂ حال کی ہندی اُردو میں سے عربی اور فارسی الفاظ کو بے دخل کر کے بنائی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہندوؤں کی تخلیق کردہ پرانی شاعری جو کچھ بھی ملتی ہے وہ برج بھاشا یا پوربی، ویس واڑی، اودھی، راجستھانی اور گجراتی وغیرہ ہی میں ملتی ہے، یعنی 'پڑی بولی' میں پائی جاتی ہے۔ 'کھڑی بولی' یا پکی بولی یا ریختہ یا موجودہ ہندی کی موجودہ نثر و نظم کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں مستعمل فارسی عربی کے خالص یا تحریف شدہ الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ سنسکرت یا ہندی کے تتسم اور تدبھو الفاظ رکھنے سے ہندی بنالی گئی'' (ص ۱۰۷)۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ اُردو میں کھڑی بولی کو بنیاد بنا کر نثر لکھنے کی روایت کافی قدیم ہے اور یہ سلسلہ دکن سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند میں بھی، کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے کافی پہلے سے، اُردو میں نثری نمونے ملنا شروع ہو جاتے ہیں اور ''کربل کتھا'' (فضلِ علی فضلی)، ''قصۂ مہر افروز و دلبر'' (عیسوی خاں بہادر)، ''نوطرزِ مرصع'' (میر محمد حسین عطا خاں تحسین)، ''عجائب القصص'' (شاہ عالم ثانی)، ''قصۂ ملک محمد وگیتی افروز'' (مہر چند کھتری)، اور ''سلکِ گہر'' (انشا اللہ خاں انشا) اُردو کی وہ نثری تصانیف ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل لکھی جا چکی تھیں۔ زمانۂ حال کی ہندی میں کھڑی بولی

کے نثری نمونے انیسویں صدی سے پہلے ناپید ہیں۔ اس زبان میں یہ سلسلہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہاں کی لکھی ہوئی للوجی لال کی ''پریم ساگر'' زمانۂ حال کی کھڑی بولی ہندی کی پہلی کتاب قرار پاتی ہے۔ اس بات کی تائید معروف ہندی اسکالر اور ماہرِ لسانیات بال گووند مشر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جو ای۔ انا ملائی کی مرتبہ کتاب "Language Movements in India" [=ہندوستان کی لسانی تحریکیں] میں شامل ان کے مضمون "Language Movements in Hindi Region" [=ہندی علاقے کی لسانی تحریکیں] سے منقول ہے:

''نثر کے لیے کھڑی بولی ہندی کا استعمال سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل وعقد کی سرپرستی میں انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوا'' (ص ۲۷)۔

انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوؤں میں یہ روایت چلی آرہی تھی کہ شاعری کے لیے برج بھاشا کا استعمال کیا جاتا تھا اور نثر کھڑی بولی ہندی میں لکھی جاتی تھی۔ اس وقت برج بھاشا کا طوطی بول رہا تھا۔ اور یہ ہندوؤں میں راجستھان سے لے کر بہار تک ادبی ذریعۂ اظہار کی حیثیت سے بے حد مقبول تھی اور اس میں نثری نمونے محض خال خال پائے جاتے ہیں۔ بال گووند مشرا اپنے اسی مضمون میں کہتے ہیں کہ یہ ادبی صورتِ حال ''بے قاعدہ اور انتہائی مصنوعی'' (anomolous and highly artificial) تھی۔ چنانچہ جلد ہی ایک ''تحریک'' شروع کی گئی جس کے نتیجے میں شاعری کی زبان کی حیثیت سے برج بھاشا کو ہٹا کر ''کھڑی بولی پر مبنی زبان کو رواج دیا گیا'' جو تمام ادبی اصناف کے لیے یکساں استعمال کی جاسکے۔

اُردو نثر کا ارتقا چیٹر جی ۱۸۰۰ء کے آس پاس بتاتے ہیں اور اسے ہندی نثر کے ارتقا کے ساتھ جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اعلیٰ ہندی یا معیاری (کھڑی بولی) ہندی کا نثر کی زبان کی حیثیت سے ارتقا تقریباً اُردو کے ساتھ ہی ہوا، یعنی کلکتہ میں انگریزوں کے زیرِ سرپرستی انیسویں صدی کے آغاز سے'' (ص ۱۶۷)۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''برج بھاکھا اور اودھی جیسی خالص بولیوں سے قطعِ نظر، معیاری ہندی یا اعلیٰ ہندی کو ادب کے لیے استعمال کرنے کی کوشش اُردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے'' جس کا سلسلہ وہ پندرھویں صدی تک لے جاتے ہیں اور مثال میں کبیر کی شاعری کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''کبیر کی شاعری کی زبان بحیثیتِ مجموعی ہندی ہے، نہ کہ اُردو۔'' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''زبان کا نام ہندی (جسے پہلے 'ہندوی' کہتے تھے) ہندوستانی اور اُردو ناموں کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے'' (ص ۱۶۷)۔ کبیر کی شاعری کی زبان کو اعلیٰ ہندی یا معیاری (کھڑی بولی) ہندی بتانا محلِ نظر ہے۔ کبیر کا تعلق اصلاً بھوجپوری کے علاقے سے تھا، لیکن وہ ادھر ادھر

گھومتے رہتے تھے، لہٰذا ان کی زبان پر مختلف بولیوں کے اثرات پڑے اور ان کی زبان ''سدھکڑی بھاشا'' کہلائی۔ یہ کھڑی بولی کی بنیاد پر معیاری بنائی گئی اعلیٰ ہندی یا اُردو کے بالمقابل قائم کی گئی 'ہندی' ہرگز نہیں۔ چیٹر جی نے کھڑی بولی ہندی کی ادبی تاریخ کو ماضی میں دور تک لے جانے کے لیے خواہ مخواہ کبیر کا نام پیش کیا۔ چیٹر جی جو 'ہندی' یا 'ہندوی' کو اُردو کا قدیم نام تسلیم کر چکے تھے، وہی اب ان ناموں کو جدید ہندی کے قدیم ناموں کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ''اُردو'' نام بعد میں پڑا اس لیے اُردو کو بعد کی زبان بتاتے ہیں جب کہ ہندی کے ممتاز عالم دھیریندرورما کا خیال ہے کہ ''تاریخی اعتبار سے کھڑی بولی اُردو کا استعمال ادبی کھڑی بولی ہندی کے استعمال سے زیادہ قدیم ہے''۔ ('ہندی بھاشا کا اتہاس'، ص ۶۰)۔ زبانوں کی تاریخ میں یہ اکثر ہوتا آیا ہے کہ زبان پہلے تشکیل پاتی ہے اور اس کا نام بعد میں پڑتا ہے یا رکھا جاتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال ہمارے سامنے سنسکرت زبان کی ہے۔ سنسکرت زبان پورے شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق پورے ایک ہزار سال تک (۱۵۰۰ تا ۵۰۰ قبل مسیح) پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہی۔ اس دوران میں چار وید تخلیق کیے گئے اور پانِنی نے اس زبان کی نہایت منضبط قواعد تخلیق کی جو ''اشٹا دھیائی'' کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن اس طویل عرصے کے دوران اس زبان کا کوئی نام نہیں پڑا۔ پانِنی نے اس کے لیے صرف ''بھاشا'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا نام ''سنسکرت'' بہت بعد میں جا کر پڑا۔ لفظ ''سنسکرت'' پہلے زبان کے معنی میں مستعمل نہیں تھا، بلکہ اس کے لغوی معنیٰ تھے، 'شستہ وشائستہ'۔ بعد میں یہی لفظ اسم لسان کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ پالی زبان کا نام بھی بعد میں پڑا۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور بعض دوسری بولیوں کے نام بھی بعد میں پڑے۔ اُردو کا بھی حال یہی ہے کہ اسے پہلے دوسرے کئی ناموں سے پکارا گیا پھر بعد میں جا کر اس کا موجودہ نام ''اُردو'' پڑا لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ جب سے اس کا نام اُردو پڑا تب سے اس کی پیدائش عمل میں آئی۔ اُردو کے مخالفین اُردو کی تاریخ کو کم کرنے کے لیے ہمیشہ یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ اس غلط بیانی اور کج فہمی کی ابتدا سنیتی کمار چیٹر جی سے ہوتی ہے جنھوں نے یہ کہا تھا کہ ''اُردو کا سترھویں صدی کے خاتمے سے قبل ادبی زبان کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں تھا'' (ص ۱۶۲)۔

(۵)

امرت رائے نے چیٹر جی سے ہی اشارہ پا کر اپنی کتاب "A House Divided" [= گھر جو تقسیم ہو گیا] میں اُردو کو وَلی کے بعد کی اختراع بتایا ہے اور اسے ''لسانی پھوٹ'' اور علیحدگی پسندی'' کا نتیجہ قرار

دیا ہے۔ امرت رائے ''ہندی'' اور ''ہندوی'' کو اُردو کے قدیم نام تسلیم نہیں کرتے اور اُردو کے تمام تر قدیم ادبی سرمایے کو (جس میں دکنی ادب بھی شامل ہے) زمانۂ حال کی ہندی کی تاریخ کا جزوِ لاینفک قرار دیتے ہیں۔ اس طرح چیٹر جی کی طرح وہ بھی اُردو پر ہندی کی لسانی وادبی قدامت اور فوقیت کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ امرت رائے کے خیال میں اُردو کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے اس کا نام ''اُردو'' پڑتا ہے اور جب سے اس میں ہندی عناصر کی جگہ عربی فارسی عناصر شامل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں تقریباً ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

امرت رائے نے اُردو پر ''علیحدگی پسندی'' کا الزام تو عائد کیا ہی ہے، حد تو یہ ہے کہ وہ اُردو کو ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈول میں جگہ دیے جانے پر بھی معترض ہیں۔ ان کے خیال میں ''اُردو کو (اس کے رسم الخط کے ساتھ) آئین میں ہندی کے علاوہ ایک علیحدہ قومی زبان کی حیثیت دینے میں عجلت اور ناسمجھی سے کام لیا گیا، کیونکہ یہ فیصلہ مسئلے کی پیچیدہ نوعیت پر اچھی طرح غور کیے بغیر کیا گیا تھا اور مبہم اور سہل انگاری کے تصور پر مبنی تھا۔'' (۲۸۷)

اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ امرت رائے نے یہ خیال گیان چند جین کے اس قول سے لیا ہے:

> ''ہندوستان کے آئین میں اُردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے، لسانی حقیقت نہیں۔''

جین صاحب کا یہ قول ان کے ایک مضمون ''اُردو، ہندی یا ہندوستانی؟'' مطبوعہ ''ہندوستانی زبان'' (سال ۵، نمبر ۱، اکتوبر ۱۹۷۳ء) میں شامل ہے۔ انھوں نے یہ بات کھل کر نہیں کہی ہے کہ اُردو کو ہندوستان کے آئین میں جگہ نہیں ملنی چاہیے تھی، لیکن اقتباسِ بالا کے بین السطور سے ہی مترشح ہوتا ہے کہ جب ہندی کو آئین میں جگہ دے دی گئی تو پھر اُردو کو اسی آئین میں جگہ دینے کا کیا جواز؟ ان کے خیال میں ایسا کرنا محض ''سیاسی مصلحت'' ہی ہو سکتی ہے، ''لسانی حقیقت'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

گیان چند جین اُردو اور ہندی کو ایک زبان تسلیم کرتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے اپنے بعض مضامین میں کھل کر کیا ہے۔ اپنے مذکورہ مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اُردو ہندی دو الگ زبانیں نہیں...... اگرچہ اُردو ادب اور ہندی ادب دو مختلف اور آزاد ادب ہیں، لیکن اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں۔''

اسی خیال کو جین صاحب نے اپنی حالیہ کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' میں نہایت

جارحانہ اور متعصبانہ انداز میں، اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار ہو کر (with communal mindset) حد درجہ غیر معتدل انداز اور غیر علمی رویہ اختیار کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ جس نے اُردو دنیا کو 'سکتے' میں ڈال دیا ہے۔ لہٰذا ایک ایسی کتاب جو اُردو زبان کو بے وجہ بدنام کرتی ہو، اس کے خلاف غلط اور جھوٹا پروپیگنڈا کرتی ہو، اس کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کرتی ہو، اس کی تاریخ کو مسخ کرتی ہو، اور اس کے بولنے والوں کے خلاف نفرت کا بیج بوتی ہو نیز ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت اور شکوک و شبہات پیدا کرتی ہو اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ اُردو کے خلاف زہر اگلنے والی اس کتاب نے سنیتی کمار چیٹر جی اور امرت رائے کو بھی مات دے دی ہے۔ یہ وہی گیان چند جین ہیں جنھوں نے ساری زندگی اُردو کی کمائی کھائی اور عزت، شہرت، دولت سب کچھ انھیں اُردو ہی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے اور یہ وہی گیان چند جین ہیں جنھوں نے اپنے مذکورہ مضمون ''اُردو، ہندی یا ہندوستانی؟'' میں لکھا ہے کہ ''میں مردم شماری میں اپنی مادری زبان اُردو لکھواتا ہوں۔'' اپنی مادری زبان کے ساتھ کوئی شخص اتنا بڑا 'وشواس گھات' یا غداری کیسے کرسکتا ہے؟ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے، ع:

یہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں

گیان چند جین نے اپنی اس کتاب میں نہ صرف اُردو زبان کو مطعون و ملعون کیا ہے اور اس پر ''تنگ نظری'' کی تہمت لگائی ہے بلکہ اُردو رسم الخط میں بھی کیڑے نکالے ہیں اور دیوناگری رسم الخط (زمانۂ حال کی ہندی کا رسم الخط) کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ گیان چند جین نے آخرِ عمر میں جب کہ وہ سات سمندر پار بیٹھے ہوئے ہیں اور پارکنسن جیسی مہلک بیماری کا شکار ہیں ایسی دل آزار کتاب کیوں اور کس کے اشارے پر لکھی؟ اُردو کے بارے میں اس قدر منفی رویے (Negative Approach) کی حامل کتاب تو آج تک ہندی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی۔

امرت رائے اگرچہ پریم چند کے بیٹے تھے، لیکن وہ بنیادی طور پر ہندی کے ادیب و عالم تھے۔ انھوں نے اُردو اگر سیکھی بھی ہوگی تو اتنی مہارت پیدا نہ کرسکے ہوں گے کہ اس زبان میں لکھی ہوئی دقیق علمی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ اور ان سے اخذ و استفادہ کرسکیں۔ لہٰذا گمانِ غالب ہے کہ امرت رائے نے اپنی مذکورہ کتاب کی تسوید و تصنیف کے دوران گیان چند جین سے بھرپور مدد لی ہوگی کیونکہ جس زمانے میں امرت رائے اس کتاب کا پہلا ڈرافٹ تیار کر رہے تھے اس زمانے میں دو سال تک گیان چند جین ان ہی کے شہر الہٰ آباد میں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر رہے تھے۔ امرت رائے کی یہ خوش نصیبی تھی کہ وہ علمی تعاون حاصل

کرنے کے لیے جب چاہتے جین صاحب سے مل سکتے تھے۔ جب جین صاحب حیدرآباد چلے گئے تب بھی امرت رائے کا رابطہ ان سے برابر قائم رہا اور وہ ہر طرح کی علمی امداد جین صاحب سے حاصل کرتے رہے۔ امرت رائے نے اپنی مذکورہ کتاب کے ''Acknowledgments'' میں علمی تعاون کے لیے گیان چند جین کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ شکریہ ادا کیا ہے اور نہایت صاف گوئی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ''کتاب کے اُردو مواد کے لیے میں نے کلیتاً معروف اُردو اسکالر گیان چند جین پر انحصار کیا ہے۔'' امرت رائے نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ جین صاحب نے ''نہایت فراخدلی کے ساتھ میری مدد کی اور نہ صرف اس موضوع سے متعلق مجھے کتابیں اور رسائل فراہم کیے، بلکہ خیالات (Ideas) بھی دیے اور ہر طرح کی قابل انحصار اطلاعات بھی مجھے مہیا کرائیں''۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جین صاحب سے ''میرا تبادلۂ خیال انتہائی مفید اور کارآمد ہوتا تھا اور مجھے ہمیشہ اس سے تحریک ملتی تھی۔''

امرت رائے کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گیان چند جین "A House Divided" کی تصنیف میں امرت رائے کے ساتھ برابر کے شریک رہے لیکن سرورق پر بدقسمتی سے صرف امرت رائے کا ہی نام چھپا۔ گیان چند جین کی حالیہ تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' کو اگر امرت رائے کی مذکورہ کتاب کا تتمہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کیونکہ اُردو، اُردو بولنے والوں نیز مسلمانوں کے خلاف جو باتیں امرت رائے کی کتاب میں کہنے سے رہ گئی تھیں وہ سبھی باتیں گیان چند جین کی اس حالیہ کتاب میں بلا جھجک کہہ دی گئی ہیں۔ جین صاحب نے علاوہ اور باتوں کے اگر ایک طرف اُردو کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ''اُردو کا مزاج تنگ نظری کا ہے'' (ص ۱۲۴)، تو دوسری طرف امرت رائے نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اور ایک ''غیر سیکولر'' اور ''شدید مذہبی رجحان'' کی حامل زبان ہے اور اگر اسے مراعات دی گئیں تو یہ ''سیکولر یک جہتی کے خلاف کام کرے گی'' (ص ۲۸۹)۔

> ''اگرچہ یہ بات ناممکن نہیں ہے کہ ووٹوں کی بنیاد پر کھیلے جانے والے سیاسی اقتدار کے بے ڈھب کھیل کے سیاق میں ایک دن اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے گا؛ لیکن ایسا کرنا ہمارے خیال میں ملک کے قومی مفادات کے لیے مضرت رساں ہوگا، کیونکہ اپنے غیر سیکولر مزاج اور شدید مذہبی رجحان کی وجہ سے یہ (زبان) سیکولر یک جہتی کے خلاف کام کرے گی'' (ص ۲۸۹)۔

اُردو زبان کے تاریخی تناظر کے اس مدلل اور مفصل جائزے سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ

یہ ہیں:

۱۔ اُردو، ہندی (زمانۂ حال کی ہندی) سے زیادہ قدیم زبان ہے، اور اس کا ادبی ارتقا بھی ہندی کے ادبی ارتقا سے بہت پہلے ہوا ہے۔

۲۔ 'ہندی' (قدیم مفہوم میں)، 'ہندوی'، 'ریختہ'، 'دہلوی'، 'گجری'، 'دکنی' اُردو ہی کے قدیم نام ہیں، ہندی (زمانۂ حال کی ہندی) کے نہیں۔

۳۔ ہندی دانشوروں کا یہ کہنا کہ چونکہ موجودہ اُردو کا 'اُردو' نام اٹھارھویں صدی کے اواخر میں پڑا، لہٰذا اس سے پہلے اُردو کا وجود نہ تھا سراسر لغو اور اِن دانشوروں کی کج فہمی اور لسانی تعصب کا آئینہ دار ہے۔

۴۔ ہندی دانشوروں کا یہ بیان بھی سراسر غلط اور لسانی حقیقت کو جھٹلانا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں 'اصلاحِ زبان' کے نام پر ہندی (جو ان دانشوروں کے مطابق شروع سے چلی آرہی تھی) میں سے انڈک یا ہندی الاصل الفاظ کو چھانٹ کر نکال دینے سے اور ان کی جگہ پر عربی فارسی کے الفاظ رکھ دینے سے 'اُردو' نام کی ایک علیحدہ زبان بنائی گئی۔

۵۔ اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ زمانۂ حال کی کھڑی بولی ہندی یا ناگری ہندی/ اعلیٰ ہندی کا ارتقا اٹھارھویں صدی کے خاتمے کے بعد غیر فطری طور پر عمل میں آیا۔ اُردو زبان جو کھڑی بولی کی بنیاد پر ارتقا پا کر بارھویں صدی کے اواخر سے شمالی ہندوستان میں بلا لحاظِ مذہب و ملّت رائج تھی اور عام بول چال، خواندگی (Literacy) اور شائستہ طرزِ کلام کی زبان بن چکی تھی اور ادبی اعتبار سے بھی نہایت ترقی یافتہ اور متمول تھی، انیسویں صدی کے اوائل میں اسی زبان میں سے عربی فارسی الفاظ کو خارج کر کے اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے الفاظ رکھ کر موجودہ ہندی بنائی گئی اور اس کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کیا گیا۔ شمالی ہندوستان کے ہندوؤں نے جو اُس وقت تک اُردو پڑھتے لکھتے تھے دھیرے دھیرے اس نئی اور مصنوعی زبان کو اپنا لیا۔ انیسویں صدی کی ہندو احیا پرست تنظیموں نے ''ہندی آندولن'' (ہندی تحریک) چھیڑ کر اس نوزائیدہ زبان کے فروغ کو تقویت پہنچائی۔

۶۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ ہندی (دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی زمانہ حال کی کھڑی بولی ہندی) اُردو سے نکلی ہے، لہٰذا حقیقی معنوں میں اس ہندی کو اُردو کی شیلی (اسلوب) کہنا زیادہ مناسب ہوگا، نہ کہ اُردو کو ہندی کی 'شیلی' سمجھنا (جیسا کہ ہندی دانشوروں کی غیر منطقی دلیل ہے)۔

کتابیات

۱۔ الوک رائے "Hindi Nationalism" (نئی دہلی: اورینٹ لانگ مین، ۲۰۰۰ء)۔

۲۔ امرت رائے "A House Divided: The Origin and Development of Hindi-Urdu" بازطبع (دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۹۱ء)۔

۳۔ اونکار راہی، کھڑی بولی: سوروپ اور ساھتیک پرمپرا (دہلی: پی پرکاشن، ۱۹۷۵ء)۔

۴۔ ای۔ انا ملائی (مرتب)، "Language Movements in India" (میسور: سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، ۱۹۷۹ء)

۵۔ برج رتن داس، کھڑی بولی ہندی کا اتہاش (بنارس: ہندی ساہتیہ کیٹر، ۲۰۰۹ سمبت)۔

۶۔ پال آر۔ براس، "Language, Religion and Politics in North India" (نئی دہلی: وکاس پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۵ء)۔

۷۔ جیوترندر داس گپتا، "Group : "Language Conflict and National Development" Politics and National Language Policy in India" (برکلے: سنٹر فار ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیا اسٹڈیز، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، ۱۹۷۰ء)۔

۸۔ چندردھر شرما گلیر ی، پرانی ہندی (کاشی: ناگری پرچارنی سبھا، ۲۰۱۸ سمبت)۔

۹۔ حکم چند نیر، اُردو کے مسائل: ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کی روشنی میں (بنارس: شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، ۱۹۷۷ء)۔

۱۰۔ دھیریندرورما، ہندی بھاشا کا اتہاس (الٰہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۶۷ء)۔

۱۱۔ رام ولاس شرما، بھارت کی بھاشا سمسیا، دوسرا ایڈیشن (نئی دہلی: راج کمل پرکاشن، ۱۹۷۸ء)۔

۱۲۔ سنیتی کمار چیٹر جی، "Indo-Aryan and Hindi"، دوسرا ایڈیشن (کلکتہ: فرما کے۔ ایل مکھو پادھیائی، ۱۹۶۰ء)۔

۱۳۔ سہیل بخاری، اُردو کی زبان (کراچی: فضلی سنز لمٹیڈ، ۱۹۹۷ء)۔

۱۴۔ سید احتشام حسین (مترجم)، ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، از جان بیمز (لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۷۱ء)۔

۱۵۔ سید محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء)۔

۱۶۔ شتی کنٹھ مشر، کھڑی بولی کا آندولن (کاشی: ناگری پرچارنی سبھا، ۲۰۱۳ سمبت)۔

۱۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اُردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو (کراچی: آج کی کتابیں، ۱۹۹۹ء)۔

۱۸۔ فرینک ای۔ کئی "A History of Hindi Literature"، بازطبع (کلکتہ: وائی۔ ایم۔ سی۔ اے پبلشنگ

ہاؤس، ۱۹۶۰ء)۔

۱۹۔ کرسٹو فر آر۔ کنگ ، "One Language Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India"(بمبئی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء)۔

۲۰۔ گیان چند جین، لسانی مطالعے (نئی دہلی: ترقی اُردو بورڈ، ۱۹۷۳ء)۔

۲۱۔ گیان چند جین، ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب (دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵ء)

۲۲۔ لچھمن ایم۔ خوب چندانی، "Language in a Plural Society"(شملہ: انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، ۱۹۸۸ء)۔

۲۳۔ مرزا خلیل احمد بیگ، لسانی تناظر (نئی دہلی: باہری پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)۔

۲۴۔ مرزا خلیل احمد بیگ، اُردو کی لسانی تشکیل، تیسرا ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء)۔

۲۵۔ مرزا خلیل احمد بیگ (مرتب)، اُردو زبان کی تاریخ، دوسرا ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء)

۲۶۔ مسعود حسین خاں، مقدمۂ تاریخ زبانِ اُردو، ساتواں ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء)۔

۲۷۔ مسعود حسین خاں، اُردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر، خطبۂ پروفیسر ایمریٹس (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء)۔

پروفیسر عبدالمغنی
پٹنہ، بھارت

ہندی بمقابلہ اُردو: ایک مسئلہ اور اس کا حل

ہندی بمقابلہ اُردو کا مسئلہ قریب ڈیڑھ سو سال پرانا ہے، مگر آزادی کے بعد پچھلے چھپن سال میں اس نے ایک بظاہر نا قابل حل صورت اختیار کر لی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف براہ راست شمالی ہند میں جہاں یہ مسئلہ پیدا کیا گیا، بلکہ پورے ملک میں بالواسطہ۔ اور نتیجتاً زبان کا مسئلہ بالآخر قومی یک جہتی کو پارہ پارہ کر دے گا اور خدانخواستہ ہندوستان کی ایک نئی تقسیم کا دروازہ کھولے گا۔ یہ واقعہ اور اندیشہ موجودہ مرکزی حکومت کی پالیسی اور طرز عمل سے سامنے آ رہا ہے، خاص کر ٹیلی ویژن کی خبروں کے سرکاری انداز اور بی جے پی کے بڑے لیڈروں کی تقریروں کی مصنوعی زبان سے، جو حکومت ہند کے غلط تعلیمی منصوبوں کی غماز ہے، جن کے مطابق نصاب تعلیم اور تاریخ کو مسخ کر کے کھلی فرقہ پرستی کو پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بول چال کی عام زبان زبردستی بگاڑی جا رہی ہے۔ چند نمونے اس بگاڑ کے ملاحظہ ہوں:

کاروائی	کے بجائے	کارواہی
انوکھا	کے بجائے	انوٹھا
دکھ درد	کے بجائے	پیڑا
بارش	کے بجائے	ورشا
رات	کے بجائے	راتری
شام	کے بجائے	سندھیا
زمین	کے بجائے	پرتھوی
آمدنی	کے بجائے	آئے
عمر	کے بجائے	آیو
واقعہ یا حادثہ	کے بجائے	گھٹنا

اس طرح کے بے شمار الفاظ ہیں اور عام فہم انگریزی لفظوں: ٹیلی ویژن، سیکریٹریٹ وغیرہ کے جو نامانوس ہندی ترجمے کیے گئے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہزاروں سال پیچھے جا کر سنسکرت جیسی قدیم اور ناقابل فہم زبان سن رہے ہیں اور گویا لفظوں کے ذریعے ذہنوں کی شدھی کی جارہی ہے اور ملک میں ان سادھو سنتوں کا راج ہو گیا ہے جن کی شکلیں دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ جدید دور تو دُور کی بات ہے، عہدِ وسطیٰ سے بھی آگے بڑھ کر ہم واقعی ''پراچین کال'' میں آ گئے ہیں اور ماقبل تاریخ کے زمانے میں سانس لے رہے ہیں۔

یہ منظر صریحاً فرقہ وارانہ سیاست بازی کا ہے۔ اس سے ملک کی وحدت، قومی یک جہتی، جمہوریت اور ترقی پسندی کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ زبان کا معاملہ تہذیبی ہے۔ تہذیب بجائے خود انسانیت کی علامت ہے۔ الفاظ سماج کے کردار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ زبان حکومت نہیں بنا سکتی ہے۔ اس کا تعلق عوام کی فطری بول چال سے ہے۔

دستور ہند کی منظوری کے بعد زبان کا مسئلہ حل ہو جانا چاہیے تھا۔ آئین کے شیڈول ۸ میں چودہ قومی زبانوں کا اندراج کیا گیا جس میں اضافہ ہوا۔ دیوناگری ہندی کو سرکاری زبان اس توقع کے ساتھ قرار دیا گیا تھا کہ وہ مقبول عام ''ہندوستانی'' سے استفادہ کر کے ملک کے تمام باشندوں کے لیے قابلِ قبول ہوگی۔ یہ ایک جمہوری عمل ہوتا نہ کہ سامراجی اور آمرانہ۔ آزادی کے وقت ''ہندوستانی'' کی مروجہ شکل عوامی سطح پر اُردو تھی جیسا ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے ترانے اور ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے سے عیاں تھا۔ فلموں کے مکالمے اور گیت بھی اسی ہندوستانی زبان کے تھے اور ہیں۔ تمام علوم وفنون کی ملکی زبان میں تعلیم کے لیے بھی، نصاب سے تدریس تک، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں کامیاب تاریخی تجربہ وسیع پیمانے پر ہو چکا تھا۔ یونیسکو کے تازہ ترین اعداد وشمار کے مطابق چینی کے بعد بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبان اُردو ہے۔ یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور ایشیا کے ممالک میں جو ہندوستانی باشندے ہیں ان کی زبان اُردو ہے۔ دنیا کے ہوائی اڈوں، ریلوے سٹیشنوں اور سمندری بندرگاہوں پر اُردو کا استعمال ہوتا ہے۔

ان سارے حقائق کے باوجود خاص کر شمالی ہند میں اُردو کو نظر انداز کرنے اور اس کی قیمت پر سنسکرت آلود ہندی کو فروغ دینے کی سرکاری کوشش کا ردِعمل کیا ہو سکتا ہے اور انجام کیا ہوگا؟ جنوبی ہند کا ہندی مخالف ایجی ٹیشن ایک اشارہ ہے اس نتیجے کی طرف جو زبان کے معاملے میں زبردستی، تنگ نظری اور ناروا داری

سے پیدا ہوسکتا ہے۔ خود شمالی ہند کے اندر اُردو کو دبا کر ہندی کو ابھانے کی جو روش ۱۹۳۷ء سے، خاص کر اتر پردیش میں اختیار کی گئی ہے اس نے ایک تہذیبی انتشار پھیلایا ہے۔ اس سلسلے میں سہ لسانی فارمولے کا تذکرہ عبرت خیز ہے۔ ۱۹۴۹ء میں وزیر اعظم جواہر لعل نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے ریاستوں کے وزرائے تعلیم کی کانفرنس بلا کر طے کرایا کہ سیکنڈری یا سکولوں میں تمام طلبہ و طالبات حسب ذیل ترتیب سے تین زبانوں کی تعلیم حاصل کریں، جب کہ پرائمری ایجوکیشن مادری زبان میں طے شدہ تھا:

۱۔ مادری زبان

۲۔ جدید ہندوستانی زبان

۳۔ غیر ملکی (انگریزی) زبان

شمالی ہند میں اس فارمولے پر عمل اس طرح متوقع تھا کہ اُردو خواں دوسری زبان کے طور پر ہندی پڑھیں گے اور ہندی خواں اُردو۔ چنانچہ اُردو خوانوں نے ہندی اختیار کی، مگر ہندی خوانوں نے فارمولے کی سپرٹ کے خلاف اُردو کے بجائے دوسری زبان کے طور پر سنسکرت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود ۱۹۶۱ء میں وزرائے اعلیٰ کانفرنس نے مندرجہ بالا شکل میں ہی فارمولے کی توثیق کی۔ بعد میں فارمولے کو عملی شکل دینے کے لیے اچاریہ جے۔ بی کرپلانی کی زیر صدارت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ایک ممبر جناب حیات اللہ انصاری تھے۔ کمیٹی نے یہ گل کھلایا کہ سنسکرت کو ایک جدید ہندوستانی زبان قرار دے دیا تا کہ اُردو کو نظر انداز کر کے سنسکرت اختیار کرنے میں کوئی اصولی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ اس طرح تھری لینگویج فارمولے کو غارت کر دیا گیا۔ اگر چہ اس فرقہ پرستانہ غارت گری اور اُردو دشمنی کے باوجود اُردو خواں آج تک ہندی پڑھ کر قومی یک جہتی کا یک طرفہ ثبوت دے رہے ہیں اور تالی ایک ہی ہاتھ سے بج رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتر پردیش میں سرکاری طور پر منظور شدہ سکولوں میں اُردو کی تعلیم ختم کر دی گئی اور ملک کی سب سے بڑی ریاست میں اُردو کے خلاف ہندی والوں کی محاذ آرائی کا عالم یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں سب سے پہلے بہار کے آفیشل لینگویجز امنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۸۰ء کے بعد، جس کے مطابق اُردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان تمام ضروری مقاصد کے لیے قرار دیا گیا، ۱۹۸۹ء میں ایسا ہی ایکٹ جو اتر پردیش میں نرائن دت تیواری کی کانگریسی وزارت نے منظور کیا، اس کو مقدمہ بازی کے چکر میں ڈال کر بے اثر کر دیا گیا۔ نہ تو ملائم سنگھ کی ایس۔ پی وزارت نے ایکٹ پر عمل کرانے کی راہ نکالی، نہ مایاوتی کی بی۔ ایس۔ پی وزارت نے، جنھیں حکومت میں کانگریس کی جانشینی کا فخر حاصل ہوا اور جو اُردو دوستی کی دعویدار ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ہندی بمقابلہ اُردو کا مسئلہ خاص کر اتر پردیش کی پیداوار ہے اور اس کا واحد سبب اُردو کے مقابلے میں ہندی والوں کا احساس کمتری اور احساس خوف ہے۔ تقسیم ہند کا اس معاملے سے کوئی اصولی تعلق نہیں، اس لیے کہ ہندوستان آج بھی ایک قومی نظریے کا حامل اور مشترکہ کلچر کا علم بردار ہے۔ یہ کلچر اصلاً اور عملاً اُردو کی دین ہے اور اس کا پورا ادب اس کا کھلا ثبوت ہے۔ ملک کی اُردو آبادی وحدتِ قومی ہی کی بنیاد پر آئین کی پابند ہے۔ لیکن ہندی والے سمجھتے ہیں کہ اُردو کی موجودگی میں ہندی کو فروغ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا کبھی وہ رسم الخط بدلنے کی بات کرتے ہیں، کبھی عربی و فارسی کی عظیم الشان عالمی وراثت کو چھوڑنے کی ہدایت دیتے ہیں، جبکہ یہ دونوں باتیں سراسر نامعقول اور ناممکن ہیں۔ اُردو رسم الخط کسی رسم الخط سے، خواہ وہ لاطینی ہو یا دیوناگری، کم تر نہیں اور عربی و فارسی کا سرمایہ تو وہ دولت ہے جس کے خزانے سے فائدہ دنیا بالخصوص ہندوستان کی تمام زبانوں نے اٹھایا ہے۔ ''قرآنی'' رسم الخط، خاص کر ایشیا و افریقہ کے لیے سب سے بڑا بین الاقوامی رابطہ بھی ہے۔

سرسید احمد خاں نے انیسویں صدی کے وسط میں محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کا ایک فرقہ زبان کے سوال پر دوسرے فرقے کے ساتھ اتحاد کرنے کے لیے آمادہ نہیں، جب انگریزوں نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار اُردو کو سرکاری زبان بنایا اور اس کے خلاف ہندی کے علم بردار کہلانے والوں نے احتجاج شروع کردیا، حالاں کہ ۱۸۶۹ء تک اُردو ہی کا ایک نام ہندی بھی تھا، جیسا غالب کے ایک مجموعہ خطوط کے نام ''عودِ ہندی'' سے ظاہر ہے اور دوسرے مجموعے کا نام انھوں نے اُردوئے معلیٰ رکھا تھا۔ دراصل ایک فارسی لفظ 'ہندی' ہندوستان کی زبان، باشندگان اور چیزوں کے لیے زمانۂ قدیم سے مستعمل ہے اور عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور پراکرتوں کی آمیزش سے جس مشترکہ عوامی زبان کا خمیر برصغیر میں اٹھا اس کا نام سترہویں اور اٹھارہویں صدی سے عرف عام میں اُردو ہوگیا، جب کہ دیوناگری کا ہیولا انگریزوں کے قائم کردہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ۱۸۰۰ء کے بعد آہستہ آہستہ ابھرنے لگا اور اس سے قبل آج کی ہندی کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ فقط اودھی کہلانے والی ایک بولی پر مبنی تھا، جس کو بھی اُردو نے برج بھاشا اور دکنی وغیرہ کے ساتھ اپنے اندر جذب کرلیا۔

اُردو کی اسی اصلیت، وسعت اور جامعیت نے اسے برصغیر میں رابطے کی زبان (Link Language) بنادیا، جو وہ آج تک ہے۔ اس کا رسم الخط بھی مختلف زبانوں کے حروف تہجی (Alphabets) پر مشتمل اور ہر قسم کی آوازوں کا عکاس ہے۔ شدھی کے برخلاف رواداری اور وسیع النظری اُردو کی وہ عوامی طاقت ہے جو دیوناگری کو نصیب نہیں۔ اسی لیے شروع سے آخر تک جنگ آزادی کی مقبول عام زبان پورے ملک میں اُردو

ہی رہی۔ اس کے ادب میں بلا امتیاز ہر فرقے اور طبقے کے مذہبی و معاشرتی ذخیرے موجود ہیں۔ انگریزی لفظوں کو بھی اُردو نے جس آسانی اور کثرت سے جذب کرلیا ہندی نہیں کرسکی۔ اس کے باوجود جب ہندی بمقابلہ اُردو کا مسئلہ سیاسی طور پر پیدا کیا گیا تو قاضی عبدالودود کی کوششوں سے پٹنہ میں عبدالحق راجندر پرشاد پیکٹ پر ۱۹۳۸ء میں دستخط ہوئے، جس کے مطابق آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان اُردو بخط فارسی اور دیونا گری ہندی بیک وقت دونوں ہوتیں، لیکن ۱۹۴۹ء میں آزاد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندوستانی بخط فارسی و دیوناگری کے بجائے فقط دیوناگری کو سرکاری زبان بنادیا۔

بہرحال ۵۳ سال کا جمہوری تجربہ واضح کرتا ہے کہ اُردو کے بغیر اور اس کے برخلاف تنہا ہندی اصحاب اقتدار کی ریشہ دوانیوں کے باوُجود عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ۱۹۴۹ء میں آزاد ہندوستان کے معماروں نے قومی یک جہتی اور لسانی وتہذیبی اتحاد کے لیے جو سہ لسانی فارمولا وضع کیا تھا وہی اپنی اصلی اور مکمل شکل میں جو حسب ذیل ہے، ہندی بمقابلہ اُردو کے مسئلے کا واحد حل ہے:

۱۔ مادری زبان...... اُردو بولنے والے اُردو اور ہندی بولنے والے سکولوں میں ہندی پڑھیں۔ اس مقصد کے لیے دونوں زبانوں کے ماہرین اپنی اپنی زبان کی نصابی کتابیں مرتب کریں اور معلمین ان کا سبق دیں۔

۲۔ جدید ہندوستانی زبان...... اُردو والے جس طرح ہندی پڑھ رہے ہیں ہندی والے بھی اپنی خوشی سے اُردو پڑھیں۔ دونوں کے لیے الگ الگ نصاب دونوں کی تدریس کو آسان بنانے کی خاطر مرتب کیے جائیں۔

۳۔ انگریزی زبان سب کے لیے عام ہو۔

یہ فارمولا خاص کر شمالی ہند کے لیے کارگر ہوگا، جب کہ جنوبی ہند کے لیے اس میں کچھ تبدیلی پہلی دو زبانوں کے سلسلے میں کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے تاکہ ملک کی قومی یک جہتی میں زبان کا مسئلہ حائل نہ ہو۔

قومی ذرائع ابلاغ (Media) خاص کر ٹیلی ویژن کی زبان کو صحیح اور پورے معنوں میں قومی بنانا ہو گا۔ اُردو کے عام فہم، آسان، سلیس اور حسین الفاظ کو ہندی کے دشوار و مشکل، ثقیل اور بھونڈے الفاظ پر ترجیح دینی ہوگی، ان کا استعمال اور تلفظ بھی درست کرنا ہوگا۔ اس طرح ہندوستانی زبان نہ کہ ہندی زبان کا فروغ تو قومی سطح پر شمالی ہند میں ہوگا جب کہ جنوبی، مشرقی اور مغربی ہند میں وہاں کی علاقائی زبانوں کو ریاستی سطح پر فروغ پانے کا موقع ملنا یا ملتے رہنا چاہیے تاکہ زبان کا معاملہ قومی وحدت کے لیے کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔ انگریزی کا

استعمال اس وقت تک باقی رہنا چاہیے جب تک اس کا ہندوستانی نعم البدل میسر نہ آ جائے۔ اس مقصد کے لیے سہ لسانی فارمولے کا مخلصانہ استعمال ہی کامیابی کی کوئی راہ نکال سکتا ہے، نہ اُردو کو دبا کر ہندی کو اُبھارنے کا تجربہ شمالی ہند میں آدھی صدی کے اندر ناکام ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ناکام ہوگا۔ اُردو اپنی زندگی کے لیے کبھی کسی حکومت کی محتاج نہیں رہی، نہ آئندہ رہے گی، اس لیے کہ یہ ایک عوامی زبان ہے اور رہے گی۔ البتہ اس کی مزید ترقی کے لیے اُردو دوستوں کو ہر سرکاری و غیر سرکاری یعنی قومی وہ جمہوری سطح پر تحریکی جدوجہد کرنا اور کرتے رہنا پڑے گا۔ ابتدائی و ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سے روزگار و کاروبار تک اُردو کا مستقل استعمال وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ محکموں اور دفتروں میں بھی اُردو کا چلن سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد سے آسان ہو جائے گا۔

(بشکریہ 'ہماری زبان' نئی دہلی)

اُردو ہندی رسم الخط

ا۔حروف

ظاہر ہے کہ زبان (بھاشا) بیشمار جملوں کا خزانہ ہے اور ہر جملہ (واکیہ) لفظوں (شبدوں) کا مجموعہ ہے اور الفاظ تمام تر حرفوں (ورڑنوں) سے مرکب ہیں۔ پس بالآخر زبان تمام تر حروف پر مشتمل ہے اور تعجب ہے کہ معدودے چند حروف باہم مل جل کر لاکھوں الفاظ کے ذریعے بے شمار خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے کتب خانے میں چلے جایئے۔ ہر زبان کے معدودے چند حروف سے علوم کے بڑے بڑے عالم آباد نظر آئیں گے۔ دنیا میں لاکھوں ایجادیں ہوئیں اور ہوں گی لیکن کوئی ایجاد حروف کی ایجاد کا مقابلہ نہیں کر سکتی ظاہر میں انسان کی ترقیوں کا یہی خزینہ اور یہی ذخیرہ ہے۔

۲۔حرفیات

الفاظ کے اقسام و تغیرات فن صرف (شبد وچار) سے اور جملوں کی ترکیب فن نحو (واکیہ وچار) سے متعلق ہے اور صرف و نحو مجموعی طور پر فن قواعد (ویا کرڑن ودیا) کہلاتے ہیں۔ رہے حروف (ورڑن) سوان کے تلفظ (اُچارڑن) کی بحث فن قرأت (ورڑن وچار) سے متعلق ہے اور ان کی تحریر (آکار) کی بحث فن رسم الخط (لپی) سے متعلق ہے اور حروف کی ترکیب (سنیوگ) دونوں فن میں شامل رہتی ہے۔ لیکن کوئی سابقہ اصطلاح جامع اور موزوں معلوم نہ ہو سکی جو حروف کی تینوں بحثوں پر حاوی ہو۔ لہٰذا ایک جدید اصطلاح حرفیات (ورڑن ودیا) وضع کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ حروف کے تینوں پہلو تلفظ و تحریر و ترکیب یک جا پیش نظر ہو سکیں اور بحیثیت مجموعی حروف کے نقص و کمال کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن چونکہ مجوزہ اُردو ہندی اصطلاح ابھی معروف و مسلم نہیں ہے۔ اس مقالہ کا عنوان رسم الخط (لپی) ہی رکھنا پڑا کہ آج کل یہ اصطلاح حروف کی بحث میں عام طور پر رائج ہے۔

۳۔اُردو ہندی حروف

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اُردو حروف بیشتر عربی کے حرف ہیں۔ البتہ چند حروف فارسی ہندی کے بھی

شامل ہیں اور ہندی حروف تمام تر سنسکرت کے حرف ہیں۔ البتہ اب ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہندی حروف میں چند حرف اُردو تلفظ کے بھی شامل رہیں۔

۴۔ ہندی کی واقفیت

طالب علمی کے زمانے میں ہندی پڑھی تھی اور مدت تک شوق سے پڑھی تھی۔ رحیم، کبیر بلکہ سورداس، تلسی داس جیسے شاعروں کا کلام پڑھنے میں فرصت کا وقت گزرتا تھا۔ بہت سے ہندی دوہے یاد تھے۔ ہندی زبان میں ایسے دوہوں کی کمی نہیں جو بلحاظ زبان اُردو کے قریب رہتے ہیں اور سچ پوچھیے تو ایسی ہندی بہت سوندھی سلونی ہوتی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اُردو ہندی کے میل سے دلکش اور من موہنی زبان بن سکتی ہے اور ایک حد تک بن چکی ہے۔ بہر حال ابتدا میں مدت تک ہندی سے دلچسپی رہی لیکن مصروفیتیں بڑھنے کے بعد پھر مہلت نہ ملی کہ ہندی تازہ ہوتی رہتی۔ مدتوں بعد ملازمت سے فارغ ہو کر اب ادھر توجہ ہوئی تو پھر کچھ یاد تازہ ہوگئی۔

لیکن ہندی ادبیات کے قطع نظر اس دوران میں بھی ہندی حروف کے مسائل زیرِ غور آتے رہے۔ ہندی اور سنسکرت کے اساتذہ سے حسبِ موقع تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ چنانچہ گزشتہ سالوں میں انجمن ترقی اُردو کے زیرِ سرپرستی دہلی اور ناگپور جیسے مقامات میں ہندی رسم الخط پر علمی جلسوں میں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا اور ایسے موقعوں پر احباب کا تقاضا ہوا کہ اس بحث پر باقاعدہ تالیف شائع ہونی چاہیے۔

۵۔ اُردو...... ہندی...... ہندوستانی

جس زبان میں رامائن جیسی شاعری ہو۔ اس کی ادبیت میں کیا شک ہو سکتا ہے اور یوں بھی ہندی میں ادب کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندی کلام میں معنٰی کی لطافت اور اثر آفرینی مسلم ہے۔ خاص کر محبت و اخلاق کے بیان میں اس کا رنگ بہت دلکش ہے اور اس کی تشبیہات و تمثیلات تو فطرت کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ پھر کلام میں بحروں کا جو وسیع اہتمام ہے۔ اس میں موسیقی کی بہت گنجائش رہتی ہے۔ راگ راگنیاں خوب جمتی ہیں۔ کھلتی ہیں اور موسیقی سے نظم کا اثر گہرا پڑتا ہے۔ غرض کہ ہندی ادب قابلِ مطالعہ ہے۔ ہندی کو نظر انداز کرنا تنگ نظری ہے۔ پھر اُردو کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں بھی لسانی اعتبار سے ہندی کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے۔ پس ہندی کے مطالعہ پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ اعلٰی معیار نہ سہی وسط یا کم از کم ابتدائی واقفیت بھی کارآمد ہو سکتی ہے۔

لیکن ہندوستان کی جو زبان اندرون ملک و بیرون ملک سب سے زیادہ بولی جاتی ہے سمجھی جاتی ہے وہ وہی ہے جو اُردو کہلاتی ہے اور وہ بہ تناسب مختلف ملک کی بیشتر زبانوں کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ہندی عنصر تو صاف ظاہر ہے۔ پس اُردو کی وسعت جاذبیت اور جامعیت کا انکار کرنا کھلی حقیقت کا انکار ہے۔ پھر اس میں ادب کے علاوہ علوم وفنون قدیمہ وجدیدہ کا ذخیرہ پہلے سے خاصا موجود ہے اور کچھ مدت سے علوم وفنون کا اس میں نمایاں اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان میں بلحاظ توسیع وترقی کوئی زبان اُردو کے ہم پلہ نظر نہیں آتی۔

بریں ہم اُردو کے مقابل ہندی کے رواج کی بحث جو ملک میں پھیل رہی ہے۔ گویا دونوں زبانوں میں رقابت پیدا ہو رہی ہے۔ مصالحت کے مدنظر ملک کی عام زبان کا ایک تیسرا نام ہندوستانی تجویز ہوا ہے۔ جس میں گویا اُردو ہندی دونوں زبانیں بقدر مناسب شامل رہیں۔ اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اُردو میں ہندی کا عنصر موجودہ تناسب سے بڑھا دیا جائے تو یہ تحریک اُردو میں پہلے سے جاری ہے اور تقویت پا رہی ہے لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی کے نام سے اُردو کے بجائے سنسکرت کی ہندی رائج کی جائے تو یہ دوسرا سوال ہے اور اصل مقصد کے مغائر بلکہ منافی ہے۔

۶۔ رسم الخط

اُردو ہندی کے بجائے مصلحتاً ہندوستانی زبان تسلیم ہو جانے کے بعد بھی حروف کی بحث باقی رہ جاتی ہے۔ جس میں رسم الخط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا بھی مصلحت آمیز حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اُردو ہندی رسم الخط ساتھ ساتھ حسب موقع محل استعمال ہوں لیکن ہندی کے حامی جو دراصل اُردو کے بجائے ہندی رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سمجھوتہ پر بھی راضی نہیں ہیں بلکہ ان کو ہندی رسم الخط پر اصرار ہے۔ خیر اصرار سہی لیکن لطیفہ یہ ہے کہ وہ ہندی حروف کو اُردو حروف پر فنی لحاظ سے فائق بتاتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے اور اس دعویٰ کا شد و مد سے اعلان ہوتا رہتا ہے۔ جس کی بدولت عام مغالطہ پھیل رہا ہے۔ حتیٰ کہ حامیان اُردو بھی اس مغالطے کے شکار پائے گئے کہ ہندی حروف میں تلفظ تحریر وترکیب کے لحاظ سے جامعیت سہولت اور باقاعدگی ہے اور گویا اُردو حروف میں یہ بات نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔ اُردو حروف تلفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں اکثر اعتبار سے ہندی حروف کے مقابل فنی فوقیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آئندہ جو تفصیل پیش ہوگی اس سے مغالطہ خود بخود درفع ہو جائے گا۔ نیز اندازہ ہوگا کہ کثرت مشاغل میں جبکہ لوگوں کو تحقیق وتوثیق کی فرصت کم ہو۔ کسی

امر کی شہرت عامہ پروپیگنڈا کے ہاتھوں کس درجے بے بس ہو جاتی ہے۔ وہی مثل صادق آتی ہے کہ۔

بد اچھا بدنام بُرا

۷۔ خلاصہ

تفصیل تو آئندہ فصلوں میں پیش ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اوّل تو اُردو کے مقابل ہندی حروف کی مجموعی تعداد ڈیوڑھی ہے یعنی (۵۰) فی صد زیادہ۔ دوسرے حروف کی اشکال و علامات کی تعداد کا فرق اس سے بھی زیادہ ہے یعنی اُردو کے مقابل سہ چند۔ چنانچہ تشریح آئندہ فصل اول میں درج ہوگی۔ پھر بھی اُردو حروف کی متعدد صاف اور واضح آوازیں ہندی میں ندارد ہیں اور ہندی کی جو بعض آوازیں اُردو میں کم ہیں وہ ایسی دقیق یا رقیق ہیں کہ خود ہندی میں وہ باعث تکلف محسوس ہوتی ہیں اور باعث دشواری مانی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اُردو سے زیادہ ہندی حروف کے مختلف تلفظ متشابہ ہیں جن سے تحریر میں پیچیدگی بڑھ جاتی ہے۔ پھر ہندی حروف کی شکلیں بھی طولانی اور پیچیدہ ہیں جن کے لکھنے میں زیادہ وقت اور جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید براں متعدد شکلیں متشابہ ہیں جو سرسری تحریر میں بآسانی اشتباہ پیدا کرتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہندی حروف کی ترکیبیں ہیں (سنیوگ) کہ ایک طرف تلفظ میں بہت دقیق یا رقیق ہوتی ہیں تو دوسری طرف تحریر میں ان کے جوڑ بند مختلف محل بلکہ مختلف نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ لکھنے پڑھنے میں حیرانی لاحق ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی منزل میں جبکہ عبارت سادہ سلیس ہو ہندی کا لکھنا پڑھنا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن جوں جوں عبارت کا معیار بڑھتا ہے۔ تلفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں حروف کی دقت اور پیچیدگی معمول سے بہت زیادہ بڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ اوسط درجے میں وہ خاصی غور طلب بن جاتی ہے اور اعلیٰ عبارت میں تو حرفوں کا تلفظ، حرفوں کی تحریر اور حرفوں کی ترکیب اچھے اچھوں کو حیران کر دیتی ہے۔ چنانچہ معنیٰ مطالب کے قطع نظر سنسکرت بلکہ ہندی کی اعلیٰ مذہبی اور علمی عبارتیں بلحاظ زبان صحیح لکھنا پڑھنا خاص مہارت کی بات ہے اور جس ہندی کو رواج دینا مقصود معلوم ہوتا ہے وہ سنسکرت کی ہندی ہوگی تو لامحالہ حروف کی خصوصیات عبارت میں بافراط نمایاں ہوں گی۔

۸۔ تحقیقاتی کمیٹی

ہندی حروف کے ان ہی امور پر غور کرنے کی غرض سے چند سال پہلے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ جس نے غالباً رپورٹ بھی تیار کی تھی لیکن شاید وہ ہندی رسم الخط کے موافق نہ تھی اور اس میں فنی لحاظ

سے ہندی حروف کی کوتاہیاں اور دشواریاں تفصیلاً پیش کی گئی تھیں؛ ہندی کے حامیوں نے اس رپورٹ کی عام اشاعت مناسب نہ سمجھی اور وہ یوں ہی روپوش ہوگئی ورنہ اس کی اشاعت سے بہت کچھ مسائل واضح ہو جاتے۔ اک زمانے میں اس کمیٹی کا چرچا رہا لیکن مزید کیفیت تحقیق نہ ہو سکی۔

۹۔ موجودہ مقالہ

بہر حال اُردو ہندی حروف کا اِک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں حروف کے تلفظ' حروف کی تحریر' اور حروف کی ترکیب' غرض جملہ امور کی مختصر کیفیت بیان ہوگی۔ تا کہ خصوصیات متعلقہ کا بقدر ضرورت اندازہ ہو جائے۔ شاید اسی بحث پر تفصیلی تالیف بھی متعاقب پیش ہو سکے لیکن۔

یک سر و ہزار سودا ہے

کیا معلوم نوبت آئے نہ آئے اور آئے تو کب آئے۔ سر دست یہ مقالہ حاضر ہے:

گو مباحث کو عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اصل لطف تو ان کو آئے گا جو ہندی کی کچھ واقفیت رکھتے ہیں لیکن جو ہندی سے بالکل ناواقف ہیں ان پر بھی خصوصیات حروف کا عام رجحان بخوبی واضح ہو جائے گا اور عجب نہیں ان کو ہندی کی واقفیت کا بھی شوق پیدا ہو جائے تا کہ خود تصدیق کر لیں۔ اسی جماعت کے خیال سے مباحث کے دقیق اور طویل پہلو نظر انداز کر دیے گئے تا کہ مطالعہ میں الجھن محسوس نہ ہو۔ ممکن ہے یہ مقالہ ہندی اور انگریزی میں بھی متعاقب شائع ہو۔

ہندی کی فنی اصطلاحات بقدر ضرورت اُردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ مباحث میں درج ہیں لیکن بنظر سہولت اُردو تحریر میں درج ہیں اور جہاں جو حروف و الفاظ ہندی تحریر میں درج ہیں۔ وہ بھی لیتھو کی کتابت میں خوش خط درج نہ ہو سکے کہ ہندی کتابت طولانی پیچیدہ ہے اور کاتب ہندی کے مشاق نہ تھے۔ توقع ہے کہ آئندہ یہ مقالہ اُردو ٹائپ میں طبع ہوگا تو ہندی حروف و الفاظ ہندی ٹائپ میں صاف خوشنما درج ہوں گے۔ تاہم جو ہندی اصطلاحات جابجا درج ہوئیں۔ ان کی ایک جامع فہرست آخر میں بطور ضمیمہ شریک کر دی گئی اور اصطلاحات ہندی میں بھی تحریر ہوئیں گو چنداں خوشخط تحریر نہ ہو سکیں۔

۱۰۔ شکریہ

بعض احباب کا شکریہ خاص طور پر واجب ہے۔ ہندی کے معاملے میں پنڈت ہری ہر شاستری (بیکنٹھ باشی) پروفیسر سنسکرت جامعہ عثمانیہ جو علی گڑھ کالج کے زمانے سے دوست تھے زیادہ شریک مشورہ

رہتے تھے لیکن مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو کی فرمائش سے اس مضمون کی ابتدا ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی والی تقریر میں بہت سرگرم دلچسپی ظاہر فرمائی اور مسٹر سجاد مرزا معتمد تعلیمات سرکار عالی وقتاً فوقتاً تقاضا کرتے رہے۔ ایسے احباب کی توجہ بالآخر کارگر ہوئی اور خدا کا شکر ہے کہ مقالہ شائع ہو گیا۔

جو فنی مشورے بغرض اصلاح و اضافہ موصول ہوں گے باعث تشکر ہوں گے اور آئندہ ایڈیشنوں کے سلسلے میں وہ زیر غور آ سکیں گے کہ منشاء تحقیق و توضیح ہے تاکہ رسم الخط کے تعلق سے اُردو ہندی حروف کی خصوصیات بلحاظ تلفظ و تحریر و ترکیب عام طور پر ظاہر ہو جائیں اور کسی مغالطے کا احتمال نہ رہے کہ ایسے علمی امور میں رائے عامہ کی صحت بہت ضروری ہے اور یہی اس مضمون کا مقصد ہے۔

فصل اوّل

حروف کی آوازیں

(ورڑن اُچارڑن)

ا۔ اُردو حروف کے تلفظ

اُردو میں کل ۳۷ حروف ہجا ہیں۔ ان میں ۳۰ حرف عربی کے ہیں۔ تین حروف خالص ہندی کے ہیں۔ ایک حرف خالص فارسی کا ہے اور تین حرف ہندی فارسی میں مشترک ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

ا	د	ض	ل
ب	(ڈ)	ط	م
(پ)	ذ	ظ	ن
ت	ر	ع	و
(ٹ)	(ڑ)	غ	ھ
ث	ز	ف	ء
ج	ژ	ق	ی
چ	س	ک	ے
ح	ش	گ	
خ	ص		

ان میں تین حرف (ٹ) (ڈ) (ڑ) ہندی سے مختص ہیں۔ حرف (ژ) فارسی سے مختص ہے اور تین حرف (پ) (چ) (گ) ہندی فارسی میں مشترک ہیں۔ باقی ۳۰ حرف عربی کے ہیں۔ آخری حرف (یا) کی دو شکلیں اُردو میں لکھی جاتی ہیں۔ گول اور لانبی۔ جن کے تلفظ میں معروف و مجہول کا فرق رہتا ہے لہٰذا ان کو دو حروف شمار کیا گیا۔ حرف (لا) جو (لام الف) کہلاتا ہے۔ جداگانہ حرف شمار نہیں کیا گیا۔ کہ وہ (ل) اور (ا) کا مجموعہ ہے اور مجموعہ کی حیثیت سے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۲۔ بعض تلفظوں کا امتیاز

مندرجہ (۳۷) حروف کے منجملہ (۳۱) حروف کی آوازیں تو بالکل صاف اور واضح ہیں کہ تلفظ میں کسی اشتباہ کا احتمال نہیں۔ البتہ بقیہ (۶) حرف کے تلفظ میں احتیاط سے امتیاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

۱۔ (ت۔ط) ان میں (ت) کا تلفظ تو صاف اور واضح ہے۔ لیکن (ط) کا تلفظ با حتیاط ادا کرنا ضرور ہے۔ ورنہ سرسری طور پر (ت) سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ط) کا تلفظ بھاری مضبوط ہے اور صحیح تلفظ میں (ط) (ت) سے بالکل ممیز ہے۔ لیکن عام طور پر تلفظ میں امتیاز کم رہتا ہے۔

۲۔ (ث۔س۔ص) ان میں (س) کا تلفظ تو صاف اور واضح ہے لیکن (ص) کے تلفظ کو باحتیاط ادا کرنا ضرور ہے۔ ورنہ سرسری طور پر (س) سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ص) کا تلفظ بھی بھاری مضبوط ہے اور صحیح تلفظ میں (ص) (س) سے بالکل ممیز ہے لیکن عام طور پر تلفظ میں امتیاز کم رہتا ہے اور (ث) کے تلفظ میں تو امتیاز لطیف ہے۔ عام طور پر (س) اور (ث) میں امتیاز میں رہتا ہے۔

۳۔ (ذ۔ز۔ض۔ظ) ان میں (ز) کا تلفظ تو صاف اور واضح ہے لیکن (ض) کے تلفظ کو باحتیاط ادا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ سرسری طور پر (ز) سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ض) کا تلفظ بھی بھاری مضبوط ہے اور صحیح تلفظ میں (ض) (ز) سے بالکل ممیز ہے لیکن عام طور پر تلفظ میں امتیاز کم رہتا ہے۔ (ظ) کے تلفظ کی کیفیت بھی (ض) سے ملتی جلتی ہے اور (ذ) کے تلفظ میں تو امتیاز اور بھی لطیف ہے۔ عام طور پر (ذ) اور (ز) میں امتیاز نہیں رہتا۔

حروف کا تلفظ اور بالخصوص مندرجہ بالا (۹) حروف کا تلفظ عربی میں فن قرأت کا ایک خاص مبحث ہے۔ چنانچہ فن قرأت میں اس ناچیز نے جو ایک کتاب بعنوان ''تسہیل الترتیب'' تالیف کی ہے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں جملہ حروف کے تلفظ کی بحث تفصیل سے درج ہے۔ یہاں مزید صراحت کی گنجائش نہیں۔

۱۳۔ تحریکِ اصلاح

حاصل کلام یہ کہ (۳) حرف کے ساتھ (۶) حرف کے تلفظ میں بالعموم ایسی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ سرسری طور پر تمیز دشوار معلوم ہوتی ہے۔ یعنی (ت) کے ساتھ (ط) اور (س) کے ساتھ (ث) (ص) اور (ز) کے ساتھ (ذ)، (ض) (ظ)۔ چنانچہ اصلاح پسندوں کی رائے ہے کہ گو لسانی اعتبارات مانع ہوں گے تاہم سہولت عامہ کی خاطر یہ (۶) حرف تحریر میں ترک کر کے باقی (۳) حرف یعنی (ت) (ز) اور (س) پر اکتفا کیا جائے تو املا کی ساری دشواری رفع ہو جائے۔ صرف یہی (۶) حرف ہیں جن سے اُردو کی املا میں شک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ باقی سب حرف اپنے اپنے تلفظ میں صاف اور واضح ہیں۔ کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا اصلاح کی صورت میں اُردو حروف کی تعداد (۳۷) کے بجائے (۳۱) رہ جائے گی اور آوازوں میں بلحاظ کیفیت کمی سہی لیکن بلحاظ کمیت کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ پوری (۳۱) آوازیں صاف اور واضح رہ جائیں گی۔

محولہ بالا اصطلاح کی ایک درمیانی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مذکورہ بالا (۹) متشابہ حروف میں (۳) حرف (ث) (س) اور (ز) عام اساسی قرار دے دیے جائیں کہ (ط) کے بجائے (ت) لکھی جائے یا (ث) اور (ص) کے بجائے (س) لکھا جائے۔ یا (ذ) اور (ض) اور (ظ) کے بجائے (ز) لکھی جائے۔ تو عملاً اس کو صحیح مانا جائے لیکن جو قابلیت رکھتے ہوں وہ حرف (ط) (ث۔ص) اور (ذ۔ض۔ظ) بھی الفاظ میں ان کے محل پر لکھ سکتے ہیں۔ البتہ ان حروف میں غلطی کی جائے تو وہ غلطی شمار ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ عام لوگوں کو اساسی حروف (ت) (س) اور (ز) سے املا میں مطلوبہ سہولت عملاً حاصل ہو جائے گی اور علمی لوگ بھی ادبی املا جاری رکھ سکیں گے اور فرق تسلیم ہو جانے کی صورت میں کوئی التباس نہ ہوگا۔

۱۴۔ اُردو حروفِ علت و اعراب

اُردو میں ۳۷ حروف صحیح کے منجملہ تین حرف حروف علت کا بھی کام دیتے ہیں۔ یعنی (الف) (و) اور (ی) جن کو مجموعی طور پر (وائے) کہتے ہیں اور حروف علت کی علامات جو اعراب کہلاتی ہیں ذیل میں

ملاحظہ ہوں:

(الف) کی مناسبت سے	فتحہ یا زبر	مثلاً ئَر
(ی) کی مناسبت سے	کسرہ یا زیر	مثلاً بِر
(و) کی مناسبت سے	ضمہ یا پیش	مثلاً ئُر

ان کے سوا بھی تین اعراف ہیں یعنی:

(۱)	سکون کی علامت	جزم	(ْ)
(۲)	سکون و حرکت کا اجتماع	تشدید	(ّ)
(۳)	حرکت کا طول	مد	(ٓ)

۱۵۔ ہندی حروف کے تلفظ

اُردو حروف (۳۷) کے مقابل ہندی حروف کی تعداد (۵۳) ہے۔ یعنی تقریباً (۵۰) فی صد زیادہ یا یوں کہیے کہ اُردو سے ڈیوڑھی۔

حروف علت۔ سُوَر (۱۶) عدد

او	اُ	ای	اِ	آ	اَ
لِری		لِر			رِر
اَوَ		اُو	اَئی		اے
		اَہ	ان		

حروف صحیح۔ وِینجن (۳۷) عدد

ڑن	گھ	گ	کھ	ک
ین	جھ	جَ	چھ	چ
نڑ	ڈھ	ڈ	ٹھ	ٹ
نَ	دھ	دَ	تھ	تَ
مَ	بھ	بَ	پھ	پ

شَ	دَ	لَ	رَ	یَ
گش	ژ	ہَ	سَ	شُ
	کَیَن	......	ثُر	......

۱۶۔ ہندی حروف صحیح میں دس حَرف مُرکبُ

اُردو کے سب حرف تلفظ میں مفرد ہیں۔ لیکن ہندی کے حروف صحیح (وِنجُن) میں (۳۷) کے منجملہ صرف (۲۴) حرف تلفظ میں مفرد (شُدھ) ہیں اور باقی (۱۳) حرف تلفظ میں مرکب (سَنیُکت) ہیں اور ان (۱۳) کے منجملہ (۱۰) حرف مرکب دس حرف مفرد سے متعلق ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں:

حرف مفرد (اشُدھ)	حرف مرکب (سَنیُکت)
ک	(کھ)
گ	(گھ)
(چ)	(چھ)
(ج)	(جھ)
ٹ	ٹھ
ڈ	ڈھ
ت	تھ
د	دھ
پ	پھ
ب	بھ

گویا مندرجہ بالا فہرست میں جو دس حرف مفرد اوّل درج ہیں۔ ان کے ساتھ حرف (ھ) گھل جانے سے مزید دس حرف مرکب جدا بن گئے جو ان کے مقابل میں درج ہیں اور جن کا تلفظ مرکب ہے۔ تاہم یہ حروف بھی مفرد شمار ہوتے ہیں۔

۱۷۔ ہندی میں حرف (ھ) کا پیچ

لیکن تعجب یہ کہ ہندی کے جو باقی حرف صحیح ہیں۔ان کے ساتھ حرف (ھ) اس طرح نہیں گھلتا۔نہ ان سے اس طرح جداگانہ حرف مرکز بنتے ہیں۔ بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔یعنی حرف (ھ) کی آواز ان سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔ بلکہ بہرصورت جدا رہتی ہے۔چنانچہ ہندی میں لفظ (نھانا) لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ حرف (ن) کے ساتھ حرف (ھ) کا تلفظ نہیں ملتا۔ پس لکھیں تو ہندی میں (نہانا) لکھ سکتے ہیں۔اسی طرح لفظ (ننھا) نہیں لکھ سکتے۔البتہ (ننہا) لکھ سکتے ہیں۔علیٰ ہذا (چولھا) یا (کولھا) یا (کولھو) نہیں لکھ سکتے۔البتہ (چولہا) یا (کولہا) یا (کولہو) لکھ سکتے ہیں۔وجہ وہی ہے کہ حرف (۔ن) کی طرح حرف (ل) کے ساتھ بھی حرف (ھ) کا تلفظ نہیں ملتا۔(حرف (ڑ) کے ساتھ بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ ہندی میں (ٹیڑھا) نہیں لکھ سکتے۔البتہ (ٹیڑہا) لکھ سکتے ہیں۔حالانکہ (سیدھا) لکھتے ہیں کہ حرف (دھ) مرکب موجود ہے اور ایسے ہی بہت سے الفاظ ہیں جن میں (ھ) متعلقہ حرف صحیح سے نہیں ملتی۔لہٰذا وہ لفظ ہندی میں صحیح نہیں لکھے جا سکتے۔حالانکہ اُردو میں ایسے تمام الفاظ بے تکلف لکھے جاتے ہیں۔

غرض کہ ہندی میں حرف (ھ) کی عجب کیفیت ہے۔بعض حروف میں ایسی گھلتی ہے کہ جدا حرف مرکب بن جاتے ہیں اور بعض حروف سے ایسی پھٹتی ہے کہ مرکب حرف تو درکنار مُرکب آواز تک نہیں بن سکتی۔حالانکہ اُردو میں (ھ) کی آواز بلا تکلف ہر حرف کے ساتھ گھلتی ہے۔کوئی تفریق نہیں رہتی۔اسی سبب اُردو، ہندی کی طرح حروف مرکب کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی اور لطف یہ کہ اگر ہندی کی طرح (ھ) کی آواز کو جدا رکھنا چاہیں تو بھی اُردو میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔حرف (ھ) کی شکل میں ذرا سا فرق کر دیتے ہیں (بھاری) (بَہاری) یا (گھاری) (گَہاری) یا (پھلی) (پہلی) یا (بُھلانا) (بہلانا) یا (کھلانا) (کہلانا) غرض کہ حرف (ھ) کا معاملہ ہندی میں جس درجے طویل اور پیچیدہ ہے اسی درجے اُردو میں مختصر اور صاف ہے اور یہ حرف بکثرت الفاظ میں مستعمل ہے۔

۱۸۔ ہندی حروف صحیح میں خاص تین حرف مرکب

مذکورہ بالا (۱۰) حرف صحیح گرچہ تلفظ میں مرکب ہیں کہ ان میں (ھ) کی آمیزش ہے۔تاہم وہ معمولاً مرکب نہیں کہلاتے۔البتہ تین حرف اور ہیں جو باقاعدہ حرف مرکب (سَنیُکت ورَڑن) کہلاتے ہیں۔ ان کی ترکیب زیادہ پیچیدہ ہے اور ان کی آوازیں ترکیب کے سبب ایسی رقیق ہوگئی ہیں کہ تلفظ میں مشق کی

ضرورت ہوتی ہے اور تحریر میں بھی توجہ درکار ہے۔ ورنہ غلطی کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۱۔ حرف (ک) اور حرف (ش) کا مرکب حرف (کش)۔

۲۔ حرف (گ) اور حرف (ین) کا مرکب حرف (گین)۔

۳۔ حرف (ت) اور حرف (ر) کا مرکب حرف (تر)۔

ان تینوں حروف مرکب کا تلفظ رقیق ہے اور مشق سے زبان پر جمتا ہے۔ دوسرے حرفوں کی طرح حروف علت کے ساتھ ان کی گردان کیجیے تو تلفظ کا اندازہ ہوتا ہے۔ حروف علت اور ان کی علامات آئندہ بیان ہوں گی۔

حرف (کش) کا تلفظ لفظ کے شروع میں دشوار ہوتا ہے۔ مشکل سے گرفت میں آتا ہے۔

حرف (گین) کا تلفظ تو اور بھی رقیق ہے۔ خاص کر لفظ کے شروع میں گرفت دشوار ہے۔ البتہ آخر میں کچھ گرفت ہوتی ہے۔ تاہم ایسے تلفظ مشق کے طالب ہیں۔

حرف (تر) کا تلفظ نسبتاً کم دشوار ہے۔ خاص کر لفظ کے درمیان میں۔ لیکن لفظ کے شروع میں اس کا تلفظ بھی دشوار ہے۔

بہرحال تینوں حرف مرکب ہیں اور ان کا تلفظ بھی رقیق ہے۔ غور کیجیے تو ان کے سوا تین حرف اور بھی تلفظ میں مفرد نہیں بلکہ کسی نہ کسی حد تک مرکب ہیں اور ان کے تلفظ میں غنغناہٹ ہے اور ان کے استعمال کی بھی خاص صورت ہے۔ بہرحال ہندی کے حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ (۱۳) بلکہ ایک اعتبار سے (۱۶) حرف مرکب ہیں۔ اگرچہ ان میں صرف (۳) (سنیکت ورڑن) کہلاتے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف (۲۴) بلکہ (۲۱) حروف مفرد رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اُردو کو (۳۷) حروف مفرد حاصل ہیں اور اگر ان میں سے (۶) حرف جن کا تلفظ متشابہ ہے منہا کر دیے جائیں تو بھی اُردو میں حروف مفرد کی تعداد (۳۱) رہتی ہے۔ یعنی ہندی کے مقابل (۱۰) یا کم از کم (۷) حرف مفرد اُردو میں زیادہ ہیں اور تلفظ کی وسعت کا مدار بیشتر حروف مفرد کی تعداد پر رہتا ہے کہ ان ہی سے مرکب تلفظ بنتے ہیں۔

۱۹۔ ہندی حروف صحیح مشابہ

ہندی کے حروف صحیح مفرد (۲۴) یا (۲۱) کے منجملہ دو حرف تلفظ میں از حد مشابہ ہیں۔ گویا ایک ہی حرف معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی (ش) اور (ش) لیکن ہندی میں یہ دو حرف جدا مانے جاتے ہیں اور ہر دو حرف کا

موقع محل الفاظ میں سمجھنا تحریر میں بہت دشواری پیدا کرتا ہے۔ تاہم فرق مسلم ہے اور اس درجہ اہم کہ ایک حرف کی جگہ دوسرے کا استعمال غلطی شمار ہوتا ہے۔ مثلاً لفظ (آشا) میں حرف (ش) کا استعمال ہے اور لفظ (بھاشا) میں حرف (ش) کا استعمال ہے۔ اگر اس کے خلاف لکھی تو غلطی سرزد ہوگی۔ حالانکہ دونوں لفظوں میں (شا) کا فرق محال ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا (دیش) اور (بھیش) میں بھی (ش) کا فرق رہتا ہے۔ غرض ہندی میں دو (ش) ہیں اور فرق بہت دقیق ہے۔ مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ بلحاظ تلفظ اگر ایک (ش) کو بطور زاید نظر انداز کر دیا جائے تو ہندی حروف صحیح میں حروف مفرد کی تعداد پھر (۲۴) کے بجائے (۲۳) یا (۲۱) کے بجائے (۲۰) رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اُردو میں حروف مفرد کی تعداد (۳۷) یا کم از کم (۳۱) ہے۔

۲۰۔ ہندی حروف صحیح متبادل

مندرجہ بالا (۲۴) یا (۲۳) یا (۲۰) حروف صحیح مفرد کے منجملہ (۵) حرف متبادل حروف کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ایک ہی حرف علت کے بجائے اپنے اپنے موقع محل پر استعمال ہوتے ہیں اور تلفظ میں دقیق فرق پیدا کرتے ہیں۔ اس سے لکھنے پڑھنے میں جو پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اس کی مختصر تشریح ذیل میں پیش ہے۔ رہی خود حرف علت کی بحث سو وہ حروف علت (سور) کے تحت جداگانہ پیش ہوگی۔

۲۱۔ ہندی حروف صحیح میں (۵) ورگ

ہندی حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ پہلے (۲۵) حرف (سپرش ورڑن) کہلاتے ہیں۔ باقی (۱۲) حروف کے منجملہ چار حرف (اَنتَھ ورڑن) اور چار حروف (اوشم ورڑن) کہلاتے ہیں جو چار حرف باقی رہے ان میں تین تو حرف مرکب ہیں (سَنیُکت ورڑن) جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دراصل ہندی حرف نہیں ہے۔ بلکہ مرہٹی سے مستعار لے لیا گیا ہے۔ اس لیے یہ باقی چار حرف کسی خاص قسم میں شمار نہیں ہوتے۔

بہرحال یہاں فی الوقت (سپرش ورڑن) کے (۲۵) حروف سے بحث ہے۔ سو یہ (۲۵) حروف جملہ (۵) ورگوں میں تقسیم ہیں اور ہر ورگ میں (۵) حروف جملہ (۵) ورگوں میں تقسیم ہیں اور ہر ورگ میں (۵) حرف شامل ہیں۔ علیٰ الترتیب۔ چنانچہ۔

۱۔ پہلا ورگ (ک) سے شروع ہوتا ہے اور (تورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (ڑن) ہے۔

۲۔ دوسرا ورگ (چ) سے شروع ہوتا ہے اور (چورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں

حرف (۔ ین) ہے۔

۳۔ تیسرا ورگ (ٹ) سے شروع ہوتا ہے اور (ٹورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (ڑ) ہے۔

۴۔ چوتھا ورگ (ت) سے شروع ہوتا ہے اور (تورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (ن) ہے۔

۵۔ پانچواں ورگ (پ) سے شروع ہوتا ہے اور (پورگ) کہلاتا ہے۔ اس کا آخری پانچواں حرف (م) ہی ہے۔

پانچوں ورگ کے یہی آخری (۵) حرف علت (ن ساکن) کے بجائے اپنے اپنے ورگ میں متبادل ہیں قاعدہ یہ ہے کہ (ن ساکن) کی آواز کے بعد کا حرف صحیح جس ورگ میں شامل ہو اسی ورگ کا آخری پانچواں حرف۔ حرف علت (ن۔ ساکن) کے بجائے لفظ میں استعمال ہوگا۔ البتہ ایک فرق ہے کہ حرف ایسی صورت میں صرف نصف لکھے جاتے ہیں اور باقی تین سالم رہتے ہیں یا دو نصف نصف۔ مگر ایک حرف بہرصورت سالم رہتا ہے۔

چند مثالوں سے مندرجہ بالا تقسیم بخوبی واضح ہو جائے گی۔ مثلاً اگر لفظ (پتنگ) لکھنا چاہیں تو چونکہ (ن ساکن) کی آواز کا حرف مابعد (گ) پہلے ورگ (کورگ) میں شامل ہے۔ اس لیے (ن ساکن کی علامت) کے بجائے پہلے ورگ کا آخری پانچواں حرف (ڑن) استعمال ہوگا۔ علیٰ ہذا لفظ (پلنگ) کو لکھیں گے۔ اس کے تلفظ کا بھی وہی حال ہے۔ مشق کی ضرورت ہے۔ علیٰ ہذا (گنگا) کو لکھیں گے۔ وہی موٹا غنغنا تلفظ ہے اور چند لفظ لیجیے جن کا تلفظ اُردو میں صاف سلیس ہے۔ مگر ورگ کے قاعدہ سے وہ ہندی میں موٹا غنغنا ہو جاتا ہے۔ جیسے (شنکر) یا (پنکھا) یا (کنگھا) پھر تلفظ کی دشواری کے سوا لفظوں کی شکل دیکھیے۔ اس سے ہندی حروف کی ترکیب میں بے محلی ظاہر ہوتی ہے۔ حروف کی ترکیبوں میں بکثرت ایسی بے محل شکلیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے کچھ آئندہ فصل سوم میں بیان ہوں گی۔

علیٰ ہذا دوسرے ورگ (چورگ) میں مقررہ قاعدہ کے بموجب حرف (ن ساکن کی علامت) کے بجائے حرف (ین) استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً (انجن) (منجن) (کنچن)

علیٰ ہذا تیسرے ورگ (ٹورگ) میں حرف (ن ساکن کی علامت) کے بجائے حرف (ڑ) استعمال ہوتا ہے، مثلاً (پنڈت) کو لکھیں گے۔ تکلف ظاہر ہے۔ علیٰ ہذا (کنٹھا) (ٹھنڈا)۔ (جھنڈا)۔ غرض کہ تلفظ موٹا

غنغنا ہو جاتا ہے۔

چوتھے اور پانچویں ورگ یعنی (تورگ اور پورگ) میں حرف (ن ساکن کی علامت) کے بجائے علی الترتیب حرف (ن) اور حرف (م) نصف نصف لکھے جاتے ہیں مثلاً (آنند) (اندھا) (بند) (انبا)۔

پھر یہ پانچوں حرف بجائے خود بھی متحرک استعمال ہوتے ہیں اگرچہ بعض کم ہوتے ہیں۔ ان میں دو حرف (ن) اور (م) کا تلفظ تو صاف ہے۔ لیکن پہلے تین حرف اور تلفظ میں غنغناہٹ ہے اور مشق کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً دوسرے حرفوں کی طرح حروف علت کے ساتھ ان کی گردان کیجیے تو تلفظ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان میں حرف (نڑ) بطور حرف صحیح متحرک باقی دو حرفوں کے مقابل زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ سب لفظوں میں غنغناہٹ ہے اور جب یہ حرف ترکیب میں دو مرتبہ متصل واقع ہو تو تلفظ کی غنغناہٹ مشکل سے گرفت میں آتی ہے۔ ایسے الفاظ کے تلفظ میں اچھے اچھوں کو مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۲۔ اُردو ہندی حرف صحیح کی آوازیں

حاصل کلام یہ ہندی کے (۳۷) حروف صحیح (ونجن) کے منجملہ کم از کم (۱۳) حرف تو مرکب (سنیکت) ہیں۔ باقی زیادہ سے زیادہ (۲۴) جو مفرد (شدھ) ہیں۔ ان میں بھی دو کی آواز (ش) از حد مشابہ ہے۔ گویا عملاً دونوں حرفوں سے ایک ہی آواز نکلتی ہے' البتہ حرفوں کے استعمال میں فرق رہتا ہے۔ جس سے لامحالہ حیرانی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے سوا حرف صحیح اور جو خود بھی ایک حد تک حرف مرکب ہیں۔ بیشتر حرف علت (ن ساکن) کے بجائے الفاظ میں کام دیتے ہیں۔ گویا معمولاً اس کے بدل یا قائمقام ہیں۔ پس ہندی میں عملاً حرف صحیح مفرد (۲۱) رہ جاتے ہیں اور اگر حرف (نڑ) بھی تلفظ کے مدنظر مرکب مان لیا جائے تو پھر ہندی میں حروف صحیح مفرد صرف (۲۰) قرار پاتے ہیں اور یہ وہی ہندی حرف ہیں جو اُردو حرف میں شامل ہیں۔

غرض اُردو کے (۳۷) یا کم از کم (۳۱) حروف صحیح کے منجملہ (۲۰) حرف صحیح حسب تفصیل بالا ہندی میں ملتے ہیں۔ رہے اُردو کے باقی (۱۷ یا ۱۱) حروف سو ان میں اوّل تو ہندی کا ایک حرف (ی) اُردو کے دو حرف (ی معروف وے مجہول) کی جگہ شمار ہوا ہے۔ دوسرے حرف (الف) ہندی کے حروف علت کے تحت شامل ہے اور باقی (۱۵) یا (۹) اُردو حروف حسب تفصیل ذیل ہندی میں ندارد ہیں۔ حالانکہ ہندی حروف کی مجموعی تعداد اُردو کے مقابل ڈیوڑھی ہے یعنی (۳۷) کے مقابل (۵۳) اور حروف صحیح بھی دونوں زبانوں میں

برابر ہیں (۳۷) (۳۷)۔

(الف) عام صاف اور واضح آوازیں (۹)۔ (ح) (خ) (ن) (ژ) (ع) (غ) (ف) (ق) اور حرف (ہ) ختم لفظ پر جیسے سینہ۔ شیشہ۔

(ب) دیگر خاص متشابہ آوازیں (۶) (ط) (ذ' ظ' ض) (ث' ص)

گویا یوں تو اُردو ہندی کے حروف صحیح بلحاظ تعداد (۳۷) (۳۷) مساوی ہیں۔ تاہم (۱۵) یا کم از کم (۹) صاف اور واضح آوازیں اُردو حروف کی ہندی حروف میں ندارد ہیں جو اُردو میں بکثرت مستعمل ہیں۔

اس کے مقابل سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کچھ ہندی حروف صحیح کی آوازیں اُردو حروف میں بھی ندارد ہیں۔ یا سب کی سب ادا ہوتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندی کے (۲۰) حروف صحیح مفرد کی آواز ہیں۔ اُردو حروف میں موجود ہیں۔ چنانچہ صراحت اوپر درج ہو چکی ہے۔ حروف صحیح مرکب میں بھی (۱۳) کے منجملہ (۱۰) آوازیں جو حرف (ھ) کی مرکب ہیں۔ اُردو میں بے تکلف استعمال ہوتی ہیں۔ بلکہ (ھ) کی مرکب آوازیں تو اردو میں ہندی سے کہیں بڑھ کر ادا ہوتی ہیں۔ چنانچہ تفصیل اوپر درج ہو چکی ہے۔ بہر حال ہندی حروف صحیح کی (۳۰) آوازیں (۳۷) کے منجملہ اُردو حروف میں ملتی ہیں۔

البتہ تین حرف مرکب یعنی (کش) (تر) اور (گین) کی آوازیں اُردو حروف میں نہیں ملتیں اور خود ہندی میں بھی یہ آوازیں خالی از تکلف نہیں ہیں۔ کہ رقیق ہیں۔ جن کے لکھنے پڑھنے میں احتیاط درکار ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا (مزید تین حرف یعنی (ڑن) (ین) اور (نڑ) جو کسی نہ کسی حد تک مرکب ہیں۔ گو مفرد شمار ہوتے ہیں۔ یہ بھی اُردو حروف میں نہیں ملتے۔ خاص وجہ یہ ہے کہ اُردو حروف تلفظ میں تمام تر مفرد ہیں۔ جن سے مرکب آوازیں بن سکتی ہیں۔ لیکن خود حروف کی آوازیں ہندی کی طرح مرکب نہیں ہیں۔ مزید برآں مذکورہ تینوں حروف کی آواز میں جو غنغناہٹ ہے وہ بھی ہندی زبان کی ایک خصوصیت ہے۔

المختصر ہندی حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ (۲۰) حروف مفرد کی آوازیں اُردو حروف میں معمولاً ملتی ہیں۔ مزید برآں (۱۰) حروف مرکب جن میں حرف (ھ) کی آمیزش ہے' ان کی آوازیں بھی اُردو میں بے تکلف استعمال ہوتی ہیں۔ البتہ (۶) ہندی حروف صحیح کی مرکب آوازیں جو یا تو رقیق ہیں یا غنغنی ہیں۔ اُردو میں بہ تکلف ادا ہو سکتی ہیں اور خود ہندی میں بھی یہ خالی از تکلف نہیں ہیں۔ نیز حرف (ش) ہندی میں دو مرتبہ شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ اُردو میں ایک مرتبہ شمار ہوا ہے۔ اس طرح ہندی حروف صحیح کی تعداد (۳۷) پوری ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اُردو حروف کی (۱۵) یا کم از کم (۹) مفرد آوازیں ہندی حروف میں ندارد ہیں اور ہندی حروف کی (۶) مرکب آوازیں اُردو حروف میں نہیں ملتیں۔ البتہ بہ تکلف ادا ہو سکتی ہیں اور خود ہندی میں بھی خالی از تکلف نہیں ہیں۔

اُردو حروف کی جو صاف اور واضح آوازیں ہندی حروف میں نہیں ملتیں۔ ان میں سے بعض آوازیں شامل کرنے کے واسطے ہندی حروف پر نقطوں کا اضافہ تجویز ہوا ہے۔ یعنی:

(خ) کے واسطے (کھ) پر نقطہ جیسے (خ)

(ز) کے واسطے (ج) پر نقطہ جیسے (ز)

(ع) کے واسطے (أ) پر نقطہ جیسے (ع)

(غ) کے واسطے (گ) پر نقطہ جیسے (غ)

(ف) کے واسطے (پھ) پر نقطہ جیسے (ف)

(ق) کے واسطے (ک) پر نقطہ جیسے (ق)

علیٰ ہذا باقی دو حروف بھی لفظوں کے ذریعے ہندی میں لا سکتے ہیں۔ یعنی

(ح) کے واسطے (ھ) پر نقطہ جیسے (ح)

(ژ) کے واسطے (ج) پر دو نقطے جیسے (ژ)۔

البتہ حرف (ھ) یا (ہ) کا معاملہ ٹیڑھا ہے۔ چنانچہ پارہ نمبر ۱۷ میں اور نیز اسی پارہ میں اس کی کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔

بہر حال ہندی حروف میں نقطوں کا استعمال بہت کم تھا۔ چنانچہ اپنے محل پر یہ صراحت درج ہے۔ لیکن زبان کی ضرورتوں نے بالآخر ہندی کو بھی حرفوں میں نقطے استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔

۲۳۔ ہندی حروف علت

اُردو حروف علت تحت پارہ (۱۴) اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ ہندی میں (۵۳) حروف کے منجملہ حروف علت (سُور) (۱۶) ہیں جو اس فصل میں تحت پارہ (۱۵) پہلے درج ہو چکے ہیں۔ اعادے کی ضرورت نہیں۔

حروف صحیح (وِینجن) کی طرح حروف علت (سُور) کی بھی ہندی میں دو قسمیں ہیں۔ یعنی مفرد

(شدھ) اور مرکب (سنیکت) سچ پوچھیے تو حروف مرکب ہی نے ہندی حروف کی تعداد بہت بڑھادی۔ شکلیں بہت بڑھادیں۔ ترکیب میں پیچیدگیاں بڑھادیں۔ ورنہ اُردو میں حروف کی تمام آوازیں مفرد ہیں اور مفرد آوازوں سے بیشتر مرکب آوازیں حسب ضرورت بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں ہندی کے مقابل حروف کی مجموعی تعداد کم ہے۔ یعنی (۵۳) کے مقابل (۳۷) لیکن آوازوں کی تعداد زیادہ ہے۔ آوازوں کی ترکیب میں سہولت زیادہ ہے اور ترکیب کی شکلیں بھی سادہ مختصر ہیں۔ چنانچہ کچھ صراحت اوپر پیش ہو چکی ہے۔

سولہ (۱۶) حروف علت کے منجملہ (۱۰) حروف میں (۵) حروف مفرد و مرکب ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

شدھ سور	سنیکت سور
اَ	آ
اِ	ای
او	اُو
رِر	رری
لِر	لری

مندرجہ بالا تقسیم کے سوا باقی (۶) حرف علت بھی مرکب (سنیکت) ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

اے	ائی
او	اؤ
اں	اہ

المختصر (۱۶) حرف علت (سور) کے منجملہ صرف (۵) حرف مفرد (شدھ) ہیں اور باقی (۱۱) مرکب (سنیکت) ہیں۔ حالانکہ اُردو میں ان تفریقات کی ضرورت نہیں۔ تین حرف علت جو مفرد ہیں اور ان کے چند اعراب تقریباً تمام آوازیں ادا کر دیتے ہیں۔ سوائے (ر) کی مندرجہ بالا چار آوازوں کے جو خود ہندی میں بھی رقیق ہونے کے سبب باعث تکلف شمار ہوتی ہیں اور یوں بھی وہ تلفظ کے معیار پر حرف (ر) سے متعلق ہیں۔ حروف علت میں ان کا شمار خالی از تکلف نہیں ہے۔

الحاصل حرف صحیح ہوں یا حرف علت۔ اُردو میں سب مفرد ہیں، لیکن ہندی میں بلحاظ تلفظ تقریباً نصف حروف مفرد ہیں اور باقی نصف مرکب۔ نتیجہ یہ کہ ہندی حروف کی مجموعی تعداد اُردو سے ڈیوڑھی ہے۔

لیکن مفرد آوازیں اُردو حروف کی ہندی سے ڈیوڑھی ہیں اور ان سے حسب ضرورت مرکب آوازیں بن جاتی ہیں۔ چنانچہ تفصیل اوپر درج ہو چکی ہے۔

۲۴۔ ہندی حروف علت کی علامات یعنی ماترا

پھر ہندی حروف علت کی علامات (ماترا) بھی ہیں جو حروف صحیح کے ساتھ استعمال ہوتی ہیں۔ صرف پہلے حرف علت کی کوئی ماترا نہیں کہ ہر حرف کے آخر میں مضمر رہتا ہے۔

	حرف علت (سور) علامت (ماترا)	مثال
(الف)	(ا)	(کَ)
	(آ)	(کا)
	(اِ)	(کِ)
	(اِی)	(کی)
	(اُ)	(کُ)
	(اُو)	(کُو)
	(اے)	(کے)
	(اَی)	(کَی)
	(او)	(کو)
	(اوَ)	(کوَ)
(ب)	(رِ)	(کِر)
	(رِی)	(کری)
	(لِر)	(کلر)
	(لری)	(کلری)

(ج) باقی رہے دو حروف علت (ان۔ن ساکن) اور (اہ۔ہ۔ساکن)۔ پہلے حرف کی علامت (T) ہے جو (انسوار) کہلاتی ہے۔ اور دوسرے حرف کی علامت (:T) ہے جو (وِسَرگ) کہلاتی ہے۔ خلاصہ: یہ کہ حروف علت کی علامات (ماترا) کی تعداد بھی حروف کے برابر (۱۶) ہے۔

یہاں یہ یاددہانی بے محل نہ ہوگی کہ حرف علت (ن ساکن) کے استعمال کی پانچ صورتیں وہ ہیں جو (۵) ورگوں کے تعلق سے تحت پارہ (۲۱) اوپر بیان ہو چکی ہیں اور ہر صورت میں یہ حرف بطریق بدل ایک جداگانہ شکل اختیار کرتا ہے۔

علیٰ ہذا حرف (ر) کا استعمال بھی ہندی میں دقیق اور پیچیدہ ہے کہ بڑے بڑے عاجز رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ متعدد صورتوں کی منجملہ چار پیچیدہ صورتیں تو اوپر اسی پارہ میں اور نیز پارہ (۲۳) میں بیان ہو چکی ہیں۔ یعنی حرف علت (رر) (رری) (لر) اور (لری) اور ان کی چار ماترا۔ جو اوپر درج ہو چکی ہیں۔ تلفظ میں تحریر میں ترکیب میں طوالت و پیچیدگی پیدا کرتی ہیں بلکہ الفاظ کو چیستاں بنا دیتی ہیں۔ ان کے سوا مزید صورتیں آگے درج ہیں۔

بہرحال دو حروف (ن) اور (ر) کی طوالت اور پیچیدگیوں کی مزید تفصیل اسی فصل میں آئندہ پیش ہوگی۔ (ملاحظہ ہو پارہ نمبر ۲۷، ۲۸)۔

۲۵۔ اُردو ہندی حروف علت کا تقابل

تفصیل بالا سے واضح ہوگا کہ ہندی میں حروف علت اور ان کی علامات کا سلسلہ بھی خاصا طویل ہے اور ایک حد تک دقیق و پیچیدہ ہے۔ اس کے مقابل اُردو میں حروف علت صرف (۳) ہیں۔ یعنی (الف) (و) اور (ی) جن کا مجموعہ (وائے) کہلاتا ہے۔ پھر (و) اور (ی) میں ہر ایک کی دو قسم ہیں۔ (معروف) و (مجہول)۔ اُردو میں معروف (ی) لکھتے ہیں اور مجہول (ے) چنانچہ اسی بنا پر یہ دو حرف جداگانہ شمار ہوئے۔ البتہ (و) معروف ہو یا مجہول ایک ہی شکل میں لکھا جاتا ہے اور حرکت ماقبل سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا علامات (اعراب) بھی ان حرفوں کی مناسبت سے (۳) ہیں یعنی (زبر) (زیر) (پیش) حرکات میں حرف (ء) کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے اور اس مختصر مجموعہ سے ہندی کے دس (۱۰) حروف علت اور دس (۱۰) علامات کا کام بیشتر نکل جاتا ہے اور کہیں بالفرض کچھ خفیف فرق رہ جائے تو سہولت و اختصار کے مدنظر وہ چنداں قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی خاطر تلفظ میں دقت و پیچیدگی بڑھائی جائے جس کی اصلاح میں خود ہندی والے فکرمند ہیں۔

باقی رہے (۶) حرف علت جو مد (الف) کے بعد مد (ب) اور مد (ج) میں پارہ (۲۴) کے تحت اوپر درج ہو چکے ہیں۔ اول تو بلحاظ تلفظ ان کو حرف علت شمار کرنا ہی غور طلب ہے۔ دوسرے ان میں سے (۴)

حرف مد (ب) کی آوازیں جو حرف (ر) سے متعلق ہیں اوپر بیان میں آچکی ہیں کہ وہ کس درجے باعث طوالت ہیں اور ان کے رقیق تلفظوں میں فرق کس درجے دشوار ہے۔ تاہم یہ حروف سنسکرت ہندی کی خصوصیت ہیں۔ ان کے سوا باقی دو حروف علت اُردو میں یوں ہی بلا تکلف ادا ہوتے ہیں۔

۲۶۔ اُردو اعراب کی بعض خصوصیات

غرض کہ ہندی حروف علت کا کام اُردو حروف علت سے بڑی حد تک چل جاتا ہے اور بآسانی چل جاتا ہے لیکن اُردو اعراب کی بعض خوبیاں اور سہولتیں ہندی میں بالکل ندارد ہیں۔ مثلاً تشدید (ّ) کے استعمال سے ہندی ناواقف ہے۔ نتیجہ یہ کہ ایک ہی حرف دو مرتبہ لکھنا پڑتا ہے، جس سے طوالت کے سوا تحریر میں بدنمائی پیدا ہوتی ہے۔

غرض کہ ہندی میں علامت تشدید (ّ) نہ ہونے سے تحریر میں عجیب عجیب طوالتیں پیش آتی ہیں جن کی مزید کیفیت ترکیب حروف کے تحت فصل سوم میں بیان ہوگی۔

علیٰ ہذا ہندی میں (ہ) کا استعمال بھی ندارد ہے۔ جو لفظ کے آخر میں لگتی ہے اور اعراب میں فتحہ یعنی زبر کا ساتھ دیتی ہے۔ مثلاً (شیشہ) لیکن ہندی میں لکھنا چاہیں تو (شیش) لکھیں گے یا (شیشا) یا (شیشاہ) یا (شیشھ) لیکن (شیشہ) نہیں لکھ سکتے۔ علیٰ ہذا سینہ۔ آئینہ۔ راجہ جیسے الفاظ نہیں لکھ سکتے۔ جن کے آخر میں (ہ) شامل ہو اور زبر کا ساتھ دیتی ہو۔

ہندی میں علامت جزم (ْ) بھی ندارد ہے۔ متعلقہ حروف کو بالعموم نصف کر کے سکون کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً (عَلَم) اور (عِلم) یا (مَلَک) اور (مُلک) بہر حال نصف حروف کی بے محلی ظاہر ہے۔ اس کے سوا بھی جزم نہ ہونے کے سبب ترکیب میں حروف کی بے محل شکلیں پیدا ہوتی ہیں جن کی ضروری کیفیت فصل سوم میں پیش ہوگی۔ اُردو ہندی حروف علت کی بحث فصل دوم میں بھی تحت پارہ (۳۷) درج ہے۔

۲۷۔ ہندی میں حرف (ن) کی طوالت

ہندی میں حرف (ن) کے تلفظ میں اور تحریر میں جو پیچیدہ فرق پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیت ذیل میں ملاحظہ طلب ہے:

اوّل تو ہندی میں حرف (ن) کی دو کیفیتیں ہیں۔ ایک تو وہ حرف صحیح ہے (وِینجَن) اور حرف متحرک ہے۔ (اَنْجَنت ورڑن) یعنی (ن متحرک)۔

دوسرے وہ حرف علت ہے۔(سوَر)اورحرف ساکن ہے(ہلنت ورڑن)یعنی(ن ساکن)۔

ہندی حروف صحیح (۳۷) کے منجملہ پہلے (۲۵) حرف (سپرس ورڑن) کہلاتے ہیں اور وہ (۵) ورگوں میں مساوی طور پر (۵) (۵) تقسیم ہیں اور ہر ورگ میں حرف علت یا اس کی ماترا کے بجائے ورگ کا آخری پانچواں حرف استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ صراحت اوپر تحت پارہ (۲۱) درج ہو چکی ہے۔

ورگوں کے (۲۵) حرفوں کے سوا جو باقی حروف صحیح ہیں۔ان کے ساتھ ترکیب میں (ن ساکن) کے واسطے چار شکلیں مستعمل) ہیں:

۱۔ جیسے (انجن)

۲۔ ماترا جیسے (نندی) پھندا

۳۔ (نصف) جیسے (ہندی) (بندی)
(کلنتھا)

۴۔ (علامت چندر بندو) جیسے (بانس) (بنگلا)

غرض کہ (ن ساکن ماترا) کی ہندی میں (۹) شکلیں رہتی ہیں۔(۵) شکلیں (۵) ورگوں میں اور (۴) شکلیں ان کے سوا باقی حروف صحیح کے ساتھ حسب صراحت بالا اور ہر شکل کا موقع محل سمجھنا ضرور ہے۔ بعض شکلوں کے موقع محل میں امتیاز کرنا بہت دشوار ہوتا ہے جبکہ تلفظ میں ذرا بھی فرق معلوم نہ ہو۔جیسے (نندی) اور (بندی)۔

پھر (۳) حروف مرکب (سَنیُکت) ورڑن) کے منجملہ ایک حروف (گین) میں بھی حرف (ین) شامل رہتا ہے اور خود حرف (ین) بھی حرف (ن) کی ایک خاص شکل ہے۔

پس تفصیل بالا سے واضح ہوگا کہ حرف علت (ن ساکن یا ماترا) ہندی میں (۱۰) شکلیں اختیار کرتا ہے اور ہر شکل کا موقع محل جدا ہے اور ہر شکل میں تلفظ جدا ہے لیکن اکثر تلفظ ایسے دقیق یا رقیق ہیں کہ۔یا تو ان کا ادا کرنا دشوار ہے یا ان میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔چنانچہ صراحت اوپر درج ہو چکی ہے۔

حرف صحیح (ن) اگر کسی لفظ کے آخر میں واقع ہو تو بحالت سکون اس کی دو آوازیں ہو سکتی ہیں۔ ایک خالی ایک بھری۔خالی میں کے نیچے ایک علامت لگاتے ہیں جیسے (ماں) اور بھری میں کسی علامت کی ضرورت نہیں۔جیسے (مان) اُردو میں یہ فرق (ن) کے نقطے سے ظاہر کرتے ہیں۔بھرے (ن) میں نقطہ لگاتے ہیں جیسے (مان) خالی (ں) میں نقطہ نہیں لگاتے جیسے (ماں)۔

خلاصہ یہ کہ ہندی میں بلحاظ تلفظ و تحریر و ترکیب حرف (ن) کی جملہ دس بارہ شکلیں ہیں جن کے استعمال میں مبتدی تو کیا متوسط بھی حیران رہتے ہیں اور منتہی کو بھی توجہ درکار ہوتی ہے۔

۲۸۔ ہندی میں حروف (ر) کی طوالت

پھر حرف (ر) کا استعمال ہندی میں حرف (ن) سے بھی زیادہ طویل و پیچیدہ ہے۔ چنانچہ مختصر کیفیت ملاحظہ طلب ہے۔

اوّل تو حرف (ر) خود ایک حرف صحیح ہے۔ (وِینجن) اور حرف متحرک ہے (اجنت ورڑن) پھر حرف صحیح (تر) جو حرف مرکب ہے۔ (سنیکت ورڑن) اس میں بھی حرف (ر) مضمر ہے اور وہ تلفظ میں آتا ہے مثلاً (ماترا) پھر چار حرف علت ہیں (سوَر) جن میں داخل ہے۔ ان چار میں بھی دو مفرد ہیں۔ (شدّہ) اور دو مرکب (سنیکت) چنانچہ صراحت پہلے درج ہو چکی ہے۔ وہ چار حرف یہ ہیں۔

حرف مفرد	حرف مرکب
(رِر)	(رری)
(لر)	(لری)

گویا حرف (ر) کی (۶) شکلیں ہیں۔ ایک صحیح مفرد۔ ایک صحیح مرکب۔ دو علت مفرد، دو علت مرکب اور پھر ان کے تلفظ میں، ان کی تحریر میں ایسے دقیق فرق ہیں کہ اچھے اچھے چکراتے ہیں۔ غریب مبتدی یا متوسط کا تو ذکر کیا ہے۔

الحاصل حرف کی (۶) شکلیں بحیثیت حرف اور (۱۰) شکلیں بحیثیت علامات (ماترا) استعمال ہوتی ہیں۔ گویا (۱۶) شکلیں ہیں۔ حروف علت کی ماترا (۴) کے بجائے (۲) رکھیں کہ باقی دو خود حروف متعلقہ کی ہم شکل ہیں تو بھی تعداد ۱۴ رہتی ہے اور دقیق نظر میں تعداد بڑھ سکتی ہے۔ لیکن طوالت منظور نہیں۔ عام شکلوں پر اکتفا کی گئی اور ان ہی شکلوں کے تلفظ میں فرق کرنا۔ تحریر میں فرق کرنا، کافی حیران کن ہے۔ تاہم یہ فرق اپنی جگہ محکم و مسلم ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا غلطی کا موجب ہوتا ہے۔

۲۹۔ ہندی میں حرف (ڑ) مستعار

ہندی زبان میں حرف (ڑ) نہیں ہے۔ بلکہ حرف جو حروف صحیح کی فہرست میں درج ہے۔ وہ دراصل مرہٹی زبان کا حرف ہے۔ البتہ ہندی میں دو حرف ایسے ہیں جن کے تلفظ میں (ن غنہ) اور نرم (ڑ) کی

آواز (ر) کے قریب ملی رہتی ہے۔ ان حروف کا بھی صحیح تلفظ دشوار ہے۔ کافی تکلف درکار ہوتا ہے۔ یعنی (ڑن) اور (نڑ) ان کی مزید کیفیت سابق میں بیان ہو چکی ہے۔ ان کی حیثیت بھی تقریباً حرف مرکب (سنیکت ورڑن) کی ہے۔ گرچہ یہ حرف مفرد (شدھ ورڑن) شمار ہوتے ہیں۔

۳۰۔ ہندی میں آخری حرف علّت (اہ)

سولہ (۱۶) حروف علت کے منجملہ آخری حرف علت ہندی میں (اہ) ہے۔ اوّل تو تلفظ کے معیار سے اس کا حرف علت ہونا غور طلب ہے۔ دوسرے یہ حرف بھی بعض دیگر حروف علت کی طرح مفرد نہیں مرکب ہے۔ تقریباً یہی آواز اُردو میں حرف (ہ) سے نکلتی ہے۔ جیسے: (پُنَہ) اور (مُنہ)۔

ہندی میں حرف (ھ۔ہ) کے تلفظ میں تحریر میں کیا دقت اور طوالت پیش آتی ہے اور اُردو کے مقابل کیا خامی اور کمی ہے۔ سابق میں تحت پارہ (۱۷) کیفیت درج ہو چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

المختصر ہندی کے (۱۶) حروف علت کا بیشتر کام اُردو کے (۳) حروف علت سے بعض دیگر حروف کے ساتھ بڑی حد تک نکل جاتا ہے۔ رہی حرف (ر) کی دقت سو وہ تلفظ و تحریر میں خود ہندی پر بار ہے۔ اُردو حروف میں ایسے تلفظ کی کمی عملاً کمی نہیں سمجھی جاتی۔

۳۱۔ ہندی حروف میں تلفظ وتحریر کی پیچیدگی

اوپر جو کچھ کیفیت پیش ہوئی اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی حروف کے تلفظ میں اور تلفظ کے تحت تحریر میں کیا طوالت و پیچیدگی لاحق ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ طوالت و پیچیدگی کی صرف عام شکلیں بیان کی گئی ہیں۔ ورنہ ان کے بعد اور بھی مراحل پیش آتے ہیں۔ چنانچہ ان مراحل کا علم و عمل ایک خاص فنی شعبہ ہے جو ہندی قواعد میں (سندھی) کہلاتا ہے۔ حروف علت کے (گن) اور (وردھی) اور پھر حروف علت کی تفریق وترکیب اور ان کے تلفظ و تحریر میں تغیر و تبدل علیٰ ہذا حروف صحیح کی تفریق وترکیب اور ان کے تلفظ و تحریر میں تغیر وتبدل اور ان کے ساتھ آخری دو حروف علت اور ان کی ماترا کا استعمال۔ یہ جملہ مباحث فنی حیثیت سے علم وتحریر میں طویل و پیچیدہ ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ایک فنی شعبہ شمار ہوتے ہیں۔ (سندھی) جس پر اچھے اچھوں کو عبور کم حاصل ہوتا ہے۔ اسی سبب سنسکرت عبارت لکھنے پڑھنے میں بڑی احتیاط اور توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بھی چیستان معلوم ہوتی ہے۔ یہاں فن (سندھی) کے متعلق سرسری اشارہ پر اکتفا کی گئی۔ تفصیل کا تو ذکر کیا۔ اجمال کی بھی گنجایش نہیں کہ ناواقفوں کو حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جن کو شوق ہو سنسکرت کی قواعد کا مطالعہ کریں۔

چونکہ ہندی کی بنیاد سنسکرت ہے۔ عبارت میں بھی اور رسم الخط میں بھی۔ لہٰذا سنسکرت کی خصوصیات ہندی میں منتقل ہوتی ہیں۔ بمدارجِ مختلفہ حسب معیار عبارت۔

۳۲۔ سنسکرت کی تخصیص

سنسکرت میں تلفظ تحریر اور ترکیب کی تفریقیں اور پیچیدگیاں جو حیران کن پائی جاتی ہیں ممکن ہے کسی حد تک اس کا باعث قدامت کی خامی ہو۔ تاہم بڑی حد تک وہ ارادی معلوم ہوتی ہیں۔ وجہ یہ کہ سنسکرت ایک قدم مذہبی مقدس زبان ہے۔ جس کا لکھنا پڑھنا بھی ایک مذہبی مقدس جماعت کا مخصوص کام تھا۔ وہی جماعت زبان کی دقیق وطویل پیچیدگیوں کی ماہر ہوسکتی تھی اور لوگوں کو دھرم کا گیان دے سکتی تھی۔ اسی سبب اپنے زمانے میں بھی سنسکرت عام زبان نہ تھی بلکہ خاص مذہبی مقدس زبان تھی اور مذہب کے طفیل میں ادبی وعلمی شعبوں میں بھی خاص اہتمام سے استعمال ہوتی تھی۔ گویا اپنے مقصد ومرتبہ کے لحاظ سے دقت وپیچیدگی سنسکرت کی خوبی تھی کہ زبان ماہرین کے واسطے مخصوص تھی اور دوسروں سے محفوظ۔

حاصل کلام یہ کہ ہندی حروف تلفظ میں تحریر میں ترکیب میں، تفریقوں اور پیچیدگیوں کے طویل سلسلے رکھتے ہیں۔ جن کی مختصر کیفیت کچھ اوپر بیان ہوئی اور کچھ آگے بیان ہوگی۔ تاکہ رسم الخط کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

فصل دوم

حروف کی شکلیں

(ورڑن آکار)

۳۳۔ اُردو حروف کی شکلیں

یوں تو اُردو میں حروف کی مجموعی تعداد (۳۷) ہے۔ لیکن حروف کی شکلیں تعداد میں صرف (۲۰) ہیں۔ اس کفایت کا راز یہ ہے کہ مشابہ حروف میں نقطوں سے خوب کام لیا گیا ہے۔ دو ایک حروف میں دوسرا فرق رہتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

۱	ا(الف)	۷	ص(ض)
۲	ب(پ ت ٹ ث)	۸	ط(ظ)
۳	ح(ج۔چ۔خ)	۹	ع(غ)
۴	د(ڈ۔ذ)	۱۰	ف
۵	ر(ڑ۔ز۔ژ)	۱۱	ق
۶	س(ش)	۱۲	ک(گ)
۱۳	ل	۱۷	ہ
۱۴	م	۱۸	ء
۱۵	ن	۱۹	ی
۱۶	و	۲۰	ے

اُردو میں کمی تعداد کے سوا اشکال حروف کی تین خصوصیات اور بھی ہیں جو ہندی حروف کے مقابل فایق ہیں۔ اول یہ کہ ہر حرف کی ایک ہی شکل ہے۔ یہ نہیں کہ بعض حروف کی دو دو شکلیں ہوں۔ دوم یہ کہ شکلیں سادہ مختصر ہیں۔ طولانی پیچیدہ نہیں ہیں۔ تیسرے حروف کی شکلیں ایک دوسرے سے بخوبی مختلف اور ممیز ہیں، کچھ حروف مشابہ ضرور ہیں جن میں نقطوں وغیرہ کے ذریعے صاف امتیاز رہتا ہے لیکن اُردو میں یہ نہیں کہ حروف شکلوں میں متشابہ ہوں اور لکھنے پڑھنے میں اشتباہ پیدا کریں۔ اس کی مزید تشریح ہندی حروف کے تحت آگے پیش ہوگی۔ اگر علیحدہ سرسری طور پر لکھے جائیں تو اُردو میں صرف دو حروف متشابہ ہو سکتے ہیں۔ یعنی (د) اور (و) لیکن ترکیب میں یہ حرف بھی ممیز ہو جاتے ہیں مثلاً والد۔ خالو۔

۳۴۔ ہندی حروف کی شکلیں

ہندی حروف کی مجموعی تعداد (۵۳) ہے اور ان کی شکلیں بھی جدا جدا (۵۳) ہیں۔ چنانچہ فصل اوّل میں تحت پارہ (۱۵) درج ہیں۔ بلکہ شکلیں (۵۳) سے زیادہ ہیں کہ بعض حروف دو دو شکلیں رکھتے ہیں۔

غرض کہ سات آٹھ حروف دو دو شکلیں رکھتے ہیں۔ اگر ان کی مزید شکلیں بھی شامل کی جائیں تو اشکال حروف کی مجموعی تعداد کم وبیش (۶۰) ہو جاتی ہے۔ گویا اُردو اشکال (۲۰) کے مقابل سہ چند۔ وجہ یہ کہ

نقطوں سے امتیاز حروف میں کام نہیں لیا گیا۔ ہندی میں صرف (۳) حروف کے ساتھ نقطہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دو حرف علت اور ایک حرف صحیح۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ حروف علت میں (۱۶) کے منجملہ (۹) حروف میں باقی (۷) حروف کے ساتھ قریبی مشابہت ہے۔ اس مشابہت کے مدنظر اشکال کی مجموعی تعداد (۶۰) کے بجائے (۵۱) بھی شمار ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اُردو سے ڈھائی گنا رہتی ہے۔

پھر ایک ہی نظر میں واضح ہو جاتا ہے کہ ہندی حروف کی شکلیں طولانی اور پیچیدہ ہیں۔ حروف دیکھنے میں بیل بوٹے معلوم ہوتے ہیں جن کی نقشہ کشی کے لیے مشق کی ضرورت ہے اور بہرصورت تحریر کے واسطے زیادہ وقت اور زیادہ جگہ درکار ہے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی جگہ میں جلدی سے صاف حرف لکھ لیں۔ اس مجبوری سے بعض جماعتیں خاص کر ساہوکار، مہاجن اپنے کاروبار میں ہندی کو مروڑ کر مختصر لکھتے ہیں اور یہ مہاجنی تحریر دوسرے ہندی داں بہت کم سمجھ سکتے ہیں۔

غرض کہ اُردو کے مقابل ہندی تحریر کی گئی زیادہ طویل اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ جو زیادہ وقت اور جگہ لیتی ہے اور مشکل سے ذہن میں جمتی ہے۔ مشق کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

ہندی حروف کی شکلوں میں دو علامات مشترک ہیں۔ ایک تو ہر حرف کے اوپر پٹ لکیر کھینچتے ہیں۔ مثلاً (———) جس کو اصطلاحاً (ریکھا) کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ (ریکھا) پر (ماترا) بھی لگتی ہے۔ اس کی ہمواری برقرار نہیں رہتی۔

دوسری علامت یہ کہ بعض حروف کے آخر میں کھڑی لکیر بھی لگی رہتی ہے اس لکیر کو اصطلاحاً (پائی) کہتے ہیں۔ لیکن بعض حروف میں یہ لکیر نہیں رہتی۔ واضح ہو کہ وہی کھڑی لکیر پائی مانی جاتی ہے اور جو حرف کے آخر میں لگی ہو۔ اگر حرف کے وسط میں لگی ہو تو وہ پائی شمار نہ ہوگی۔ بعض حروف دو شکل میں لکھے جاتے ہیں۔ ایک شکل میں پائی رہتی ہے۔ دوسری میں نہیں رہتی حروف میں پائی ہونے نہ ہونے کا اثر حروف کی ترکیب پر بہت پڑتا ہے۔ جملے کے ختم پر جو کھڑی لکیر الگ بنا دیتے ہیں بطور فل اسٹاپ اس کو اصطلاحاً (وِرام) کہتے ہیں۔

۳۵۔ ہندی حروف کی متشابہ شکلیں

ہندی میں حروف کی شکلیں کثیر اور طولانی ہونے کے سوا۔ متشابہ بھی زیادہ ہیں۔ سرسری تحریر میں ان کی تمیز دشوار ہوتی ہے اور اکثر اشتباہ ہوتا ہے۔ جو صرف عبارت کی مدد سے حل ہو سکتا ہے۔

غرض کہ ہاتھ روک کر نوک پلک کے ساتھ حروف لکھے جائیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ معمولاً سرسری طور پر تیز لکھیئے تو ہندی حروف شکل میں بآسانی متشابہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ تلفظ اور ترتیب حروف ہجا میں بہت مغائر ہیں۔ پس یہ عام خیال صحیح نہیں ہے کہ ہندی میں غلط پڑھنا ممکن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس غلط پڑھنے کا امکان زیادہ رہتا ہے اور غلط لکھنا تو اور بھی آسان رہتا ہے کہ صحیح لکھنا دشوار ہے۔

۳۶۔ اُردو ہندی حروف میں مشابہ اور متشابہ شکلوں کا فرق

اس موقع پر ایک امر کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے جس کی طرف اوپر اشارے ہو چکے ہیں وہ یہ کہ اُردو کے متعدد حروف شکل میں مشابہ ہیں۔ بالعموم نقطوں سے یا بعض دیگر علامات سے ان میں تفریق و تمیز ہوتی ہے۔ مثلاً (ب) (پ) یا (ت) (ث) یا (ج) (چ) یا (د) (ڈ) یا (ک) (گ) لیکن ان حرفوں کا مشابہ ہونا خود باقاعدہ مقرر و مسلم ہے اور ترتیب حروف ہجا میں بھی ایسے مشابہ حروف کو متصل رکھا ہے۔ تاکہ ان کی مقررہ و مسلمہ مشابہت اور تفریق بخوبی ذہن نشین رہے۔ پس نقطہ ہو یا نہ ہو مقررہ و مسلمہ ربط کے سبب عبارت میں بآسانی ان کی تمیز ہو جاتی ہے۔ پھر اس مشابہت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ حروف کی شکلیں تعداد میں گھٹ گئیں۔ لیکن ہند میں حروف مشابہ نہیں بلکہ متشابہ ہیں۔ یہ حروف اپنی اپنی جداگانہ شکلیں رکھتے ہیں۔ اسی سبب شکلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے باہم اُردو کی طرح مشابہت کا کوئی ربط مقرر و مسلم نہیں ہے۔ اسی سبب شکلوں میں بھی کمی نہ ہو سکی۔ ترتیب میں بھی اُردو کی طرح ایسے متشابہ حروف ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں کہ ان کے باہم کوئی ربط ملحوظ رہے۔ بلکہ حروف ہجا کی ترتیب میں منتشر ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بے ربط متشابہ حروف کی سرسری تحریر میں بآسانی اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔

۳۷۔ اُردو اعراب اور ہندی ماترا کا استعمال

اُردو ہندی حروف علت اور ان کی علامات ضروری تفصیل کے ساتھ فصل اول میں تحت پارہ جات (۲۳ تا ۲۶) بیان ہو چکے ہیں۔ پھر ان کے علاوہ حرف (ن) اور حرف (ر) کی بعض شکلیں ترکیب میں ماترا جیسی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ چنانچہ ان کی صراحت بھی فصل اوّل میں تحت پارہ جات (۲۷و۲۸) درج ہے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے واضح ہوگا کہ اُردو میں حرف علت صرف (۳) ہیں اور اعراب کی تعداد بھی صرف (۲) ہے۔ ان کے مقابل ہندی میں حروف علت کی تعداد (۱۶) ہے اور ان کی علامات (ماترا) بھی (۱۶) ہیں جن میں دو حرف خود ہی بطور ماترا بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی (لر) اور (لری) علامات کی

تعداد کم وبیش (۲۴) ہو جاتی ہے۔ یعنی اُردو علامات (٦) کے مقابل چار گنہ۔ بریں ہم ہندی علامات کے تقریباً تمام تلفظ اُردو میں ادا ہو جاتے ہیں۔ سوائے چند رقیق اور پیچیدہ تلفظ کے اور خود ہندی میں بھی باعث طوالت و دشواری محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصلاح پسند جماعت خود طوالت اور پیچیدگی رفع کرنے کی فکر میں ہے۔ تاہم ہندی کی نوشت وخواند میں دشواری کم ہو۔

مزید برآں اُردو اعراب کی بعض خوبیاں بھی ہندی میں ندارد ہیں۔ مثلاً علامت تشدید (ّ) نہ ہونے سے تحریر و ترکیب میں بہت طوالت بڑھتی ہے۔ جس کی مختصر کیفیت اوپر تحت پارہ (۲٦) بیان ہو چکی ہے اور مزید فصل سوم میں بیان ہوگی۔ علامت جزم ( ) کا استعمال بھی ہندی میں باقاعدہ نہیں ہے۔ حرف (ہ) بھی لفظوں کے آخر میں بالفتحہ نہیں رہتی۔ جس کے سبب بعض عام تلفظ ہندی میں ادا نہیں ہوتے جیسے راجہ، باجہ، سینہ، شیشہ۔

پھر اعراب اور ماترا کے محل بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ اُردو میں اعراب کے دو محل مقرر ہیں۔ متعلقہ حروف کے اوپر جملہ اعراب لگتے ہیں۔ صرف ایک اعراب (کسرہ یا زیر) حرف کے نیچے لگتا ہے۔ لیکن ہندی میں ماترا کے محل متعدد رہتے ہیں۔

بہرحال اُردو کی طرح ہندی میں ماترا کے محل سہل اور معین نہیں ہیں، بلکہ مختلف محلوں پر ماترا لگتی ہیں جن کو سمجھنا یاد رکھنا ضروری ہے۔

اُردو اعراب اور ہندی ماترا میں ایک عملی فرق یہ بھی ہے کہ اعراب لگانا اُردو میں امر اختیاری ہے، حسب ضرورت اعراب لگا سکتے ہیں لیکن لگانا لازم نہیں اور چونکہ اُردو میں تلفظ تحریر اور ترکیب نسبتاً صاف اور سہل ہے۔ اعراب کی ضرورت کم پیش آتی ہے۔ اس کے برعکس ہندی تحریر میں ماترا لگانا لازم ہے۔ تلفظ کے اعتبار سے ماترا ضرور لگتے ہیں۔ ترک نہیں کر سکتے۔ اس سبب سے بھی ہندی تحریر میں طوالت بڑھی رہتی ہے۔

فصل سوم

حروف کی ترکیبیں

(ورڑن سنیوگ)

۳۸۔ اُردو حروف کی ترکیب اور اصلاح کی تحریک

اُردو میں ترکیب حروف کی شکلیں سہل اور مختصر ہیں۔ بآسانی عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

۱۔ (الف) (د) (ڈ) (ذ) (ر) (ڑ) (ز) (ژ) اور (و) یہ (۹) حروف جن کی صرف

(۴) شکلیں ہیں۔ یعنی (ا۔د۔ر۔و) کسی حرف مابعد سے تحریر میں نہیں ملتے۔ البتہ حرف ماقبل سے ملتے ہیں اور آپس میں تو کسی صورت میں نہیں ملتے۔ تحریر میں جدا جدا رہتے ہیں۔

۲۔ مندرجہ بالا (۹) حروف کے سوا باقی جملہ حروف حرف ماقبل اور حرف مابعد سے تحریر میں بے تکلف ملتے ہیں۔ صرف دو حرف یعنی (ع) (غ) کی شکل درمیان میں اور آخر میں کسی قدر بدل جاتی ہے۔ جیسے (معطل۔ ملمع) یا (مغل۔ بلیغ) اور (ک) کی شکل بھی (الف) اور (ل) کے ماقبل گول بنتی ہے جیسے (کام) (کل۔ شکل)۔ باقی حروف کی شکل ترکیب میں وہی اصل قائم رہتی ہے۔

الفاظ میں جو حروف کی ترکیب پیش آتی ہے تو ترکیب میں حروف کی کرسی اور نشست ایک اہم بحث بن جاتی ہے۔ اُردو میں بصورت ترکیب حرف (ح) اور اس کے ہم شکل حروف (ج۔چ۔خ) کے ماقبل ہر حرف کی کرسی ایک درجہ اونچی رہتی ہے اور بحثیت حرف مابعد خود ان حروف کی کرسی ایک ایک درجہ نیچی رہتی ہے۔ باقی جملہ حروف باہم ایک نشست قبول کر لیتے ہیں۔

ترکیب میں اُردو حروف کی چند دیگر خصوصیات بھی قابل ذکر ہیں۔ مثلاً بعض حروف کے آخر میں دائرے ہیں۔ جیسے (ح، س، ع، ق، ن، ی) اگر ایسے حروف ترکیب کے شروع میں یا درمیان میں واقع ہوں تو دائرے ترک ہو جاتے ہیں اور اگر آخر میں واقع ہوں تو دائرے برقرار رہتے ہیں جن سے تحریر میں یک گونہ خوشنمائی پیدا ہو جاتی ہے اور نظر کو بھی قیام کا موقع ملتا ہے۔

اُردو میں بلحاظ شکل صرف چار حروف ایسے ہیں جو ترکیب میں کرسی سے اونچے اٹھتے ہیں۔ یعنی (ا)، (ط۔ظ) (ک۔گ) اور (ل) حالانکہ انگریزی میں (۷) حرف کرسی سے اونچے اٹھتے ہیں۔ یعنی (بی) (ڈی) (ایف) (ایچ) (ک) (ا) (ل) اور (ٹی) علیٰ ہذا اُردو میں صرف ایک حرف ہے جو کرسی سے نیچے اترتا ہے۔ یعنی (م) سو وہ بھی ترکیب کے شروع میں یا درمیان میں کرسی پر ٹھہر جاتا ہے۔ صرف ترکیب کے آخر میں کرسی سے نیچے اترتا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں (۵) حروف بہر صورت کرسی سے نیچے اترتے ہیں۔ یعنی (جی) (جے) (پی) (کیو) اور (وائی)۔

ہندی میں حروف کے سر پر جو پٹ لکیر کھینچتے ہیں جس کو (ریکھا) کہتے ہیں اس کے سبب حروف کی بالائی سطح ہموار رہتی ہے۔ البتہ علامات حروف علت (ماترا) جو اوپر لگتی ہیں ان سے ہمواری میں فرق آ جاتا ہے

لیکن نیچے کی طرف ہندی حروف بلا تکلف کرسی سے اترتے ہیں اور ترکیب میں ایک دوسرے سے لگ لپٹ کر عجب عجب شکلیں بناتے ہیں۔ جن کی مختصر کیفیت اس فصل میں آگے بیان ہوگی۔

اگرچہ اُردو حروف میں یوں بھی سادگی اور باقاعدگی ہے۔ تاہم مزید سہولتوں کی غرض سے اصلاح زیرِ غور آتی رہتی ہے۔ مختلف حلقوں سے جو تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں۔ ان کے منجملہ جناب سجاد مرزا نے حیدر آباد میں جو جدید ٹائپ وضع کیا۔ اس میں سادگی اور سہولت سب سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور عجب نہیں کہ قدامت پسندی کا جذبہ کمزور ہو تو اس طرز کا رسم الخط رائج ہو جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند تجاویز ذیل میں عرض ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض قبول ہو جائیں:

۱۔ بعض حروف کے ساتھ جو دائرے ہیں اور وہ نیچے اترتے ہیں۔ اگر طوالت معلوم ہو تو وہ مختصر ہو سکتے ہیں مثلاً (ح) کی جگہ (ـحـ) یا (س) کی جگہ (ـسـ) یا (ع) کی جگہ (ـعـ)
البتہ تین حرف کا معاملہ خاص ہے۔ (ق) (ل) اور (ن)۔ سو ان کا حل بھی آسان ہے۔ یعنی (ق) کو لکھیں (ق) گویا (ف) اور (ق) میں صرف نقطوں کا فرق رہے۔
علیٰ ہذا (ل) کو لکھیں (ک) گویا (ک) اور (ل) میں صرف مرکز کا فرق رہے اور (ن) کو لکھیں (ن) گویا (ب) اور (ن) میں نقطہ کی اونچ نیچ کا فرق رہے۔

۲۔ حرف (ح) اور اس کے ساتھی حروف (ج) (چ) (خ) کی جو کرسیاں ترکیب میں اوپر نیچے جمتی ہیں۔ ذرا سی تبدیلی سے وہ ایک سطح پر رہ سکتی ہیں مثلاً (عجب) کے بجائے (عجب) (جحت) کے بجائے (جحت) یا (حج) کے بجائے (حج)۔

۳۔ اوّل تو حرف (ک) خود ہی کرسی سے اونچا اٹھتا ہے۔ پھر اس کا مرکز اور بھی اونچا لگتا ہے۔ مرکز ترچھا بنانے کے بجائے پٹ لگایا جائے تو بلندی گھٹ جائے۔ مثلاً (بکس) کے بجائے (بکس) (کمال) کے بجائے (کمال) البتہ (الف) اور (ل) کے ماقبل ترکیب میں (ک) کی شکل گول بنتی ہے۔ جیسے (کام) (کل) ان دو صورتوں میں (ک) کا مرکز حسب سابق ترچھا رہے گا کہ کرسی میں جگہ موجود ہے۔

۔ حرف (م) جو نیچے اترتا ہے۔ اگر عربی طرز میں (م) لکھی جائے تو نیچے اترنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً کم کی بجائے (کم) البتہ آخری کشش میں ذرا سی گولائی زیبی ضرور ہے تاکہ حرف (ر) کا شبہ نہ ہو۔ مثلاً (کم) اور (کر)۔

۵۔ حرف علت (یاء) کی دوصورتیں ہیں۔ معروف و مجہول۔ اُردو میں معروف کو گول لکھتے ہیں جیسے (ی) اور مجہول کو پٹ جیسے (ے) دوسرے دائروں کی طرح اگر (ی) کا دائرہ بھی نکال دینا چاہیں تو اس کو بھی دوسرے رخ پر پٹ لکھ سکتے ہیں جیسے (ی) کے بجائے (ی) ترکیب میں بھی (یاء) معروف و مجہول کا فرق ظاہر ہوسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ معروف کے نقطے پٹ لگیں جیسے (ریت۔ جیت۔ پیٹ) اور مجہول کے نقطے کھڑے لگیں جیسے (یت، جیت، پیت) اور (یاء) بطور حرف صحیح استعمال ہو تو اس کے نقطے بھی پٹ لگیں جیسے (یاد) (یوم)۔

٦۔ حرف علت (و) کی بھی دوصورتیں ہیں۔ معروف و مجہول شکل میں ذرا سا فرق کردینے سے دونوں صورتیں ظاہر ہوسکتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ (و) معروف کی کشش حسب معمول خمدار رہے۔ جیسے (خوب۔ خون) اور (و) مجہول کی کشش سیدھی رہے جیسے (خوف) (جوش) اور (و) بطور حرف صحیح استعمال ہو تو اس صورت میں بھی اس کی کشش حسب معمول خمدار رہے جیسے (وکیل، ولی)۔

۷۔ عربی ترکیبوں کے الفاظ اُردو میں تلفظ کے مطابق سادہ لکھنے کی اجازت رہے اور جو چاہیں عربی ترکیب کے مطابق لکھیں۔ دونوں صورتیں درست مانی جائیں مثلاً (بالکل) یا (بلکل) (کالعدم) یا (کلعدم) (فی الفور) یا (فلفور) (فی الحقیقت) یا (فلحقیقت) (فی النار) یا (فِنار) (فی السقر) یا (فسقر) (اعلیٰ) یا (اعلا) (ادنیٰ) یا (ادنا) (معنیٰ) یا (معنا) (مرتضیٰ) یا (مرتضا)۔ اس طریق سے عام لوگوں کے واسطے املا میں سہولت بڑھ جائے گی اور ذی علم لوگ عربی املا بھی جاری رکھ سکیں گے۔

المختصر یہ چند تجاویز قابل غور معلوم ہوتی ہیں۔ عجب نہیں ان میں سے بعض قبول ہو جائیں۔

۳۹۔ ہندی حروف کی ترکیب

بہر حال اُردو کے مقابل۔ ہندی میں حروف کی ترکیب زیادہ رقیق اور پیچیدہ ہے اور ترکیب کی تفصیل اس درجے طویل ہے کہ جداگانہ تالیف کی طالب ہے۔ چنانچہ علامات (ماترا) کی مختصر کیفیت تو حروف علت اور حرف (ن) و (ر) کے تحت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ پھر بلحاظ تلفظ ترکیب حروف میں تغیر و تبدل ہوتا

ہے۔اس کا بھی حوالہ فصل اول میں تحت پارہ ۳۱ مختصراً موجود ہے اور یہ بحث ایک خاص فنی شعبہ سے متعلق ہے۔ جس کو اصطلاحاً (سندھی) کہتے ہیں۔اس پر اچھے اچھوں کو تلفظ وتحریروترکیب میں عبور کم رہتا ہے۔ پھر ترکیب میں بلحاظ تحریر حروف عجب عجب نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔جن کی تعداد کثیر ہے اور صحت تحریر میں ان کا پیش نظر رہنا لازم ہے۔ تفصیل کی تو گنجایش کہاں۔بطور تمثیل کچھ مرکب شکلیں ذیل میں پیش ہوں گی۔جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اُردو کی سادہ وسلیس ترکیبوں کے مقابل ہندی میں حروف کی ترکیبیں کس درجہ طویل و پیچیدہ ہیں۔جن کے لکھنے پڑھنے میں اچھے اچھوں کو غور وتوجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

تاہم ایک عام فرق ترکیب میں مسلم ہے کہ جن حروف میں علامت (پائی) رہتی ہے وہ حرف نصف نصف لکھے جائیں تو یہ علامت ساقط ہو جاتی ہے اور جن حروف میں علامات نہ ہو ان کو نصف لکھیں تو مزید پیچیدگی پیش آتی ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثالوں میں یہ فرق واضح ہو جائے گا۔

۴۰۔ ہندی میں علامت تشدید (ّ) ندارد اور لازمی طوالت

واضح ہو کہ تشدید میں ایک حرف ساکن اور متحرک رہتا ہے۔تلفظ ساکن میں نصف اور متحرک میں سالم رہتا ہے۔ اُردو کی طرح ہندی میں علامت تشدید استعمال نہیں ہوتی۔ جس کا لازمی نتیجہ تحریر میں طوالت ہے۔ چنانچہ تشدید "ّ" لگانے کے بجائے متعلقہ حرف کو لفظ میں دہراتے ہیں اور دہرانے میں مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔جن سے حیرانی لاحق ہوتی ہے۔

بعض حروف دو طرح لکھے جاتے ہیں۔ایک شکل میں (پائی) رہتی ہے۔ایک شکل میں نہیں رہتی۔

غرض کہ ایک علامت تشدید "ّ" نہ ہونے سے ہندی کی تحریر وترکیب میں طرح طرح کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں جو پیچیدگی اور طوالت پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ چند عام مثالیں اوپر درج ہوئیں۔ان کے سوا بھی شکلیں نکلتی ہیں۔ حالانکہ اُردو میں علامت تشدید "ّ" کی بدولت تحریر وترکیب بہت سادہ سہل عام فہم رہتی ہے۔

۴۱۔ ہندی میں علامت جزم (ْ) ندارد اور لازمی طوالت

تشدید کی طرح ہندی میں علامت (ْ) بھی ندارد ہے کہ ترکیب حروف میں اس سے سکون کا کام لیا جا سکے۔ نتیجہ یہ کہ متعلقہ حرف نصف تحریر ہوتا ہے اور اس تحریر کی مختلف شکلیں ہیں۔ علامت جزم (ْ) نہ ہونے کے سبب بھی ہندی حروف کی ترکیب میں عجب طوالت و پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جن کی چند عام مثالیں اوپر درج ہوئیں۔ اُردو میں جزم کے استعمال سے ترکیب حروف سادہ سہل اور عام فہم رہتی ہے۔ چنانچہ اُردو حروف

کو ہندی حروف پر جو گونا گوں فوقیتیں حاصل ہیں۔ ان میں اعراب تشدید و جزم کا استعمال بھی داخل ہے۔

۴۲۔ ہندی میں دو حرفی مرکبات

یوں بھی ہند میں حروف کی ترکیب (سنیوگ) گونا گوں شکلوں کے سبب بہت طویل و پیچیدہ مانی جاتی ہے کہ دو دو تین تین حرف مل کر عجب عجب شکلیں بناتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

۴۳۔ ہندی میں سہ حرفی مرکبات

دو حرفی مرکبات سے بڑھ کر ہندی میں سہ حرفی مرکبات پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بلحاظ تلفظ و بلحاظ تحریر و ترکیب۔

۴۴۔ ہندی مرکبات میں رقیق و دشوار تلفظ

یوں بھی سنسکرت اور ہندی میں بہت سے تلفظ دشوار رہتے ہیں۔ خاص کر وہ جن میں ناک سے موٹی آواز غنغنی نکالنی پڑتی ہے اور ایسے الفاظ معمولاً استعمال ہوتے ہیں۔

۴۵۔ ہندی حروف کی ترکیبیں طولانی

الحاصل ہندی میں حروف کی ترکیبیں کثیر ہیں جن کا تلفظ بالعموم رقیق یا غنغنہ رہتا ہے اور جن کی تحریر میں غور طلب پیچیدگی پیش آتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کچھ مثالیں اوپر بیان ہوئیں۔ سنسکرت اور ہندی کی کتابیں جو تعلیم زبان سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی ترکیبوں کی فہرستیں درج رہتی ہیں تاکہ لکھنے پڑھنے میں ان کو دیکھ کر مدد ملے۔ ہندی میں اُردو کی طرح ترکیب حروف کے قاعدے ایسے جامع اور واضح نہیں ہیں کہ بہ سہولت نوشت و خواند عمل میں آ سکے۔ مشق اور تجربہ کے بعد بھی ترکیب حروف کی صحت پر توجہ رکھنی پڑتی ہے۔ اسی سبب پیچیدہ ترکیبوں کی فہرستیں تعلیم زبان کی کتابوں میں درج رہتی ہیں۔ بطور مثال مبتدیوں کے واسطے دو کتابوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ایک تو پنڈت ہری پرشاسترى کی کتاب (ہندی اُردو مالا) کا دوسرا حصہ۔ اور ایک سر رام کشن گوپال بھنڈارکر کی پہلی کتاب بابت سنسکرت (فرسٹ بک آف سنسکرت) جن میں تعلیم زبان کے ابتدائی امور درج ہیں۔ ان دونوں میں بھی ترکیب حروف کی مختصر فہرستیں شریک ہیں اور آخر الذکر انگریزی کتاب میں ترکیب حروف کے متعلق فن (سندھی) کے کچھ ابتدائی اصول و قواعد بھی درج ہیں جن سے ترکیب حروف کی طوالت و پیچیدگی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

اگر لوگ ہندی کا مطالعہ شروع کرنا چاہیں۔ یوں تو مبتدیوں کے واسطے بہت سی کتابیں بازار میں ملتی ہیں لیکن پنڈت ہری ہر شاستری کی (ہندی اُردو مالا) پنڈت بال کرشن لاہوٹی کی (سرل ہندی پرائمر) ودیا ساگر ودیاس رائے شاستری کی (سنسکرت بالا درش) چتر ویدی دوارکا پرشاد کی (ہندی بال بدھ) اور پنڈت شیو دیال اپادھیہ کی (ہندی ویاکرن سار) یہ کتابیں مبتدیوں کے واسطے زیادہ کارآمد ہوں گی۔

شالی ہند سے ہندی کا زیادہ تعلق ہے۔ دکن میں دوسری زبانیں اپنا اپنا ادبی سرمایہ رکھتی ہیں مثلاً تامل، تلنگی، کنڑی، مرہٹی اور اُردو کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں وہ بھی کسی نہ کسی حد تک مطالعہ کی مستحق ہیں۔ کیونکہ اُردو کا ملک کی زبانوں سے خاص و عام تعلق ہے اور اسی سبب اس میں ملک کی مشترک زبان پائی جاتی ہے۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
علی گڑھ، بھارت

فورٹ ولیم کالج اور اُردو، ہندی، ہندوستانی

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی حالیہ متنازع فیہ تصنیف ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' میں شمالی ہندوستان میں انیسویں صدی کی لسانی کشمکش اور اُردو ہندی تنازع کا بالتفصیل ذکر کیا ہے لیکن اس کی ساری ذمہ داری انھوں نے اُردو اور مسلمانوں کے سر ڈال دی ہے اور کھڑی بولی ہندی اور ناگری (دیوناگری) رسم الخط کے جارحانہ 'پرچار' اور ہندوؤں کی احیا پرست تنظیموں کی اُردو مخالف سرگرمیوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس پورے مسئلے پر اہلِ ہندی کا موقف اختیار کیا ہے اور اہلِ اُردو کو جی بھر کر ہدفِ ملامت بنایا ہے۔

اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ انیسویں صدی میں مذہبی بنیادوں پر اُردو کے مقابلے میں کھڑی بولی ہندی کی تشکیل عمل میں آئی۔ یہی صدی اُردو مخالف رجحانات ونظریات اور ہندی تحریکات کے نمو پذیر ہونے کی بھی صدی ہے کیوں کہ ہندوؤں کی جانب سے جس شدت اور جارحانہ انداز سے اُردو زبان اور اس کے رسم الخط کو مٹانے اور ختم کرنے کی منظم کوششیں اس صدی میں کی گئیں وہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔

زمانۂ حال کی 'کھڑی بولی ہندی' اس کھڑی بولی کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے جس نے شمالی ہندوستان میں بارھویں صدی میں 'اُردو' کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ یہی زبانِ اُردو مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے پکاری گئی۔ ابتدائی دور میں اس کے نام ''ہندی'' اور ''ہندوی'' پڑے۔ پھر یہ ''ریختہ'' کہلائی۔ اسے ''زبان دہلی'' اور ''دہلوی'' بھی کہا گیا۔ دکن میں اسے ''دکنی'' اور ''دکھنی'' اور گجرات میں ''گجری'' کہا گیا۔ ملا وجہی نے ''سب رس'' میں اسے ''زبانِ ہندوستان'' کے نام سے موسوم کیا۔ ان تمام ناموں کے بعد اس کا موجودہ نام ''اُردو'' پڑا۔ اس وقت تک یہ زبان کافی نکھر چکی تھی اور اس کی نوک پلک غیر معمولی حد تک درست ہو چکی تھی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جب کھڑی بولی ہندی بنی تو اس وقت تک اُردو نے ادبی حیثیت سے

حیرت انگیز ترقی کرلی تھی۔ لیکن اُردو نام پڑنے کے باوصف اس کا پرانا نام ہندی بھی استعمال ہوتا رہا تھا۔ چونکہ کھڑی بولی کا تعلق مسلمانوں سے شروع سے ہی تھا اس لیے ہندو اسے ''مسلمانی بھاشا'' (مسلمانوں کی زبان) کہتے تھے اور بنظرِ حقارت دیکھتے تھے، جیسا کہ ہندوؤں کے دیے ہوئے ایک اور نام ''ملیچھ بھاشا'' سے بھی ظاہر ہے اسی لیے ہندوؤں نے بہت دنوں تک اسے منہ نہیں لگایا۔ لیکن جب اُردو، جو کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے، پورے شمالی ہندوستان میں ''مقبول عام زبان'' کی حیثیت سے رائج ہوگئی اور ادبی زبان کی حیثیت سے بھی اس کا ڈنکا بجنے لگا، تب جا کر ہندوؤں نے کھڑی بولی کی جانب توجہ دی۔ گیان چند جین 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں لکھتے ہیں:

> ''جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریز حکومت نے بھی پہلے فارسی اور بعد میں اُردو کو سرکاری کام کاج میں استعمال کیا تب اسے دیکھ کر انیسویں صدی میں اہلِ ہندی نے بھی کھڑی بولی کی طرف توجہ دی'' (ص ۱۲۹)۔

اس سے پہلے جین صاحب اپنی متذکرہ کتاب کے صفحہ ۱۵ پر یہ دکھلا چکے تھے کہ کھڑی بولی ہندی انداز اً ۱۱۰۰ء میں قائم ہوئی۔ جین صاحب سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جب اہلِ ہندی نے کھڑی بولی کی طرف انیسویں صدی میں توجہ دی تو کھڑی بولی ہندی ۱۱۰۰ء میں کیسے پیدا ہوگئی اور اس کا نام 'ہندی' کیوں کر پڑا؟ کیوں کہ لفظِ ہندی تو خالص فارسی لفظ ہے اور نو وارد مسلمانوں کی دین ہے جسے انھوں نے بارھویں صدی میں کھڑی بولی کے نئے روپ کے لیے استعمال کیا تھا۔ کھڑی بولی کا یہی نیا اور نکھرا روپ ہندی/ ہندوی/ ریختہ کہلایا جو ہماری آج کی اُردو کا قدیم روپ ہے۔ جین صاحب اُردو پر ہندی کے تقدمِ زمانی کو ثابت کرنے میں یہ بھول گئے کہ انھوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر کیا لکھ دیا ہے۔ جین صاحب کی یہ تضاد بیانی اس بات کی مظہر ہے کہ وہ خواہ مخواہ کھڑی بولی ہندی کی تاریخ کو اُردو کی لسانی تاریخ سے پیچھے لے جانا چاہتے ہیں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہندی اُردو سے قدیم تر زبان ہے، جب کہ جین صاحب یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ لسانی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کھڑی بولی ہندی میں سلسلہ وار نثری نمونے انیسویں صدی سے (بلکہ صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے وسط سے) اور شعری نمونے بیسویں صدی سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی سے قبل کی جن کھڑی بولی ہندی نثری تخلیقات کا ذکر گیان چند جین نے اپنی متذکرہ کتاب میں کیا ہے وہ یا تو جعلی ثابت ہو چکی ہیں یا ان میں دوسری بولیوں مثلاً برج بھاشا وغیرہ

کی تخلیقات شامل کر لی گئی ہیں، مثلاً اکبر کے عہد (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) کے ایک شخص گنگ کوی کے نثری رسالے 'چند چھند برنن کی مہما' کو خود اہلِ ہندی ''جعلی'' ثابت کر چکے ہیں لیکن جین صاحب اسے ''مستند'' قرار دیتے ہیں (دیکھیے 'ایک بھاشا:......'، ص ۳۰۰)۔

کھڑی بولی ہندی میں اگرچہ شاعری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوا لیکن اس کے لیے تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہو چکی تھی اور ایودھیا پرساد کھتری جو مظفر پور (بہار) کے رہنے والے تھے اور وہاں کی کلکٹری میں پیشکار تھے اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ وہ اس بات کے زبردست حمایتی تھے کہ جس طرح کھڑی بولی ہندی کو نثر کے لیے اختیار کر لیا گیا ہے، اسی طرح اسے شاعری کے لیے بھی اپنا لیا جائے۔ شمالی ہندوستان میں اس زمانے میں (۱۸۳۷ء کے بعد) اُردو، فارسی رسم الخط کے ساتھ، سرکاری زبان کی حیثیت سے پوری طرح رائج ہو چکی تھی۔ عدالتوں، دفتروں اور تعلیم و تدریس کی زبان اُردو ہی تھی۔ کھتری اُردو کو، کھڑی بولی کا روپ ہونے کی وجہ سے، پسند کرتے تھے لیکن اُردو اور ہندی میں صرف رسم الخط کا فرق مانتے تھے۔ وہ اگرچہ اُردو سے واقف تھے لیکن فارسی رسم الخط سے انھیں بَیر تھا۔ وہ اہلِ اُردو کو فارسی رسم الخط کو چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ کھڑی بولی ہندی میں شاعری کے حامیوں میں شری دھر پاٹھک بھی تھے جن کی برج بھاشا کے حامیوں سے خوب معرکہ آرائی ہوا کرتی تھی۔ دوسری جانب رادھا چرن گوسوامی اور پرتاپ نارائن مشر کھڑی بولی ہندی میں شاعری کے سخت خلاف تھے۔ یہ لوگ برج بھاشا کو کھڑی بولی سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے اور برج بھاشا کو ہی شاعری کے لیے موزوں تصور کرتے تھے۔ بالآخر اُردو زبان کے پھیلاؤ اور قبولیتِ عام کی وجہ سے کھڑی بولی کا زور اور دباؤ بڑھتا گیا اور بیسویں صدی کے آس پاس برج بھاشا کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ہندوؤں نے شاعری کے لیے بھی کھڑی بولی ہندی کو اپنا لیا۔ گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کے آتے آتے پانسہ کھڑی بولی کے حق میں پلٹا۔ اسے مہاویر پرساد دویدی، پنڈت بدری نرائن بھٹ اور میتھلی شرن گپت جیسے سرپرست مل گئے... ۱۹۱۲ء میں بابو شیام سندر داس نے یو پی کے محکمۂ تعلیم کو لکھا کہ ہندی کی کتابوں میں سے برج بھاشا کی تخلیقات نکال دی جائیں۔ ۱۹۱۴ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسے میں میتھلی شرن گپت نے کہا کہ برج بھاشا کی وکالت کرنے والے قومی زبان ہندی کے دشمن ہیں'' ('ایک بھاشا......'، ص ۱۸۲)۔

کھڑی بولی ہندی اور برج بھاشا کے درمیان اس معرکہ آرائی یا کشمکش کو گیان چند جین ''داخلی لڑائی'' کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''دراصل یہ ہندی والوں کا داخلی معاملہ تھا جس سے ہم اُردو والوں کو کچھ لینا دینا نہیں ہے''۔ (ایضاً، ص ۱۷۴) اس ''داخلی لڑائی'' سے جین صاحب کو کچھ لینا دینا ہو یا نہ ہو لیکن اہلِ اُردو کو اس سے دلچسپی ضرور ہے کیوں کہ یہ معرکہ آرائی کھڑی بولی ہندی کے ادبی ارتقا کی تاریخ کے تعین میں ہماری بڑی مدد کرتی ہے اور جین صاحب کے اس کھوکھلے دعویٰ کا قلع قمع کرتی ہے کہ ہندی اُردو سے قدیم تر زبان ہے۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں کھڑی بولی ہندی کے آغاز کے ساتھ ہی اُردو مخالف رجحانات و نظریات کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ جب للو جی لال فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں بیٹھ کر اُردو میں سے عربی و فارسی کے الفاظ کو خارج کر کے مذہبی مقاصد کے پیشِ نظر فرقہ وارانہ بنیادوں پر ایک نئی زبان قائم کر رہے تھے تو وہ درحقیقت گلکرسٹ کی اُردو مخالف ذہنیت اور آقایانِ مغرب کی فتنہ سامانی کا آلۂ کار بن رہے تھے۔ اُردو مخالف رجحانات کی داغ بیل گویا یہیں سے پڑتی ہے اور ہندی اُردو کشمکش کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے پروفیسر اور صدر ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے مطالبے پر ۷ جون ۱۸۰۲ء کو للو جی لال کا تقرر بطور ''بھاکھا منشی'' پچاس روپے ماہانہ مشاہرے پر اس مقصد کے تحت کیا گیا تھا کہ وہ وہاں کے منشیوں کی، جو بھاکھا سے ناواقف ہیں، زبان کے سلسلے میں مدد کریں گے لیکن گلکرسٹ نے انھیں دوسرے کاموں پر لگا دیا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء میں للو جی لال نے 'پریم ساگر' انھیں کی ''آگیا'' (= حکم/ ہدایت) پر لکھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گلکرسٹ نے اُردو زبان و ادب کی بے بہا خدمات انجام دی ہیں، لیکن ایک زبان کو دو زبانوں میں تقسیم کرنے کا محرک بھی وہی تھا اور اسی کے ترغیب دلانے پر فورٹ ولیم کالج کے احاطے میں ایک نئی زبان 'کھڑی بولی ہندی' کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد للو جی لال اور فورٹ ولیم کالج کے ایک اور منشی سدل مشر کی اتباع میں فورٹ ولیم کالج کے احاطے کے باہر بھی کچھ ہندو اُردو (یا دوسرے لفظوں میں کھڑی بولی) کو ناگری یا دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کا تجربہ کرنے لگے اور عربی و فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے لگے۔ سنیتی کمار چیٹرجی نے ایسی زبان کو ''سنسکرتی ہندی'' کا نام دیا ہے۔ بقول چیٹرجی، ''قوم پرستانہ یا وطن پرستانہ رجحان رکھنے والے اور سنسکرت سے محبت کرنے والے ہندو سوچ سمجھ کر ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی سنسکرتی ہندی کی جانب مائل ہونے لگے۔'' چیٹرجی کے انگریزی الفاظ یہ ہیں:

"Hindus with a nationalist or patriotic temperament and love for Sanskrit, began to turn wishfully towards Sanskritic Hindi in Nagari characters" *(Indo-Aryan and Hindi, p. 214)*.

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو پوری انیسویں صدی اُردو مخالف جذبات و رجحانات اور متعصبانہ نظریات سے پُر نظر آتی ہے۔ ۱۰- جولائی ۱۸۰۰ء (جب گورنر جنرل مارکوئس ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل ڈالی) سے لے کر ۱۸- اپریل ۱۹۰۰ء (جب لیفٹیننٹ گورنر سر اینٹونی میکڈونلڈ نے شمال مغربی صوبہ جات اور اودھ میں عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ناگری رسم الخط کو جاری کیے جانے کا حکم نامہ صادر کیا) تک اُردو زبان و رسم الخط کو گوناگوں مشکلات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور اسے ہندوؤں کی انفرادی اور اجتماعی مخالفتوں سے نبرد آزما ہونے کے علاوہ انگریزی حکومت کی بے مہری اور مخالفانہ روش کا بھی شکار ہونا پڑا۔

للوجی لال نے جب فورٹ ولیم کالج میں اُردو کے لسانی مواد کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک نئی زبان کی تعمیر کی تو ''یامنی بھاشا'' کے علی الرغم اسے ''دلّی آگرے کی کھڑی بولی'' کے نام سے موسوم کر گئے اور اس کے لیے ناگری یا دیوناگری رسم الخط اختیار کیا۔ اس زبان کو انھوں نے ہندی، ہندوستانی یا ریختہ نہیں کہا کیونکہ اس عہد میں یہ تینوں نام 'اُردو' کے لیے مستعمل تھے، اگرچہ لفظِ اُردو بھی اس عہد سے ذرا پہلے رائج ہو چکا تھا۔ اس نوزائیدہ زبان کو ہندی/ ہندوستانی/ ریختہ/ اُردو سے ممیز کرنے کے لیے ''بھاکھا'' کہہ دیا جاتا تھا۔ للوجی لال کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں ''بھاکھا منشی'' کی ہی اسامی پر ہوا تھا۔ بھاکھا سے برج بھاشا بھی مراد لیتے ہیں جس کے لیے دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا تھا۔ برج بھاشا کو ہندوؤں میں بے حد اہمیت اور مقبولیت حاصل تھی، کیوں کہ یہ کرشن بھگتی کی زبان تھی اور شاعری کا وافر ذخیرہ اس میں موجود تھا۔ اس عہد کے بعض ہندو دانشور یہ تک سمجھتے اور کہتے تھے کہ ہندی (کھڑی بولی ہندی) برج بھاشا سے ہی نکلی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی پر بہت دنوں تک برج بھاشا کا غلبہ رہا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ فروری ۱۸۰۴ء میں مستعفی ہو کر فورٹ ولیم کالج سے الگ ہو گئے لیکن ہندی اور اُردو کی رقابت کا جو بیج انھوں نے بویا تھا وہ پنپتا رہا۔ ان کے جانشین اُردو سے اپنے تعصب کا برابر اظہار کرتے رہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے ۱۸۰۸ء میں ولیم ٹیلر کا تقرر عمل میں آیا۔ کہا جاتا ہے کہ زمانۂ حال کی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی کھڑی بولی ہندی کے لیے 'ہندی' کا لفظ سب سے پہلے ولیم ٹیلر نے ہی استعمال کیا، ورنہ اس سے پہلے لفظِ ہندی فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی

اس ''مقبولِ عام زبان'' کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو ہماری آج کی 'اُردو' ہے اور جسے فورٹ ولیم کالج کے ارباب اور دوسرے انگریز 'ہندوستانی' کہتے تھے، اگرچہ اس کے لیے لفظِ ہندی انیسویں صدی کے اواخر تک مستعمل رہا۔

ولیم ٹیلر نے فورٹ ولیم کالج کونسل کو ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی کی تعلیم سے متعلق پیش کی گئی اپنی رپورٹ میں لفظِ ہندی کا استعمال جدید مفہوم میں کیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''میں ...... صرف ہندوستانی یا ریختہ کا ذکر کر رہا ہوں، جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جسے پڑھانے کی ذمہ داری میری ہے۔ میں ہندی کا ذکر نہیں کر رہا جس کا اپنا رسم الخط ہے یا میں اس زبان کا ذکر نہیں کر رہا جس میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا ہے' (لکشمی ساگر وارشنے، 'فورٹ ولیم کالج' بحوالۂ شتی کنٹھ مشر، 'کھڑی بولی کا آندولن' ص ۱۷)۔

للو جی لال نے ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج کے احاطے میں جو زبان گھڑی تھی اس کا اساسی [illegible] میں ۱۸۱۲ء میں باقاعدہ نام ''ہندی جس کا اپنا رسم الخط ہے'' بھی پڑ گیا۔

ولیم ٹیلر کے مستعفی ہو جانے کے بعد ۱۸۲۳ء میں ولیم پرائس ہندوستانی شعبے کے پروفیسر اور صدر مقرر کیے گئے۔ وہ ہندی کے زبردست حمایتی تھے اور ہندی کو اُردو پر ترجیح دیتے تھے۔ ہندی سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ پروفیسر تو تھے ہندوستانی کے لیکن خود کو ہندی پروفیسر کہتے تھے اور لکھتے بھی ہندی پروفیسر تھے۔ اسی زمانے میں لیفٹیننٹ ڈی۔ رڈیل کو فورٹ ولیم کالج کونسل کا سیکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے رڈیل کالج کے ممتحن کے عہدے پر فائز تھے۔ رڈیل نے بھی اُردو کے خلاف معاندانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ اُردو کے بارے میں ان کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ اسے مغلوں کی رائج کی ہوئی ایک غیر ملکی زبان کہتے تھے اور اُردو کے بجائے دیسی زبان کی تعلیم کو زیادہ مفید تصور کرتے تھے۔ رڈیل نے ۲۴ ستمبر ۱۸۲۴ء کو کالج کونسل کی جانب سے گورنمنٹ سیکریٹری قانون کو جو خط لکھا تھا اس سے ان کی اُردو دشمنی کا صاف پتا چلتا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ہندوستانی جسے اُردو بھی کہا جاتا ہے اسے ہندوستان کے سربرآوردہ لوگ اور بالخصوص مسلمان بولتے ہیں۔ چونکہ اسے مغلوں نے رائج کیا تھا اس لیے آج بھی یہ ایک غیر ملکی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اُردو کی ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی

ہندوستان کی تین چوتھائی آبادی اس کے عربی و فارسی الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔اس کے بجائے سنسکرت سے نکلی ہوئی کسی بھی دیسی زبان کو پڑھانا زیادہ مفید رہے گا'' (بحوالہ گیان چند جین، 'ایک بھاشا......'، ص ۱۶۵)۔

اس اقتباس سے نہ صرف یہ پتا چلتا ہے کہ رڈیل کی اُردو زبان کے بارے میں معلومات کتنی غلط، ناقص اور نامکمل ہیں بلکہ اُردو سے ان کی عصبیت اور عناد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

آئندہ کے حالات بتاتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کونسل نے اُردو کے خلاف ایک محاذ کھول رکھا تھا۔ چنانچہ کالج کونسل کی ہی سفارش پر گورنر جنرل نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی ہونے والے نئے ملازمین کو ''ہندوستانی کے بجائے برج بھاشا'' کی تعلیم دیے جانے کی منظوری دے دی تھی۔ بقول گیان چند جین ''گورنر جنرل نے اس تجویز پر صاد کر دیا۔'' (ایضاً)

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے راقم الحروف نے اپنی کتاب 'لسانی تناظر' (۱۹۹۷ء) میں اس خیال کا اظہار کیا تھا:

> ''حقیقت تو یہ ہے کہ نہ صرف فورٹ ولیم کالج بلکہ انگریزی حکومت نے بھی اُردو کے خلاف معاندانہ روش اختیار کر رکھی تھی'' (ص ۲۵۴)۔

اس عبارت کو پڑھ کر جین صاحب نہایت جز بز ہوئے اور انھوں نے اپنی متذکرہ کتاب میں صفحہ ۱۶۳ پر اس عبارت کو نقل کرتے ہوئے راقم الحروف کو ہدفِ ملامت بنایا۔

کیا گیان چند جین نے حکم چند نیّر کا وہ بیان نہیں دیکھا (یا اگر دیکھا تو نظر انداز کر دیا!) جس میں انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے ارباب کو صاف طور پر کھڑی بولی ہندی کی پیدائش کا ذمے دار ٹھہرایا ہے، نیز برطانوی سامراجی حکام کی اس لگن اور دُھن کا ذکر کیا ہے جسے انھوں نے ''ہندی کو ہندوؤں کی قومی، تہذیبی اور عوامی زبان بنانے کے لیے'' اپنا شعار بنا لیا تھا؟ حکم چند نیّر اپنی کتاب 'اُردو کے مسائل' (۱۹۷۷ء) میں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ انیسویں صدی کے آغاز ہی میں فورٹ ولیم کالج کے سربراہوں نے متعدد اُردو کتابوں کو دیوناگری میں شائع کر کے اور للو جی سے 'پریم ساگر' لکھوا کر کھڑی بولی پر مبنی، شدھ ہندی کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن اس صدی کے وسط تک دیوناگری اور ہندی کا دائرۂ عمل فورٹ ولیم کالج کی چار دیواری، یا زیادہ سے زیادہ یورپی حکام کے ذہنوں

تک محدود رہا تھا۔ اس زمانے میں ہندی کو ہندوؤں کی قومی، تہذیبی اور عوامی زبان بنانے کے لیے سامراجی حکام کس طرح سرگاڑی اور پاؤں پہیہ کیے ہوئے تھے، اس کا اندازہ بنارس کالج (سابق سنسکرت کالج وبعدہٗ کوئنز کالج) کے پرنسپل اور شعبۂ انگریزی کے صدر ڈاکٹر جے آر بیلن ٹائن کی رپورٹ سے بخوبی ہوسکتا ہے'' (ص ۸۵، ۸۶)۔

اس کے بعد حکم چند نیّر نے بیلن ٹائن کی رپورٹ کا متن پیش کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے کالج کے ہندو طلبہ کو، جو ''ہندی کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے''، ہندی پڑھنے اور اسے ''اپنی ماؤں اور بہنوں'' کی زبان سمجھنے کے لیے اکساتا تھا۔ اس نے ان طلبہ کو ایک مضمون لکھنے کے لیے کہا تھا جس کا عنوان تھا، ''تم اپنی ماؤں اور بہنوں کی روزمرہ زندگی کی واحد زبان کو اور ان کی تہذیب کو حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہو۔'' اس پر طلبہ کو سخت حیرت ہوئی اور انھوں نے بیلن ٹائن کو ایک عرضداشت دی جس میں یہ سوال اٹھایا کہ وہ (بیلن ٹائن) ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟ طلبہ نے یہ بھی کہا کہ:

> ''ہمیں بخوبی معلوم نہیں کہ آپ یورپی لوگ ہندی سے کیا مراد لیتے ہیں، کیوں کہ یہاں سینکڑوں بولیاں ہیں اور ہمارے خیال میں سبھی ہندی کہلانے کی یکساں مستحق ہیں'' (رپورٹ تعلیماتِ عامہ شمال مغربی صوبہ جات، بابت ۴۷-۱۸۴۶ء، ص ۳۲۔ بحوالہ حکم چند نیّر، 'لسانی مسائل'، ص ۸۷)۔

ان رپورٹوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہندی کی کیا اہمیت اور حیثیت تھی اور برطانوی سامراجی حکام کس طرح اُردو کے مقابلے میں ہندی کو آگے بڑھانے کے درپے تھے۔ صرف اس لیے کہ ہندوستان کی دو معزز قوتوں کے درمیان جو یگانگت اور لسانی وحدت قائم ہے، وہ پارہ پارہ ہو جائے۔ اس سے ہندوستان میں برطانوی مفاد کو تقویت پہنچنے کے بے حد امکانات تھے۔ نہ صرف بیلن ٹائن بلکہ اس زمانے کے دوسرے انگریز بھی دل میں اُردو سے عناد رکھتے تھے اور ہندی کو فروغ (Promote) دینے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ ایسے ہی ایک شخص کا نام سر جارج ابراہم گریرسن تھا۔ گریرسن کا تعلق اگرچہ بنگال سول سروس سے تھا لیکن بعد میں وہ ہندوستانی لسانیات کے ماہر اور "Linguistic Survey of India" (=لسانی جائزہ ہند) کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ یہ ہندی زبان کا زبردست حمایتی تھا اور اس کی ترویج وترقی کا دل سے خواہاں تھا۔ یہ ناگری پرچارنی سبھا کا، جو ہندی اور ناگری رسم الخط کے 'پرچار' کے لیے ۱۸۹۳ء میں بنارس میں قائم کی گئی تھی، باقاعدہ رکن تھا۔

بقول حکم چند نیر:

''گریرسن نے شمال مغربی صوبہ جات کی عدالتوں اور دفتروں میں ہندی کو اُردو کے برابر درجہ دلانے کے لیے ۱۸اپریل ۱۹۰۰ء کے میکڈانل کے فیصلے کے سلسلے میں نہایت اہم رول ادا کیا تھا'' (ایضاً،ص ۸۸)۔

شیام سندر داس جو ناگری پرچارنی سبھا کے بانیوں میں سے تھے اپنی خودنوشت 'میری آتم کہانی' میں لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے گریرسن کو ہندی کی حمایت میں مضمون لکھ کر کسی اخبار میں چھپوانے کے لیے لکھا تھا۔ گریرسن نے کچھ جواب نہ دیا۔ شیام سندر داس نے شکایتی خط لکھا۔ اس دوران میں میکڈانل کا فیصلہ شائع ہو چکا تھا تو گریرسن نے شیام سندر داس کو لکھا کہ میں نے پسِ پردہ رہ کر ہندی کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ مضمون لکھ کر نہ کرسکتا تھا'' (بحوالہ حکم چند نیر، متذکرہ کتاب، ص ۸۸)۔

گیان چند جین نے اپنی کتاب 'ایک بھاشا......' میں کرسٹوفر کنگ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''کالج میں کبھی ہندی کا الگ شعبہ قائم نہیں ہوا جب کہ ہندوستانی، عربی اور فارسی کے تھے'' (ص ۱۶۶)۔

کنگ اور جین کو معلوم ہونا چاہیے کہ فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا الگ شعبہ قائم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ ۱۸۰۰ء میں جب کلکتہ میں یہ کالج قائم ہوا تو اس وقت ہندی (= کھڑی بولی ہندی) کا وجود نہ تھا۔ یہ زبان فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد معرضِ وجود میں آئی۔ اس عہد میں علاقائی بولیاں، مثلاً برج بھاشا، اودھی، راجستھانی وغیرہ ضرور رائج تھیں لیکن کھڑی بولی ہندی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۲۴ء کے اواخر میں فورٹ ولیم کالج کونسل نے گورنر جنرل سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی ہونے والے نئے ملازمین کو ہندوستانی کے بجائے برج بھاشا کی تعلیم دیے جانے کی سفارش کی تھی۔ اگر اس وقت کھڑی بولی ہندی موجود ہوتی تو کالج کونسل کے ارباب برج بھاشا کو پڑھائے جانے کی سفارش کیوں کرتے اور گورنر جنرل اس تجویز پر ''صاد'' کیوں کرتے؟

فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی دور میں بھی گلکرسٹ نے ''بھاکھا منشی'' کی ہی تقرری کی سفارش کی تھی، نہ کہ ہندی منشی کی۔ کیوں کہ ہندی (= کھڑی بولی ہندی) نام کی زبان کا اس وقت کوئی وجود تھا ہی نہیں اور

لفظِ ہندی بالتخصیص اُردو کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے مترجمین و مصنفین بھی 'ہندی' سے اُردو ہی مراد لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن کے اُردو ترجمے کو بھی ہندی ترجمہ کہا جاتا تھا۔ گیان چند جین کو بھی اس بات سے اتفاق ہے کہ ہندی، اُردو کا ہی ایک نام تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کی ابتدا تک 'ہندی' نام اُردو کے لیے مستعمل تھا'' ('ایک بھاشا.....'، ص ۱۳۴)۔

لیکن اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ نہ صرف انیسویں صدی کی ابتدا تک بلکہ پوری انیسویں صدی کے دوران زبانِ اُردو کے لیے 'اُردو' نام کے علاوہ 'ہندی' نام بھی مستعمل رہا ہے، بلکہ اقبال نے تو بیسویں صدی کے اوائل میں بھی اپنی فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' میں اُردو کے لیے ہندی نام استعمال کیا ہے:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است

طرزِ گفتارِ دری شریں تر است

(یہاں ''ہندی'' سے مراد اُردو اور ''دری'' سے فارسی مراد ہے)

اس امر کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی کے دوران 'ہندوستانی' سے بلا شرکتِ غیرے (Exclusively) 'اُردو' ہی مراد لی جاتی تھی کوئی اور زبان نہیں، نیز جس زبان کو انگریز ''ہندوستانی'' (Hindoostani) کہتے تھے وہ زبان 'اُردو' ہی تھی جو فارسی (یا عربی و فارسی) رسم الخط میں لکھی جاتی تھی جیسا کہ آج بھی لکھی جاتی ہے، لیکن یہ اب اُردو کا اپنا رسم الخط ہو گیا ہے اور اسے اُردو رسم الخط کہنا ہی درست ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند اپنے ایک مضمون ''فورٹ ولیم کالج اور ابتدائی ڈکشنریاں'' (مطبوعہ 'اخبارِ اُردو'، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۷ء) میں ''ہندوستانی مساوی اُردو'' کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

''اس زبان کا، جسے 'ہندوستانی' کہا گیا ہے (بلا شرکتِ غیرے) رسم الخط ناگری نہیں تھا بلکہ Parso-Arabic تھا۔''

بعض اہلِ ہندی کو یہ غلط فہمی رہی ہے کہ انگریز 'ہندوستانی' سے 'اُردو' کے علاوہ 'ہندی' (ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی کھڑی بولی ہندی) بھی مراد لیتے تھے۔ انگریزوں نے ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی کھڑی بولی ہندی کو کبھی ہندوستانی نہیں کہا۔ وہ ایسی زبان کو ''بھاکھا'' کہتے تھے لیکن بھاکھا سے شمالی ہندوستان کی دیگر علاقائی بولیاں بھی مراد لی جاتی تھیں۔

جہاں تک کہ ناگری لپی (رسمِ خط) کا تعلق ہے تو یہ بات غالباً کسی اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ اس

زمانے میں یہ ایک غیر مقبول رسم الخط تھا اور اس کی افادیت بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گلکرسٹ کے عہد میں فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے میں جن ۳۶ منشیوں/مترجموں/مصنفوں کا تقرر ہوا تھا اور جن کی فہرست کا نقشہ، مع ان کی تقرری کی تاریخوں، عہدوں اور تنخواہوں کی تفصیلات کے، محمد عتیق صدیقی نے اپنی کتاب 'گلکرسٹ اور اس کا عہد' (ص ۱۷۵ تا ۱۷۷) میں پیش کیا ہے۔ ان میں ''بھاکھا منشی'' (للو جی لال) کے علاوہ صرف ایک ''ناگری نویس'' (کاشی راج) اور ایک ''ناگری خوش نویس'' (مہانند) تھا۔ باقی تمام ملازمین، باستثنائے چند، صرف اُردو مساوی ہندوستانی (اُردو = ہندوستانی) کے کاموں پر مامور کیے گئے تھے۔

انیسویں صدی کے دوران ناگری رسم الخط کو کتنا ''غیر اہم'' سمجھا جاتا تھا، اس کا اندازہ میجر جوزف ٹیلر کے اُردو-انگریزی لغت 'A Dictionary, Hindoostanee and English' کے تخفیف شدہ ایڈیشن (لندن: ۱۸۲۰ء) کے دیباچے سے بخوبی ہوتا ہے جس میں ناگری رسم الخط کی عدم مقبولیت کی وجہ سے اسے پورے طور پر ترک کر دیے جانے کی بات کہی گئی ہے۔

> "A knowledge of the Nagree character being comparatively of little use to the generality of Hindoostanee scholars, I have entirely discarded it..."
>
> (بحوالہ ستیہ پال آنند، متذکرہ مضمون)

اس لغت میں تمام الفاظ اُردو (نسخ ٹائپ) میں دیے گئے ہیں اور ان کے تلفظات رومن (سیدھے Font) میں۔ ہر لفظ کے آگے اس کے انگریزی معنی ترچھے حروف (Italic) میں دیے گئے ہیں۔ اس لغت میں کہیں بھی ناگری رسم الخط کا استعمال نہیں ہوا ہے: مثلاً

A ناقہ naqu, f. (from نوق) A she camel.
P ناگاہ nagah, suddenly, unexpectedly, all at once, unawares.
H ہمیں humen, *To us.* Humeen,□ We, ourselves.
S ہنس huns, m. *A. douck.*

(نوٹ: A سے عربی، P سے پرشین (فارسی)، H سے ہندوستانی اور S سے سنسکرت مراد ہے)۔

اس سے پہلے گلکرسٹ نے جو انگریزی-اُردو لغت "A Dictionary, English and Hindoostanee" کے نام سے دو جلدوں میں (علی الترتیب ۱۷۸۶ء اور ۱۷۹۰ء میں) شائع کیا تھا اس میں انگریزی الفاظ کے معنی پہلے رومن اور بعد میں اُردو رسم الخط (نستعلیق) میں دیے گئے ہیں اور کہیں بھی

ناگری رسم الخط کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، مثلاً:

To ABANDON, h. chhorna چھوڑنا, teagna تیاگنا, tujna تجنا, a. turk kurna ترک کرنا۔

ABANDONED, a. khalee خالی, h. soona سونا, oojar اوجار, p. weeran ویران۔

[نوٹ: h سے ہندوستانی، a سے عربی اور p سے پرشین (فارسی) مراد ہے]۔

اس دور میں ناگری رسم الخط کے غیر اہم ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ عدالتوں اور دفتروں میں ناگری میں درخواستیں دینے والے عنقا تھے اور درخواستیں لکھنے والے محرر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے کیوں کہ گیان چند جین کے بقول ''یوپی کے علاقے میں پوری انیسویں صدی میں دفتروں اور عدالتوں میں اُردو کا غلبہ رہا'' (متذکرہ کتاب، ص ۱۸۶)۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ۱۸۹۳ء میں بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا کا قیام عمل میں آیا۔ حکم چند نیّر اس جہت میں سبھا کی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''عدالتوں میں ہندی اور ناگری کو رائج کرنے کے لیے اس (سبھا) نے مختلف شہروں کے وکیلوں اور محرروں سے رابطہ قائم کیا۔ ناگری میں بلا معاوضہ درخواستیں لکھنے کے لیے ہر ضلع کی عدالت میں ایک تنخواہ دار ناگری نویس محرر مقرر کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۰۳ء میں پہلا تنخواہ دار ناگری نویس محرر بنارس کی عدالت میں مقرر کیا'' ('اُردو کے مسائل'، ص ۱۲۹)۔

ان مثالوں اور دلیلوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اور پوری انیسویں صدی کے دوران ہندوستانی مساوی اُردو (ہندوستانی = اُردو) تھی نہ کہ ہندوستان مساوی ہندی (ہندوستانی = ہندی)، نیز ہندوستانی کہی جانے والی زبان اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی تھی نہ کہ ناگری رسم الخط میں۔

اس سماجی اور تہذیبی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کھڑی بولی کو، جس سے بعد میں ہندی تشکیل پذیر ہوئی، ہندوؤں نے مسلمانی بولی/ زبان سمجھ کر بُری طرح نظر انداز کر رکھا تھا۔ اسے وہ بنظرِ حقارت دیکھتے تھے اور اس کے لیے ''ملیچھ بھاشا'' جیسا تحقیری کلمہ استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا اس میں ہندوؤں نے انیسویں صدی کے آغاز تک نہ تو باقاعدہ نثر لکھی تھی اور نہ ہی شاعری کی تھی۔ شاعری تو اس سے کوسوں دور تھی۔ نومولود کھڑی بولی ہندی میں سلسلہ وار نثری نمونے انیسویں صدی کے اوائل سے ملنا شروع ہوتے ہیں اور شعری نمونے بیسویں صدی سے۔ انیسویں صدی سے پہلے اس کا نام بھی ہندی نہ تھا۔ کیوں کہ یہ نام بلاشرکتِ غیرے

اُردو کے لیے مستعمل تھا۔ لہٰذا کس بنیاد پر فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل وعقد ہندی کا الگ شعبہ قائم کرتے؟ اور اگر ایسا شعبہ قائم بھی کر دیا جاتا تو وہاں ہندی کے نام پر کیا پڑھایا جاتا؟ کیوں کہ ہندی (=کھڑی بولی ہندی) میں نہ تو نثر تھی اور نہ نظم اور نہ ہی اس زبان کا چلن تھا۔ ہندی کی کم مایگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ گلکرسٹ نے ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے ہندی کے طالب علموں کے لیے اُردو شاعر عبداللہ مسکینؔ کا ایک مرثیہ دیوناگری رسم الخط میں چھاپا تھا۔ اس کے علاوہ مرزا کاظم علی جوان نے 'سنگھاسن بتیسی' اور 'شکنتلا ناٹک' اور مظہر علی خاں ولا نے 'بیتال پچیسی' اور (قصہ) 'مادھونل' جیسی کتابیں پہلے اُردو ہی میں لکھی تھیں جن کے لیے انھیں انعامات ملے تھے۔ گلکرسٹ کی ایما پر بعد میں یہ کتابیں دیوناگری رسم الخط میں منتقل کی گئیں۔

اس کے علی الرغم اُردو پورے شمالی ہندوستان میں جاری وساری تھی۔ اُردو کی ادبی روایاتِ نثر ونظم بھی نہایت قدیم وتوانا تھیں اور اُردو کو ہندی پر ہر لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ شمالی ہندوستان کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ گلکرسٹ نے ۱۷۹۸ء میں جب اپنی چوتھی کتاب "The Oriental Linguist" (=مشرقی زبان داں) شائع کی تو اُردو کو "ہندوستان کی مقبولِ عام زبان" "The Popular Language of Hindoostan" کے نام سے موسوم کیا۔ لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی کے نو وارد سول ملازمین کو اُردو زبان، جسے انگریز "ہندوستانی" (Hindoostanee) کہتے تھے، کی تعلیم دینا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ اسی مقصد کے تحت گلکرسٹ نے جو ہندوستانی زبان (=اُردو زبان) کا ماہر تھا، سب سے پہلے کلکتے میں جنوری ۱۷۹۹ء میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام اس نے اورینٹل سیمی نری (Oriental Seminary) رکھا۔ یہ مدرسہ گورنر جنرل ویلزلی کی ایما پر قائم کیا گیا تھا اور اسے سرکاری ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ گلکرسٹ کا یہ مدرسہ ڈیڑھ سال تک قائم رہا۔ اسی کی بنیادوں پر کلکتے ہی میں ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو بڑے پیمانے پر فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا، کیوں کہ ویلزلی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ کمپنی کے نو وارد سول ملازمین کو سرکاری زبان فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان 'اُردو' کی بھی تعلیم دی جانی چاہیے۔ اورینٹل سیمی نری کے قیام تک گلکرسٹ اُردو زبان سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور اس نے انگریزی-اُردو لسانی لغت دو جلدوں میں "A Dictionary, English and Hindoostanee" کے نام سے شائع کی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے ۱۷۹۶ء میں اُردو زبان کی قواعد بھی "A Grammar of the Hindoostanee Language" کے نام سے شائع کی تھی۔ ان کتابوں کی اشاعت سے گلکرسٹ اُردو اسکالر اور مشرقی زبان داں کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا اور اس کی شہرت انگلستان تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو

اسی سال اس کا تقرر ہندوستانی زبان کے شعبے میں پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے کر دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کالج کے ارباب حل وعقد اُردو کو ''ہندوستانی زبان'' یا صرف ''ہندوستانی'' کہتے تھے کیوں کہ ان کے نزدیک اُردو ہی ''ہندوستانی کی مقبولِ عام زبان'' تھی۔ اسی لیے فورٹ ولیم کالج کے اُردو زبان کی تعلیم وتدریس سے متعلق شعبے کا نام ہندوستانی شعبہ رکھا گیا۔ اس عہد میں اُردو بمقابلہ ہندی (= زمانۂ حال کی ہندی) یا ہندوستانی بمقابلہ ہندی (= زمانۂ حال کی ہندی) نام کی کوئی چیز نہ تھی، کیوں کہ ہندی (= دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی زمانۂ حال کی کھڑی بولی ہندی) ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور لفظِ ہندی، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، بلا شرکتِ غیرے صرف اُردو زبان کے لیے مستعمل تھا۔ علاقائی بولیاں اپنے اپنے ناموں سے جانی جاتی تھیں، یا انھیں محض بھاکھا/ بھاشا کہہ دیا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے منشی جو سب کے سب اُردو داں تھے فورٹ ولیم کالج کو ''مدرسۂ ہندی'' کہتے تھے اور ہندوستانی شعبے کو (جس کے گلکرسٹ پروفیسر اور صدر تھے) ''تفریقِ ہندی'' یا ''تفریقِ ہندوی'' کہتے تھے اور گلکرسٹ کو 'مدرسِ ہندی'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ان منشیوں نے اپنے تراجم وتالیفات کے دیباچوں میں جہاں اپنے حالاتِ زندگی اور دیگر کوائف بیان کیے ہیں وہیں انھوں نے اُردو کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اُردو کے لیے لفظِ ''اُردو'' کے علاوہ ''زبانِ اُردو''، ''اُردوئے معلّی''، ''ہندی''، ''زبانِ ہندی''، ''زبانِ ریختہ'' جیسے نام بھی استعمال کیے ہیں، مثلاً میرامّن نے 'باغ وبہار' میں ''حقیقت اُردو زبان کی''، ''اُردو کے لوگ''، ''ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی'' جیسے فقرے استعمال کیے ہیں۔ میرامّن نے اپنی ایک دوسری کتاب 'گنجِ خوبی' میں ''اُردوئے معلّی کی زبان'' کا فقرہ بھی استعمال کیا ہے اور اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ان کو بھی اپنی سمجھ کے موافق جوں کا توں ہندی میں نظم کیا۔'' میر بہادر علی حسینی 'اخلاقِ ہندی' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ''زبانِ فارسی سے ترجمہ سلیس رواجی ریختے میں، جسے خاص وعام بولتے ہیں کیا اور نام اس کا 'اخلاقِ ہندی' رکھا۔'' اسی طرح حیدر بخش حیدری نے جب فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا اُردو ترجمہ کیا تو دیباچے میں لکھا کہ ''زبانِ ہندی میں موافق محاورۂ اُردوے معلّی کے...... ترجمہ کیا اور نام اس کا 'توتا کہانی' رکھا۔'' حیدری نے خاتمۂ کتاب میں مزید لکھا کہ ''ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ہندی میں حرف طوئے نہیں اور اس حقیر نے طوطی نامۂ فارسی کو زبانِ ریختہ میں لکھا، اس واسطے اس طوطی کی طوئے کو تتے سے بدل دیا۔'' حیدر بخش حیدری کی دوسری مشہور کتاب 'آرایشِ محفل' ہے جو ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''جان گلکرسٹ

صاحب دام اقبالہٗ کے حکم سے .... زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام 'آرایشِ محفل' رکھا۔'' فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شیر علی افسوؔس بھی تھے جنھوں نے 'باغِ اُردو' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''بارے فضلِ ایزدی اور لطفِ سرمدی سے تمام کتاب زبانِ اُردو میں لکھی اور مقبول خاص و عام ہوئی۔ نام اس کا 'باغِ اُردو' رکھا۔'' فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی ایما پر قرآن شریف کے اُردو ترجمے کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا اور اس کے ۵۶ صفحات چھپ بھی گئے تھے لیکن گلکرسٹ کے جانے کے بعد اربابِ کالج نے اس کی طباعت رکوا دی تھی۔ اس ترجمے کا کام کئی لوگوں نے انجام دیا تھا جن میں مرزا کاظم علی جواؔن بھی تھے۔ وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں، ''قرآن شریف کا ترجمہ زبان ریختہ میں تمام ہوا۔'' اسی دیباچے میں کئی جگہ ''ہندی'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً ''اگر فارسی ترجمہ ہوا ہے تو ہندی میں کیا کفر ہے''، یا ''ترجمہ کلام اللہ کا اگرچہ ہندی زبان میں ہے، ہند کے لوگ بخوبی سمجھیں گے''، یا ''یقین ہے کہ سچ سچ کتابیں اس عصر میں عربی و فارسی سے ہندی میں ہوئی ہیں''، وغیرہ۔ کاظم علی جواؔن نے 'شکنتلا ناٹک' بھی اُردو میں لکھا۔ وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''گلکرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ کے حسب الحکم کاظم علی جوان نے اسے زبانِ ریختہ میں بیان کیا۔'' اسی دیباچے میں جواؔن نے گلکرسٹ کو ''مدرسِ ہندی'' لکھا ہے:

> ''کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنؤ کے بڑے صاحب (رزیڈنٹ) ہیں، انھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہ کے ۱۸۰۰ عیسوی میں کتنے شاعروں کو سرکارِ عالی (کمپنی) کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد کلکتہ کو روانہ کیا۔ انھوں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا، اور موافق حکمِ حضور خدمت میں مدرسِ ہندی کے، جو صاحب والا مناقب جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ ہیں، شرف اندوز ہوا۔ دوسرے ہی دن انھوں نے نہایت مہربانی والطاف سے ارشاد فرمایا کہ شکونتلا (شکنتلا) ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر''(بحوالہ محمد عتیق صدیقی، 'گلکرسٹ اور اس کا عہد'، ص ۲۰۴)۔

مرزا علی لطف، نہال چند لاہوری اور باسط خاں اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے ملازم نہ تھے لیکن گلکرسٹ نے ان سے کالج کے ہندوستانی زبان کے شعبے کے لیے کتابیں لکھوائیں۔ لطف نے فارسی تذکرے 'گلزار ابراہیم' (از: علی ابراہیم خاں) کی بنیاد پر اُردو میں تذکرہ 'گلشنِ ہند' لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبانِ انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم ان

کی تربیت کے لیے سارا، یہ خونِ جگر کھاتے ہیں۔'' نہال چند لاہوری نے تاج الملوک اور گل بکاؤلی کے قصے کو فارسی سے اُردو میں منتقل کیا اور اس کا نام 'مذہبِ عشق' رکھا۔ چنانچہ وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''اس نحیف نے مارکوئس ولزلی، نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں، ہندی میں تالیف کیا اور اس کا نام 'مذہبِ عشق' رکھا۔'' اسی طرح باسط خاں 'گلشنِ ہند' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''بطریق بسم اللہ کے اگر اتنی عبارت ہندی تحریر میں یا تقریر میں آئی تو کچھ کلمۂ کفر نہیں۔''

ان دلائل وشواہد اور معروضی حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جو زبان ''ہندی'' کے نام سے موسوم تھی وہ ہماری آج کی اُردو تھی، نہ کہ زمانۂ حال کی ناگری ہندی کیوں کہ اس ہندی کا تو اس وقت کوئی وجود ہی نہ تھا۔ چنانچہ آج سے دو سو سال پہلے 'ہندی' سے صرف ایک ہی زبان مراد لی جاتی تھی اور وہ تھی 'اُردو'۔ یہی زبان 'ریختہ' کہلاتی تھی اور اسی کا دوسرا نام 'ہندوستانی' تھا۔ لہٰذا اربابِ فورٹ ولیم کالج ایک ہندی یعنی اُردو کی موجودگی میں کسی دوسری ہندی (جس کا وجود ہی نہ ہو) کا شعبہ کیسے قائم کر سکتے تھے۔ گیان چند جین نے یہ بات کہ، فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا شعبہ نہ تھا، آج کے لسانی تناظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہی ہے۔ اگر ان کی نظر آج سے دو سو سال پہلے کے شمالی ہندوستان کے لسانی وتہذیبی منظر نامے پر مرکوز ہوتی تو وہ ہرگز یہ بات نہ کہتے۔ کسی عہد کے لسانی مسائل پر لکھتے وقت اس عہد کے تہذیبی وعمرانی پہلوؤں پر بھی غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ گیان چند جین صرف فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈز کو ٹٹولتے ہیں، ان کی نظریں اس عہد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی منظر نامے پر نہیں جاتیں کہ صحیح نتائج اخذ کر سکیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حل وعقد نے اُردو کی تہذیبی اہمیت اور سماجی قدر وقیمت نیز ضرورت کو سمجھا اور اس کے افادی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ یہ رتبہ شمالی ہندوستان کی کسی اور زبان کو حاصل نہ تھا۔ اسی لیے فورٹ ولیم کالج میں اُردو کی تعلیم وتدریس کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا جسے ہندوستانی شعبہ کہا گیا۔ ہندی (کھڑی بولی ہندی) کی اس وقت نہ تو کوئی لسانی اہمیت تھی اور نہ سماجی قدر وقیمت اور افادیت۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے پانچویں دہے میں بھی بنارس سنسکرت کالج (بعدہٗ کوئنز کالج) کے ہندو طلبہ تک ہندی پڑھنے سے گھبراتے تھے بلکہ گریز کرتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت متذکرہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بیلن ٹائن، جو ہندی کا زبردست حمایتی تھا، کی وہ کوششیں ہیں جو اس نے اپنے کالج کے طلبہ میں ہندی سے رغبت پیدا کرنے اور انھیں اس زبان کی تحصیل کی جانب مائل کرنے کے لیے کی تھیں، لیکن اس میں وہ ناکام رہا تھا۔ یہ ذکر فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ۴۵ سال بعد کا ہے۔ اس سے اس بات کا

بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے وقت ہندی اور ہندی تعلیم کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔

۱۸۰۰ء کے آس پاس شمالی ہندوستان میں جہاں مختلف بولیوں کے مختلف نام رائج تھے وہیں ایک نام 'بھاکھا' بھی مستعمل تھا جس کا ماخذ سنسکرت لفظ 'بھاشا' (= زبان) ہے۔ یہ نہ صرف برج بھاشا (جو دہلی کے جنوب مشرقی علاقے کی بولی ہے اور جس کا مرکز متھرا ہے) کے لیے مستعمل تھا بلکہ کسی بھی علاقائی یا مقامی بولی کو 'بھاکھا' کہہ دیا جاتا تھا۔ کچھ اہلِ علم اسے زمانۂ حال کی ناگری ہندی کی ابتدائی شکل مانتے ہیں۔ اسی لیے اس زمانے (انیسویں صدی کی ابتدا) میں ناگری ہندی کو بھی اکثر بھاکھا کہہ دیا جاتا تھا۔ یہ کوئی مستقل اور مخصوص بولی یا زبان نہ تھی اور نہ ہی اس زمانے میں اس کی کوئی اہمیت تھی۔ منشی سداسکھ لال جو کھڑی بولی ہندی کی کتاب 'سکھ ساگر' کے مصنف بتائے جاتے ہیں، بنیادی طور پر اُردو کے شاعر تھے اور نیازؔ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے 'بھاکھا' کی حقیقت صرف ایک مصرع میں بیان کردی ہے، ع

رسم و رواج بھاکھا کا دنیا سے اٹھ گیا

'بھاکھا' ایک عام لسانی اصطلاح تھی جس کا اطلاق کسی بھی علاقائی بولی کے لیے، جو اُردو/ ہندی/ ہندوی/ ریختہ/ ہندوستانی نہ ہو، ہو سکتا تھا۔ لیکن چوں کہ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لیے اس کا چلن روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور لوگ شائستہ اور ترقی یافتہ زبان اُردو کی جانب مائل ہوتے جاتے تھے، جیسا کہ منشی سداسکھ لال نیازؔ کے متذکرہ بالا مصرع سے بھی ظاہر ہے۔ تاہم گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی زبان کے شعبے میں جو بنیادی طور پر اُردو زبان کا شعبہ تھا ۷ جون ۱۸۰۲ء کو پچاس روپے ماہانہ مشاہرے پر ایک ''بھاکھا منشی'' (للوجی لال) کا تقرر کروایا۔ لیکن گلکرسٹ جب فروری ۱۸۰۴ء میں مستعفی ہو کر کالج سے الگ ہو گئے تو ان کے جانشین کی تجویز پر ۱۱- جون ۱۸۰۴ء کو للوجی لال کو ''غیر ضروری'' قرار دے کر برطرف کر دیا گیا۔ اس عہد میں ہندی (= کھڑی بولی ہندی) کی کیا اہمیت و افادیت تھی، اس امر کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں ایک بھاکھا منشی تک کی کھپت نہ ہو سکی، ہندی کا الگ شعبہ قائم کرنا تو دور کی بات تھی۔ جین صاحب کو یہ بات سوچنی چاہیے تھی کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب نے للوجی لال کو جو بھاکھا منشی کے عہدے پر فائز تھے، بالآخر محض دو سال کے قلیل عرصے میں ''غیر ضروری'' قرار دے کر کیوں برطرف کر دیا تھا؟ جب کہ اُردو کے درجنوں منشی اور مصنفین و مترجمین، مثلاً شیر علی افسوس، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولا، میر بہادر علی حسینی، میر امن، حیدر بخش حیدری، خلیل علی خاں اشک، مرزا محمد فطرت لکھنوی، مولوی حفیظ الدین، مرتضیٰ خاں، تصدق حسین، واجد علی وغیرہ اسی طرح اپنے اپنے عہدوں

پر بحال اور اُردو کے تصنیفی و تالیفی کاموں میں منہمک رہے۔ گیان چند جین نے للو جی لال کی فورٹ ولیم کالج میں تقرری کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کی برطرفی کی بات کو وہ دبا گئے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ للو جی لال کی برطرفی کا ذکر کرتے تو انھیں یہ بھی بتانا پڑتا کہ انھیں کیوں برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس طرح اس عہد میں ہندی کی مقبولیت اور غیر افادیت کا راز فاش ہو جاتا۔ گیان چند جین کو فورٹ ولیم کالج پر یہ الزام عائد کرنے سے پہلے کہ ''فورٹ ولیم کالج میں اُردو، عربی، فارسی وغیرہ کے شعبے تھے، نہ تھا تو ہندی کا''۔ (دیکھیے متذکرہ کتاب، ص ۱۷) یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جب ایک بھاکھا منشی ہی کالج کے لیے ''غیر ضروری'' ہو گیا تھا تو ہندی کا ایک پورا شعبہ ارباب کالج کس بنیاد پر قائم کرتے اور ایک غیر مقبول اور غیر منفعت بخش زبان (جو نومولود بھی تھی) کے لیے زرِ کثیر کیوں خرچ کرتے؟ دوسری اہم بات یہ ہے کہ گلکرسٹ کھڑی بولی کے اسلوب کو ''گنوارو'' (Vulgur) تصور کرتا تھا۔ اس کے باوصف اس نے کئی کتابیں بخطِ دیوناگری کھڑی بولی میں لکھوائیں اور کئی کتابیں ہندوستانی یعنی اُردو سے دیوناگری رسم الخط میں منتقل کروائیں۔ اس امر سے کسی اہلِ علم کو انکار نہ ہوگا کہ گلکرسٹ 'ہندوستانی' سے صرف اُردو مراد لیتا تھا اور اسی کو وہ ''اصل ہندوستانی اسلوب'' (The Genuine Hindoostanee style) کہتا تھا۔ اس کے علی الرغم کھڑی بولی بخطِ دیوناگری کو وہ ''ہندوی'' کہتا تھا جو اس کے نزدیک ''گنوارو'' (The vulgur or Hindavi) اسلوب تھا۔

فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کے جانشینوں نے اُسی ''ہندوی'' کو ''ہندی'' کہنا شروع کر دیا اور اس کے بہی خواہ بن بیٹھے۔ لیکن کالج کے احاطے سے باہر اس طرح کی ہندی کا کوئی چرچا یا زور نہ تھا اور کافی عرصے تک اس کی طرف کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی، لیکن انیسویں صدی کے وسط سے ہندوؤں کی توجہ رفتہ رفتہ اس زبان کی جانب مبذول ہوتی گئی۔ گیان چند جین کے بقول ''زبان کا مسئلہ غدر کے بعد اُبھر کر سامنے آیا...... ہندو اور ہندی آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے'' ('ایک بھاشا......'، ص ۱۸۶)۔ ہندی کو 'بڑھانے' اور اسے ہندوؤں کی قومی اور تہذیبی علامت بنانے میں برطانوی حکام کی سازش اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمتِ عملی کو کتنا دخل تھا، جین صاحب کی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ۱۰۔ جولائی ۱۸۰۰ء (فورٹ ولیم کالج کے قیام) سے لے کر ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء (میکڈونلڈ کے ناگری کے نفاذ سے متعلق فیصلے) تک اُردو کے خلاف جو کچھ بھی ہوتا رہا اسے حق بجانب قرار دیتے ہوئے گیان چند جین نے الٹا مسلمانوں کو ہی ہدفِ ملامت بنایا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر فرمان فتح پوری

ناگری، رومن اور اُردو رسم الخط کا قضیہ

پچھلے تیس سال یعنی ۱۹۰۶ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان اُردو ہندی تنازع کے سلسلے میں جو مسائل و موضوعات زیر بحث رہے' ان میں ''رسم الخط'' اور ہندوستانی کو مرکزی اہمیت حاصل رہی۔ ''ہندوستانی'' کی بحث کا آغاز اگرچہ ۱۹۲۵ء ہی سے ہو چکا تھا[1]۔ جبکہ کانگریس نے اس کو برصغیر کی قومی زبان تسلیم کیا تھا لیکن چونکہ اس بحث میں شدت ۱۹۳۵ء کے بعد بلکہ قیام پاکستان سے چند برس پہلے پیدا ہوئی۔ اس لیے اس کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا' البتہ ''رسم الخط'' کے مسئلے کا اس جگہ قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ہے کہ اس عرصے میں یہی گھوم پھر کر اہل علم اور سیاست دانوں کا موضوع سخن رہا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق:

> ''رسم الخط کا مسئلہ آج تک بہت زیر بحث ہے اور خاصا بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے۔ اس میں مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جیسا ہمارے ہاں عام دستور ہے رسم الخط کو قومی تہذیب اور مذہب کا جزو سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ لوگ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس پر بحث کرنا ترک کر دیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس مسئلے کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس رسم الخط میں صرف کم ہو گا' وقت کم لگے گا جگہ کم گھرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہو گی اور جو دیکھنے میں خوشنما ہو گا وہی مقبول ہو کے رہے گا''[2]۔

لیکن رسم الخط کے سلسلے کی جو بحث اس درمیان شد و مد سے جاری ہوئی وہ نئی نہ تھی۔ اس کی بنیاد بھی دراصل اسی وقت پڑ گئی تھی جب کہ فورٹ ولیم کالج' کلکتہ میں للوالال جی سے ''پریم ساگر'' لکھوا کر ناگری میں شائع کی گئی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ فارسی اور ناگری رسم الخط کا جھگڑا اتنا ہی پرانا ہے جتنا ہندی اور اُردو کا .... بلکہ تاریخی حالات پر غور کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ اُردو ہندی قضیے کا آغاز بھی حقیقتاً ''رسم الخط'' کے سوال سے پیدا ہوا۔ بابو شیو پرشاد' بابو راجندر لال متر' بابو نوبین چند اور ان کے ہم خیال شروع میں صرف یہ

چاہتے تھے کہ اُردو کا رسم الخط فارسی کے بجائے ناگری کر دیا جائے۔ اس میں ان کی دانائی اور دور اندیشی کو دخل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ رسم الخط اور زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور جیسے ہی اُردو کا رسم الخط بدلا گیا ہندی خود بخود ابھر کر سامنے آ جائے گی اور اُردو کا اپنا وجود ختم ہو جائے گا لیکن مخالفین کی یہ چال کامیاب نہ ہوئی۔ اُردو کے بہی خواہوں نے جلد ہی ان کے در پردہ عزائم کو بھانپ لیا اور اُردو کی حفاظت کے ساتھ فارسی رسم الخط کی حفاظت کو بھی ضروری خیال کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا زبان اور رسم الخط کے مسئلے ایک دوسرے سے نتھی ہو گئے اور آخر تک رہے۔ ہندی زبان سے قبل ناگری رسم الخط کا مطالبہ جیسا ابھی ذکر کیا گیا' خاص سبب سے تھا۔ ہندی الگ سے کوئی زبان نہ تھی۔ اس کا نحوی ڈھانچہ اور قواعد کے اصول وہی ہیں جو اُردو کے' صرف سنسکرت کے الفاظ بکثرت استعمال کرنے سے ہندی بن جاتی تھی۔ ہندوؤں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے اُردو کو ناگری میں لکھنے کا مطالبہ کیا پھر اس میں سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال کر سنسکرت الفاظ شامل کر دیے اور اسے ہندی کا نام دے دیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۸ء میں اُردو کے خلاف جو طویل عرضداشت ہندوؤں کی طرف سے لیفٹیننٹ گورنر میکڈونلڈ کو دی گئی اس میں بھی صرف ''ناگری'' کو رائج کرنے کی گزارش کی گئی تھی۔ مولوی وحید الدین سلیم نے ''معارف'' بابت ستمبر ۱۹۰۰ء میں بہ عنوان ''حامیانِ ہندی اور ان کا مغالطہ'' لکھا ہے کہ:

> ''صوبہ جات متحدہ کے عام باشندوں کو جن کی زبان اُردو یا ہندوستانی ہے اور جن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے باشندے شامل ہیں سخت تعجب اس بات پر ہے کہ ہز آنر نواب لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب و اودھ نے ۲- مارچ ۱۸۹۸ء کو حامیانِ ناگری کے میموریل کے جواب میں جو اسپیچ کی تھی اس میں انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ حامیان ناگری اس زبان کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے جو عدالتوں میں رائج ہے بلکہ وہ اس خط کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ لکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸- اپریل کے ریزولیوشن کو نافذ کرنے کے وقت خود نواب ممدوح نے بھی اس امر کا اقرار کیا ہے کہ یہ ریزولیوشن ہندی حروف کے عدالتوں میں جاری کرنے سے متعلق ہے۔ ہندی زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر آخر کیا وجہ اس بات کی پیش آئی کہ ۲۱- جون ۱۹۰۰ء کے ریزولیوشن میں ہندی زبان اور ناگری حروف دونوں کو عدالتوں میں جاری کرنے کا حکم صادر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس حکم کا ایک جز میموریل

پیش کرنے والوں کی خواہش سے بھی زیادہ ہے"۔[۳]

اس بیان سے ایک اندازہ تو یہ ہوا کہ میکڈونلڈ صاحب کس درجہ اُردو کے دشمن اور ہندی کے طرفدار تھے۔ دوسری یہ کہ ہندوؤں نے رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ دانستہ اور خاص منصوبے کے تحت کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی زبان کے لیے جو رسم الخط صدیوں تک استعمال میں آتا رہتا ہے اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور رس تعلقات قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ و ریشہ میں اس طرح بندھ جاتا ہے کہ رسم الخط کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی لازمی امر ہے۔ یہی حال اس قوم کا ہے جو اپنی زبان کے لیے ایک رسم الخط رکھتی ہے۔ اگر اس رسم الخط کو مطلقاً بدل دیا جائے تو وہ قوم اپنے ماضی، روایات، ادب، ثقافت، علوم، فنون سب سے بیگانہ ہو جائے گی۔ گویا صدیوں کی ترقی کے بعد وہ پھر اپنے بچپن کی جانب لوٹے گی اور اس طرح اسے ایک ایسے عظیم خسارے سے واسطہ ہوگا جس کی کسی طرح تلافی نہیں کی جا سکتی"۔[۴]

چنانچہ ہندوؤں نے خاص اسی غرض سے کہ "ناگری" کے استعمال سے نہ صرف اُردو بلکہ مسلمانوں کے سارے ثقافتی و تہذیبی سرمائے کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو جائے گا' ہندی زبان سے پہلے ناگری رسم الخط کو جاری کرنے پر زور دیا۔ ہندی کے بعض حامیوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا کہ ناگری رسم الخط' فارسی رسم الخط سے بہتر ہے اور اس کا رواج مروجہ فارسی خط سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ ہندی کے سرگرم حامی راجندر لال متر نے ۱۸۶۴ء میں کہا تھا کہ:

"ہندوستانی زبان سچ پوچھو تو دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، ناگری اور فارسی"

۔ فرق یہ بتایا ہے کہ فارسی رسم الخط مسلمانوں کی ہندوستانی (اُردو) اور ناگری رسم الخط ہندوؤں کی ہندوستانی (اُردو) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

گارسین دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اُردو کو ناگری رسم الخط میں لکھنے سے عربی و فارسی الفاظ کو پڑھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ جتنا کہ سنسکرت الفاظ کو فارسی رسم الخط میں"۔[۵]

اُردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں ناگری ہی نہیں رومن یا لاطینی رسم الخط کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے، گارسین دتاسی کے مذکورہ بالا خطبے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے جس سال راجندر لال متر نے ناگری کو رائج کرنے کے سلسلے میں مضمون لکھا اسی سال ایک مستشرق ماہر لسانیات نے ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے رسالے میں اُردو کو رومن میں لکھنے کا مشورہ دیا، دلیل یہ دی کہ:

''اُردو کا کوئی اپنا مخصوص رسم الخط نہیں ہے۔ فارسی رسم خط ہندی نژاد نہیں ہے اور دیوناگری رسم الخط میں جو ہندوؤں میں بالعموم مروج ہے یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس زبان کے فارسی عناصر کا بخوبی احاطہ کر سکے۔''

گارسین دتاسی نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

''اُردو کو لاطینی خط میں لکھنا مفید نہ ہوگا۔ اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھ مزید ایسے حروف کی ضرورت ہوگی جن پر خصوصی علامتیں لگی ہوئی ہوں۔ یہ ایک نیا نظام تہجی ہوگا اور ان کا سیکھنا ہندی کے حروف تہجی سے بھی زیادہ دشوار ہوگا''۔

گارسین دتاسی نے اور بھی کئی خطبوں میں زور دے کر کہا ہے کہ:

''زبان اور رسم الخط ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں اس لیے اُردو کے رسم الخط کو ناگری یا رومن میں بدلنا اس کے حق میں تباہ کن ثابت ہوگا''[6]۔

اپنی مشہور کتاب ''تاریخ ادب ہندوستانی'' کے مقدمے میں بھی اس نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''گزشتہ کئی برسوں سے ہندوستان میں وہی رجحان پیدا ہو گیا ہے جو یورپ میں قومیت کے نام پر پیدا ہوا تھا۔ ہندوؤں نے اُردو پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملک کی عام زبان اُردو نہیں ہندی ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اُردو ایک دلکش ادبی سرمایہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس ہندی کا ادبی حیثیت سے عدم وجود برابر ہے۔ یہ مسئلہ ادبی نوعیت کا ہے جیسے فرانس میں تنگ نظر قوم پرستوں نے صوبائی بولیوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش میں اٹھایا تھا۔ اسی طرح ہندو فارسی رسم الخط کے مخالف ہیں اور دیوناگری کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ایسا کرنا آنکھ سے اندھے ہونے کے مترادف ہے بہر حال مسلمانوں نے بڑی حوصلہ مندی سے ان کے حملوں کا مقابلہ کیا

اور ایسی قوی دلیلیں پیش کیں کہ میرے نقطۂ نظر سے وہ کامیاب رہے۔ یہ اختلاف دراصل نسل و مذہب کے اختلاف سے پیدا ہوا ہے' کون جانے کہ انگریزی حکومت رومن حروف تہجی کو رواج دے کر اس اختلافی مسئلے کو ختم کردے گی یا باقی رکھے گی لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ علمی وادبی حیثیت سے ایک افسوسناک واقعہ ہوگا''۔ ہے

غرضیکہ اُردو کے لیے فارسی خط کے بجائے ناگری یا رومن رسم الخط کی تجویزیں بہت پرانی ہیں، ان تجویزوں پر بحث کا سلسلہ سیاسی، علمی اور صحافتی ہر سطح پر ایک مدت سے جاری ہے۔ انیسویں صدی تک یہ بحث عموماً انفرادی حیثیت کی تھی یا زیادہ سے زیادہ علمی وادبی انجمنوں کی نمائندگی تک محدود تھی، لیکن بیسویں صدی میں یہ ہندو مسلم سیاست کا ایک جزو بن گئی اور علمی وادبی شخصیتوں کے ساتھ اس بحث میں سیاسی مفکرین اور قومی رہنما سبھی شریک ہو گئے، دھواں دھار تقریریں ہوئیں، مقالات لکھے گئے، اخبارات میں اداریے اور کالم چھپے، علمی وادبی اور تعلیمی وسماجی انجمنوں نے قراردادیں منظور کیں۔ سیاسی جماعتوں کے درمیان مشترک قومی زبان اور مشترک رسم الخط کی تلاش میں مذاکرات ہوئے لیکن یہ ساری چیزیں عملاً بے نتیجہ ثابت ہوئیں اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، اس لیے کہ ایک زبان کے مستقل رسم الخط کو خارج کر کے اس پر کسی دوسری زبان کے رسم الخط کو منطبق کرنے یا مروجہ رسم الخط کو پنچایت یا حکم واحکام کے ذریعے شعوری طور پر آسان بنانے کا عمل ایک غیر فطری عمل تھا۔ زبان چھوٹی ہو یا بڑی رسم الخط اس کا بنیادی جزو ہوتا ہے، نہ تو رسم الخط کو زبان سے جدا کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی زبان بغیر اپنے مخصوص رسم الخط کے بہت دنوں تک زندہ رہ سکتی ہے۔ ان کا باہم تعلق جسم وجان کی طرح ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ:

> ''یوں تو روح کے لیے ہر جسم برابر ہے، کوئی بھی ہو، جسم اگر صالح، توانا اور کامل ہے تو روح کو ترقی کرنے اور اندرونی توانائی حاصل کرنے کی بڑی آسانیاں ہیں۔ زبان کو بھی رسم الخط چاہیے وہ رسم الخط کی محتاج ہے اور رسم الخط کی صلاحیت اور کاملیت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ ایک اور مثال درخت وزمین کی ہے۔ درخت کو زبان سمجھیے اور زمین کو رسم الخط۔ درخت ایک خاص قطعہ زمین سے متعلق ہوتا ہے جس میں اس کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ درخت کی نشوونما میں ایک قطعۂ زمین کا بڑا دخل ہوتا ہے، رسم الخط کو زبان کی نشوونما میں تو کوئی دخل نہیں لیکن وہ زبان کے مزاج اس کی گوناگوں تبدیلیوں اور ارتقائی منزلوں کا حامل ہوتا ہے۔ رسم الخط زبان کا آئینہ ہے۔ جس میں

اس کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ اس کی زندگی کا مقیاس ہے، ایک کتاب ہے جس میں زبان کی پوری تاریخ لکھی ہوتی ہے۔

درخت جو زمین میں جڑ پکڑ چکا ہے آسانی کے ساتھ اکھاڑا نہیں جاسکتا اور اگر کسی تختۂ زمین سے اکھاڑ کر دوسری جگہ اس کو جما دیا جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ درخت خشک ہو جاتا ہے اور اگر دوسری جگہ جم بھی جاتا ہے تو اچھے پھل نہیں دیتا۔ یہ اثر اس زمین سے الگ کرنے کا ہوتا ہے جہاں وہ عرصہ سے لگا ہوا تھا۔ یہ تو ایک مثال ہے۔

کسی زبان کے قدیم رسم الخط کو ترک کرنا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا خط اختیار کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔ اس سے زبان کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مٹ جاتی ہے۔ لفظ بے جان ہو جاتے ہیں اور زبان میں وہ اثر اور جادو نہیں رہتا جو جگ بیتنے پر اس نے حاصل کیا تھا''۔[۸]

باایں ہمہ اس غیر فطری عمل کو بعض حضرات برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی ہندوستان و پاکستان میں آزمانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اگر چہ کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے بعنوان زبان اور رسم الخط کا تعلق اس بات کا اظہار کیا کہ:

''یہ بات طے شدہ ہے کہ زبان پہلے پیدا ہوئی اور اس کا رسم الخط بعد میں۔ میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ زبان اور رسم الخط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے بلکہ رسمی ہے۔ پھر جو یہ خیال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ اگر کسی زبان کا رسم الخط بدلا گیا تو وہ زبان بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

اب اگر یہ بات طے ہو جائے کہ زبان اور رسم الخط الگ الگ چیزیں ہیں اور کوئی زبان کسی رسم الخط میں لکھی جاسکتی ہے تو پھر اُردو کے لیے دیوناگری، لاطینی اور فارسی رسم الخط میں سے کسی ایک کے منتخب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کرے گا۔ فطرت، مزاج اور نفسیات کے نام پر بہت سے علمی مغالطے تیار کیے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اگر رسم الخط بدل دیا جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہو جائے گی''۔[۹]

پروفیسر سید احتشام حسین نے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں جو دلائل دیے تھے اوّل تو وہ بہت کمزور تھے دوسرے یہ کہ وہ خود بھی رسم الخط اور زبان کے گہرے رشتے سے خوب واقف تھے اور انھوں نے

انجان بن کر اس موضوع کو محض بحث مباحثے کے لیے چھیڑا تھا۔ اس لیے کہ جیسے ہی ان کے مضمون کے جواب میں علامہ نیاز فتح پوری اور دوسرے ادیبوں نے قلم اٹھایا وہ اپنے مؤقف سے دستبردار ہو گئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بہت پرانے مسئلے کو ایک نئے شوشے کے طور پر پھر چھوڑا اور اُردو املا کو آسان بنانے کی غرض سے بعض آوازوں کو اُردو کے حروف تہجی سے خارج کرنے کی تجویز پیش کی[۱۰]۔ اس کی رد میں پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا تھا پھر بھی کئی مضامین لکھے گئے۔ ہر طرف سے مخالفت ہوئی، مولانا حامد حسن قادری نے لکھا:

''میرے نزدیک اُردو کو آسان کرنے کی یہ تجویز نہایت خرابی کا باعث ہے۔ جب تک ہندو پاک میں مسلمان ہیں، اسلامی کلچر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور کلچر کے اجزائے ترکیب واستحکام و ترقی میں عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانیں شامل ہیں اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ صدہا لفظ جو تینوں زبانوں میں مستعمل ہیں، عربی و فارسی میں صحیح لکھے جائیں اور اُردو میں ث، ذ، ض، ظ وغیرہ بدل کر لکھے جائیں''[۱۱]۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا:

''زبان وہ چیز نہیں کہ حاکم، حکم جاری کر دے اور دوسرے ہی دن نئی زمین، نیا آسمان بن جائے۔ یہ ان چیزوں میں ہے کہ: نہ بزورے نہ بزاری نہ بہ زری آید''[۱۲]۔

پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان کے اقتدار میں آنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں رسم الخط کا مسئلہ پھر شد و مد کے ساتھ اٹھایا گیا، وہی سوال پرانی تجویز جس کا مقصد فارسی رسم خط کو رومن خط سے بدلنا تھا اور جس کی مخالفت گارسین دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کی تھی، سامنے لائی گئی۔ اخبارات و رسائل کے ذریعے اس کے متعلق دوسروں کی آرا طلب کی گئیں، کراچی کے اخبار جنگ نے اس پر رائے شماری کا سلسلہ شروع کیا، نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا یعنی چند ایک کے سوا عام و خاص سب نے رومن رسم الخط کی تجویز کو رد کر دیا۔

ان مباحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو کا رسم الخط دو چار سال نہیں پورے سو سال معرض بحث میں رہا ہے اور آج بھی اس کے خلاف بعض گوشوں سے آوازیں سننے میں آ جاتی ہیں۔ اس آواز کے خلاف سینکڑوں مدلل و مضبوط مضامین اُردو کے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خطبات اور گارسین دتاسی کے مقالات و خطبات میں تو مخالفین کی آرا کے ساتھ رسم الخط کا مسئلہ جگہ جگہ زیر بحث آیا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے ترجمان ''ہماری زبان،، میں اس موضوع سے متعلق کم و بیش وہ ساری بحثیں محفوظ

ہیں، جو کانگریس اور مسلم لیگ کے مؤقف کے طور پر موضوع سخن رہیں۔ جیسا کہ پچھلی سطور میں ذکر کیا ہے، زبان و ادب کے بعض عالموں نے بھی بطور خاص توجہ کی اور اُردو رسم الخط کی مدافعت میں نہایت کارآمد مضامین لکھے۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، پروفیسر معین الدین دردائی، سید عبدالقدوس ہاشمی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور بعض دوسروں نے صرف یہی نہیں کہ ناگری، رومن اور اُردو رسم الخط کی بحث میں ساری نئی پرانی دلیلوں کو سمیٹ لیا بلکہ بعض نئے دلائل کا اضافہ بھی کیا لیکن پچھلے سو سال کی لمبی اور تکرار بے جا بحث کو اس کے جملہ حوالوں اور تفصیلات کے ساتھ اس جگہ دہرانا نہ تو ممکن ہے نہ مفید، البتہ رسم الخط کے موضوع کا ایک مختصر سا جائزہ اس جگہ پیش کیا جا رہا ہے جسے اس موضوع سے متعلق سارے مباحث کا خلاصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ رسم الخط سے مراد وہ نقوش و علامات ہیں جنھیں حروف کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ہے، زبان خود کیا ہے؟ اس جگہ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ زبان نام ہے مجموعۂ الفاظ کا۔ الفاظ مرکب ہیں اصوات سے اور اصوات نام ہے ان تصاویر، خطوط اور نشانات کا جو ارتقا کی منزلیں طے کر کے آج، حروف کے نام سے ہمارے سامنے ہیں۔ یہی حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں اپنی مربوط صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ہیں۔

زبان کی طرح رسم الخط کے وجود میں آنے کے بھی اسباب ہیں، زبان کی بالکل ابتدائی منزلوں میں جب کوئی آواز کسی کے منہ سے نکلی ہو گی تو آواز دینے والے نے مخاطب پر اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے اصل چیز دکھائی ہو گی یا پھر جس چیز کی طرف توجہ دلانی مقصود رہی ہو گی اس کی نشاندہی کے لیے کوئی تصویر، نقش یا علامت بنا دی ہو گی۔ ٹھوس چیزوں کے سلسلے میں نقوش و علامات یا تصاویر سے بڑی مدد ملی ہو گی۔ لیکن جذبات و کوائف کو سمجھنے سمجھانے میں خاص دشواری پیش آئی ہو گی۔ اس لیے کہ جذبات و کوائف کا تعلق عالم خارجی سے نہیں عالم محسوسات سے ہے، پھر بھی آج جبکہ ہر قسم کے اظہار کے لیے رسم الخط ہی سے کام لیا جا رہا ہے یہ کہنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انسان نے بہت جلد جذبات و محسوسات کے اظہار کے لیے بھی علامتیں وضع کر لی تھیں۔ یہی علامتیں ہزاروں سال کی مسافت طے کر کے حروف کے نام سے موسوم ہوئیں اور آج ان ہی کا دوسرا نام رسم الخط ہے۔ زبان اور رسم الخط دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا غلطی ہے۔ لباس کو اتار کر پھینکا جا سکتا ہے۔ بدلا جا سکتا ہے، رسم الخط زبان کا لباس نہیں بلکہ اس کی جلد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اسے زبان سے الگ کرنے کا نتیجہ زبان کی

تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ خیال گمراہ کن ہے کہ کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں پوری صحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے اور ایک زبان کے مطالب کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں من و عن ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر زبان کے لیے ایک جداگانہ رسم الخط کی ضرورت نہ ہوتی، ساری زبانیں ایک ہی قسم کے حروف یا رسم الخط سے اپنا کام چلا لیتیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل الفاظ دیکھیے:

1. Head, 2. Hid, 3. Hell, 4. Hill

اگر انھیں اُردو میں لکھا جائے تو ''ہڈ'' اور ''ہل'' کے سوا کسی اور طرح لکھنا ممکن نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری ادائے تلفظ میں حارج ہوگی، مزید وضاحت کے لیے حسب ذیل الفاظ دیکھیے:

1- Eye, I
2- Hear, Heir
3- Berth, Birth
4- Hole, Whole
5- Die, Dye
6- Foul, Fowl
7- Lose, Loose
8- Lawyer, Liar
9- For, Far
10- See, Sea
11- Sun, Son

انھیں اُردو میں علی الترتیب: آئی، ہیر، برتھ، ہول، ڈائی، فاول، لوز، لائر، فار، سی اور سن لکھا جائے گا اور یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ انگریزی کا کون سا لفظ اس جگہ مراد ہے۔ انگریزی میں ہم تلفظ الفاظ ایک دو نہیں ہزاروں ہیں۔ اس لیے وہ اُردو رسم الخط میں معنوی الجھن پیدا کریں گے۔ ایک مثال اور دیکھیے:

Man, Main, Mean

میں سے انگریزی میں ہر ایک اپنا جدا تلفظ اور معنی رکھتا ہے لیکن اُردو رسم الخط میں یہ سب ''مین'' کی صورت میں لکھے جائیں گے اور ان کے تلفظ و معنی تک پہنچنا دشوار ہوگا، بعض انگریزی الفاظ تو ایسے ہیں کہ انھیں کسی طرح اُردو میں لکھا ہی نہیں جا سکتا مثلاً:

Pure, Cure, Sure

اُردو میں ''پیور''، ''کیور''، ''شیور'' کی شکل میں لکھے جائیں گے اور اپنا تلفظ یکسر کھو بیٹھیں گے۔ انگریزی کے Badge, Catch اور Batch کی صورت اُردو میں ترتیب وار ''کیچ، بیج اور بیچ'' ہو جائے گی

اور یہ اُردو کے بامعنی لفظ بن جائیں گے۔

انگریزی میں حروف علت (Vowel) یعنی A,E.I.O اور U کی آوازیں، اکثر الفاظ میں ایک سی ہو جاتی ہیں مثلاً Ought, Sir, Early, All اور Ugly وغیرہ ظاہر ہے کہ انھیں اُردو رسم الخط میں الف یا ع سے لکھا جائے گا اور تلفظ میں معنی دونوں کے سمجھنے میں دقت ہوگی، اس جگہ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انگریزی میں حروف تہجی یا آوازیں صرف چھبیس ہیں، اس کے برعکس اُردو میں حروف یا آوازوں کی تعداد تقریباً دگنی ہے۔ بایں ہمہ اُردو رسم الخط میں انگریزی کا لکھنا ممکن نہیں ہے، عربی اور فارسی رسم الخط میں انگریزی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اور زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزی کی D اور T کی آوازیں پیدا کرنا عربی اور فارسی حروف کے ذریعے ممکن ہی نہیں۔ اس قسم کی دشواریاں اُردو کو انگریزی حروف میں لکھنے سے پیدا ہوں گی۔ اُردو میں حروف تہجی یعنی آوازوں کی تعداد کثیر ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کے چھبیس حروف ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اُردو کی بہت سی آوازیں ایسی ہیں جو انگریزی یا رومن رسم الخط میں موجود نہیں مثلاً د، ڑ، ت، ط، ع، غ، خ وغیرہ کی آوازوں کو لے لیجیے اور دل، پہاڑ، تمام، طالب، وسیع، غریب، خدا کو انگریزی میں لکھیے تو بالترتیب ان کی صورتیں یہ ہوں گی۔

Khuda, Garib, Wasi, Talib, Tamam, Pahar, Dil

یعنی دل کو ڈل، پہاڑ کو پہار، تمام کو ٹمام، طالب کو ٹالب، وسیع کو وسی، غریب کو گریب اور خدا کو کھدا لکھا جائے گا۔ اس سے تلفظ و معنی، دونوں بری طرح مجروح ہو ں گے۔ د، غ اور خ کی آوازیں تو رومن میں کسی طرح پیدا ہی نہیں کی جاسکتیں۔ اگر That کی مثال دے کر یہ کہا جائے کہ د کی آواز Th سے غ کی آواز Gh سے اور خ کی آواز Kh سے پیدا کر لی جائیں گی تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ دھ، گھ، کھ وغیرہ کی آوازیں کہاں سے آئیں گی؟ چنانچہ اگر مندرجہ ذیل الفاظ انگریزی میں لکھے جائیں:

غل، گھل، تھم، خر، کھر وغیرہ

تو ان کی صورتیں یہ بنیں گی اور اوپر کے لفظوں میں سے صرف ایک ہی سمجھا جائے گا۔

Khar, Tham, Ghaul

ایسی ہی مشکلات ا اور ع، ح اور ہ ، ث، ص، س اور دوسرے مشابۃ الصوت حروف کی آوازوں میں پیش آئیں گی اور ان کے ذریعے تلفظ و معنی کا اخذ کرنا ناممکن ہوگا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہر زبان کا رسم الخط اس کے اپنے مزاج اور ساخت کے مطابق ہوتا ہے

اور وہ اسی میں صحیح طور پر پڑھی اور لکھی جاسکتی ہے، کسی دوسری زبان میں رسم الخط منتقل کرنے سے اس کی صورت اس قدر مسخ ہو جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا اسی لیے رسم الخط کو زبان کا لباس نہیں جلد کہا جاتا ہے۔ جلد اتار دینے سے زبان اصل صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔ رہ گیا یہ سوال کہ اُردو کا رسم الخط کس قسم کا ہے اور اس میں کیا خامیاں اور خوبیاں ہیں؟ سو اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ کسی زبان کے رسم الخط کی اچھائی یا برائی کو دو طریقوں سے پرکھا جاسکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کس حد تک مفید و آسان ہے اور دوسرے یہ کہ دیکھنے میں کتنا خوبصورت ہے۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہر زبان کے نظام تہجی میں اتنے ہی حروف یا نشانات ہوتے ہیں جتنی اس کے بولنے میں آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان حروف کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ ساری آوازوں کو آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے لے آئیں، اس لحاظ سے اُردو کا رسم الخط بہت جامع اور کامیاب رسم الخط ہے کہ وہ اس زبان کی ساری مروج آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

اُردو رسم الخط میں حروف تہجی کی تعداد پچاس ہے۔ انگریزی میں یہ صرف چھبیس ہیں، ہندی یعنی ناگری رسم الخط میں ان کی تعداد بیالیس ہے۔ عربی میں انتیس اور فارسی میں تینتیس ہے۔ یہ حروف چونکہ ان زبانوں میں استعمال ہونے والی آوازوں کی تعداد کا تعین کرتے ہیں اس لیے آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان میں آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو بین العلاقائی و بین المملکتی مزاج کی زبان ہے۔ اس نے اپنے نظام تہجی میں عربی، فارسی اور ہندی یعنی آریائی اور سامی دونوں خاندان کی زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس میں انگریزی سے لے کر علاقائی زبانوں تک کی ساری زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ دنیا کی مختلف زبانوں کی آوازوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ ہر اُردو جاننے والا عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کو ان کے حقیقی تلفظ کے ساتھ عموماً بول سکتا ہے اس لیے کہ ان میں ایک آواز بھی ایسی نہیں جو اُردو میں موجود نہ ہو یا جس کو ادا کرنے پر اُردو خواں طبقہ قادر نہ ہو۔ گویا جس طرح اُردو اپنے ذخیرہ الفاظ اور صرف ونحو کے اصول کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان ہے اسی طرح اس کا رسم الخط بھی مخلوط ہے۔ وہ دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہے اور ظاہر میں عربی و فارسی رسم الخط سے بہت قریب ہے لیکن اُردو کے رسم الخط کو عربی یا فارسی کا رسم الخط خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ اُردو کے حروف تہجی میں ہندی اور انگریزی کی ایسی آوازیں بھی شامل ہیں جو عربی و فارسی میں نہیں ہیں۔ ان آوازوں کی تعداد ایک دو نہیں خاصی ہے مثلاً:

ڈ، ٹ، ڑ، بھ، تھ، ٹھ، کھ، چھ، دھ

وغیرہ کی آوازیں نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں، ظاہر ہے کہ عربی و فارسی داں حضرات کو ان آوازوں کے

نکالنے اور ہندی یا انگریزی کو صحیح تلفظ کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں سخت مشکل ہو گی لیکن اُردو خواں افراد کو کسی زبان کے سیکھنے یا اسے لکھنے پڑھنے میں بہت آسانی رہے گی۔ نتیجتاً کہنا پڑتا ہے کہ اُردو کا اپنا رسم الخط ہے اور اس کی وسعت ساری زبانوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

سر ولیم جونز نے کہا تھا کہ:

> ''مکمل زبان وہ ہے جس میں ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آ سکتا ہے، نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکے۔ خیالات اگر سادہ ہوں تو الفاظ بھی سادہ اور اگر خیالات مشکل ہوں تو وہ بھی مشکل۔ اس طرح مکمل رسم الخط وہ ہے جس میں اس زبان کی ہر آواز کے لیے ایک مخصوص نشان ہو'' [۱۳]

رسم الخط کی اس تعریف پر اُردو کا رسم الخط پورا اترتا ہے۔ اُردو رسم الخط کی جامعیت و ہمہ گیری سے قطع نظر، اس کا بڑا وصف یہ بھی ہے کہ ناگری اور انگریزی رسم الخط کے مقابلے میں جگہ بہت کم لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقت اور کاغذ دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دیکھنے میں بھی دیدہ زیب ہے۔ انگریزی اور ہندی زبانوں کے حروف کے ساتھ اُردو حروف پر ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہو گا کہ سادگی کے باوجود اُردو کے حروف، نگاہ کے لیے ایک خاص قسم کی کشش رکھتے ہیں۔ چوتھی خوبی یہ ہے کہ اُردو میں اعراب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رومن میں A,E,I,O,U کے حروف زبر، زیر اور پیش کی آواز کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوتے ہیں، یہی حال ناگری یا ہندی رسم الخط کا ہے۔ اور ان کی ماترائیں اعراب کی حرکتیں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ان حروف علت اور ان کی علامتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اُردو میں آسانی یہ ہے کہ اعراب کے لیے الگ سے حروف نہیں ہیں بلکہ اعراب کا کام زبر، زیر، پیش کے مختصر نشانات سے لے لیا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت بھی کچھ دنوں کے لیے رہتی ہے بعد کو جب مشق بہم پہنچالی جاتی ہے تو ان نشانات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ جملے کی ساخت اور مفہوم کے لحاظ سے ہر لفظ کے اعراب خود بخود ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ اُردو کا ایسا وصف ہے جو دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔

پانچویں امتیازی بات یہ ہے کہ اُردو رسم الخط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا ہے اور اس کے حروف اور ان کی آوازیں عربی و فارسی سے بہت قریب ہیں، یہ قربت اُردو والوں کو عربی اور فارسی سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ عربی و فارسی والے بھی بآسانی اُردو میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ عربی و فارسی سے ہمارا جو ثقافتی و تہذیبی اور اسلامی و دینی رشتہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اُردو کا رسم الخط ان رشتوں کو استوار کرنے میں معاونت

کرتا ہے۔اس طرح کی اور کئی باتیں اُردو رسم الخط کی خصوصیات میں شمار کی جاسکتی ہیں لیکن ان اوصاف کے باوجود اُردو رسم الخط پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔خاص اعتراضات یہ تھے:

۱۔ اُردو رسم الخط میں حروف تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔اس لیے ان کا سیکھنا اور سکھانا بہت مشکل ہے۔اس کے برعکس دوسری زبانوں کے حروف تعداد میں بھی کم ہیں اور لکھنے میں بھی سادہ ہیں۔

۲۔ اُردو کے حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں، کبھی پورے لکھے جاتے ہیں، کبھی آدھے اور کبھی کبھی صرف ان کا چہرہ بنادیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، اُردو لکھنا پڑھنا سکھانے میں حارج ہوتی ہے اور اُردو پر قابو پانے کے لیے دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ اُردو میں ہم صوت، یعنی ایک ہی قسم کی آواز رکھنے والے حروف متعدد ہیں، مثلاً ا اور ع۔ت اور ط۔ث، س، ص۔ذ، ز، ژ، ظ، ض۔ح اور ہ وغیرہ یہ آوازیں، املا میں خاص طور پر الجھن پیدا کرتی ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا لفظ ''ث'' سے لکھا جائے'کون سا ''س'' سے اور کون سا ''ص'' سے۔

۴۔ اُردو میں اعراب کی دشواریاں ہیں، یہاں ناگری اور رومن کی طرح زیر، زبر اور پیش کے لیے حروف نہیں ہیں۔صرف قیاس سے زیر، زبر اور پیش لگا کر کام چلایا جاتا ہے۔ یہ چیز تلفظ اور املا کے تعین میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔

۵۔ اُردو رسم الخط میں بہت سے حروف لکھے جاتے ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے مثلاً خواب وخواہش کو''خاب'' اور'' خاہش''بولا جاتا ہے اور'' و'' کی آواز کہیں ظاہر نہیں ہوتی۔ لکھنے میں یا املا میں اس کا لانا ضروری ہے یہی حال ''عبدالرشید'' اور ''فی الحقیقت'' وغیرہ کے الفاظ کا ہے۔

یہ سارے اعتراضات فارسی اور عربی رسم الخط پر بھی وارد ہو سکتے ہیں۔اس لیے کہ اُردو رسم الخط ان دونوں سے بہت قریب ہے، صرف بعض آوازیں اور ان کے نشانات یعنی حروف تو اُردو میں زیادہ ہیں، لیکن جہاں تک جوڑ' شوشہ' مرکز' کشش اور دائروں کا سوال ہے، وہ بالکل ایک جیسے ہیں، تینوں زبانیں دائیں سے بائیں کو بالکل ایک ہی ڈھب سے لکھی جاتی ہیں۔تینوں میں خط نسخ اور نستعلیق سے کام لیا جاتا ہے اور سب میں

ٹائپ وطباعت کے مسائل ایک جیسے ہیں لیکن آج تک کسی نے فارسی یا عربی رسم الخط کو ناقص بنانے کی ہمت نہیں کی۔ خود ایرانی اور عربی علمائے زبان نے اس قسم کا خیال ظاہر نہیں کیا کہ ان کے رسم الخط کے سبب فارسی اور عربی کی ترقی رکی ہوئی ہے۔ بلکہ عملاً یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ عربی و فارسی کی کتابیں خوبصورت ٹائپ اور نستعلیق میں اعلیٰ درجے کی طباعت کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں، کسی نے رسم الخط کو کتابوں کی اشاعت کی راہ میں حائل قرار نہیں دیا، پھر آخر اُردو رسم الخط ہی کو اعتراضات کا نشانہ کیوں بنایا گیا؟ صرف اس لیے کہ ہندوؤں کو ہندی کے نام سے اپنی قومی زبان کو فروغ دینا اور اُردو کو ختم کر کے مسلمانوں کے ثقافتی آثار کو برصغیر سے ختم کرنا تھا۔ پھر بھی آیئے سارے اعتراضات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ معترضین اپنے مؤقف میں کس حد تک حق بجانب تھے۔

۱۔ پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ ہے اور ان کا سیکھنا سکھانا آسان نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حروف کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے لیکن یہ چیز اُردو کی سرشت اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ بتایا جا چکا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کا خمیر مختلف زبانوں اور بولیوں کی مدد سے تیار ہوا ہے۔ اس نے علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ یہ اثر الفاظ پر بھی ہے اور اصوات یعنی حروف پر بھی۔ اس نے فارسی کے خاص حروف پ، گ، ژ کو عربی کے خاص حروف ث، خ، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع وغیرہ کو اور سنسکرت و ہندی کے خاص حروف ڈ، ڑ، تھ، ٹھ، پھ اور جھ وغیرہ کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور اسی جذب واخذ کی بدولت اسے بین الاقوامی مزاج ملا ہے۔ اس مزاج کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ کی رہتی ساری آوازوں کی متحمل ہے۔ اگر آوازوں کی یہ کثرت اُردو رسم الخط میں نہ ہوتی تو اس کا مزاج وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ ایسی صورت میں آواز یا حروف کی کثرت کو اس کا عیب نہیں ہنر کہنا چاہیے۔ اسی ہنر کی بدولت تو اسے قبول عام نصیب ہے، اگر اس میں یہ ہنر نہ ہوتا تو وہ اب تک زندہ نہ رہتی کب کی مر گئی ہوتی۔ اس لیے کہ اسے عربی و فارسی یا ہندی وانگریزی کی طرح کبھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی، بایں ہمہ اس نے ترقی کی دوڑ میں بہت سی زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ گویا عملاً اس بات کا ثبوت ہے کہ رسم الخط نے کبھی اس کی راہ میں روڑا نہیں اٹکایا بلکہ اس کی بدولت دوسری زبان کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں۔

اب رہ گئی سادگی اور سہل الحصول ہونے کی بات تو سب جانتے ہیں کہ بچوں کو لکھنا سکھانے کے سلسلے میں جو بڑی دقت، پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ حروف کے نشانات کے مطابق ان کی انگلیاں آسانی سے

نہیں چلتیں، ایک ایک حرف کو بار بار ان سے لکھوایا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ اس کے بنانے پر قابو حاصل کر پاتے ہیں۔ ماہرین تعلیم نے اس وقت کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہے کہ بچوں سے ابتدا میں، چاک سے سیدھی سادی لکیریں کھنچوائی جائیں اور ہاتھ رواں ہو جانے کے بعد ان کی توجہ حروف تہجی کی طرف مبذول کرائی جائے۔

ان حروف کو بچوں سے لکھوائیں اور خود لکھ کر دیکھیے مجھے یقین ہے کہ اُردو حروف، ہندی و انگریزی کے مقابلے میں آسان ثابت ہوں گے اور کم وقت اور کم جگہ میں بنائے جا سکیں گے۔ یہاں ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے، اُردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ سہی لیکن تعداد کی زیادتی کے باوجود ان کا بنانا اور ان پر قابو پالینا آسان ہے۔ نیچے لکھے ہوئے حروف تہجی کو ذرا غور سے دیکھیے:

۱۔	ا	۲۔ب، پ، ت، ٹ، ث
۳۔	ج، چ، ح، خ	۴۔د، ڈ، ذ
۵۔	ر، ڑ، ز، ژ	۶۔س، ش
۷۔	ص، ض	۸۔ط، ظ
۹۔	ع، غ	۱۰۔ف، ق
۱۱۔	ک، گ	۱۲۔ل
۱۳۔	م	۱۴۔ن
۱۵۔	ہ	۱۶۔ی

ان میں صرف سولہ شکلیں بنیادی ہیں۔ اگر بچہ ان سولہ حروف پر قابو پا جائے تو وہ ان کی مدد سے سارے دوسرے حروف خود بخود بنا لے گا۔ اس لیے کہ باقی حروف صرف نقطوں یا مرکز کے اضافے سے بن جاتے ہیں جو بچہ ''ب'' لکھ سکتا ہے وہ اس سلسلے کے سارے حروف بنا لے گا اور پہلے ہی دن یہ محسوس کرلے گا کہ وہ استاد کی مدد کے بغیر اپنی طرف سے بہت کچھ کر لیتا ہے۔ حروف کے سارے مندرجہ بالا سلسلے اسی نوعیت کے ہیں۔ ان کا پہلا حرف بنوا دیا جائے تو باقی حروف بچے خود بنا لیں گے۔ ایسی صورت میں محض تعداد کی بنا پر یہ کہنا کہ اُردو کے حروف تہجی کا سکھانا مشکل ہے، صحیح نہیں ہے۔ اُردو کے حروف بناوٹ کے لحاظ سے حد درجہ سادہ اور اشکال کے اعتبار سے ناگری اور انگریزی سے بھی تعداد میں کم ہیں اور ایک اچھا استاد چند دن میں سارے حروف بچوں کے ذہن نشین کرا سکتا ہے۔

۲۔ اُردو رسم الخط پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں اس لیے ان کے پہچاننے اور لکھنے میں دشواری ہوتی ہے، یہ اعتراض بھی غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم الخط کی ظاہری صورت کو دیکھ کر وارد کر دیا گیا ہے، اُردو میں حروف یقیناً اپنی شکلیں بدلتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھیے:

باسط	طبیب	رباب
لباس	سامان	تسلیم
قلم	عقل	اخلاق

ان میں "ب" "س" اور "ق" کی شکلوں پر غور کیجیے، لفظ کے آخر میں پورا حرف آیا ہے یعنی اصل شکل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لفظ کے آغاز اور وسط میں شکل بدلی ہے، لیکن یہ تبدیلی دونوں میں ایک سی ہے۔ گویا حروف نے صرف ایک شکل بدلی ہے۔ پھر یہ تبدیلی ایسی بھی نہیں کہ حرف پہچاننے یا اس کے بنانے میں دقت ہو۔ بات یہ ہے کہ اُردو کے حروف، افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افراد اپنے چہرے سے پہچانے جاتے ہیں جسم سے نہیں۔ اگر چند آدمی اپنے اپنے چہرے ڈھانپ کر سامنے آ جائیں تو ان کا پہچاننا مشکل ہو گا۔ عدالتوں میں ملزمان کی شناخت کے لیے پریڈ ہوتی ہے، اصل ملزمان چند دوسرے افراد کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں، گواہان سے نشاندہی کرنے کو کہا جاتا ہے، چونکہ یہ ملزمان اپنے چہروں میں خاصی تبدیلیاں کر کے پریڈ میں شامل ہوتے ہیں اس لیے گواہ، اکثر انھیں شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف چہرے کی تبدیلی ایسی چیز ہے جو شناخت میں حارج ہو سکتی ہے لیکن اُردو کے حروف کسی ایک جگہ بھی اپنا چہرہ مسخ نہیں کرتے ہمیشہ اصل چہرے کے ساتھ سامنے آتے ہیں خواہ انھیں لفظ کے شروع میں جگہ دی جائے یا وسط میں یا آخر میں ــــ اوپر دیے ہوئے الفاظ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ کے ذریعے بھی اس دعویٰ کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ سارے حروف شکلیں بدلتے ہیں۔ اُردو کے حروف تہجی میں ا، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، ط، ظ، و، ایسے ہیں جو ہر صورت میں پورے لکھے جاتے ہیں' مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالیے:

۱۔	اسیر	تالاب	نانا
۲۔	دوڑو	کدورت	اولاد
۳۔	ڈول	کبڈی	ٹھنڈ
۴۔	ذکر	تذکرہ	کاغذ

۵۔ رشید — کرنال — افکار

۶۔ پیڑ — گڑبڑ — پہاڑ

۷۔ زہرہ — مزار — مرکز

۸۔ ژالہ — مژدہ — رپورتاژ

۹۔ طلب — مطلب — ربط

۱۰۔ ظاہر — مظہر — لفظ

۱۱۔ وحید — توحید — قابو

ہر گروہ، کے لفظوں کے آغاز، وسط اور آخر میں جو حروف آئے ہیں وہ اپنی پوری شکل کے ساتھ آئے ہیں اور ذرا سی توجہ سے ان حروف کی شناخت کی جا سکتی ہے، رہ گئے باقی حروف، ان کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ اصل چیز، حرف کا چہرہ ہے، یہ چہرہ اُردو میں ہمیشہ ظاہر کیا جاتا ہے، اس لیے حرف کی شناخت میں دقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض حروف مثلاً ب، ن، ک اور ع جب کسی دوسرے حرف سے مل کر آتے ہیں تو ان میں معمولی سا تغیر ضرور ہوتا ہے، مثلاً:

بس — بط

نس — نص

کل — کا

بغداد — مغرب

اوپر ''ب'' اور ''ن'' کو ''ل'' کی شکل میں ''س'' اور ''ص'' وغیرہ سے ملایا گیا ہے لیکن نقطوں کے ذریعے انھیں پہچان سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اُردو میں ''ن'' کے سوا کوئی حرف ایسا نہیں جس کے اوپر ایک نقطہ آتا ہو۔ یہی حال ''ب'' کا ہے کسی دوسرے حرف کے نیچے ایک نقطہ نہیں آتا۔ ''ب'' اور ''ن'' کی شکلوں کی یہ تبدیلی بھی صرف چند حروف کے ساتھ ہوتی ہے۔ باقی جگہوں پر وہ اصل چہروں ہی کے ساتھ آتے ہیں۔ ک اور گ صرف ''ل'' اور ''ا'' سے مل کر قدرے بدل جاتے ہیں ''مرکز'' کے ذریعے انھیں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ رہ گئے ع اور غ نستعلیق مین یقیناً ان میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ نسخ میں یہ بھی پورے چہرے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی معمولی تبدیلیاں ایسی نہیں جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ اُردو رسم الخط کا سیکھنا، سکھانا بہت مشکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مشکلیں انگریزی حروف سیکھنے میں پیش آتی ہیں۔

انگریزی میں سب سے پہلے بچے کو ''ایۓ'' سے لے کر ''زیڈ'' تک بڑے حروف (Capital Letters) سکھائے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مصرف انگریزی میں صرف اتنا ہے کہ وہ کسی اسم خاص(Proper Noun) اور جملے(Sentence) کے آغاز میں استعمال ہوتے ہیں۔ دو چار مقامات پر اوران کا استعمال ہوتا ہے لیکن یہ مقامات بھی اسم خاص اور جملے ہی کے تحت آ جاتے ہیں۔ بڑے حروف (Capital Letters) کے بعد، ان حروف سے بالکل مختلف شکل کے حروف یعنی a,b,c,d,e وغیرہ بنوائے جاتے ہیں۔ ان کا پہلی قسم کے حروف سے ذرا بھی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ جتنا وقت پہلے حروف کے سکھانے میں صرف ہوگا اتنا ہی ان کے سکھانے میں لگے گا، لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی، یہ حروف تو صرف لکھنے کے لیے سکھائے گئے ہیں۔ پڑھنے کے حروف ٹائپ میں، مندرجہ بالا دونوں قسم کے حروف سے الگ ہوں گے، گویا جب تک کوئی شخص انگریزی کے چھبیس حروف کو تین طرح سے لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، وہ انگریزی حروف تہجی جاننے کا دعویٰ ہی نہیں کرسکتا۔

ذیل کے انگریزی حروف دیکھیے:

A a a
B b b
D d d
E e e
F f f
G g g
H h h
I i i

اس سے ظاہر ہے کہ اکثر حروف کم از کم تین طرح اور بعض چار طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب تک کوئی آدمی انگریزی کے چھبیس حروف کو اُنہتر شکلوں میں پہچاننا اور لکھنا نہ جانتا ہو وہ انگریزی لکھنے پڑھنے کے لائق نہیں ہوسکتا۔ اب ذرا ناگری (ہندی) رسم الخط کو لے لیجیے، یہ سہل ترین رسم الخط سمجھا جاتا ہے لیکن جو لوگ ہندی سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں بعض حروف اپنی کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں۔

ان لفظوں میں ہندی کا حرف (ر) چار خاص شکلوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر شکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، اسی طرح ہندی میں ا کی آواز اور دو شکلوں سے ظاہر کی جاتی ہے اور دونوں میں جس کو چاہیں استعمال کرسکتے ہیں یعنی (آدرش) کو کی شکل میں بھی لکھنا درست ہوگا۔

نون غنہ کی آواز بھی ہندی میں کئی شکلوں سے پیدا کی جاتی ہے۔

ہر لفظ میں نون غنہ کی آواز الگ الگ شکلوں سے پیدا کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح اُردو میں بعض حروف صرف اپنا چہرہ ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندی میں بھی حرف کا صرف ابتدائی حصہ بنایا جاتا ہے جیسا کہ حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہے:

(کچّا) (لٹو) (کلّن) (بچّن)

یعنی اُردو میں جہاں تشدید کا استعمال ہوتا ہے، ہندی میں وہاں آدھا حرف لکھا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ہندی میں آدھا حرف اکثر لکھا جاتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ اس کا کوئی اصول مقرر نہیں ہے جیسے:

(کشٹ) (گند) (ویاکل) (آتما) (شبد) وغیرہ۔

اس لیے حروف کی شکلوں میں بعض تبدیلیوں کا سہارا لے کر اُردو رسم الخط کو ناقص بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس قسم کی دشواریاں ناگری اور دوسری زبانوں میں اُردو سے بھی زیادہ ہیں۔

۳۔ تیسرا اعتراض اُردو رسم الخط پر یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اس میں ہم صوت (ایک ہی قسم کی آواز والے) حروف، املا میں الجھن پیدا کرتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس لفظ کو ث سے لکھا جائے اور کس لفظ کو س یا ص سے۔ بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی ہے۔ اُردو میں چند حروف ایسے ہیں جو ایک ہی قسم کی آواز رکھتے ہیں اور لکھتے وقت ان میں امتیاز کرنا کچھ عرصے تک نو آموز کے لیے یقیناً مشکل ہوتا ہے، یہ حروف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ا، ع (۲) ت، ط (۳) ث، س، ص (۴) ذ، ز، ژ، ظ، ض (۵) ح، ہ

ان میں سے ہر گروہ کی نمائندگی کے لیے ایک ایک حرف تو رکھنا ہی پڑے گا صرف نو حروف یا ان کی آوازیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُردو رسم الخط میں دقت پیدا کرتی ہیں، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُردو ایک مخلوط اور بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے۔ اس میں جگہ جگہ کے اور بھانت بھانت کے الفاظ شامل ہیں، اس کا اصل رشتہ آریائی زبانوں سے ہے لیکن سامی خاندان خاص طور پر عربی کے بھی بکثرت الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں۔ مختلف زبانوں سے الفاظ داخل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو میں مترادف الفاظ کا ذخیرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ دوسری زبانوں میں کسی ایک چیز کے لیے ایک یا دو سے زیادہ الفاظ نہ ملیں گے لیکن اُردو میں ایک ہی چیز ہے کے لیے متعدد الفاظ موجود ہیں مثلاً ''چاند'' کا لفظ لے لیجیے اس کے لیے:

چاند، چندا، چندرما، قمر، ماہ، ماہتاب، ہلال، بدر وغیرہ

سبھی استعمال ہوتے ہیں اسی طرح تارا کے لیے:

تارا، ستارہ، سیارہ، اختر، انجم، نجوم وغیرہ

کے الفاظ مستعمل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب الفاظ دوسری زبانوں سے آئیں گے تو وہ اپنی آوازیں بھی ساتھ لائیں گے۔ چنانچہ اُردو میں جو بعض آوازوں کے کئی کئی حروف ملتے ہیں وہ اس کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو اپنے ذخیرۂ الفاظ کو اصل آوازوں کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر رہتی۔ کامل اور بہترین رسم الخط وہ کہلاتا ہے جو ان ساری آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اس زبان کے بولنے میں نکالنی پڑتی ہیں، اُردو رسم الخط کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اُردو میں بولی جانے والی تمام آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھنا آسان ہوگا، انگریزی میں چ، ذ اور ش کی آوازیں مستعمل ہیں، سینکڑوں ہزاروں الفاظ ہیں جن میں یہ آوازیں آتی ہیں مثلاً

۱۔ Future, Picture, Match, Chapter وغیرہ

۲۔ Those, This, That وغیرہ۔

۳۔ Admission, She, Motion وغیرہ۔

لیکن چ، ذ اور ش کی آوازوں کے لیے کوئی حرف مقرر نہیں ہے، حالانکہ یہ آوازیں طرح طرح سے پیدا کی جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کسی رسم الخط کا کھلا ہوا نقص ہے، اُردو رسم الخط اس نقص سے پاک ہے، ساری مستعمل آوازوں کے لیے مستقل حروف رکھتا ہے۔ اس خوبی کے نتیجے میں یہ ضرور ہوا کہ بعض آوازوں کے لیے کئی کئی حروف داخل ہو گئے ہیں، لیکن اُردو میں ہم صوت حروف زیادہ نہیں صرف تیرہ ہیں۔ ان تیرہ کو ہم نے اوپر پانچ گروہوں میں تقسیم کیا ہے، ہر گروہ سے ایک ایک حرف تو رکھنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ صرف نو حروف ایسے رہ جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ املا میں مغالطہ پیدا کرتے ہیں لیکن اس قسم کا مغالطہ پیدا کرنے والے حروف دوسری زبانوں میں اُردو سے بھی زیادہ ہیں۔ انگریزی زبان میں تو آوازوں کا کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ نشانات کچھ ہیں، آوازیں کچھ نکلتی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اس زبان کے املا (Spelling) اور تلفظ (Pronunciation) پر قابو پانا سخت مشکل ہے، جب تک ہر لفظ کے معنی کے ساتھ اس کا املا بھی اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہ ہو، لکھنا مشکل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے لفظ کے معنی کے ساتھ ساتھ اسپیلنگ بھی رٹائی جاتی ہے۔ جس شخص کو جتنے لفظوں کی اسپیلنگ یاد ہوگی، عام طور پر وہ اتنے ہی الفاظ لکھنے پر قادر ہوگا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انگریزی کے جو الفاظ ہمارے استعمال میں آتے رہتے ہیں صرف ان ہی کی اسپیلنگ ہمیں یاد رہتی ہے اور ان ہی کو ہم آسانی سے لکھ سکتے ہیں۔ باقی الفاظ کے املا میں ہمیں بار بار ڈکشنری کی ضرورت ہوتی ہے۔

انگریزی ڈکشنری میں ہر لفظ کے ساتھ ان کا تلفظ (Pronunciation) اسی لیے لکھا جاتا ہے کہ لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں ان کے متعلق یہ معلوم کر لینا کہ وہ کس قسم کی آواز پیدا کریں گے بہت مشکل ہوتا ہے، چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ انگریزی میں ''س'' کی آواز کے لیے بظاہر ایس کا حرف استعمال ہونا چاہیے اور اکثر ہوتا ہے جیسا کہ Sense, see, sun وغیرہ میں لیکن Receipt اور Centre میں "s" کی آواز "c" سے پیدا کر لی گئی ہے۔

۲۔ بظاہر ''ش'' کی آواز sh سے پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ She اور Shoe سے ظاہر ہے لیکن ''ش'' کی آواز اس کے علاوہ بھی متعدد طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ دیکھیے:

ا۔	Admission	(اڈمیشن)
ب۔	Tuition	(ٹیوشن)
ج۔	Patient	(پیشنٹ)
د۔	Ocean	(اوشن)
ہ۔	Sure	(شیور)
و۔	Machine	(مشین)
ز۔	Pressure	(پریشر)
ح۔	Fashion	(فیشن)
ط۔	Schedule	(شڈول)

جس شخص کو یہ بتایا گیا ہو کہ ''ش'' کی آواز "sh" سے پیدا ہوتی ہے، وہ کس قیاس پر سمجھ لے گا کہ مندرجہ بالا لفظوں میں ''ش'' کی آواز کن کن حروف سے پیدا ہوگی۔ چنانچہ جب تک اسپیلنگ رٹی ہوئی نہ ہو ان الفاظ کا لکھنا محال ہے۔ اگر اس طرح کے ایک دو لفظ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی، ہزار ہا الفاظ ہیں جن میں یہ دشواری پیدا ہوگی۔

۳۔ ''ک'' کی آواز کے لیے K اور Q حروف موجود ہیں۔ اس کے باوجود Cat اور Tect میں ک کی آواز "C" سے ظاہر کی گئی ہے۔

۴۔ ''ز'' کی نمائندگی کے لیے Z موجود تھا لیکن Has میں ز کی آواز "S" کی مدد سے پیدا کی گئی ہے۔

۵۔ ''ف'' کی آواز صرف "F" نہیں بلکہ Ph اور Ough سے بھی ظاہر کی جاتی ہے جیسے Prophet اور Rough میں۔

۶۔ ''ج'' کی آواز کی نمائندگی G اور J دونوں حرف کرتے ہیں جیسے Judge اور General میں۔

۷۔ ''چ'' کی آواز کے لیے کوئی حرف موجود نہیں ہے، پھر بھی کبھی Ch سے اور کبھی Ture سے اسے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً Match اور Picture وغیرہ میں۔

اس طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو انگریزی رسم الخط کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ انگریزی میں حروف سے آواز کا کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے کسی خاص لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں انھیں حافظے میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ حروف اور آوازوں کی ایسی بدنظمی شاید ہی کسی اور زبان میں پائی جاتی ہو، سینکڑوں الفاظ ہیں جن میں حروف لکھے جاتے ہیں لیکن آواز نہیں دیتے جیسے Match میں T اور Knife میں K۔ یہ چیزیں عام طور پر ایسی الجھن پیدا کرتی ہیں کہ ہر لفظ کے اسپیلنگ پر قابو پائے بغیر انگریزی کے دو جملے بھی بچہ نہیں لکھ سکتا۔ بایں ہمہ کسی طرف سے کبھی یہ آواز نہیں بلند کی گئی کہ رومن یا انگریزی کا رسم الخط بہت مشکل ہے اور اس مشکل کے سبب اس کی ترقی رکی ہوئی ہے۔

اوپر ہم صوت حروف کی دقتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ دقتیں کم و بیش دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ اسی طرح ''ز'' کی آواز کے لیے متعدد نشانات ہیں۔ ان کی مثالیں پچھلی سطور میں دی جا چکی ہیں، ان حقائق کی روشنی میں چند ہم صوت حروف کی بنیاد پر اُردو رسم الخط کو ناکارہ بنانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

۴۔ اُردو رسم الخط کی چوتھی کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں اعراب کا تعین کرنا مشکل ہے۔ کسی لفظ کا تلفظ کرتے وقت یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس جگہ زبر پڑھا جائے اور کس جگہ زیر یا پیش متصور کیا جائے اس لیے کہ اُردو میں اعراب کے نشانات زبر، زیر اور پیش بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک خاص منزل تک اس سلسلے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد اس پر قابو پایا جاسکتا ہے اس لیے کہ تلفظ کا تعلق لکھنے سے اتنا نہیں جتنا کہ بولنے سے ہے۔ اگر صحیح تلفظ کے ساتھ کوئی شخص اُردو بول لیتا ہے تو اسی قیاس پر وہ اُردو لکھے گا اور صحیح لکھے گا۔ پڑھنے کی بھی یہی صورت ہے، جن الفاظ کے تلفظ سے لوگوں کے کان آشنا ہیں، ان

الفاظ کو پڑھنے یا لکھنے میں وہ کوئی خاص الجھن محسوس نہ کریں گے۔

اُردو رسم الخط کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں حر،وف علت صرف تین ا، و، ی ہیں۔ یہ بھی اعراب کا کام کرتے ہیں لیکن ان سے زیادہ،تر زیر، زبر یا پیش کے معمولی نشانات بطور اعراب استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ اُردو تحریر جگہ بہت کم گھیرتی ہے، اُردو کے برعکس ہندی میں جگہ جگہ ماترائیں، اوپر کی لکیریں اور پائیاں لگانے کے لیے بار بار ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے اور حروف جگہ بھی خاصی گھیرتے ہیں۔ جگہ زیادہ لینے کا مطلب یہ ہوا کہ وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ انگریزی میں کہنے کو تو A,E,I.O,U کو حروف علت کہا جاتا ہے اور اعراب کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن عملاً انگریزی تحریر میں ان کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کوئی قیاس کام نہیں کرتا اور صحیح تلفظ تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ چند الفاظ بطور مثال دیکھیے:

ا۔ Shoot, Good

ب۔ Read, Red

ج۔ Put, Shut, Unity, Ugly

د۔ Sir, Pin

ہ۔ Escape, Early

و۔ Ice, Eye

ز۔ Yes,By

ان الفاظ میں I,U,E,O اور Y کی آوازوں پر غور کیجیے، نہ کوئی اصول ہے نہ تنظیم، ایک ہی حرف کی ایک ہی آواز کہیں زبر کا کام دے رہی ہے، کہیں زیر اور کہیں پیش کا ایک ہی حرف کہیں کھینچ کر پڑھا جاتا ہے کہیں یونہی اور کہیں سرے سے خاموش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کہ انگریزی الفاظ کا تلفظ متعین کرنا آسان ہے صحیح نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ حروف کی آوازیں جس بے ربطی اور بے معنویت کے ساتھ انگریزی یعنی رومن رسم الخط میں استعمال ہوتی ہیں، مشکل سے کسی دوسرے رسم الخط میں نظر آئیں گی۔ اُردو رسم الخط، رومن سے ہزار گنا بہتر ہے۔ اس میں اعراب کی ایسی دشواریاں نہیں ہیں کہ لکھنا پڑھنا مشکل ہو۔

۵۔ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ اُردو میں بعض حروف آواز نہیں دیتے پھر بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے ''خواہش'' کی ''و'' اور عبدالرشید میں ''ال''۔ معترضین کو جاننا چاہیے کہ اُردو میں اس قسم کے الفاظ کی تعداد کثیر نہیں ہے۔ تھوڑے سے الفاظ ہیں جو اس زمرے میں آتے ہیں' حروف تو صرف دو یا تین ہیں۔ جہاں تک

''ال'' کے آواز دینے اور نہ دینے کا تعلق ہے اس کے متعلق اگر حروف شمسی اور حروف قمری کی تقسیم چند مثالوں کے ذریعے طلبہ کو سمجھا دی جائے تو پھر یہ دقت خود بخود دور ہو جائے گی۔ بات یہ ہے ''ال'' کا استعمال صرف عربی ترکیب میں ہوتا ہے اور عربی ہی کے اصولوں کے مطابق وہ بولے اور پڑھے جاتے ہیں، لیکن انگریزی میں تو آواز نہ دینے والے (Silent) حروف بے شمار لفظوں میں آتے ہیں اور ایک نہیں کئی کئی آتے ہیں جیسے (Committee) اور (High) میں —— بااین ہمہ اس میں دشواری محسوس نہیں کی جاتی، پھر محض چند الفاظ کی بنا پر اُردو رسم الخط کو موردِ الزام کیوں گردانا جائے؟

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک زبان کا رسم الخط دوسری زبان پر منطبق نہیں ہو سکتا، اور نہ پختہ و مقبول ہو جانے کے بعد کسی زبان کا رسم الخط غیر ضروری اصلاحات و ترمیمات کو قبول کر سکتا ہے اور اگر اس میں کسی سبب سے تبدیلیاں لائی گئیں تو پھر وہ زبان اپنے وجود کو من وعن قائم نہ رکھ سکے گی اور اس کا سرمایہ تباہ ہو جائے گا۔ پھر بھی بعض لوگوں کی طرف سے اُردو رسم الخط میں اصلاح و تبدیلی کی تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ آیئے دیکھیں یہ تجویزیں کیا تھیں اور انھیں قبول کرنے سے اُردو کو کیا نفع یا نقصان پہنچ سکتا تھا۔

اُردو رسم الخط کے سلسلے میں ایک اصلاحی تجویز یہ پیش کی گئی تھی کہ اس میں لکھنے کے عمل کو صوتی بنیادوں پر قائم کیا جائے یعنی کسی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ہیں صرف انھیں کا لحاظ رکھ کر اس لفظ کو لکھا جائے اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے مثلاً

۱۔ ہما اور شمع میں ا اور ع کی آوازیں

۲۔ تالاب اور طالب میں ت اور ط کی آوازیں۔

۳۔ سالم، ثابت اور صادق میں س ،ث اور ص کی آوازیں

۴۔ حاصل اور ہاتھی میں ح اور ہ کی آوازیں

۵۔ ذاکر، زائر، ظاہر، ضامن میں ذ ، ز ، ظ اور ض کی آوازیں

ایک سی ہیں۔ عربی والوں کے نزدیک ان آوازوں میں فرق ہو تو ہو، اُردو والے ان آوازوں میں کوئی فرق نہیں کرتے، ایک ہی طرح بولتے ہیں، اس لیے ان آوازوں کی ترجمانی کے لیے ہر گروہ سے صرف ایک ایک حرف کو لے لینا چاہیے یعنی

(۱) ا، ع (۲) ت ، ط (۳) س، ث، ص (۴) ز، ژ، ذ، ظ، ض (۵) ہ، ح

میں سے صرف ا، ت، س، ز اور ہ کو لے لیا جائے باقی نو حروف یعنی ع، ط، ث، ص، ژ، ذ، ظ، ض اور ح کو اُردو

رسم الخط سے خارج کر دیا جائے۔اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اُردو املا کی وہ دقتیں ختم ہو جائیں گی جو آوازوں کی کثرت کے سبب محسوس ہوتی ہیں اور اُردو کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔

اوپر جن حروف کو حروف تہجی سے خارج کر دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ تعداد میں صرف نو ہیں، گویا ان نو آوازوں میں التباس کے سبب اُردو املا میں دشواری ہوتی ہے۔ حالانکہ پچھلی سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ آوازوں کا سب سے خراب نظام انگریزی میں ہے اور جب تک ہر لفظ کے ہجے (Spelling) پوری طرح رٹے ہوئے نہ ہوں کوئی شخص انگریزی لکھ ہی نہیں سکتا۔اس کے باوجود انگریزی برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اور کسی ایک فرد نے کبھی یہ آواز نہیں اٹھائی کہ انگریزی کے رسم الخط کو بدل دینا چاہیے لیکن بعض نے اُردو کے مندرجہ بالا نو حروف اور ان کی آوازوں سے بڑی الجھن محسوس کی اور ان آوازوں کو اُردو رسم الخط سے خارج کر دینے کی کوشش کی گئی۔اس سلسلے میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس نے کم وبیش دنیا کی ہر زبان سے فائدہ اٹھایا ہے۔اس پر فارسی اور عربی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔یہ اثر اس کے رسم الخط پر بھی صاف نظر آتا ہے۔علاوہ ازیں کوئی قومی زبان صرف اس غرض سے نہیں پڑھائی جاتی کہ اس قوم کے بچے اس میں معمولی شدھ بدھ پیدا کر کے دال روٹی کما کر کھا سکیں۔یقیناً یہ بھی ایک مقصد ہے لیکن قومی زبان کی تدریس کا اس سے اعلیٰ مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جو بچے آج اُردو پڑھ رہے ہیں انھیں میں سے کوئی آگے چل کر اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر، انجینئر، ماہر قانون، ریاضی دان، سائنسدان، عالم ادب، عالم زبان، ماہر لسانیات، محقق اور نقاد بن سکے۔ان میں سے کئی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے لیے اسے اُردو کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔اس کے حروف اس کے نظام صوتیات اور اس کے دخیل الفاظ سب کا حقیقی جائزہ لینا پڑے گا۔اس کام کے لیے اُردو کا موجودہ رسم الخط ہی مفید مطلب ہوگا، یہ مانا کہ اُردو میں ع، ط، ث، ص، ذ، ظ، ض، ح کی آوازیں (جنھیں خارج کر دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے) شروع میں بعض الفاظ کے املا میں، طلبہ کے لیے الجھن کا سبب بن سکتی ہیں لیکن اگر بچوں کو ابتدائی اور ثانوی منزل ہی میں یہ بات بتا دی جائے کہ یہ حروف خاص عربی کے ہیں اور اُردو میں استعمال ہونے والے الفاظ میں سے جس کسی میں ان میں سے کوئی حرف نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ لفظ عربی سے اُردو میں آیا ہے۔اس سے آگے چل کر زبان دانی اور اُردو کے لسانی مطالعے میں انھیں خاصی مدد ملے گی اور اُردو الفاظ کی شناخت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی تک پہنچنے میں بھی چنداں دقت نہ ہوگی۔عربی کے ہر لفظ میں تین حرف بنیادی ہوتے ہیں۔ان حرفوں کو اس لفظ کا مادہ کہتے ہیں، جس مادے سے کوئی لفظ بنتا ہے اس کا اس مادے سے تعلق بہر حال باقی رہتا ہے۔مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالیے:

۱۔ علم، تعلیم، معلم، تعلمش، معلّمہ، معلوم، عالم، علیم، متعلم، علام، علامہ، علوم
۲۔ عقل، عقیل، معقول، تعقل، عقیلہ، عاقل، عاقلہ، عقلیت۔

ان میں ''ع'' کی شمولیت سے بچے سمجھ جائیں گے کہ یہ الفاظ اصلاً عربی کے ہیں۔ پہلے گروہ کے الفاظ میں ''ع، ل، م'' اور دوسرے گروہ کے الفاظ میں ''ع، ق، ل'' بنیادی حروف ہیں۔ چنانچہ اگر کسی طالب علم کو ''علم'' اور ''عقل'' کے معنی بتا دیے جائیں یا اسے ان دو لفظوں کے معنی پہلے سے معلوم ہوں تو پھر وہ باقی الفاظ کے معنی تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ گویا ایک لفظ کے ذریعے وہ اس لفظ سے بنے ہوئے درجنوں الفاظ کی تفہیم پر قابو پالے گا۔ اس سے زبان دانی میں بچوں کو جو مدد ملے گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی، وقت کم لگے گا، اور معلم یا لغت سے مدد لیے بغیر بھی طلبہ اس قسم کے لفظوں کے معنی تک پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ''ع'' کو خارج کر کے ''ع'' والے الفاظ بھی ''ا'' سے لکھے جائیں وہ اس تبدیلی سے پیدا ہونے والی مشکلات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر ''علم'' اور ''عقل'' کو ''ا'' سے لکھیں تو ''الم'' اور ''اقل'' ہو جائیں گے۔ الم اور اقل کے لفظ خود عربی کے ہیں اور اُردو میں مستعمل ہیں مثلاً رنج والم، اور ''ذو اضعاف اقل'' میں اسی طرح علیم اور عقلیت کو ''ا'' سے لکھا جائے تو ان کی صورت ''الیم'' اور ''اقلیت'' کی ہو جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی اُردو میں مستعمل ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ اس سے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ''ا'' اور ''ع'' کے استعمال سے تو آدمی ان کے معنی میں فرق کر لیتا ہے لیکن جب یہ فرق مٹ جائے گا تو جگہ جگہ معنی کی تفہیم میں الجھن پیدا ہوگی۔ اگر دو چار الفاظ کا مسئلہ ہوتا تو کہہ دیا جاتا کہ کچھ دنوں بعد لوگ معنی کے تعلق سے ان پر قابو پالیں گے لیکن اُردو میں ہم صوت یا مشابہ الصوت الفاظ کثرت سے ہیں اور املا کا فرق ختم ہو جانے سے ان کے معنی متاثر ہوں گے یعنی جب امل و عمل، تعمل و تامل، امارت و عمارت، توسل و توصل، سدا و صدا، سفر و صفر، ماثوم و معصوم، ثواب و صواب، نذیر و نظیر، ظرف و ذرف، ظن و زن، کسرت و کثرت، عام اور آم، لعل اور لال، سریر اور صریر، نال اور نعل، جعل اور جال، باد اور بعد، باز اور بعض، عرض اور ارض، حال اور ہال، جالی اور جعلی، صورت اور سورت، ماموراور معمور، تانا اور طعنہ، ذکی اور زکی وغیرہ کے املوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی تو صرف یہی نہیں کہ ان کے ماخذ کا پتہ لگانا مشکل ہوگا بلکہ ان کے معنی تک پہنچنے میں بھی دقت ہوگی۔

بالفرض اس تجویز کو قبول بھی کر لیا جائے تو اُردو جس بلند منزل پر پہنچ گئی ہے اس میں یہ تبدیلی خوشگوار ثابت نہ ہوگی، اس وقت کروڑوں آدمی ہیں جو صرف املا دیکھ کر لفظوں کی قرأت روانی اور تیزی سے کر

لیتے ہیں۔ یعنی ان کی نظریں الفاظ کو خاص خاص املاؤں میں دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں لیکن جب:

حضرت کو ہزرت، صاحب کو صاھد، حفیظ کو ھفیز، طرح کو ترہ، عرض کو ارز

وغیرہ کی صورت میں دیکھیں گے تو انھیں ایک طرح کی الجھن ہوگی اور پوری روانی کے ساتھ عبارت کو نہ پڑھ سکیں گے۔ جو لوگ خارج شدہ حروف کی شکلوں سے یکسر ناواقف ہوں گے، وہ شاید اس کی مشق بہم پہنچائیں لیکن عربی اور قرآن سے جو رشتہ استوار ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں جس وقت اُردو حروف تہجی سے مندرجہ بالا نو آوازیں خارج کر دی جائیں گی اور لفظ کے تلفظ یا آواز دینے والے حروف و حرکت ہی کی بنیاد پر اس کا املا لکھا جائے گا تو اُردو کے ہزاروں الفاظ کی ظاہری صورت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو جائے گی:

۱۔ فی الحال کو فلحال، فی الواقع کو فلواقع اور فی الوقت کو فلوقت لکھا جائے گا۔

۲۔ عبدالرشید، خواہش والصلوٰۃ کو ابدرشید، خاہش اور سلات لکھا جائے گا۔

۳۔ سمیع، بجیع اور وقیع وغیرہ، سمی، بجی، وقی ہو جائیں گے۔

۴۔ رکعت، وقعت، بدعت وغیرہ کا لکھنا مشکل ہو جائے گا اور اگر لکھا گیا تو وہ رکات، وقات اور بدات ہو جائیں گے، اس لیے کہ ع کی جگہ الف استعمال ہوگا۔

۵۔ قاعدہ، مشاعرہ اور معمر وغیرہ کو قاادہ، مشاارہ اور مامر لکھا جائے گا۔

۶۔ فوراً، ابتدأً، رسماً وغیرہ کا املا فورن، ابتداان، اور رسمن ہو جائے گا۔

۷۔ عربی کے مروجہ الفاظ ”شریف، مجید،، وغیرہ کو شریفن، مجیدن لکھا جائے گا۔

۸۔ عیسیٰ، توسیع، اسماعیل، وغیرہ ایسا، توسی اور اسماایل میں بدل جائیں گے۔

غرضیکہ لاکھوں الفاظ کا املا بدل جائے گا اور اُردو زبان و ادب کا چار سو سالہ ذخیرہ خاک میں مل جائے گا، نہ کوئی اس کا پڑھنے والا ہوگا نہ لکھنے والا۔ سارے کتب خانوں اور علمی و ادبی ذخیروں کو دریا برد کر کے ایک نئی زبان کے لیے کام شروع کرنا ہوگا۔ ہم بتا چکے ہیں زبان اور رسم الخط کی ترقی و تبدیلی عام طور پر، زندگی کے تقاضوں کے مطابق خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی شعوری کوشش اس پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے، بفرض محال ایسی کوشش کی بھی جائے تو ؎

ایک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

آج کا ایٹمی دور بھلا اس کی اجازت کہاں دے گا؟ زبان و رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہمارا ثقافتی و تہذیبی سرمایہ خود اپنے ہاتھوں خاک میں مل جائے گا۔ تجربہ کرنا ہو تو کسی علمی ادبی کتاب کا ایک پیراگراف لے لیجیے اور اسے نئے املا کے مطابق لکھ کر دوبارہ پڑھنے کی کوشش کیجیے۔ وہ پیراگراف آپ کی نظروں کے لیے اتنا اجنبی ہوگا کہ پڑھنا مشکل ہو جائے گا ......ایسی صورت میں اُردو رسم الخط کو، اس کی معمولی دقتوں کی وجہ سے بدلنا اور اُردو کی لاکھوں علمی و ادبی کتابوں کو نئی نسل کے لیے مہمل بنانا کہاں کی دانشمندی ہوگی؟

اُردو رسم الخط کی اصلاح کے سلسلے میں دوسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ موجودہ رسم الخط کو رومن رسم الخط سے بدل دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اُردو زبان وہی رہے جو ہم لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن اسے ا، ب، پ، ت، وغیرہ کے بجائے A,B,C,D وغیرہ کے حروف میں لکھا جائے۔

رومن رسم الخط کی تائید میں جو باتیں اُردو کے حق میں کہی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر رومن کو اپنا لیا گیا تو اُردو املا آسان ہو جائے گا۔ بین الاقوامی اتحاد میں اس سے مدد ملے گی۔ علمی و ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوگا اور اُردو تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر کے دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہونے لگے گی۔ یہ باتیں جتنی آسانی سے کہہ دی گئی ہیں اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں ہیں۔ ہم پچھلی سطور میں وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ زبان اور رسم الخط میں جسم و جان کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ جی سکتے ہیں۔ اس لیے انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ان کے ساتھ کھلی دشمنی ہوگی۔ ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اُردو میں حروف کی تعداد پچاس سے زیادہ اور رومن میں صرف چھبیس ہے۔ ظاہر ہے کہ چھبیس آوازیں کسی طرح بھی پچاس آوازوں کی نمائندگی نہیں کر سکتیں، مثلاً چ اور ش کی آواز کے لیے رومن میں کوئی حرف نہیں ہے۔ حالانکہ یہ آوازیں Admission اور Picture وغیرہ قسم کے ہزاروں الفاظ میں پائی جاتی ہیں، لیکن یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کن کن حروف سے یہ آوازیں پیدا ہوں گی۔

Christian, Match, Mixture

میں، چ کی آواز الگ الگ طریقوں سے پیدا کی گئی ہے۔ ش کی آواز آٹھ دس طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ یہی حال دوسری آوازوں کا ہے۔ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس رسم الخط میں اُردو کا لکھنا کتنا مشکل ہوگا؟ سب جانتے ہیں کہ رومن میں حروف کی آوازوں اور الفاظ کے تلفظ کا کوئی مستقل نظام نہیں ہے۔ ہر لفظ کی اسپیلنگ از بر کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں اُردو کو رومن میں لکھ کر اس کے اصل تلفظ اور لہجے کو برقرار رکھنا مشکل ہوگا۔ سینکڑوں الفاظ کا تلفظ مسخ ہوگا۔ علاوہ ازیں اُردو میں عربی اور ہندی کی بہت سی آوازیں شامل ہیں،

ان آوازوں کو علامتوں کے ذریعے ہم پہچان لیتے ہیں کہ کون سا لفظ کس زبان سے آیا ہے مثلاً ڑ، بھ، پھ، کھ وغیرہ کو لے لیجیے۔ جن لفظوں میں یہ آوازیں اور ان کے نمائندہ حروف آئیں گے وہ علی الترتیب ہندی اور فارسی کے ہوں گے۔ رومن میں ان کی آوازیں کہاں سے لائی جائیں گی؟ اور بالفرض اگر انھیں ظاہر بھی کیا جائے تو وہ علامتیں کہاں ہوں گی جن کے ذریعہ ان کے لسانی رشتے کی شناخت کر لی جاتی ہے۔ غرض کہ اُردو کو رومن رسم الخط میں اول تو لکھا ہی نہیں جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے تو اس سے فائدہ کے بجائے سخت نقصان پہنچے گا۔

اسی لیے اُردو کے پارکھوں اور زبان کے عالموں نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور بار بار سوچا ہے، تائید و تردید کی دلیلوں کو نظر میں رکھا ہے۔ سود و زیاں کے تناسب کا اندازہ کیا ہے اور آخر کار پُرزور طریقے سے رومن رسم الخط کی مخالفت کی ہے۔ ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ رومن رسم الخط میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اس میں اُردو زبان کی ساری آوازیں ادا کی جا سکیں۔

۲۔ رومن میں تلفظ اور ہجے کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ اس کے ذریعے اُردو لکھنا پڑھنا آسان ہونے کے بجائے اور مشکل ہو جائے گا۔

۳۔ رومن رسم الخط، اُردو کے مقابلے میں زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ چنانچہ اس سے کتاب کا حجم خواہ مخواہ بڑھے گا اور لاگت زیادہ آئے گی۔

۴۔ اُردو رسم الخط کا فارسی اور عربی سے گہرا رشتہ ہے، رومن کو اپنانے سے یہ رشتہ ختم ہو جائے گا اور ہمارے ثقافتی و تہذیبی مشترک سرمائے کو نقصان پہنچے گا، عربی زبان سے ہم دور ہو جائیں گے اور اس کے سیکھنے میں ہمیں بڑی دقت ہو گی۔

۵۔ ہمارے اسلاف نے تحریری شکل میں جو کارنامے یادگار چھوڑے ہیں ان سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا اور ہم اپنی جڑوں کو کاٹ کر من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں گے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کے تحت آل پاکستان اُردو تدریس کانفرنس منعقدہ کراچی ۲۶ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۶۱ء میں متفقہ طور پر رومن رسم الخط کی تجویز رد کی گئی تھی اور اسے اُردو زبان کے وجود کے لیے خطرہ بتایا گیا تھا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ رومن رسم الخط اپنے ناقص صوتیات کے سبب اُردو الفاظ کے تلفظ کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ہر لفظ اس طرح مسخ ہو گا کہ اس کا صحیح پڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ اُردو کیا خود انگریزی الفاظ کا تلفظ رومن

رسم الخط کی پیچیدگی کے سبب، صحت کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر مستند لغت میں ہر لفظ کے ساتھ اس کا صحیح تلفظ قوسین کے اندر لکھ دیا جاتا ہے۔ برنارڈ شا نے رومن رسم الخط کی اس خرابی کے سبب اس میں اصلاح کی تجویز پیش کی تھی، انھوں نے سات سو الفاظ تیار کر کے ماہرین انگریزی کو دیئے تھے اور کہا تھا کہ اسی نہج پر انگریزی رسم الخط کی از سر نو تشکیل کی جائے اور جن آوازوں کے نئے رومن میں حروف موجود نہیں ہیں ان کے لیے حروف ایجاد کیے جائیں۔ چنانچہ ماہرین زبان کی ایک جماعت نے برنارڈ شا کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کر کے اسے قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن جیسا کہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کسی زبان کا رسم الخط خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو اسے بدلنا یا اس میں تبدیلیاں لانا جس سے ماضی کے علمی و ادبی سرمایہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو، بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ رومن رسم الخط اپنی ہزار خرابیوں کے باوجود اپنی پرانی ڈگر ہی پر قائم ہے۔

ان مباحث کی روشنی میں جو لوگ رومن رسم الخط کو اُردو کے لیے تجویز کر رہے ہیں وہ بالغ نظری کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں اس تبدیلی کے وہ مضر نتائج نہیں ہیں، جن کا اوپر مفصل ذکر کیا گیا ہے اور اگر ان نتائج سے باخبر ہوتے ہوئے بھی وہ رومن رسم الخط کی تائید کر رہے ہیں تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اُردو کے دوست نہیں ہیں۔

حواشی

۱۔ لینگویج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈویلپمنٹ، ص ۱۱۱۔

۲۔ خطبات عبدالحق، ص ۴۱۔

۳۔ مضامین سلیم، جلد اوّل، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۱ء، ص ۱۶۴۔

۴۔ خیابان (خاص نمبر)، مطبوعہ شعبۂ اُردو، پشاور یونیورسٹی، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۷۰۔

۵۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۲۔

۶۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۳۔

۷۔ مقدمہ تاریخ ادب ہندوستانی (اُردو ترجمہ قلمی)، مخزونہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، کراچی یونیورسٹی، ص ۴۔

۸۔ نگار (لکھنؤ) بابت اگست ۱۹۵۱ء، ص ۳۱۔

۹۔ نگار (لکھنؤ) بابت جون ۱۹۵۱ء، ص ۳۵ تا ص ۳۸۔

۱۰۔ خاور (ڈھاکہ) بابت مئی ۱۹۵۲ء، ص ۳۹ تا ص ۴۲۔

۱۱۔ خاور (ڈھاکہ)، بابت جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۳۰۔

۱۲۔ خاور (ڈھاکہ)، بابت جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۳۰۔

۱۳۔ زبان اور اُردو زبان، ص ۵۲۔

☆☆☆

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

رومن اُردو کیوں؟

اطلاعاتی ٹیکنالوجی نے دنیا کو ایک طوفان کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان بھی طوفان بن کر دنیا پر چھا گئی ہے۔ انگریزی زبان صحیح معنوں میں دنیا (جو بقول شخصے عالمی گاؤں یا گلوبل ولیج بن چکی ہے) کی مشترکہ زبان یا لنگوا فرانکا (Lingua Franca) ہے۔ انگریزی سیکھنا ہر شخص کے لیے خواہی نخواہی ضروری ہو گیا ہے بالخصوص ایک مختلف ثقافت یا مختلف زبان کے حامل خطے کے لوگوں سے ابلاغ وارتباط کے لیے انگریزی ناگزیر بن چکی ہے۔ چونکہ آج کی دنیا میں تمام جدید علوم وفنون کے خزانے انگریزی زبان میں موجود ہیں اور کسی بھی موضوع پر ہونے والی جدید تحقیق اور اس کے مصادر ومنابع اس زبان میں دستیاب ہیں اور انٹرنیٹ نے ان تک رسائی اور ان کا حصول بھی نہایت آسان اور کم خرچ بنا دیا ہے۔ لہٰذا آج کی دنیا میں انگریزی سے ناواقفیت گویا بیک وقت اندھا، گونگا اور بہرا ہونے کے مترادف ہے۔ چنانچہ انگریزی کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔

انگریزی زبان کی ان فتوحات کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں کے ذہن میں چند سوالات ضرور اُبھرتے ہیں جنھیں اپنی زبان اور اپنی تہذیب وثقافت سے واقعی محبت ہے، مثلاً یہ کہ کیا کسی قوم نے اپنی زبان یا اپنے رسم الخط کو انگریزی زبان یا رومن رسم الخط کی خاطر اترن کی طرح اتار پھینکا ہے؟ کیا کسی قوم نے کمپیوٹر (بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انٹرنیٹ) کے استعمال میں سہولت کی خاطر اپنے رسم الخط کو ترک کر کے ثقافتی خودکشی فرمائی ہے؟ جب بھی میں کہیں یہ بحث سنتا یا پڑھتا ہوں کہ اُردو کو رومن حروف میں لکھا جانا چاہیے تو یہ سوالات میرے ذہن میں بھی سر ابھارنے لگتے ہیں۔

جو لوگ اُردو کے رسم الخط میں تبدیلی کی وکالت کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر اُردو کو رومن رسم الخط کے پلے باندھ دیا جائے تو اُردو اور اس کے نئے رسم الخط دونوں کی زندگی ...... اور ہماری بھی ...... چین اور آرام سے گزر جائے گی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں کوئی زبان اس وقت تک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے نوساختہ مذہب پر ایمان نہ لے آئے۔ یہ اور اسی

قسم کی دیگر بظاہر معقول مگر درحقیقت بے سروپا باتیں اس ضمن میں کی جاتی ہیں۔ اُردو کے یہ خودساختہ دوست (جو درحقیقت بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہیں) ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جیسے ہی اُردو رومن حروفِ تہجی کو اختیار کرے گی کسی جادو کے زور پر وہ جدت اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہوجائے گی، یہ انٹرنیٹ پر چھا جائے گی اور ساری دنیا میں اس کا چلن عام ہوجائے گا اور نجانے کیا کیا ہوجائے گا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بے اصولے اور من کے کھوٹے لوگ کسی کے اشارے پر اور سرپرستی میں ایک ایسی باقاعدہ مہم چلا رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ قوم کی کچھ ایسی ذہنی تطہیر کی جائے کہ یہ اُردو اس کی زندگی بھر کے شریکِ حیات...... بلکہ اس کی حیات اور اس کی روح...... یعنی اس کے عربی رسم الخط سے علیحدگی پر آمادہ ہوجائے۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل چلائی جانے والی بدنیتی پر مبنی اس مہم کے اس نئے جنم پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس مہم کی تجہیز و تکفین کو بھی کوئی نصف صدی گزر چکی ہے اور لوگ اسے بھول بھال گئے ہیں۔ ایسے موقعے پر یہ شبہات پیدا ہونا فطری امر ہے کہ اب یہ مہم کیوں اور کس کے اشارے پر چلائی جارہی ہے۔

جدید دور میں، سوائے ترکی کے، ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے اپنے رسم الخط کو ترک کرکے اپنے ماضی، اپنی ثقافت اور اپنے ادب سے تمام رشتے یک بیک منقطع کرلیے ہوں...... وہی رسم الخط جس میں وہ قوم صدیوں سے لکھتی اور اپنے ہم زبانوں سے اپنے دل کی بات کہتی چلی آرہی ہو۔ ترکوں کے پاس اپنی...... صحیح یا غلط...... وجوہات ہوں گی جن کی بنا پر انھوں نے اپنے رسم الخط کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ان وجوہات کا سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۸ء میں ترکی کا رسم الخط عربی سے رومن کردیا تھا[1] اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے عربوں اور عربی سے نفرت تھی اور اسے یہ باور کرایا گیا تھا کہ اپنے رسم الخط کو یعنی اپنی تاریخ، ثقافت اور مذہب کو بھلا دینے سے ترکی فوراً ہی ترقی اور یورپ کے ساتھ ساتھ بھائی چارگی کے دور میں داخل ہوجائے گا۔ لیکن واحسرتا کہ یورپ کے ساتھ برابری اور بھائی چارگی رسم الخط کی تبدیلی کے پچھتر (۷۵) سال بعد بھی ترکی سے گریزپا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ترکی کو ہنوز یورپی یونین کا مکمل رکن نہیں بنایا گیا خواہ ترکی یورپیوں سے زیادہ یورپی بننے کی کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کرتا رہے۔ (برسبیلِ تذکرہ، یورپ کے سابقہ اشتراکی ملکوں کو ترکی پر ترجیح دیتے ہوئے رکن بنالیا گیا ہے، اگرچہ ترکی نے ان سے بہت پہلے درخواست دے رکھی ہے)

دراصل بات یہ ہے کہ خود کو دوسروں کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے اپنی شناخت اور اپنی اصلیت کو چھوڑنا ایسی ہی حماقت آمیز بات ہے جیسے کوئی اپنی کھال بدلوا کر نیا اور بہتر انسان بننے کا دعویٰ کرے۔

جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال اور اس میں مہارت اور ترقی کی بات ہے تو چند ہی قومیں ہوں گی جو اس میدان میں جاپانیوں کی ہم پلہ ہوں۔ جاپان نے ٹیکنالوجی کے استعمال کے علاوہ اس کی ایجاد میں بھی تقریباً ہر قوم کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ تو کیا انھوں نے اپنے رسم الخط کو ترک کر دیا ہے؟ معروف ماہر لسانیات ماریو پی (Mario Pie) اپنی معروف کتاب دی اسٹوری آف لینگویج (The Story of Language) میں لکھتے ہیں کہ انیس سو پچاس (۱۹۵۰ء) کے لگ بھگ چند امریکی ماہرین تعلیم نے جاپانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے رسم الخط سے ''چھٹکارا'' پالیں اور اس کی بجائے رومن حروف اختیار کر لیں[۲]۔ جاپانیوں نے ان کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا اور دلیل دی کہ اس طرح تو اس وقت تک موجود تمام کتابیں ردی ہو جائیں گی اور ان سب کو پھینک کر انھیں نئے سرے سے یعنی نئے رسم الخط میں چھاپنا پڑے گا[۳]۔ یاد رہے کہ جاپانی رسم الخط اس لحاظ سے مشکل ترین خیال کیا جاتا ہے کہ چینی زبان کی طرح یہ بھی تصویری خط (Ideogram) ہے اور یہ غیر صوتی ہے، اس میں حروف تہجی نہیں ہوتے بلکہ یہ تلفظ کو ظاہر کرنے والے نشانات یا علامات یعنی "Syllabic Characters" پر مشتمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جاپانیوں کے پاس رسم الخط کو ترک کرنے کے لیے اس کے بہت مشکل اور پیچیدہ ہونے کا بہانہ بھی موجود تھا لیکن وہ اسے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اب ذرا ان دیگر ''ترقی یافتہ'' اقوام کے رسم الخط پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جو ٹیکنالوجی اور سائنس میں بہت آگے ہیں اور ان کا رسم الخط رومن نہیں ہے یعنی روس، چین، کوریا اس میں ملائشیا کو بھی شامل کر لیجیے۔ کیا وہ بھی رسم الخط میں تبدیلی کے کسی منصوبے پر غور کر رہے ہیں یا رومن حروف کو اپنائے بغیر ہی سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھ جانے اور ترقی کر لینے کے بعد بھی رومن رسم الخط کی ضرورت محسوس نہیں کرتے؟ نہیں جناب! یہ تو ہماری پاکستانی قوم کے چند ''عظیم'' ذہن اور عبقری ہی ہیں جو ایسی عظیم ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں کہ اپنی تاریخ، ادب، ثقافت اور مذہبیات کے بے مثل ذخیرے کو ایک ناموزوں رسم الخط اختیار کر کے غرقاب کرنے کی اچھوتی اور نادر روزگار تجویز پیش کر سکتے ہیں۔

اُردو کا رسم الخط کیوں تبدیل نہیں کیا جانا چاہیے؟

زبان کے لیے رسم الخط کی وہی حیثیت ہے جو روح کی جسم کے لیے ہے۔ کوئی بھی زبان اپنے فطری اور خلقی رسم الخط کے بغیر ایک بے جان جسم ہے۔...... محض ایک دھڑ جسے اعضا کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن وہ

روح سے عاری ہے۔ کسی زبان کا رسم الخط تشکیل پانے میں صدیاں لگتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ اور یہ ان تمام پیچیدگیوں، نزاکتوں، لسانیاتی مجبوریوں، صوتیاتی ضرورتوں اور کتابت کی الجھنوں کے حل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے جو اس زبان میں درپیش ہوتی ہیں۔ فطری طریقے سے تشکیل اور قدرتی طور پر ارتقا پایا ہوا رسم الخط ہی کسی زبان کی خوب صورتی اور اس کی قوت نمو کو صحیح طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی زبان میں پائی جانے والی تمام آوازیں اور الفاظ کے درست تلفظ کو اس زبان کے اپنے رسم الخط ہی میں درست طور پر ظاہر اور ادا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کسی زبان کا اپنا رسم الخط ہی اس کے لیے موزوں ترین ہوتا ہے۔ کسی اجنبی اور بیگانے رسم الخط میں لکھی گئی زبان ایک ایسے مقید پرندے کی مانند ہوتی ہے جس کے پر قینچ دیے گئے ہوں، جس کی روح کو کچل دیا گیا ہو اور اسے ایک بے شناخت غلام بنا دیا گیا ہو۔

اُردو کا رسم الخط بنیادی طور پر اس سامی رسم الخط کی ترمیم شدہ شکل ہے جو عربی لکھنے میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ رسم الخط پہلے ایران پہنچا اور وہاں سے برعظیم پاک و ہند۔ فارسی زبان میں بعض ایسی آوازیں ہیں جن کو ظاہر کرنے کے لیے عربی میں حروف نہیں تھے، مثلاً ''چ''، ''گ'' اور ''پ''۔ فارسی کی صوتیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل ایران نے عربی حروف میں ترمیم و اضافے کے ذریعے، مثلاً ''ب'' اور ''ج'' کے نقطوں کی تعداد میں اضافہ کر کے یا کاف کی کشش کو دہرا کر کے، عربی رسم الخط کو اپنی ضروریات کے مطابق بنا لیا۔ جب مسلمان فاتحین اس رسم الخط کو برعظیم پاک و ہند لے کر آئے تو اس طرح کی ترمیم و اضافے سے اسی رسم الخط میں سنسکرت اور دراوڑی زبانوں کی ان آوازوں کو لکھا جانے لگا جو عربی اور فارسی میں وجود نہیں رکھتی تھیں؛ مثلاً ''ٹ''، ''ڈ'' اور ''ڑ''۔

دنیا کی کئی دیگر زبانوں کی طرح اُردو کا اپنا رسم الخط ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے ان ساری آوازوں کو بہ تمام و بکمال لکھا اور ادا کیا جا سکتا ہے جو اُردو میں وجود رکھتی ہیں۔ کسی بھی زبان کا رسم الخط تاریخی طور پر اور تمام عملی ضروریات کو اپنے اندر سموتے ہوئے فطری انداز میں صدیوں میں تشکیل و ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی زبان کے تمام صوتیوں اور تلفظ میں ذرا سے فرق کو تحریر میں ظاہر کرنے کے لیے اس کے اپنے قدرتی رسم الخط کے سوا کوئی رسم الخط کارآمد نہیں ہو سکتا۔

کسی بھی زبان کے رسم الخط میں تبدیلی کرنا کوئی معمولی بات نہیں اور یہ مشکل کام اس صورت میں مشکل تر ہو جاتا ہے جب نئے یعنی مانگے کے رسم الخط میں وہ ساری آوازیں نہیں ہوتیں جو اس مخصوص زبان میں وجود رکھتی ہیں جس کا رسم الخط بدلنا مقصود ہے۔ یہی دشواری اس وقت پیش آئی تھی جب ایسی افریقی

زبانوں کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی کوشش گئی جن کو پہلے کبھی نہیں لکھا گیا تھا، نہ حروف کی صورت میں نہ تصویری خط کی صورت میں۔ اُردو میں ایسی کئی آوازیں موجود ہیں جو رومن رسم الخط میں لکھی جانے والی اکثر زبانوں میں وجود نہیں رکھتیں؛ مثلاً ''ق'' یا ''غ'' '' یا ''ژ'' یا ''چھ''۔ اور جہاں تک آوازوں کا معاملہ ہے تو اُردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ حروف تہجی کی تعداد کے لحاظ سے وہ ایک اتنی ثروت مند زبان ہے کہ تقریباً ہر آواز کو ادا کر سکتی ہے، چاہے وہ عربی کا ''ق'' ہو یا ''غ''؛ فارسی کا ''ژ'' ہو یا سنسکرت ر دراوڑی کا ''ڑ'' اور ''گھ''، اُردو میں ان آوازوں کو اسی طرح بولا اور اُردو کے اپنے رسم الخط کے ذریعے بالکل ٹھیک ٹھیک لکھ کر بالکل ٹھیک ٹھیک پڑھا بھی جا سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اُردو کا اپنا رسم الخط رومن رسم الخط کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور برتر ہے۔ رومن رسم الخط تو اُردو کی نصف آوازیں بھی ٹھیک طور پر ادا نہیں کر سکتا۔

رومن رسم الخط میں اُردو لکھنے سے صرف آوازوں کی درست ادائی ہی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ایک اور پریشانی بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ رومن رسم الخط میں اُردو لکھتے ہوئے اضافی حرف علت یا مصوتہ یعنی واول (Vowel) استعمال کرنا پڑتا ہے کیونکہ عربی یعنی اُردو رسم الخط میں مصوتوں کا استعمال بہت کم ہوتا ہے اور خفیف مصوتوں کے لیے کوئی الگ حرف نہیں ہوتا بلکہ ان کی قدر (Value) (یعنی صوت کا دورانیہ یا کیفیت) حروف کے اوپر یا نیچے اعراب لگا کر ظاہر کی جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ جس حرف کی جس حرکت کو ہم اُردو میں زیر، زبر یا پیش سے ظاہر کر دیتے ہیں اس کے لیے رومن میں حرف علت یا مصوتہ (Vowel) استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم لفظ ''مستقبل'' رومن حروف میں لکھنے کی کوشش کریں (Mustaqbi) تو اس میں تین حروف علت ''یو''، ''اے'' اور ''آئی'' لکھنے ہوں گے جبکہ ان کے اُردو تلفظ میں کسی مصوتے کی کوئی آواز شامل نہیں اور اسی طرح بعض لفظوں میں اُردو میں جہاں ایک حرف علت ہے اسے رومن میں لکھتے ہوئے بسا اوقات دو حروف علت لانے پڑتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں حرف علت دہرے صوتیے (Diphthong) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا رومن رسم الخط اُردو کے انفرادی اوصاف اور رنگ ڈھنگ ہی کو بدل دے گا۔

کچھ رومن رسم الخط کے بارے میں

انگریزی جو رسم الخط استعمال کرتی ہے اس کے بارے میں بھی لب کشائی کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ جب انگریزی نے لاطینی حروف اپنائے تو اس بات کا ابتدا ہی میں احساس ہو گیا کہ یہ حروف نہ صرف یہ کہ انگریزی لکھنے کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ ان میں انگریزی کی تمام آوازوں کو

آسانی سے اور ایک حرف کو ایک علامت سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ان میں سے کچھ حروف اضافی ہیں اور یہ جن آوازوں کو لاطینی میں ظاہر کرتے ہیں ان کا انگریزی میں وجود ہی نہیں ہے۔ رومن رسم الخط رومنوں کی لسانی ضروریات کو مدنظر رکھ کر ایجاد کیا گیا تھا اور اسے بعد میں دیگر اقوام نے اختیار کرلیا (۴)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی الفاظ کے ہجے ان کے تلفظ سے اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ کئی ماہرین لسانیات نے انگریزی میں املا کے قوانین کو الل ٹپ اور من مانا (Arbitrary) قرار دیا ہے۔

انگریزی کے معروف ڈراما نگار جارج برنارڈ شا (۱۸۵۶ء تا ۱۹۵۰ء) نے تو انگریزی کے ہجے کے قوانین کا مذاق اڑاتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ انگریزی میں لفظ ''گھوٹی'' (ghoti) کو ''فش'' (fish) پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی کہ انگریزی میں بعض اوقات جی ایچ (gh) کو ایف (f) بھی پڑھا جاتا ہے مثلاً لفظ لاف (laugh) میں۔ اسی طرح او (o) کا تلفظ کبھی آئی (i) کی طرح بھی کیا جاتا ہے جیسے ویمن (women) میں۔ اور ٹی آئی (ti) کبھی ش (sh) کی آواز بھی دیتا ہے مثلاً نیشن (nation) میں۔ اس طرح انگریزی میں ghoti لکھ کر fish پڑھنا عین ممکن ہے۔ برنارڈ شا نے انگریزی کے ہجے کے قوانین بدل کر انھیں عقل و منطق کے مطابق بنانے والے کے لیے ایک بڑی رقم کے نقد انعام کا بھی اعلان کیا (۵) (افسوس کہ یہ انعام آج تک کوئی حاصل نہیں کر سکا، شاید اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں)۔

املا اور ہجے کے اصولوں میں تبدیلی کرنا کوئی مذاق نہیں ہے اور انگریزی جیسی زبان کے لیے تو یہ تقریباً ناممکن ہے جس میں چوالیس صوتی اکائیاں یا صوتیے یعنی فونیم (Phoneme) ہیں (۶) اور ان کو ظاہر کرنے کے لیے صرف چھبیس حروف تہجی ہیں لہٰذا ان چوالیس آوازوں کو ''ایک آواز ایک علامت'' کی بنیاد پر لکھ کر ظاہر کرنا ممکن نہیں۔ گویا رومن رسم الخط میں صرف یہی خرابی نہیں کہ اس میں بہت سی آوازوں کو لکھ کر ظاہر ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں یہ بھی نقص ہے کہ اس میں ایک آواز کو ایک حرف سے ظاہر کرنا بھی ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ''ش'' کی یا ''چ'' کی آواز کو اُردو اور کئی دوسری زبانوں میں ایک حرف تہجی سے ظاہر کیا جاتا ہے لیکن رومن رسم الخط میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے دو دو حروف یعنی ایس ایچ (sh) اور سی ایچ (ch) لکھنے پڑتے ہیں۔ چونکہ انگریزی اور اس کے رسم الخط کی خرابیاں اجاگر کرنا سردست میرا موضوع نہیں ہے لہٰذا میں اس پر مزید کچھ کہنے سے گریز کروں گا ورنہ اس ضمن میں مزید بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

رسم الخط ہی زبان ہے

جو لوگ اُردو کے لیے رومن رسم الخط کی وکالت کرتے ہیں وہ رسم الخط کی اہمیت کو شاید پوری طرح نہیں سمجھتے۔ وہ غالباً زبان اور رسم الخط کو دو الگ الگ وجود خیال کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں رسم الخط ہی زبان ہے۔ کیونکہ حروف تہجی تو وہ علامات ہیں جو زبان میں استعمال ہونے والی بنیادی آوازوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ کسی زبان کا اپنا فطری رسم الخط ہی اس میں موجود تمام دقائق و لطائف، تلفظ میں معمولی تبدیلیوں اور کسی لفظ کے کسی خاص جزو پر زور یا تاکید کو صحیح طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔ اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے انگریزی کو اُردو رسم الخط میں لکھ کر دیکھیے۔ اگرچہ اُردو میں موجود متنوع آوازیں اور اس کے اعراب کا نظام انگریزی آوازوں اور تلفظ کی درست ادائی میں معاون ہوگا لیکن نتائج اطمینان بخش نہیں ہوں گے۔

ایک اور نقصان

اُردو کا رسم الخط رومن کرنے کا ایک اور نقصان یہ ہوگا کہ مشرق وسطیٰ سے ہمارے لسانی اور ثقافتی روابط اچانک منقطع ہو جائیں گے۔ ایک مشترک رسم الخط نے ایران، پاکستان اور عرب ممالک کو ایک رشتے میں باندھ رکھا ہے۔ ایک رسم الخط کی وجہ سے اس شخص کے لیے عربی اور فارسی سیکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے جو اُردو سے واقف ہے۔ ایران اور عرب ممالک میں سفر کے دوران ہوائی اڈے یا سڑک یا کسی بھی جگہ پر چھوٹے موٹے بورڈ یا ہدایات کو پڑھنا آسان ہوتا ہے اور اسی طرح ان ملکوں کے باشندے پاکستان میں اتنی اجنبیت محسوس نہیں کرتے بالخصوص اگر یہ چیزیں اُردو میں لکھی ہوں۔ اور پھر ذرا ہماری آنے والی نسلوں کا تو سوچیے! موجودہ رسم الخط سے محروم ہو کر وہ اُردو (اور عربی، فارسی) کے ان شاہکاروں کو پڑھنے اور سمجھنے سے محروم ہو جائیں گے جو صدیوں سے ہمارا قابل فخر سرمایہ چلے آرہے ہیں۔ ہر شاہکار کو پہلے نئے رسم الخط میں لکھ کر شائع کرنا پڑے گا تاکہ وہ ان خزانوں سے محظوظ ہو سکیں۔ یہ محرومی یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑا نقصان جو ایک مسلمان کے تصور میں آسکتا ہے وہ قرآن پاک کی تلاوت سے محروم ہو جانا ہے اور یہ محرومی ایسی ہے کہ اس کے آگے تمام نقصانات ہیچ ہیں۔

کمپیوٹر اور اُردو

اُردو کے رسم الخط کو بدلنے اور رومن حروف کو اپنانے کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے اُردو کمپیوٹر کی دنیا میں داخل ہو جائے گی۔ یہ دلیل دینے والوں کے علم میں یہ بات غالباً نہیں ہے کہ اب

اُردو کے مختلف سوفٹ ویئر آسانی سے دست یاب ہیں اور کمپیوٹر سے دل چسپی رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد انھیں استعمال بھی کر رہی ہے۔ اُردو میں برقی مکتوب (ای میل) اب کوئی نئی چیز نہیں رہی۔ دیگر اداروں کے ساتھ ساتھ مقتدرہ قومی زبان نے بھی اُردو کو ''سائبر'' بنانے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ان اداروں کی کوششیں بڑی کام یاب رہی ہیں۔ مقتدرہ کی ایک بڑی حالیہ کام یابی مائیکروسوفٹ کے اشتراک سے ''مقتدرہ اُردو آفس ۲۰۰۳ء'' کا اجرا ہے (۷)۔ اُردو کو اس وقت ایک نئی اور سائنسی جہت ملی جب مائیکروسوفٹ کے کمپیوٹر پروگرام ''ونڈوز ایکس پی'' کو اُردو میں بھی متعارف کرایا گیا اور اس طرح اُردو ای میل (e mail) یعنی اُردو برقی مکتوب بہت آسان ہوگیا (۸)۔ اُردو ویب سائٹوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور انٹرنیٹ پر اُردو کے لکھو کھا صفحات اپنا وجود رکھتے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ اُردو میں ''چیٹنگ'' یعنی کمپیوٹر کے ذریعے بات چیت کو متعارف ہوئے اب تین چار سال ہونے کو آرہے ہیں اور یہ کوئی عجوبہ یا نئی چیز نہیں رہی۔ غرض اُردو اس سائنسی دور میں کمپیوٹر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے لہٰذا اُردو کے رسم الخط کو رومن کرنے کا مطالبہ کرنے والے کم از کم کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کے استعمال کو جواز نہ بنائیں اور اس کے لیے کوئی اور معقول بہانہ تراشیں (بہانے تو انھیں بہت مل جائیں گے مگر معقول ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا)۔ اُردو کے رسم الخط میں تبدیلی (۹) کا مطالبہ کرنے والے اُردو کے دوست ہرگز نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو بقول غالب:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

حواشی

۱۔ پی، ماریو، (Pei, Mario) "The Story of Language"، نیو امریکن لائبریری، نیویارک، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۱۔

۲۔ ایضاً ص ۱۰۲۔

۳۔ ایضاً ص ۱۰۲۔

۴۔ ایضاً ص ۱۰۱؛ نیز کرسٹل، ڈیوڈ (Crystal, David) "The Penguin Dictionary of Language" (دوسرا ایڈیشن)، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲، ۲۹۱۔

۵۔ پی، ماریو، (Pei, Mario) "The Story of Language"، ص ۱۰۱، ۱۰۲۔

۶۔ سائمن پوٹر (Simeon Potter) نے اپنی کتاب "Our Language" میں لکھا ہے کہ انگریزی میں چوالیس (۴۴) آوازیں ہیں جن میں سے بارہ (۱۲) حروف علت یا مصوتے (Vowels)، نو (۹) دہرے صوتیے (diphthong) اور تیئیس (۲۳) مصمتے یا حروف صحیح (consonants) ہیں۔ (پینگوئن بکس، ۱۹۷۳ء، ص ۶۲)۔ البتہ بعض ماہرین کے خیال میں انگریزی میں پینتالیس (۴۵) صوتیے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ انگریزی میں مصوتوں کی تعداد تیرہ (۱۳) ہے، مثلاً Edward Finegan اپنی کتاب "Language: its structure and use" میں لکھتے ہیں کہ فرانسیسی میں پندرہ (۱۵) اور انگریزی میں تیرہ (۱۳) مصوتے ہیں۔ (ہارکورٹ بریس کالج پبلشرز، فورٹ ورتھ، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۴)۔ جبکہ اس کے مقابلے میں اُردو میں ایک رائے کے مطابق اٹھاون (۵۸) صوتیے یا فونیم ہیں (ملاحظہ ہو: ''اُردو ساخت کے بنیادی عناصر'' از نصیر احمد خاں، اُردو محل پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ۹۰)۔

۷۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو محمد اکبر سجاد کا مضمون مشمولہ ''اخبارِ اُردو''، فروری ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۔۳۱۔

۸۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: محمد نعمان کا مضمون مشمولہ ''اخبارِ اُردو''، فروری ۲۰۰۶ء، ص ۳۲۔۳۳۔

۹۔ اس موضوع پر درج ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی مفید ہوگا:

- ''اُردو زبان اور اس کا رسم خط''، از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مطبوعہ کتاب نگر، لکھنؤ، (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۶۱ء۔
- ''رومن رسم الخط اور پاکستان: ایک علمی جائزہ''، از سید عبدالقدوس ہاشمی، مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۶۵ء۔
- ''اُردو رسم الخط اور اس کی اہمیت''، از محمد امین عباسی، مطبوعہ ایشیاٹک لٹریری سوسائٹی، لکھنؤ، ۱۹۵۹ء۔
- ''اُردو رسم الخط اور ٹائپ''، از ڈاکٹر طارق عزیز، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔
- ''اُردو رسم الخط''، مرتبہ شیما مجید، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء۔

☆☆☆

شمس الرحمٰن فاروقی

کچھ اُردو رسم الخط کے بارے میں

یہ ہماری زبان کی بدنصیبی ہی کہی جائے گی کہ اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویزیں بار بار اٹھتی ہیں، گویا رسم الخط نہ ہوا کوئی ایسا داغ بدنامی ہوا کہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانا بہت ضروری ہو۔ کبھی اس کے لیے رومن رسم الخط تجویز ہوتا ہے، کبھی دیوناگری اور افسوس کی بات یہ ہے کہ رسم الخط میں تبدیلی کی بات کرنے والے اکثر خود اہل اُردو ہی ہوتے ہیں۔ جب سے انگریز بہادر کی نگاہ کرم اس زبان پر پڑی، اس کے دوست نما دشمنوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی ہے۔ انگریزوں نے پہلے تو اس کا نام ''ہندی'' سے بدل کر ''ہندوستانی'' رکھنا چاہا۔ جب وہ نہ چلا تو ان کی خوش قسمتی سے لفظ ''اُردو'' ان کے ہاتھ آ گیا۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک ''زبان اُردوے معلیٰ'' کا خطاب فارسی کے لیے عام تھا اور لفظ اُردو کے معنی تھے، ''شاہجہاں آباد کا شہر'' یا ''قلعہ معلاے شاہجہاں آباد''۔ جب دہلی (یعنی اُردو بمعنی ''دہلی شہر'') میں ہندی (یعنی آج کے معنی میں اُردو زبان عام ہوئی تو اس کو (یعنی ''ہندی'' کو) زبان ''اُردوے معلیٰ'' کہا جانے لگا۔ پھر مختصر ہوتے ہوتے یہ فقرہ ''زبان اُردو'' یا ''اُردو کی زبان'' اور پھر صرف ''اُردو'' رہ گیا۔ انگریزوں کو بھی یہ بات موافق آتی تھی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی کوئی الگ زبان ہو اور وہ ''ہندی'' کہلائے۔ لہٰذا انھوں نے ہندی کا نام ہماری زبان سے چھین کر ایک نئی زبان کو دے دیا اور ہماری زبان کا نام صرف ''اُردو'' رہ گیا۔ یعنی انگریزوں کی مہربانی سے ہماری زبان سارے ہندوستان کی زبان کے بجائے اُردو یعنی ''لشکر بازار'' یا ''شاہی کیمپ اور دربار'' کی زبان ٹھہری۔

انگریزوں نے دوسرا ستم یہ کیا کہ انھوں نے لفظ ''اُردو'' کے معنی ''لشکر بازار/ شاہی کیمپ اور دربار'' نہیں بلکہ ''فوج/لشکر'' بیان کیے۔ آہستہ آہستہ یہ بات اتنی مقبول ہوئی کہ سب اُردو والے بھی یہی سمجھنے لگے کہ ہماری زبان دراصل ایک فوجی اور لشکری زبان ہے۔ ابھی حال ہی میں ''ہماری زبان'' میں ایک نظم چھپی ہے جس میں یہ بات کم و بیش فخریہ کہی گئی ہے کہ اُردو ''لشکری'' زبان ہے۔ احسن مارہروی نے ۱۹۱۰ء میں ایک طویل نظم ''اُردو لشکر'' کے نام سے لکھی اور طبع کرائی تھی۔ میں نے اس کا ایک نسخہ نظامی بک ایجنسی بدایوں کے

یہاں سے بڑے اشتیاق سے منگوایا کہ دیکھیں آج سے کوئی سو برس پہلے احسن مارہروی نے اُردو زبان کے نام کے بارے میں شاید کوئی دلچسپ بات کہی ہو یا شاید یہ بتانا چاہا ہو کہ اُردو دراصل ''لشکری'' زبان نہیں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس نظم میں وہی عام بات دہرائی گئی ہے کہ اس زبان کی پیدائش اور ترقی مسلمانوں کے زمانے میں اور ان کی فوج وغیرہ میں ہوئی۔ لفظ ''اُردو'' کے غلط لیکن مقبول معنی لشکر کی مناسبت سے احسن مرحوم نے اپنی نظم کا نام ''اُردو لشکر'' رکھ دیا اور ولی دکنی سے لے کر اپنے زمانے تک کے بڑے ادیبوں کو ''اُردو لشکر کے سردار'' قرار دیا۔

ابتدا اس کی ہوئی ہے اس زمانے میں یہاں
جب مسلمانوں کا تھا ہندوستاں میں خوب راج

اس پر طرہ یہ کہ اُردو کو انگریزوں کا احسان مند ٹھہرایا گیا ہے۔ احسن مارہروی کہتے ہیں:

ہے گورمنٹ اپنی عادل ہم کو ہے اس سے امید
وہ ہمارے حال پر فرمائے گی بے شک کرم
کی حمایت جس قدر اُردو زباں کی آج تک
وہ نہیں کچھ کم جو آسانی سے ہو جائے رقم
عدل پر اس سلطنت کے ناز کرنا چاہیے
ایسے عادل ایسے منصف تھے نہ کسریٰ اور جم

ایسی صورت میں اگر گلکرسٹ (Dr John B. Gilchrist) کو اُردو کا محسن اعظم قرار دیا گیا تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر ہماری زبان کا اصل نام یعنی ''ہندی'' برقرار رکھا جاتا تو یہ افسانہ گھڑنا اور رائج کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ لشکری زبان ہے۔ بھلا کون تھا جو تسلیم کرتا کہ جس زبان کا نام ''ہندی'' ہو، اسے لشکریوں اور فوجیوں نے رائج کیا تھا؟ میر امن نے جب ''باغ و بہار'' میں ''اُردو'' (یعنی دہلی) کی زبان کی ''تاریخ'' اپنے لفظوں میں بیان کی تو انھوں نے سب سے بڑی ناانصافی اس زبان کے ساتھ یہ کی کہ انھوں نے یہ کہیں کہا ہی نہیں کہ یہ زبان (جسے وہ اُردو کی زبان کہہ رہے ہیں) دراصل ''ہندی'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ تو کہا کہ اس زبان کو ''اُردو'' (یعنی دہلی) کے سارے لوگ بولتے ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان، کیا عورتیں کیا مرد، کیا بچے، کیا بوڑھے، لیکن انھوں نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ اس زبان کا نام ''ہندی'' ہے۔ جب میر کہتے ہیں:

کیا جانے لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب

آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

تو ان کی مراد جے شنکر پرشاد اور رام چندر شُکل کی ہندی سے نہ تھی، اور نہ ٹی وی اور آکاش وانی کی ہندی سے تھی۔ لفظ ''ہندی'' سے میر وہی زبان مراد لے رہے تھے جس میں وہ شعر کہتے تھے اور جسے ہم آج ''اُردو'' کہتے ہیں۔

جب ہماری زبان کا نام ''ہندی'' سے ''اُردو'' بنا دیا گیا تو انگریزوں، اور انگریزوں کے حمایتی ''قوم پرست'' ہندوؤں کی توجہ رسم الخط پر زیادہ زور و شور سے ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ اپنی خوبصورتی، کم جگہ میں زیادہ الفاظ کھپا دینے کی صلاحیت، فن کارانہ تنوع کے امکانات، اور فارسی، عربی اور سنسکرت سے اس کے ربط کے سبب سے اُردو کا رسم الخط ہندوستانی تہذیب کی شانوں میں ایک شان ہے۔ اور اُردو کے مخصوص حالات کو مدنظر رکھیں تو اسے اُردو زبان کی جان کہا جا سکتا ہے۔ یعنی موجودہ حالات میں اُردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز درحقیقت اُردو کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی تجویز ہے۔ رنج کی بات یہ ہے کہ اُردو کے مخالفین، اور دوست نما دشمن، مدت دراز سے اس کے رسم الخط کو اپنی دشمنی کا ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

اُردو کا رسم الخط بدل کر اسے رومن میں لکھنے کی تجویز سب سے پہلے حضرت گلکرسٹ نے رکھی تھی۔ افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر اب بھی گلکرسٹ کو اُردو زبان کے محسنین میں شمار کرتے ہیں جب کہ حقیقت برعکس ہے۔ اپنی کتاب "The Oriental Fabulist" مطبوعہ ۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ نے بخیال خود یہ ثابت کیا تھا کہ اُردو ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی ہندوستانی زبانوں کو رومن رسم الخط میں ''آسانی'' اور ''صحت'' کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس معاملے پر تھوڑی سی بحث مرحوم عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "Origins of Modern Hindustani Literature" مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۳ء میں پیش کی ہے لیکن گلکرسٹ کی تجویز میں جو سامراجی تکبر اور حاکمانہ تنگ نظری پنہاں ہے اس کی طرف عتیق صدیقی نے اعتنا نہیں کیا۔ اس تجویز پر اعتراض کے بجائے صدیقی مرحوم نے اسے ''ہندوستان کو متحد کرنے کی قابل تعریف کوشش'' کا نام دیا ہے۔

گلکرسٹ کی بات پر اس وقت شاید زیادہ توجہ نہ دی گئی لیکن جب انگریزوں کے زیر اثر اُردو اور ''ہندی'' کی تفریق قائم ہونے لگی اور ''ہندی'' زبان کو ہندوؤں کے ''قومی تشخص'' کی پہچان بتایا جانے لگا تو ملک کے ایک طبقے نے جو انجانے میں انگریزی سامراج کا شکار بن چکا تھا اُردو کی مخالفت کو بھی ہندی کے قیام

کے لیے ضروری جانا۔ اُردو کی مخالفت جن بنیادوں پر کی جانے لگی، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اُردو کا رسم الخط ''ناقص'' ہے یا/ اور غیر ملکی ہے۔ چنانچہ راجندر لال مترا نے ۱۸۴۶ء میں ایک مضمون بزبان انگریزی لکھا اور اپنے تئیں ثابت کیا کہ ناگری رسم الخط کو اُردو رسم الخط پر فوقیت ہے۔ اس زمانے میں اُردو رسم الخط کو رومن کر دینے کی بات اتنے زور شور سے اٹھائی جا رہی تھی کہ گارساں دتاسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں سیاسی مصلحت اور دباؤ کے تحت انگریز لوگ اُردو کا رسم الخط رومن کر ہی نہ ڈالیں۔ دتاسی نے لکھا کہ ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ اس معاملے کی تفصیل کے لیے فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو املا اور رسم الخط'' مطبوعہ اسلام آباد ملاحظہ ہو۔

راجندر لال مترا نے اپنے زمانے کے ''ہندو قوم پرست'' حلقوں پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ بھارتیندو ہریش چندر سے بھی ان کے مراسم تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ اگر بھارتیندو کو اُردو سے ناگری رسم الخط والی ''ہندی'' کی طرف راغب کرنے میں ''ہندو قوم پرست'' ''حلقوں کا ہاتھ تھا' تو انھیں اُردو سے متنفر کرنے اور اس کے رسم الخط میں کیڑے نکالنے کی طرف راجندر لال مترا نے مہمیز کیا ہو۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ وہی بھارتیندو ہریش چندر، جنھوں نے ۱۸۷۱ء میں لکھا تھا کہ میری اور میرے گھرانے کی عورتوں کی زبان اُردو ہے، دس سال بعد ایجوکیشن کمیشن کے سامنے یہ کہتے ہوئے پائے جائیں کہ اُردو رسم الخط ایک طرح سے مسلمانوں کی سازش ہے، کہ اس میں ''لکھیے کچھ اور پڑھیے کچھ'' کی آسانی ہے۔ اس طرح عام سادہ لوح رعایا کو دھوکا دینے کے لیے یہ رسم الخط نہایت موزوں ہے! ان معاملات کی تفصیل کے لیے وسودھا ڈالمیا کی کتاب ملاحظہ ہو جو ۱۹۹۷ء میں دہلی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔ "The Nationalization of Hindu Traditions Bharatendu Harishchandra and Nineteenth Century Banaras"۔ اس کے علاوہ ساگری سین گپتا کی پی ایچ ڈی تھیسس بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے اجزا Annual of Urdu Studies, No.9 میں شائع ہوئے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اُردو پر ''لکھیں کچھ، پڑھیں کچھ'' کا الزام دھرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ خود دیوناگری اس عیب سے خالی نہیں (اگر یہ عیب ہے)۔ انگریزی وغیرہ کا تو پوچھنا کیا ہے، کہ جہاں معمولی آوازوں، مثلاً چ، ش، ف، وغیرہ کو بیان کرنے کے آٹھ آٹھ، نو نو طریقے ہو سکتے ہیں۔ دیوناگری کا حال یہ ہے کہ یہاں کھ (kha) اور رَ وَ (rava) میں کوئی فرق نہیں ''روانا'' لکھیے اور ''کھانا'' پڑھیے دھ (dha) اور گھ (gha) میں اتنا کم فرق ہے کہ ذرا سی لرزش قلم سے ''گھر'' کی جگہ ''دھر'' اور ''دھان'' کی جگہ ''گھان'' ہو جاتا ہے۔ تھ (tha) اور ی (ya) بھی اسی قدر کم فرق ہے کہ ''تھان'' کو ''یان'' پڑھ لینے کا پورا پورا امکان ہے۔

نون غنہ لکھنے کے لیے طرح طرح کے پاپڑ بیلے جاتے ہیں۔ اس ایک ہی آواز کو تین چار طرح لکھا جاتا ہے۔ ''چندر بندو'' کچھ ہے ''ژاں'' اور طرح سے ہے ''صرف ''بندی'' اور طرح کی ہے اور کہیں آدھا ma (مَ) لگا دیتے ہیں۔ اس رنگ کے الجھاوے اور بھی ہیں لیکن مثال کے لیے اتنے کافی ہوں گے۔ پھر اس دعویٰ کے کیا معنی کہ دیوناگری میں غلط پڑھنے کی گنجائش نہیں؟

کھڑی بولی کے متعدد الفاظ دیوناگری میں لکھے ہی نہیں جا سکتے مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ کی لکھائی سے دیوناگری قاصر ہے:

کوا' لیے' گاؤں' ڈیوڑھا' بہن' کواڑ' کوئی' [بروزن فَعَل (وتد مجموع)' یا بروزن فَعْ (سبب۔ ثقیل)] وغیرہ۔

اسی طرح یہ بھی ہے کہ ان گنت الفاظ ایسے ہیں جن میں وسطی یا آخری حروف ساکن ہے لیکن دیوناگری انھیں متحرک لکھنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ چَلنَا (Chalana)، فاصلہ (Fasala)، چِکنَا (Chikana)، گھاسَ (Ghasa)، جَنَتَا (Janata) جَلنا وغیرہ۔ لکھنا اور چلنا' راستہ، چکنا' گھاس' جنتا وغیرہ میں متحرک لکھے ہوئے حرف (ل' س/ص' ک' س' ن) کو ساکن پڑھنا پڑتا ہے جو ناگری رسم تحریر کی روح کے خلاف ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کھڑی بولی (یعنی اُردو) اور ناگری رسم الخط میں کوئی مناسبت نہیں۔ کھڑی بولی، جو بعد میں اُردو ہندی یعنی اُردو کہلائی، وہ ناگری میں لکھی جانے کا تقاضا ہی نہیں کرتی۔ دیوناگری رسم الخط اور کھڑی بولی میں باہم مناسبت ہوتی تو یہ مشکلات بھی نہ ہوتیں اور یہ عدم مناسبت نہ ہوتی۔

عام اُردو دانوں نے رسم الخط کی تبدیلی، یا املا میں ''اصلاح'' کی تجاویز کو کبھی لائق توجہ نہ جانا۔ یہ ان کی سلامتی طبع کی دلیل ہے۔ لیکن اُردو کے بعض ''خیر خواہ'' حضرات کو خواہ مخواہ ہی کرید لگی رہتی ہے کہ اس بچاری غریب کی جورو کو اپنی بھاوج بنا کر چھیڑتے رہیں۔ آزادی کے فوراً بعد ترقی پسند حلقوں سے آواز اٹھائی گئی کہ اس زبان کو زندہ رہنا ہے تو اسے اپنا رسم الخط بدل کر دیوناگری کر لینا چاہیے۔ جب اس بات پر کسی نے کان نہ دھری تو آزادی، کے دو دہائی بعد پھر بعض لوگوں نے جن میں کچھ بہت بڑے ترقی پسند نام بھی انفرادی طور پر شامل تھے، یہی نعرہ بلند کیا۔ اس بار احتشام صاحب جیسے جید مفکر اور صائب الرائے ترقی پسند ادیب نے بھی اس آواز کو سختی سے دبا دینے کا مشورہ دیا۔ لیکن اُردو کی بیچارگی اس کے ''دوستوں'' کو ایسی دلکش لگتی ہے کہ وہ اسے بار بار رسوا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی سیاسی لوگوں کو شوق چراتا ہے کہ اُردو کی

''اصلاح'' فرمانے والوں میں اپنا بھی نام لکھوا لیں۔ چنانچہ آج ایک طرف تو ہمارے کچھ بہت بڑے ادیب کسی نہ کسی عنوان سے اُردو کے رسم الخط میں تبدیلی لانے کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف مولانا ملائم سنگھ بھی اُردو والوں سے کہتے ہیں کہ رسم الخط بدل ڈالو، فائدے میں رہو گے۔ (یہی بات مرار جی دیسائی بھی کہتے تھے)۔ فائدہ کیا ہوگا، اس کا حساب تو آسان ہے کہ بہت ہی کم فائدہ ہوگا لیکن نقصان کتنا ہوگا اس کا حساب ناممکن ہے، کیونکہ رسم الخط کی تبدیلی کسی بھی زبان کے لیے خسرانِ عظیم کا باعث ہوتی ہے۔ اُردو جیسی بتیس دانتوں میں دبی ہوئی ایک زبان بچاری کا تو پوچھنا ہی کچھ نہیں کہ رسم الخط کھو کر وہ کس قعرِ مذلت میں جا گرے گی۔

اہلِ اُردو براہِ کرم اپنے تاریخی سرمائے پر نظر ڈالیں، انگریزوں کی سیاست کو خیال میں لائیں۔ اُردو کے رسم الخط میں تبدیلی کی ہر سفارش کے ڈانڈے انگریزوں کی ان سازشوں سے ملتے ہیں جو انھوں نے اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا کر کے اس ملک کے ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی غرض سے رچائی تھیں۔

گلکرسٹ نے اپنی کتاب "The Oriental Linguist" مطبوعہ ۱۸۰۲ء (اول ایڈیشن ۱۷۹۸ء) میں لکھا ہے کہ میں جس زبان (یعنی اُردو) کو 'ہندوستانی'' کا نام دینا چاہتا ہوں اس کا اصل نام تو ''ہندی'' یا ''ہندوی'' ہے لیکن اس سے ہمارا خیال ہندوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ''ہندی/ ہندوی'' وہ زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ''حملوں'' سے پہلے بولی جاتی تھی۔ [بہت خوب' اسی تحقیق کے بل بوتے پر ہم اہلِ اُردو مسٹر گلکرسٹ کو السنۂ ہند کا ماہر گردانتے ہیں! بہرحال' آگے سنیئے] گلکرسٹ نے مزید فرمایا کہ یہ بات تو ہے کہ اس (یعنی جس زبان کا نام میں ''ہندوستانی'' رکھنا چاہتا ہوں) زبان کے بولنے والے اسے ''ہندی/ ہندوی'' ہی کہتے ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہندوستانی بے وقوف لوگ ہیں' انھیں ان باریکیوں کی طرف متوجہ بھی کیا جائے تو وہ خاک نہ سمجھیں گے۔ یہ نام ''ہندی'' تو ہندوؤں کی زبان کا ہونا چاہیے۔ رفتہ رفتہ ''ہندی'' کا وہ روپ بھی نمودار ہوگا جس میں سنسکرت اور دیگر ہندوستانی عناصر کی کثرت ہوگی۔ مسلمان ''ہندوستانی'' کو اور ہندو لوگ ''ہندی'' کو اختیار کر لیں گے۔ یہ دو طرز اس ملک میں مقبول ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا بیانات کی لغویت کی طرف آپ کو متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان باتوں کی تردید کرنے کے بجائے خود ہم نے بھی اپنی ہی زبان کی برائیاں شروع کر دیں۔ لیکن ایک بات یہاں ضرور ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ گلکرسٹ کی باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو والوں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ فارسی و عربی سے بھری ہوئی زبان لکھیں۔ بلکہ ''ہندی'' والوں کو سمجھایا کہ تم سنسکرت بھری زبان

لکھو۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر تارا چند کی کتاب "The Problem of Hindustani" (مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۴ء) کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ انگریزوں کی خوشامد کے باوجود احسن مارہروی کو قومی یکجہتی کا اس قدر پاس ہے کہ انھوں نے اپنی طویل نظم ''اُردو لشکر'' (جس کا ذکر اوپر ہوا) میں فارسی عربی لفظوں کو مع عطف و اضافت لکھنے سے گریز کیا ہے اور انشا تو بہت پہلے ''رانی کیتکی کی کہانی لکھ کر ثابت کر چکے تھے کہ فارسی عربی الفاظ کو برتے بغیر بھی اُردو لکھی جا سکتی ہے۔ (اور لطف یہ ہے کہ آج ہندی والے اس کتاب کو اپنی نثر کے شاہکاروں میں گنتے ہیں!) انگریزوں کی سیاست کس کس طرح اُردو زبان اور اس کے بولنے والوں پر کارگر ہوئی' اس کو سمجھنے کے لیے آلوک رائے کی کتاب "Hindi Nationalism" مطبوعہ "Longmans" سنہ ۲۰۰۱ء ملاحظہ ہو۔ آلوک رائے صاحب فرزند ہیں امرت رائے کے لیکن انھوں نے اس کتاب میں امرت رائے کی بدنام زمانہ کتاب "A House Divided" کے بیانات کی قلعی کھول دی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے ولایت میں رہنے والے بعض اہل اُردو کی طرف سے آواز اٹھی ہے کہ اُردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ انگلستان میں رہنے والے اہل اُردو کے بچے اُردو بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے۔ لہٰذا اگر اُردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے تو وہ بخوبی اُردو پڑھ اور لکھ بھی سکیں گے۔ ممکن ہے یہ تجویز کسی ایک فرد واحد کو یا کسی گروہ کو اچھی معلوم ہوتی ہو لیکن اس کے پس پشت دراصل سہل انگاری اور کاہلی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کی زحمت کاہے کو مول لیں، کیوں نہ اُردو کو انگریزی کر دیں، ہرے لگے گی نہ پھٹکری اور رنگ (ان کے خیال میں) چوکھا آئے گا۔

میں چاہتا ہوں کہ اگر یورپ اور امریکہ کے سینکڑوں مقامات میں پھیلے ہوئے لیکن مٹھی بھر یہودی اپنی زبان "Yiddish" کو اتنا فروغ دے سکتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوں اور ہر یہودی، وہ چاہے جہاں بھی رہتا ہو، یدش پڑھ اور لکھ لیتا ہو تو اُردو والے، جو صرف انگلستان میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں، ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

جب بنارس اور الٰہ آباد کے بنگالی یہاں چار سو برس سے رہتے رہنے کے باوجود اُردو کے مذکر مؤنث، واحد جمع، میں اب بھی غلطی کرتے ہیں، کیوں کہ بنگالی میں مذکر مونث نہیں ہے اور اُردو کے واحد جمع کے قاعدے بنگالی میں نہیں چلتے، تو اُردو کے لوگ چند ہی برسوں میں اپنی زبان سے اتنے دور کیوں ہو جاتے ہیں کہ انھیں اسے لکھنا یا پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے؟ پھر الٰہ آباد میں تو متعدد ایسے بنگالیوں سے بھی میری ملاقات ہے جو اُردو اور بنگالی میں مکمل طور پر ذولسان ہیں۔ ممکن ہے وہ اُردو پڑھ نہ سکتے ہوں لیکن ان کا شین قاف اتنا

ہی درست ہے جتنا کسی اُردو والے کا ہوسکتا ہے اور آپس میں وہ اس دھڑلے سے بنگالی میں بات چیت کرتے ہیں کہ ہم لوگ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جو قومیں اپنی زبان اور تہذیب پر افتخار رکھتی ہیں ان کے یہی طور ہوتے ہیں۔ نہ معلوم ہم لوگ اپنی زبان کے بارے میں اس قدر مدافعانہ اور اعتذاری رویہ کیوں اپنائے بیٹھے ہیں۔

خیر، ان باتوں سے قطع نظر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اُردو کا رسم الخط رومن کر دینے میں کئی طرح کے نقصانات عظیم ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

۱۔ اُردو کا رسم الخط بدلنا اُردو زبان اور ادب دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ بدلا ہوا رسم الخط خواہ رومن ہو یا ناگری، اس سے اُردو زبان اور ادب دونوں کو ایسا دھکا پہنچے گا کہ ممکن ہے وہ جاں بر ہی نہ ہوسکیں۔ وہ گراں قدر ادبی سرمایہ جو گزشتہ پانچ چھ سو برس سے اُردو کے اپنے رسم الخط میں لکھا گیا ہے، تقریباً سارے کا سارا ضائع ہو جائے گا۔ ہم اپنے کلاسیکی متون، اور کلاسیکی ہی کیوں، گزشتہ پانچ دہائی کے بڑے متون کے بھی اچھے ایڈیشنوں کے معاملے میں بہت مفلس ہیں۔ جو تہذیب اور معاشرہ اپنے بڑے ادیبوں کے اہم ترین متون کو بھی بازار میں دستیاب نہیں رکھتا۔ اس سے توقع کرنا فضول اور خام خیالی ہے کہ وہ اپنے سارے گزشتہ سرمائے کو نئے رسم الخط میں منتقل کر کے اسے عام اور متداول کرے گا۔ رسم الخط بدلا گیا تو دس برس بھی نہ گزریں گے کہ زبان اور ادب دونوں پر خاک اڑنے لگے گی اور اُردو کے دشمن دل و جان سے یہی چاہتے ہیں۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ نہ میر کا کوئی معتبر کلیات بازار میں ملتا ہے، نہ میر انیس کا، نہ نصرتی یا باقر آگاہ کا۔ پریم چند، نذیر احمد، منٹو، راشد الخیری، حسن نظامی، بیدی، امجد حیدر آبادی وغیرہ کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ لیکن ان کے پرانے ایڈیشن موجود ہیں اور پڑھنے والے انھیں پڑھ بھی سکتے ہیں۔ جب اُردو کا رسم الخط رومن یا ناگری ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ ان کے پڑھنے والے عنقا ہو جائیں گے۔ کچھ دن بعد اُردو کا پرانا سرمایہ اُردو میں پڑھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ پرانے، گلے سڑے ایڈیشن بھی کچھ لائبریریوں اور کچھ کباڑیوں کے علاوہ کہیں اور نہ ملیں گے اور رومن یا ناگری میں یہ متون دستیاب ہوں گے نہیں۔ پھر نتیجہ ظاہر ہے۔

۲۔ فرض کیا کوئی صورت ایسی نکل آتی ہے کہ اُردو کا سارا ادب نہ سہی، سارا اعلیٰ ادب پہلے

رومن یا ناگری میں منتقل کرلیا جائے، پھر رسم الخط بدلا جائے۔ اول تو یہ ممکن نہیں۔ اس کام کے لیے روپیہ ہی اتنا درکار ہوگا کہ ایک پوری حکومت کا خرچ اس سے چل جائے گا لیکن مان لیا یہ ممکن ہوا بھی تو ہم جس رسم الخط کو اختیار کریں گے، اس کے اپنے مسائل ہمارے سامنے آئیں گے اور ان کا اب تک کوئی حل نہیں بہم ہو سکا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہوگی کہ جب اُردو رسم الخط ہی میں ایسے ایڈیشن نہیں ملتے جن کو پوری طرح صحیح نہیں تو کم وبیش لائق اعتماد کہا جا سکے، تو اُردو سے ناگری یا رومن میں منتقل کرنے کے لیے کس ایڈیشن کو معتبر مانا جائے گا؟ اور بہت سی اہم کتابیں یا اہم شعرا کے کلیات تو ابھی طباعت پذیر بھی نہیں ہوئے۔ اُردو کے کس نسخے کو بنیادی متن قرار دیا جائے اور کیوں؟

۳۔ رسم الخط بدلنے کے پہلے سب سے بڑا سوال یہ طے ہونا چاہیے کہ نئے رسم الخط میں اُردو الفاظ کا محض تلفظ ظاہر کیا جائے گا، یا املا بھی ظاہر کیا جائے گا۔ اگر صرف تلفظ ظاہر کیا جائے گا تو نئے رسم الخط میں اُردو کے بہت سے حروف تہجی باقی نہ رہیں گے۔ مثلاً ث، س، ص، سب کو ایک ہی علامت کے ذریعہ ظاہر کیا جائے گا۔ اسی طرح ع اور الف میں ایک قائم رکھا جائے گا۔ ایک ترک ہوگا۔

۴۔ جن لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اُردو کا رسم الخط رومن کر دیا جائے، ان سے درخواست ہے کہ اس تجویز میں مضمر خرابیوں اور اس پر عملدرآمد ہونے کے خاص نقصانات کو دھیان میں لائیں۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

۵۔ اُردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کے لیے کوئی ایسا نظام ابھی تک نہیں ہے جسے سب قبول کرتے ہوں۔ بہت سے لوگ من مانی کرتے ہیں، بہت سے لوگ "Library of Congress" کے نظام پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ "Library of Congress" کے نظام میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کر کے اسے برتتے ہیں۔ بہت سے لوگ کم وبیش وہ نظام استعمال کرتے ہیں جو عربی سے رومن کرنے کے لیے متداول ہے۔ بہت سے لوگ کوئی اور نظام بکار لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، خ لکھنے کے لیے حسب ذیل مختلف طریقے مستعمل ہیں:

چھوٹا ایکس (small x)

چھوٹا کے اور چھوٹا ایچ (kh)

چھوٹا سے اور چھوٹا ایچ ،لیکن دونوں حرفوں کے نیچے لکیر (kh) بڑا کے (K)۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ جب مختلف لوگ ایک ہی حرف کو رومن رسم الخط میں مختلف طرح ادا کریں گے، کوئی کچھ لکھے گا، کوئی کچھ، تو بچے کی تعلیم کس طرح ہوگی؟ یا پھر یہ ہوگا کہ کم و بیش ہر گھر میں رومن اُردو اپنی ہی طرز کی ہوگی۔ کسی کا کسی سے میل نہ ہوگا اور اس کا امکان زیادہ ہے کہ ہر بااثر طبقہ اپنے طور پر اپنے قاعدے اختیار کرے گا۔ جس زبان کے بولنے والے ابھی تک اس بات پر متفق نہ ہو سکے کہ ''دعویٰ'' لکھیں یا ''دعوا''، گذر لکھیں یا گزر، توتا لکھیں کہ طوطا، وطیرہ لکھیں یا وتیرہ، رحمٰن لکھیں یا رحمان، تمغا لکھیں یا تمغہ، معمہ لکھیں یا معما، مہینہ لکھیں یا مہینا، پیسہ لکھیں یا پیسا، تماشہ لکھیں یا تماشا، گئے لکھیں یا گیے (وغیرہ صدہا مثالیں ہیں)، اس کے بارے میں یہ توقع کرنا خام خیالی ہے کہ سب لوگ کان دبا کر ایک ہی قاعدے پر اتفاق کر لیں گے اور جھگڑا نہ کریں گے۔ یہاں تو ابھی یہ عالم ہے کہ یہی فیصلہ کرنے میں سر پھٹول ہو رہی ہے کہ ''کھ''، ''بھ'' وغیرہ مخلوط آوازوں کو اُردو حرف تہجی مانا جائے کہ نہیں؟ اور اگر مانا جائے تو انھیں کہاں جگہ دی جائے؟ ''ب'' کے فوراً بعد ''بھ'' آئے یا بڑی ''ے'' کے بعد؟ لغت میں پہلے ''بیٹا'' کا اندراج ہو یا ''بھاری'' کا؟ ابھی تو اسی پر تکرار ہے کہ لغت لکھتے وقت الف مد (آ) والے لفظ پہلے آئیں گے کہ خالی الف والے؟ بظاہر تو یہ بات ایسی ہے کہ اس میں کسی بحث یا اختلاف کی ضرورت ہی نہیں، لیکن اگر آپ اُردو کے ''مستند'' لغات ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس باب میں ''نوراللغات'' کا عمل کچھ ہے، ''آصفیہ'' کا کچھ اور ہے، فیلن کا کچھ دوسرا ہی ہے اور ترقی اُردو بورڈ، پاکستان کے عظیم الشان ''اُردو لغت، تاریخی اصول پر'' کے خیالات دیگر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ امید کرنا کہ سب لوگ تبدیل خط (Transliteration) کے ایک ہی اصول پر اتفاق کر لیں گے، یا جلد اتفاق کر لیں گے، محض امید پرستی ہے۔

۶۔ اُردو میں بہت سی آوازیں ایسی ہیں جنھیں رومن رسم الخط ادا نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور

پر حسب ذیل الفاظ کو رومن میں صحیح لکھنا غیر ممکن ہے:
بہن، قاعدہ، کہنا، کوا، کنواں، دودھاری (بمعنی دو دھاروں والی مثلاً دو دھاری تلوار)، دعا، وغیرہ۔

ان الفاظ میں زیر، زبر، پیش کی جو آوازیں ہیں وہ رومن یا ناگری میں نہیں ادا ہو سکتیں۔

۷۔ اگر صرف لفظ کو ادا کرنا ہے (اور بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے) تو اُردو کے ہزاروں الفاظ کا تلفظ بگاڑ کر رومن میں لکھنا ہوگا۔ مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ کو دیکھیں:

پردہ، اگر اسے parda لکھیں تو تلفظ غلط ہو جاتا ہے۔ اگر pardah لکھیں تو اور بھی غلط ہو جاتا ہے۔ اگر اسے pard لکھیں تو کوئی لفظ ہی نہیں بنتا۔ (ملحوظ رہے کہ بعض اوقات اسے انگریزی لفظ قرار دیتے ہیں تو اسے purdah لکھتے ہیں)۔

گناہ، اسے اگر gunah لکھیں تو h کی آواز انگریزی میں غائب ہو جائے گی۔ صرف گنا سنائی دے گا۔ انگریزی میں کوئی طریقہ ایسا نہیں کہ آخر میں آنے والی ہائے ہوز کی آواز کو ملفوظ کر سکیں۔ مجبوراً اسے gunaha لکھنا پڑے گا جو تلفظ کے قطعاً منافی ہے۔

کارواں، اگر اس کے نون غنہ کے لیے کوئی ایک علامت سب لوگ مقرر کر بھی لیں تو رومن اس لفظ کو یا تو karvan لکھیں گے یا karavan لکھیں گے۔ اُردو کے لحاظ سے دونوں تلفظ غلط ہیں۔ اُردو میں ''کارواں'' کی رائے مہملہ ساکن ہے لیکن اس پر ہلکا سا زبر بھی ہے۔ رومن میں وسطی سکون ظاہر کرنے کا کوئی طریقہ نہیں اور جس طرح کا سکون/حرکت ''کارواں''، ''فیصلہ'' جیسے بے شمار لفظوں میں ہے اس کے لیے رومن میں کچھ بھی انتظام ممکن نہیں۔

میر (یائے معروف)، دور (واؤ معروف) جیسے کتنے ہی الفاظ ہیں جو بہ اعتبار تلفظ رومن میں ادا نہیں ہو سکتے۔ انگریزی میں Miir کا تلفظ mear اور duur کا تلفظ duar ہے۔ کیونکہ انگریزی تلفظ کے اعتبار سے آخری R نہیں بولا جاتا۔ اگر اسے بولنا ہے تو اس کے پہلے یا بعد حرکت دینی ہوگی جو اُردو تلفظ کے منافی ہے۔ اُردو جاننے والے تمام انگریز اور امریکن اپنی زبان کی مجبوری کے باعث ''میر'' کو mere

بروزن fear بولتے ہیں۔ ایک مدت ہوئی جب میں (زیادہ تر طالب علمی کے دنوں میں) انگریزی فلمیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب فلم کا نام یاد نہیں رہا، لیکن اس میں ایک ہندوستانی کردار ''کبیر'' نامی تھا۔ مجھے اس کا تلفظ Kabi'ar سن کر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ بعد میں مغربی ممالک میں ہر جگہ میں نے یہی صورت پائی۔ ''کشمیر'' کے پرانے ہجے اسی وجہ سے Cashmere تھے اور ایک خاص طرح کا اونی کپڑا آج بھی Cashmere ہی کہلاتا ہے۔ اسی طرح ایک خاص طرح کے ریشمی کپڑے کو Madras کہتے ہیں اور چونکہ اس ہجے میں دونوں A کی قیمت غیر معلوم ہے لہٰذا اس لفظ کو انگریزی قاعدے کے مطابق آج بھی ''میڈرس'' (''میڈ'' بروزن sad اور ''رس'' بروزن fuss) کہتے ہیں۔

۸۔ عربی فارسی، خاص کر عربی کے ان گنت الفاظ ہیں اُردو میں جن کے تلفظ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے میں اختلاف نہیں لیکن اُردو میں ان کا تلفظ عربی/ فارسی سے مختلف ہے۔ خیر، جہاں اختلاف نہیں، وہاں تو ممکن ہے کہ رومن میں بھی اُردو کے تلفظ کو اپنا لیا جائے (حالانکہ بہت سے لوگ نہ مانیں گے) لیکن جہاں اختلاف ہے وہاں کیا کیا جائے، مثلاً:

rivayat لکھیں کہ rvayat؟ murawat لکھیں کہ muruu'at؟ hisab لکھیں کہ hesab یا hasab؟ Mihdi یا؟ لکھیں کہ Mahdi یا Mehdi؟ (یہ خیال رہے کہ انگریزی میں Mihdi/Mahdi/Mehdi جو بھی لکھیں، حرف h پڑھنے میں نہ آئے گا اور بچے کو یہ سیکھنے میں بہت مشکل ہوگی کہ یہاں حرف h صاف صاف پڑھنے میں نہ آئے گا اور بچے کو یہ سیکھنے میں بہت مشکل ہوگی کہ یہاں حرف h صاف صاف بولا جائے گا)۔ taqii'ah لکھیں یا taqaiyah یا taqayyiah؟ sayyid لکھیں یا syyad یا saiyad یا syed لکھی؟ janaza لکھیں کہ jenaza؟ zimam لکھا جائے کہ zamam؟ qabool لکھنا بہتر ہے کہ qubool؟ اسی طرح، sha'oor درست مانا جائے یا shu'oor؟ furogh اچھا ہے کہ farogh؟

۹۔ ایک مشکل ان لفظوں میں ہوگی اور ایسے لفظ بہت ہیں اور رائج بھی ہیں جن کو شعر میں تو

اصل تلفظ کے اعتبار سے نظم کیا جاتا ہے لیکن بول چال میں ان کا تلفظ کچھ اور ہے مثلاً:
شمع، شکل، ذبح، شہد، ہرج، طرح، اطمینان، حرکت، کلمہ، صدقہ وغیرہ۔

۱۰۔ بہت سے ایسے لفظ ہیں جو موقعے یا رواج کے اعتبار سے کئی طرح بولے جاتے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ مثلاً یہ الفاظ رومن میں کس طرح لکھے جائیں گے؟

کہ: اس کے تین لفظ ہیں (۱) کاف کے بعد ہلکی یائے معروف، (۲) کاف کے بعد ہلکی یائے مجہول، (۳) کاف کے بعد لمبی یائے مجہول) اور اگر ضرورت ہو تو کبھی کبھی کاف کے بعد طویل یائے معروف بھی بولی جاتی ہے۔

''لیلیٰ'' اور اس قسم کے تمام الفاظ جن کا تلفظ کبھی کبھی یائے معروف سے کرتے ہیں (بروزن ''پھیلی'') اور کبھی، خاص کر اضافت کی حالت میں الف مقصورہ کے ساتھ (بروزن ''پھیلا'')۔

چیونٹی: اس کے تین تلفظ ہیں (۱) چیں اوٹی بروزن فاعلن (۲) چوں ٹی بروزن فع لن (۳) چیوں ٹی، یائے مخلوط کے ساتھ، بروزن فع لن)۔

حد، خط، کف، حج اور اس طرح کے دوسرے عربی لفظ جن کے آخری حرف پر تشدید ہے، لیکن وہ صرف اضافت کی حالت میں کبھی کبھی بولی جاتی ہے۔

مچھر، چپراس وغیرہ بہت سے لفظ ہیں جنھیں دلی والے اور بہت سے مشرقی ہندوستان والے، رائے ہندی سے بولتے ہیں (مچھڑ، چپڑاس) اور باقی لوگ سادہ رائے مہملہ سے۔

۱۱۔ اب بعض باتیں اور دیکھ لیجیے۔

اگر املا نہیں ظاہر کرنا ہے تو بہت جگہ تلفظ بھی غلط ہو جائے گا۔ مثلاً مندرجہ ذیل پر غور کریں:

ضعف، سعید، معذور، معقول

ضد کی اور بات ہے لیکن ان لفظوں میں ع کا تلفظ سراسر الف یا ہمزہ کا نہیں۔ حسب ذیل سے مقابلہ کریں:

زور، لئیق، ماجور، ماقول

صاف ظاہر ہے کہ ضعف/ زور، سعید/ لئیق، معذور/ ماجور، اور معقول/ ماقول کے تلفظ ایک نہیں ہیں۔ اول الذکر لفظوں میں تھوڑی سی آواز عین کی سنائی دیتی ہے۔ رومن میں اسے کس طرح ادا کریں گے؟

جن لفظوں میں واؤ معدولہ مع الف ہے (خوان، خواب) ان کا تلفظ ان لفظوں سے مختلف ہے جن میں واؤ معدولہ بے الف ہے (خوش، خود) ایسے الفاظ میں املا ظاہر کریں تو تلفظ ہاتھ سے جاتا ہے اور تلفظ ظاہر کریں تو املا کا خون ہوتا ہے۔

رومن میں ہمزہ کا متبادل کچھ نہیں۔ رومن رسم الخط میں ہمزہ اور ع اور الف سب ایک ہو جائیں گے۔ مثلاً عکس/aks، تاسف/taassuf، الم/alam

رومن میں پڑھنے والا ان الفاظ میں فتحہ کی آوازوں کا کچھ امتیاز نہ کر سکے گا۔ آہستہ آہستہ ان کا تلفظ بدل جائے گا اور پھر شاعری کو موزوں پڑھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔

استدلال ابھی اور بھی ہیں لیکن جو ماننا چاہے اس کے لیے اتنے بہت ہیں اور جو نہ ماننا چاہے اس کے لیے پوری کتاب بھی کافی نہ ہوگی۔ بہر حال رسم الخط کی تبدیلی کے مویدین سے میری درخواست ہے کہ وہ مسعود حسن رضوی ادیب کی چھوٹی سی کتاب ''اُردو زبان اور اس کا رسم الخط'' پڑھ لیں اور اگر توفیق ہو تو اسی موضوع پر محمد حسن عسکری اور احتشام حسین کے مضامین بھی دیکھ لیے جائیں۔ شان الحق حقی نے اس سلسلے میں اچھی بات کہی ہے:

> ''رسم الخط اپنی زبان کے لیے اور زبان اپنے بولنے والوں کے لیے ہوتی ہے۔ چند غیر ملکیوں کی سہولت کے لیے اپنی زبان کی کایا پلٹ کرنا مضحکہ خیز حرکت ہوگی...... دنیا کو اُردو کی طرف متوجہ کرنا ہو تو ہمیں اس کے اندر بہتر سے بہتر ادب پیدا کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس کی دم میں کھنکھنا باندھنے کی۔''

اس پر میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اُردو کا رسم الخط اگر رومن میں کر دیا جائے تو جتنی سہولتیں حاصل ہوں گی ان سے کہیں بڑھ کر مشکلیں پیدا ہوں گی اور یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ اگر ایک بار رسم الخط کی تبدیلی پر ہم راضی ہو گئے تو یہ تقاضا بار بار اٹھے گا، آج لوگ دیوناگری یا رومن کے لیے کہہ رہے ہیں،

کل کو کسی اور رسم الخط کے لیے مانگ ہوگی کہ اُردو لکھنے کے لیے اسے بھی استعمال کیا جائے۔ خود ہندوستان میں لوگ کہیں گے کہ دیوناگری قبول ہے تو بنگالی کیوں نہیں؟ بنگالی قبول ہے تو تمل کیوں نہیں؟ پھر یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے والا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا، اپنے رسم الخط یا املا میں تبدیلی کا تقاضا کرنے کی بیماری صرف اُردو والوں میں ہے۔ اگر کسی اور زبان والے سے کہیے کہ ''میاں تمہارا رسم الخط یا املا ناقص ہے، اسے بدل ڈالو،، تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائے گا اور ایسا نہیں ہے کہ مغرب میں تیسری دنیا سے آئے ہوئے صرف اُردو کے ہی لوگ بستے ہوں۔ ہندوستان اور افریقہ اور ایشیا کی اکثر زبانیں بولنے والوں کی کثیر تعداد مغرب میں مقیم ہے۔ ان میں سے تو کسی کی بھی زبان سے نہیں سنا گیا کہ ہمارے بچوں کو اصل رسم الخط میں دقتیں درپیش ہوتی ہیں، کیوں نہ اپنی زبان (مثلاً مراٹھی، بنگالی، ملیالم، سنگھل، سواحیلی، ہوکسا) کا رسم الخط بدل کر رومن کر دیا جائے۔

کچھ دن ہوئے ایک صاحب کی تجویز نظر سے گزری کہ اُردو میں حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ اس سے کمپیوٹر کو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اُردو کے حروف بھی الگ الگ لکھے جائیں تو کمپیوٹر کے میدان میں آسانی ہو جائے گی۔

اول تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ الگ الگ حرف لکھنے سے کمپیوٹر کو کون سی آسانی ہو جائے گی؟ کمپیوٹر غریب اُردو کا نقاد تو ہے نہیں کہ عقل سے عاری ہو، وہ تو ایک بہت ہی نازک اور حساس مشین ہے جو سکھایئے گا سیکھ لے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ کمپیوٹر جب اُردو فارسی عربی لکھتا ہے تو اسے معلوم رہتا ہے کہ یہ انگریزی یا فرانسیسی نہیں ہے اور اس میں مجھے بڑی مشکل ہونا چاہیے۔ کمپیوٹر تو حکم کا تابعدار ہے، اس میں اقداری فیصلے کی صلاحیت نہیں۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اُردو میں حرفوں کو الگ الگ کیوں نہیں لکھا جاتا، جب کہ مثلاً رومن اور ناگری میں ایسا ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن زبانوں میں حرف الگ الگ لکھے جاتے ہیں ان میں اعراب بالحرف یا اعراب صریح، یا موقعے موقعے سے دونوں کا التزام ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر کو سنسکرت/ ہندی میں ''ماترا،، کہتے ہیں۔ اعراب بالحرف کے لیے وہاں شاید کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کے عمل کو یوں واضح کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ نے اُردو میں لکھا:

ہم: اب آپ سے کہا گیا کہ اچھا اس کے حرف الگ الگ کر کے رومن رسم الخط میں لکھیے، جس طرح انگریزی لکھی جاتی ہے۔ تو آپ نے لکھا:

HM: اب ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا پڑھیے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی میں کوئی لفظ اس قماش کا ہے ہی نہیں جس میں صرف یہ دو حرف ہوں۔ لامحالہ آپ کہیں گے، ''لفظ 'ہم' کے اعراب کیا ہیں؟ یہ معلوم ہو تبھی تو انگریزی میں لکھوں گا۔'' آپ کی بات وزنی ہے، لہٰذا آپ کو بتایا گیا کہ یہاں ہم میں اول مفتوح ہے۔ ''بہت خوب، ابھی لیجیے،'' آپ نے جھٹ کہا اور لکھا: HAM

اس بات سے قطع نظر کہ لفظ Ham کے انگریزی میں کئی معنی ہیں اور بھی معنی اُردو لفظ ''ہم'' کے معنی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ آپ یہ ملاحظہ کریں کہ پڑھنے/ سیکھنے والے کو کتنی مشکل ہو گی (اور آپ کے کمپیوٹر غریب کو شاید کتنی مشکل ہو گی) جب یہ لفظ ہم رومن رسم الخط میں اور رومن طرز کے مطابق حرف الگ الگ کر کے لکھا جائے گا؟ اگر آپ اعراب بالحرف نہ دیں گے تو کوئی پڑھ ہی نہ سکے گا کہ لکھا کیا ہے؟ اُردو میں تو رسم بن چکی ہے' پڑھنے والے کو معلوم ہے کہ شروع شروع کی اکا دُکا منازل کے بعد اعراب صریح (زیر زبر پیش) میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لہٰذا مجھے خود ہی معلوم کرنا ہے کہ مثلاً حسب ذیل شعر میں الفاظ پر اعراب کیا ہیں:

کئی گزرے سنہ ترا کم تھا سن جو لیے تھے سن ترے گھونگرو
گیا سینہ چھن گئے ہوش چھن جو بجے تھے چھن ترے گھونگرو

چنانچہ جب میرا سابقہ اُردو زبان اور رسم الخط میں لفظ ''ہم'' سے پڑا تو میں نے یہ پکار نہ لگائی کہ ارے بھائی اس پر اعراب کیا ہیں؟ میں نے خود کو سکھا لیا ہے کہ یہاں اول حرف پر تین میں سے ایک حرکت ہو گی اور مجھے قیاس اور تجربے سے کام لے کر معلوم کر لینا ہے کہ اس وقت کون سی حرکت ہے۔ اگر مجھے صرف HM دکھایا جائے گا تو میں مرتے مرتے مر جاؤں گا لیکن مجھے اعراب نہ ملے گا۔ اچھا اگر یہ طے کر لیں کہ میاں جس طرح اُردو میں اٹکل سے پڑھتے ہو، اسی طرح رومن میں اٹکل سے پڑھ لو۔ جان لو کہ اس زبان میں اعراب بالحرف نہیں ہیں۔ اس پر التمس یہ ہے کہ کیا معنی، اُردو زبان میں اعراب بالحرف نہیں؟ تو پھر اسی لفظ ''نہیں'' میں ہائے ہوز کے بعد کیا ہے؟ حرف دوم یہاں مکسور ہے اور حرف سوم پر کوئی حرکت نہیں، وہ لمبی ''ا'' کی آواز ظاہر کر رہا ہے، کہنے کو چھوٹی 'ی' ہے۔ یہ اعراب صریح ہے' یعنی کسی حرف کو علامت میں بدل کر اس سے اعراب کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہی چھوٹی 'ی' جب لفظ 'ادھر' میں آئے گی تو اور طرح لکھی جائے گی۔ جب لفظ 'پیلی' میں لکھی جائے گی تو اور طرح لکھی جائے گی۔ اب ذرا 'بانگِ درا' کا پہلا مصرع حرفوں کو الگ الگ کر

کے رومن طرز میں صرف اُردو کے اعراب کے مطابق لکھیے:

اے ہ م ال ہ اے ف ص ی ل ک ش و ر ہ ن د و س ت اں

میں نے لفظوں کے درمیان فاصلے رکھے ہیں لیکن کوئی بندۂ خدا اس مصرعے کو پہلے سے اُردو میں پڑھے بغیر پڑھ ہی دے تو دیکھوں، صحیح اور موزوں پڑھنا تو دور رہا۔ کہیں پر اعراب غائب ہیں، کہیں اعراب صریح ہے، لیکن پھر بھی مبہم (مثلاً پتہ نہیں چلتا کہ 'ہندوستاں' میں واؤ معروف ہے کہ مجہول؟)

معلوم ہوا اُردو میں کہیں کہیں اعراب صریح ہے، زیادہ تر فقدان اعراب ہے اور جہاں اعراب ہیں وہاں اکثر مبہم ہیں۔ ایسی زبان کو آپ انگریزی کی طرح الگ الگ حرفوں اور التزام اعراب کے ساتھ کس طرح لکھیں گے؟

ایک بات اور بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انگریزی میں اعراب بالحرف بالکل نہیں ہے اور نہ ایسا ہے کہ اعراب بالحرف کی امداد سے تلفظ قطعی اور واضح ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں جہاں جہاں (مثلاً) حسب ذیل حرف آخر لفظ میں ساتھ آتے ہیں، وہاں اعراب بالحرف ہے:

BLE(aBLE);DLE(bunDLE); GLE(buGLE)KLE(tacKLE)

مگر مشکل یہ ہے کہ ان تینوں میں حرف L اور اس کے ماقبل کے درمیان حرکت یکساں نہیں ہے۔

Table میں B اور L کے بیچ میں ہلکا سا ضمہ ہے۔

Bundle میں D اور L کے بیچ ہلکا سا کسرہ ہے۔

Bugle میں G اور L کے بیچ میں کچھ نہیں ہے، فتحہ مان سکتے ہیں، لیکن وہ اس قدر ہلکا ہے کہ ہونا نہ ہونا مساوی سمجھیے۔

Tackle میں K اور L کے بیچ میں بہت ہلکا سا ضمہ ہے، ذرا کسرہ کی طرف مائل۔

لہٰذا وہاں بھی تلفظ کی مشکلیں اعراب کے ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر ہیں، خواہ حرف کتنی ہی دور دور کیوں نہ لکھے جائیں۔ انگریزی کی نقل کرنے سے یہاں اُردو کو کچھ نہ ملے گا۔

خلیل دھن تیجوی کی یہ بات باوزن ہے: ''اگر غیر اُردو داں طبقہ بھی اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیتا ہے تو اُردو کی آبیاری کرنے والوں کے بچوں کو (یہ کام) کیوں نہیں سکھایا جا سکتا؟'' ہم اُردو والوں کی یہ ادا خوب ہے کہ جس درخت سے پھل حاصل کرنا مشکل نظر آئے، اس درخت کی جڑ ہی کاٹ دینے پر تل جائیں گے، خود تھوڑی سی محنت نہ برداشت کریں گے۔ اسی طرح رام پرکاش کپور نے بھی سچی بات کہی۔ یہ اور بات ہے کہ ہم

لوگوں کو خود بینی سے فرصت ہی نہیں کہ ان الفاظ کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں:

اُردو کی لڑائی خود ان لوگوں سے ہے جو اُردو بولتے ہیں، اُردو کے مشاعرے پڑھتے ہیں، اُردو کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں، اُردو کے نام کی روٹی کھاتے ہیں، اُردو کے کارواں کو چلاتے ہیں اور کبھی کبھی اُردو کو سرکاری زبان بنا دینے کی مانگ کر کے عوام کو گمراہ بھی کرتے ہیں۔ اُردو میں فلمیں لکھ کر ہندی کے نام سے بیچتے ہیں اُردو کے گانوں پر ہندی سرٹیفکیٹ برداشت کرتے ہیں۔ ان تمام بڑے بڑے اُردو داں حضرات کے بچے اُردو نہیں پڑھتے، نہیں بولتے، نہیں لکھتے، نہیں جانتے، نہ ہی خود یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اُردو جیسی زبان سیکھیں۔

گزشتہ چالیس برس سے میں اُردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور پروفیسروں کی خدمت میں حاضری دیتا رہا ہوں اور میں نے انھیں حتی المقدور اس بات پر ٹوکا بھی ہے کہ آپ کے بچے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں اُردو نہیں پڑھتے۔ یہ اچھی بات نہیں اور کچھ نہیں تو یہ خیال فرمائیے کہ آپ کی تحریروں سے آپ کے اخلاف محروم رہیں گے، یہ منصفی سے عاری ہے کہ نہیں؟ لیکن مجھے افسوس ہے کہ اکا دُکا کے سوا کسی کے کان پر جوں نہ رینگی اور یہی لوگ ہیں جن کی صدائے ماتم سب سے زیادہ بلند سنائی دیتی ہے کہ ہائے اُردو مر گئی، یا مر رہی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، انھوں نے اپنے گھر سے اُردو کو بدر کر دیا ہے۔ اس لیے وہ یہی کہنے میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اُردو کا خاتمہ ہو گیا یا ہونے والا ہے۔

حقیقت، ظاہر ہے کہ اس کے بالکل برعکس ہے لیکن اُردو کی بقا کے لیے سب سے زیادہ تعاون اور قربانیاں غریب غربا کی طرف سے یا پھر ان علاقوں سے آئی ہیں جنھیں ہم یو پی والے اُردو کے علاقے نہیں سمجھتے اور وہاں کے اُردو بولنے والوں کو 'اہل زبان،، نہیں تصور کرتے۔ اُردو کے لیے سعی اور جہد سب سے زیادہ بہار میں کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ پھر مہاراشٹرا میں جہاں اُردو مخالف حکومتوں کے باوجود اُردو ذریعۂ تعلیم کی درس گاہیں خوب برگ و بار لا رہی ہیں، اُردو میڈیم سے تعلیم پائے ہوئے بچے مسلسل ہائی سکول کے امتحان میں سارے صوبے میں پہلی پوزیشن لاتے ہیں۔ یو پی والے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اُردو پڑھنا چھوڑ دیا تو سب نے چھوڑ دیا۔ وہ بہار اور مہاراشٹرا کیا، مدھیہ پردیش، کرناٹک، آندھرا، ہماچل پردیش جا کے دیکھیں تو انھیں معلوم ہو یو پی والے اپنے گلے میں ''اہل زبان'' کا تمغا لٹکائے رہیں اور سمجھتے رہیں کہ اُردو کا قتل ہو چکا۔ دنیا ان پر ہنس رہی ہے، ابھی اور ہنسے گی۔

رام پرکاش کپور نے اپنی تحریر مطبوعہ ''شاعر''، ممبئی میں ہاشم علی اختر صاحب (سابق وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کا حوالہ دیا ہے کہ ان کے دوستوں رشتہ داروں میں ''چالیس کی عمر سے کم والا ایک بھی فرد اُردو رسم الخط نہیں جانتا''، لہٰذا ہاشم علی صاحب چاہتے ہیں کہ اُردو کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ اگر کسی معاشرے میں چالیس سے کم عمر والے افراد جاہل ہوں تو ہاشم علی صاحب کی منطق کے مطابق اس معاشرے میں خواندگی کو منسوخ قرار دیا جائے اور اس کو ''زبانی'' (Oral) معاشرے کی سطح پر قائم کیا جائے اور اگر کسی معاشرے میں چالیس سے کم عمر والے افراد کو کوئی بیماری ہے تو اس بیماری کا علاج کرنے کے بجائے اسے نارمل حالت صحت قرار دیا جائے اور سب لوگوں کے لیے اس بیماری میں مبتلا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

میں کئی گزشتہ تحریروں میں رومن اور ناگری رسم الخطوں کی کئی اور کمزوریاں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ لہٰذا یہاں ان باتوں کا اعادہ نہیں کرتا۔ یہاں آخری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت سے مراعات کی بھیک مانگنے کے بجائے ہم اُردو والوں کو خود اپنی زبان کے فروغ اور استحکام کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ حکومتوں نے جتنا کیا ہے اور جو کر رہی ہیں اس سے زیادہ کی امید آپ کو کیوں ہو؟ خود ہمارا بھی کچھ فرض ہے کہ نہیں؟

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے مبر

☆☆☆

سیّد عبدالقدوس ہاشمی ندوی

رومن رسم الخط اور پاکستان

آج کل کچھ دنوں سے یہ سوال زیر بحث ہے کہ:

اگر پاکستان کے لیے رومن حروف اختیار کر لیے جائیں تو اس سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں؟

یہ سوال قومی تعلیمی کمیشن نے اپنے سوالنامے میں کیا ہے۔ جب اس سوال پر بحث شروع ہوئی تو اس کا دوسرا لازمی حصہ خود بخود اہل علم و اہل فکر کے سامنے آ گیا کہ:

اور اس عمل سے کیا نقصان ہوگا؟

اس سوال کے ان ہی دونوں پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ اس وقت بحث مقصود ہے۔ آیئے بغیر جذبہ قدامت پرستی اس مسئلہ پر خالص علمی انداز میں غور کریں۔ ممکن ہے کہ بعض غلط فہمیوں کی اصلاح ہو جائے اور بعض ایسے گوشے بھی منور ہو جائیں جو بظاہر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

جدید و قدیم محض اضافی مفہوم کی تعبیریں ہیں۔ ہر قدیم اپنے وقت میں جدید تھا اور ہر جدید چند دنوں کے بعد قدیم کہلائے گا۔ ہر نئی بات بُری نہیں ہوتی ہے اور نہ ہر پرانی بات رسائی فکر کی یادگار ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہر نئی بات اچھی ہے یا کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہر نئی تحریک بری ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک حقیقت پسند آدمی کی طرح اس مسئلہ پر بھی خالص افادی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے۔

رابطۂ اتحاد

جن لوگوں نے پاکستان میں رومن رسم الخط رائج کرنے کا سوال ان دنوں چھیڑا ہے، شاید ان کا خیال ہے کہ اُردو، بنگالی دونوں کا ایک ہی رسم الخط ہو جائے تو باہمی اختلاف ختم ہو کر اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے گی، حالانکہ یہ ایک منطقی مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ رابطۂ اتحاد میں رسم الخط کے اتحاد کو ذرہ برابر بھی اہمیت حاصل نہیں اور رسم الخط تو کیا چیز ہے زبان کے اتحاد کو بھی ثانوی بلکہ ثالثی درجہ حاصل ہے۔ اگر رسم الخط کا اتحاد حقیقتاً کوئی بنیاد ہوتا جس پر قومی اتحاد کی عمارت کھڑی کی جا سکتی تو فرانس اور جرمنی کے مابین کبھی جنگ نہ ہوتی اور یورپ و امریکہ کی ساری اقوام ایک ہی متحدہ قوم ہوتیں، ایران و عراق ایک ہی ملک کے دو صوبے ہوتے۔

جنوبی امریکہ کے سارے ممالک، ممالکِ متحدہ امریکہ کے اجزا ہوتے، کینیڈا اور ممالک متحدہ امریکہ کی ایک ہی مرکزی حکومت ہوتی۔ اسی طرح اگر مختلف خطوط کا رائج ہونا مختلف قومیتوں کے پیدا ہونے کی علت ہوتا تو آج دنیا میں اکیاسی اقوام نہیں بلکہ سات سو تین اقوام ہوتیں، ہندوستان کا موجودہ رقبہ بارہ آزاد خود مختار مملکتوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا اور روس کم از کم تین اور شاید زیادہ آزاد اقوام کا مجموعۂ اقوام ہوتا۔

کسی قوم کے مختلف اجزاء کو باہم مربوط رکھنے میں بہت سے روابط کام کرتے ہیں جن میں آٹھویں یا نویں درجہ پر آپ اتحادِ خط کو بھی چاہیں تو شمار کر لیں، لیکن حقیقتاً یہ کوئی قابلِ شمار رابطہ نہیں ہے۔ ہم آگے چل کر جہاں تبدیلی خط کے اجتماعی اثرات پر بحث کریں گے اس مسئلہ پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گے، اس جگہ تو مرحوم علامہ اقبال کی زبان میں ہم صرف اس قدر کہتے ہیں کہ اتحاد کی بنیاد کچھ اور ہی ہے:

لاطینی و لادینی کس پیچ میں الجھا تو

تاریخی پس منظر

اس سے قبل کہ پاکستان میں رومن خط اختیار کر لیے جانے کے اچھے یا برے اثرات و نتائج پر آپ غور کریں، اس تجویز کے تاریخی پس منظر کو بھی دیکھ لیں تو اچھا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے لیے رومن رسم الخط ایک غیر مانوس خط تھا لیکن جب یورپ کے تاجروں نے یہاں قدم جمایا اور معاشی لوٹ کھسوٹ پر مذہب کے مقدس نام کا پردہ ڈالنے کے لیے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے عیسائی مبلغوں کو یہاں لا کر پھیلایا گیا تو انھوں نے پہلے پہلے اس خط کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام اس لیے نہیں شروع کیا گیا کہ یہاں کی مقامی زبانوں کے لیے رومن رسم الخط اختیار کر کے یہاں کے لوگوں کو انجیل مقدس سے روشناس کرایا جائے گا۔ یہ خیال تو تقریباً ایک صدی کے بعد ان کے دماغوں میں آیا۔ اس وقت تو اس کا مقصد یہ تھا کہ یورپی تاجر جو کارندے یورپ سے لاتے تھے، ان کو یہاں کے مقامی الفاظ خصوصاً افراد و مقامات کے نام یاد کرانے کی یہ ترکیب نکالی گئی تھی اور یہ ترکیب صحیح بھی تھی۔ یہ کارندے جن حروف سے واقف ہوتے تھے، ان ہی حروف میں ملیالم اور تامل زبانوں کے الفاظ اور ہندوستان کے اشخاص و مقامات کے نام انھیں یاد کرا دینا یقیناً اس سے بہت زیادہ آسان کام تھا کہ انھیں فارسی حروف یا ملیالم حروف سکھانے کی زحمت اٹھائی جاتی۔

اس طرح رومن حروف سب سے پہلے ہمارے اسماء معرفہ کے لیے استعمال کیے گئے۔ اس ابتدائی جدوجہد کے تقریباً سو سال کے بعد جب کافی تعداد میں عیسائی بنا لیے گئے اور انھیں رومن حروف سکھا لیے تو

ضرورت محسوس کی گئی کہ ان عیسائیوں کو مقامی خط خصوصاً فارسی رسم الخط کے سیکھنے سے بچایا جائے، اور ایک ہی رسم الخط سے ان کا واسطہ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ مقامی زبانیں بولتے تھے، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں تو انھیں اتنی نہیں آ گئی تھیں کہ وہ انجیل مقدس پڑھ لیتے یا اپنی روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل ان زبانوں کے ذریعہ کرتے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی زبانوں کی عبارتیں بھی رومن حروف میں لکھی جانے لگیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی ایسی متعدد تحریریں آپ کو تاریخی یادداشتوں اور خصوصیت کے ساتھ جنوبی ہند کے قدیم گھرانوں میں دستاویزوں پر لکھی ہوئی مل سکتی ہیں۔ کاتب سطور نے ایسی بہت سی تحریریں صوبہ مدراس، دکن اور میسور کے قدیم خاندانوں میں دیکھی ہیں۔

اس کے بعد سے برصغیر میں جیسے جیسے فرانسیسیوں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کا دائرہ بڑھتا گیا، رومن حروف کے استعمال کا دائرہ بھی پھیلتا رہا، عیسائی مبلغوں کی جماعتیں بھی کام کرتی رہیں اور دیسی عیسائیوں کے لیے کتاب مقدس کے عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید کے مختلف حصے مقامی زبانوں اور فارسی زبان میں بخطِ رومن چھپتے اور تقسیم ہوتے رہے، یہاں تک کہ انگریزی تسلط نے اس خط کو اپنی فوجوں میں رائج کرنے کے لیے فوجی قواعد، گھوڑوں کے علاج اور صحت عامہ کے بعض رسالوں میں استعمال کیا۔ میرے ذاتی کتب خانہ میں ایسی متعدد کتابیں تھیں جن کی زبانیں تو مقامی ہندوستانی زبانیں تھیں مگر انھیں رومن حروف میں نہیں چھاپا گیا تھا۔

۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد جب ہندوستان کا سیاسی مطلع صاف ہو گیا اور انگریزوں کے مخالف فرانسیسی ہمیشہ کے لیے پسپا ہو کر میدان چھوڑ گئے، تو انیسویں صدی کی ابتدا میں انگریزوں نے صرف رومن حروف کی بجائے اب انگریزی زبان کے پھیلانے کی طرف حقیقی توجہ شروع کی، کیونکہ دیسی ملازمین کا صرف رومن خط جان لینا انگریزی حکومت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی طرح کافی ثابت نہ ہو سکا تھا۔

حکومت کے ذرائع، حصول اعزاز کی ترغیب، دیسی مدارس کی توہین بلکہ جبراً ان کے دروازوں کو بند کر دینا، سرکاری امدادوں کے ذریعہ پادریوں کے قائم کردہ سکول سرپرستی، مقامی قصہ کہانیوں کی انگریزی زبان اور رومن حروف میں اشاعت، اور سب سے زیادہ سرکاری دفاتر میں اس کے استعمال کی پابندی، غرض کہ دنیا کا کوئی جتن ایسا نہ تھا جو برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کو رومن خط اور انگریزی زبان سے مانوس کرنے، اور انگریزی رنگ میں اس ساری آبادی کو رنگنے کے لیے نہ کیا گیا ہو۔ کوئی بددیانتی اور کوئی دھاندلی ایسی نہ تھی

جو انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کو ان کے قدیم خیالات اور قدیم خطوط سے نا آشنا کر کے رومن رسم الخط اور انگریزی زبان سے مانوس کرنے کے لیے نہ کی ہو۔ ہمیں ۱۷۷۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ مساعی تیز سے تیز تر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ہر سال بلکہ ہر ماہ ان کے اضافے ہوتے رہے ہیں، حتیٰ کہ ڈاکخانے دیسی خطوط میں دستخطوں کے ساتھ رومن میں نام لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ انگریزی بینک دیسی خطوط کی دستخطوں پر شناخت وشہادت طلب کرتے ہیں۔ راستوں کی تختیاں تک اسی خط میں لکھی جاتی ہیں اور حد تو یہ ہے کہ پان گلوریاں بیچنے والا بھی اپنی دکان کا بورڈ رومن حروف میں لکھوا کر فخر کرتا ہے۔

اتنی وسیع، اتنی پر زور، اتنی مسلسل اور اس قدر طویل مدت تک سرکاری وغیر سرکاری مساعی کا کامیاب نہ ہونا کیا معنی؟ ان مساعی کو تو کامیاب ہونا ہی چاہیے تھا، لیکن انگریزی ہندوستان کی آخری رپورٹ مردم شماری بابت ۱۹۴۱ء ہمیں بتاتی ہے کہ آبادی کا صرف ۱.۷ فی صد یعنی پونے دو فی صد سے بھی کم حصہ رومن حروف پہچان سکتا ہے۔ یعنی تقریباً دو سو سال کی جدوجہد صرف یہ نتیجہ پیدا کر سکی کہ تقریباً دس فی صد حرف شناس آبادی میں سے پونے دو فی صد افراد رومن حروف سے آشنا ہو سکے۔

تاریخی پس منظر کے بعد اب آیئے رومن رسم الخط پر خالص علمی انداز میں غور کریں اور دیکھیں کہ پاکستان میں اگر رومن رسم الخط اختیار کر لیا گیا تو اس سے کیا فوائد اور کیا نقصانات ہوں گے۔

ابتدائی تنقیحات

پاکستان میں اس وقت اگرچہ متعدد زبانیں رائج ہیں لیکن خط کے اعتبار سے صرف دو خط ہیں، مشرق میں بنگلہ رسم الخط اور مغرب میں اُردو رسم الخط۔ مغربی پاکستان کی دوسری زبانیں سندھی، بلوچی اور پشتو، اسی (ا ب ت ث) والے خط میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ سب حقیقتاً ایک ہی خط کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی طرح بنگلہ رسم الخط اور گجراتی رسم الخط ناگری رسم الخط سے مختلف کوئی چیز نہیں، ناگری ہی رسم الخط کے مختلف انداز تحریر کے مختلف نام ہو گئے ہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جائے کہ پاکستان میں رومن رسم الخط رائج کیا جائے یا نہیں تو اس کے سوا اور کوئی مفہوم اس سوال کا نہیں ہو سکتا کہ ا ب ت ث کی جگہ اگر A.B.C.D. آ جائے تو کیا ہوگا؟

رسم الخط پر غور کرتے ہوئے ہمیں مندرجہ ذیل تنقیحات پر غور کرنا چاہیے، ان تنقیحات پر بحث کیے بغیر یہ سوال حل نہیں ہو سکتا:

۱۔ کیا صوتیاتی اعتبار سے رومن حروف اُردو اور بنگلہ کی ساری آوازوں کی ادائی کے قابل ہیں؟

۲۔ کیا تعلیم بالغاں اور نابالغاں میں اس خط کے اختیار کر لینے سے ہمیں کوئی آسانی میسر آ سکتی ہے؟

۳۔ کیا روزمرہ کی تحریری ضروریات میں ان حروف کی وجہ سے ہمیں آسانیاں مل جاتی ہیں؟

۴۔ کیا طباعت کا کام ان حروف کے اختیار کرنے سے آسان اور نسبتاً ارزاں ہو سکے گا؟

۵۔ کیا قومی اتحاد اور بین الاقوامی تفاہم میں یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوں گے؟

۶۔ کیا کچھ زیادہ علمی و ادبی سرمایہ رومن خط کے اختیار کر لینے سے ہمیں حاصل ہو سکے گا؟

اگر آپ ان تنقیحات کا جواب اُثبات میں پاتے ہیں تو ضرور رومن خط رائج کر دیجیے اور اگر نفی میں پائیں تو ہرگز ایسی غلطی نہ کریں۔ یہ ہرگز نہ دیکھیں کہ کس نے کیا کیا، ہر ملک کے اپنے مسائل ہوتے ہیں اور زبان کی اپنی مخصوص آوازیں، بے سوچی سمجھی تقلید کسی کے لیے مفید نہیں ہو سکتی، پاکستان کے لیے بھی مفید نہیں۔

یہ سادہ تنقیحات اس قابل ہیں کہ آپ ایک حقیقت پسند عملی آدمی کی طرح ان پر غور کریں، جہاں تجربہ و مشاہدہ کی ضرورت ہو وہاں اس سے بھی باز نہ آئیں، اس کے بعد کسی صحیح نتیجہ تک پہنچیں۔

آوازیں اور نقوش

پہلی تنقیح ہر اعتبار سے اولین ہی ہے۔ کسی تحریر کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی آواز کو مقررہ نقوش کے ذریعہ محفوظ کرنا اور دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس لیے اگر آوازوں کی ادائی ممکن نہ ہو یا اتنی مشتبہ ادائی ہو کہ تحریر کا پڑھنے والا اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے تو اس خط اور رمزی خطوط میں بلکہ طفلانہ لکیروں اور اس تحریر میں کیا فرق رہ جائے گا اور ایسی تحریر کے لکھنے یا چھاپنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ہر زبان میں دو یا تین قسم کی آوازیں پائی جاتی ہیں۔

الف۔ حروف صحیحہ کی آوازیں۔

ب۔ حروف علت کی آوازیں۔

ج۔ دو حروف صحیفہ کی مرکب آوازیں، مثلاً:

۱۔ اُردو میں ب پ وغیرہ کی آوازیں، انگریزی میں B.P وغیرہ کی آوازیں۔

۲۔ اُردو میں آ۔اُو وغیرہ، انگریزی میں A.U وغیرہ۔

۳۔ اُردو میں بھ پھ وغیرہ، انگریزی میں K وغیرہ۔ ان آوازوں کو علی الترتیب اُردو میں آواز صحیح، آواز علت اور آواز مرکب کہتے ہیں، انگریزی میں کانسوننٹ ساؤنڈ، واول ساؤنڈ، اور مکسڈ ساؤنڈ کہا جاتا ہے۔ بنگلہ میں ان کا نام سُورش، بین اور جوراشٹر ہے۔

مندرجہ بالا تینوں اقسام کا ہر زبان میں پایا جانا اگرچہ ضروری نہیں لیکن دو آوازوں کا پایا جانا بہرحال ضروری ہے۔کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں حروف صحیحہ اور حروف علت کی آواز نہ پائی جائیں۔ البتہ مرکب آوازوں سے عموماً سامی زبانیں خالی ہیں، مثلاً عربی اور عبرانی زبان میں آپ بھ، پھ اور گھ، کھ کی آوازیں نہیں پاسکتے۔

ایک اندازے کے بموجب، جو برطانوی بائیبل سوسائٹی نے لگایا تھا، دُنیا میں چھوٹی بڑی تقریباً ۲۳۰۰ زبانین بولی اور تقریباً ۲۰۳ قسم کے حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ان کو تحریر کے رخ کے اعتبار سے تین رخوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ اوپر سے نیچے کی طرف لکھے جانے والے حروف جیسے چینی کانجی رسم الخط وغیرہ۔

۲۔ بائیں سے دائیں رخ کو لکھے جانے والے حروف جیسے رومن ناگری وغیرہ۔

۳۔ دائیں سے بائیں رخ کو لکھے جانے والے حروف جیسے عربی عبرانی وغیرہ۔

دنیا میں جتنے بھی خط رائج ہیں ان میں عموماً حروف صحیحہ کے لیے مستقل نقوش موجود ہیں بجز چند نہایت ہی ناکارہ اور مہمل خطوط کے جہاں آوازیں تو موجود ہیں مگر ان کے لیے کوئی نقش موجود نہیں۔ یہ عیب کسی حروف تہجی کا سب سے بڑا عیب ہے، مثلاً انگریزی زبان میں چ اور شین کی بکثرت آوازیں موجود ہیں لیکن انگریزی زبان کے خط یعنی رومن رسم الخط میں ان کے لیے کوئی نقش نہیں ہے، نہ ان کا کوئی قاعدہ وضابطہ ہے، محض اہل زبان کی آوازوں اور ان کی تحریروں پر بھروسہ کرنا اور انھیں یاد رکھنا پڑتا ہے۔ چ کی آواز کبھی TU سے کبھی CH سے اور کبھی TI سے ادا ہوتی ہے مثلاً "Watch, Mixture, Christian"۔ پھر مشکل بالائے مشکل یہ ہے کہ یہی مرکب دوسری جگہ بالکل دوسری آواز دیتا ہے، مثلاً Headache۔ یہی حال ش کی آواز کا

ہے کبھی GCH سے، کبھی SSI، کبھی TIQ سے ش کی آواز پیدا کی جاتی ہے۔ تقریباً یہی حال ہندی اور بنگالی حروف کا ہے۔ کولہو، اور ننھا، میں جو لام اور ھ کی مرکب آواز ہے اس کے لیے کوئی طریقہ موجود نہیں، حالانکہ یہ آوازیں بکثرت ان زبانوں میں موجود ہیں، بلکہ یہ دونوں لفظ بھی موجود ہیں لیکن ہندی یا بنگلہ حروف میں جب آپ ان دونوں الفاظ کو لکھنا چاہیں تو کول ہُوا اور نَن ہا لکھنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح بعض اور آوازوں کے لیے بھی نقوش کا فقدان ہے۔

ان کے سوا اور بھی دو ایک خط ایسے ہیں جن میں بعض حروف صحیحہ کی آوازوں کے لیے نقوش نہیں ملتے۔ ورنہ عام طور پر ایسی آوازوں کے لیے ہر خط میں الگ الگ نقوش بنا لیے گئے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ انسانی حنجرہ سے لب تک کا حصہ جہاں سے حروف صحیحہ کی آوازیں نکالی جاتی ہیں، جوفِ دہن کی امداد حاصل کیے بغیر کوئی آواز پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہر حرف صحیح اپنی آواز کے لیے اپنے ماقبل مابعد ایک حرفِ علت یعنی جوف دہن سے ادا ہونے والی آواز کا محتاج ہے۔ آپ جب رومن حرف B یا P کی آواز نکالتے ہیں تو ان کے بعد ایک حرف علت ابھی فرض کر لیتے ہیں یا جب M، N کی آواز ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو لازماً ایک حرفِ علت E کی آواز ان کے پہلے لگا لیتے ہیں۔

اس مجبوری کی وجہ سے دنیا کے ہر خطہ میں حروفِ علت کی جُوفِ دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کی ادائی کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ بن گیا ہے۔ اب تک جتنے خط انسانوں نے بنا کر تیار کیے ہیں، ان سب میں بلا استثنا یہ عیب موجود ہے کہ ان سے جوف دہن سے ادا ہونے والی ساری آوازیں ادا نہیں ہوتی ہیں اور رومن رسم الخط تو شاید اس اعتبار سے دنیا کا سب سے ناقص رسم الخط ہے۔ انگریزی زبان اور اس کے رومن رسم الخط سے تو ہم لوگ اب مانوس ہیں۔ ذرا مندرجہ ذیل الفاظ میں ایک ہی نقش U سے پیدا ہونے والی آوازوں پر غور کیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ اگر ماسٹر صاحب کی زبان سے سنی ہوئی آواز کو بھول جائیں تو اس نقش کی مدد سے ہم ان الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں یا نہیں۔

BUT; PUT; TRIBUTE; BURN;

UNITY; UNDER; MURAL; MUSCLE

یہ تو محض یاد دلانے کے لیے دو چار الفاظ لکھ دیے گئے ورنہ رومن رسم الخط میں انگریزی زبان کی بہت سی آوازیں نہیں ہوتی ہیں، اور انگریزی ہی پر منحصر نہیں ہے، کسی زبان کی ساری آوازوں کے ادا کرنے کے لیے اس خط میں سامان نہیں ہے۔

سماعیات

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ عیب صرف رومن خط ہی میں نہیں بلکہ کم وبیش دنیا کے ہر خط میں موجود ہے، اور یہ بالکلیہ ناممکن بات ہے کہ کوئی شخص زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود صرف حرف شناسی کے ذریعہ دنیا کی کسی زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ کر کے ایک سطر بھی عبارت پڑھ دے۔ سماعیات پر بھروسہ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ رومن حروف سے اگرچہ اچھی طرح واقف ہیں لیکن اگر آپ ہسپانی زبان نہیں جانتے تو ایک سطر عبارت بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ کاغذ پر بنی ہوئی آڑی سیدھی لکیریں جنھیں حروف تہجی کہا جاتا ہے وہ صرف اتنا کام کر سکتی ہیں کہ آپ کے کان میں پڑی ہوئی اور آپ کے ذہن و حافظہ میں محفوظ آوازوں کی طرف آپ کو متوجہ کر دیں اور آپ انھیں دہرا دیں، بھلا یہ کہاں ممکن ہے کہ آپ چین کے کسی دیہاتی کو رومن حروف اور ان کی آوازوں سے آشنا کر کے شیکسپیر کے ڈرامے دے دیں اور یہ امید رکھیں کہ وہ صحیح تلفظ کے ساتھ ایک سطر بھی پڑھ لے گا۔

مختلف تدابیر

جوفِ دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کے لیے دنیا کے مختلف خطوط میں مختلف تدبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ عام طور پر حسب ذیل تدابیر دیکھنے میں آتی ہیں۔

۱۔ حروف تہجی میں سے کچھ تھوڑے سے حروف ان آوازوں کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں جیسے انگریزی زبان میں A.E.I.O.U.W.Y کو اس کام کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے اور حروف صحیحہ کے نقوش سے پہلے یا پیچھے یہ حروف لکھ کر کام چلایا جاتا ہے۔

۲۔ حروف تہجی کے ساتھ کچھ مخصوص اشکال کے نقوش مقرر کر کے انھیں حروف تہجی کے آگے پیچھے، اوپر یا نیچے لگا دیتے ہیں جیسے بنگلہ، ناگری اور کانجی حروف میں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ناگری میں سترہ ماتراؤں کا حروف تہجی کے ساتھ مستقل اضافہ کر دیا گیا ہے۔

۳۔ حروف تہجی کی شکلوں میں کسی قدر تغیر و تبدل کر کے جوف دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ تلنگی، اوڑیا اور تھائی حروف میں نظر آتا ہے۔

۴۔ ان کے لیے صرف تین حروف تہجی بنا لیے گئے ہیں جو آواز کے تینوں رخ کو بتا دیتے ہیں، باقی نازک تفاوتوں کو محض سماعیات پر چھوڑ دیا گیا ہے، جیسے اُردو، فارسی، اویغور یا اور عبرانی حروف میں کیا گیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے آخرالذکر طریقہ سب سے جدید ترین اور بہترین طریقہ ہے۔ تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جوف دہن سے ادا ہونے والی ساری آوازیں نہ پہلی صورت اختیار کرنے سے ادا ہو سکیں اور نہ دوسری یا تیسری صورت اختیار کرنے سے، بلکہ ان صورتوں میں پڑھنے اور لکھنے کی دقتیں بھی بڑھ گئیں اور تشابہات کا مزید اضافہ ہو گیا۔ دوسری طرف قلم اور آنکھ دونوں کو زیادہ کام کرنا پڑا تو سب سے بہتر طریقہ یہی قرار پایا کہ جوف دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کے تین ابتدائی رخ کو حروف سے ظاہر کر کے باقی تفاوتوں کو سماعیات پر چھوڑ دیا جائے۔

اُردو زبان اور رومن حروف

آوازوں کی اس تقسیم اور ان کی ادائی کے ان اصولوں کو ذہن میں رکھ کر اُردو زبان کے لیے رومن حروف اختیار کیے جانے کے سوال پر غور کیجیے۔ سب سے پہلے اُردو زبان کے حروف صحیحہ کی آوازوں کو لیجیے۔

رومن رسم الخط ہمیں جملہ ۲۶ نقوش دیتا ہے، ان میں سے .V.C اور X ہمارے لیے بے کار ہیں، ان کی آوازیں یا مکرر ہیں یا مکرب باقی رہے ۲۳ نقوش۔ ان سے جب ہم اپنی زبان کی آوازیں ادا کرنے کی سعی کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ڑ، ژ، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، یعنی ۱۶ حروف کی آوازوں کے لیے رومن حروف میں کوئی نقش موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ ان میں سے، ث۔ ح۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ آٹھ حروف کو یہ کہہ کر غیر ضروری قرار دیں کہ ہم ان حروف سے عربی زبان کی طرح مخصوص آوازیں نہیں پیدا کرتے لیکن یاد رکھیے کہ ایسا کہنا ذہن کی نارسائی کی علامت ہے۔ ہم اپنی زبان سے ہزاروں الفاظ کو کسی طرح خارج نہیں کر سکتے اور مجبور ہیں کہ آم اور عام میں کوئی فرق قائم رکھیں، جال اور جعل کو ایک دوسرے سے ممتاز رہنے دیں، اور اَلم و عَلم میں کوئی نہ کوئی امتیاز قائم رکھیں۔

اس طرح صرف ۲۳ نقوش ہمیں رومن رسم الخط سے ملیں گے۔ ان میں سے پانچ حروف جوف دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کے لیے مخصوص ہیں، انھیں خارج کر کے صرف ۱۸ نقوش حروف صحیحہ کے لیے ہمیں ملتے ہیں۔ پھر ۱۶ نئے نقوش ہمیں بنانے پڑیں گے۔ اس طرح ۳۴ نقوش کا ایک مجموعہ ہماری زبان

کے حروف صحیحہ کی آوازوں کے لیے تیار ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ ان سولہ آوازوں کے لیے ان ہی ۱۸ حروف میں سے بعض پر نقطہ یا علامت بنا کر کام چلا لیں لیکن نقطہ یا علامت بنانے کے بعد بہر حال وہ اسی طرح نئے حروف ہوں گے جیسے اُردو کے حروف ر، ز، ہ ہیں یا ک، گ ہوتے ہیں۔ یہ یاد رکھنے کے لیے بھی نئے حروف ہوں گے، تعلیم کے لیے بھی اور طباعت کے لیے بھی۔ یہ نہ خیال کیجیے کہ اس طرح تعداد حروف میں کوئی کمی ہو جائے گی۔

اب دوسرا مرحلہ جوف دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کا ہے۔ رومن حروف ہمیں اس کے لیے پانچ نقوش دیتے ہیں A.E.I.O.U اب دیکھیے کہ آپ کی زبان میں حروف علت کی جتنی آوازیں ہیں کیا ان سے ادا ہوسکتی ہیں۔ ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ انگریزی زبان کی تمام آوازہائے علت ان پانچ نقوش سے ادا نہیں ہوتیں ہیں۔ آپ نے تلفظ بتانے والی ڈکشنریوں میں دیکھا ہوگا کہ اس مقصد کے لیے ان میں سے ہر نقش پر متعدد قسم کے نشانات بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً Has میں A کی آواز، Small میں A کی آواز سے مختلف ہے۔ اسی طرح 'O' کی آواز ایک ہی لفظ POSITION میں دو جگہ ایک دوسرے سے بالکلیہ مختلف ہے۔ یہی حال سارے واولز (حروف علت کا ہے، جب رومن حروف میں انگریزی زبان کی سترہ یا انیس آواز ہائے علت کے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اُردو اور بنگالی زبان کی کم از کم ۳۶ آواز ہائے علت کو ان پانچ حروف سے آپ کس طرح ادا کریں گے؟

ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ ان کے لیے بھی مزید ۳۱ جدید نقوش بنا کر حروف تہجی کی تکمیل کر لی جائے گی لیکن اس طرح اُردو زبان کے لیے رومن حروف تہجی کی تعداد ۳۴ + ۳۶ = ۷۰ ہوگی۔

تیسرا مرحلہ مرکب آوازوں کی ادائی کا آتا ہے۔ اُردو میں ہم نے یہ قاعدہ بنا رکھا ہے کہ مرکب آواز کے لیے حروف ہ کی دوہری شکل (ھ) حرف صحیح کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں اس سے ایک نقش کا اضافہ تو ہوگیا ہے لیکن یہ بات طے ہوگئی کہ حرف صحیح کی اور ہ کی آوازیں الگ الگ نہیں رہیں۔ مگر یہی ترکیب ہم رومن حروف میں نہیں کر سکتے، کیوں کہ رومن حروف کے ٹکڑے نہیں ہوتے اور یہ سب علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے حروف H کو حرف صحیح کے ساتھ لکھ کر کام نہیں چلا سکتے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ H کس جگہ اپنی الگ آواز نہیں دے گا، مثال کے لیے حسب ذیل الفاظ کو دیکھیے:

راگ ہو	RAGHO	منہا دیگ	MANHA DEG
راگھو	RAGHO	ننھا دیگ	NANHA DEG

آپ ذرا سا غور کریں تو ایسی سینکڑوں مثالیں آپ کو مل جائیں گی۔ کہنے والے شاید یہ کہہ دیں کہ ہم H کے بعد فاصلہ دیں گے یا کوئی نشان لگا دیں گے لیکن ذرا سوچیے تو اُردو اور بنگلہ زبانوں میں مرکب آوازیں کس کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اگر دو لفظوں کے مابین فاصلہ رکھا جائے گا اور ایک ہی لفظ کے درمیان میں بھی فاصلہ ہوگا، تو لکھنے، پڑھنے اور طباع میں اس کی پابندی کیا مشکلات پیدا کرے گی اور تعلیمی ضروریات کے لیے یہ خط کس قدر مشکل خط ہوگا۔ اگر آپ نے ہندی۔ بنگلہ اور گجراتی کی طرح مرکب آوازوں کے لیے مخصوص نقوش بنا لیے تو آپ کو مزید تیرہ نقوش بنانے پڑیں گے۔

بھ۔ پھ۔ تھ۔ ٹھ۔ جھ چھ۔ دھ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ کھ۔ گھ۔ لھ۔ نھ

اور اُردو کے لیے رومن حروف تہجی کا مجموعہ حسب ذیل ہوگا:

حروف صحیحہ	=	۴۴	
حروف علت	=	۲۶	۸۳
حروف مرکبہ	=	۱۳	

ان جملہ ۸۳ حروف کی دو دو شکلیں ہوں گی، ایک چھوٹے حروف SMALL LETTERS اور دوسرے بڑے حروف CAPTAL LETTERS۔ اس طرح جملہ نقوش = ۲×۸۳ = ۱۶۶ ہوئے۔

چونکہ قلم سے لکھنے میں اس طرح الگ الگ گول حروف بنانا دقت طلب بلکہ عملاً ناممکن ہے، اس لیے ہر اس زبان میں جو رومن حروف میں لکھی جاتی ہے۔، ان کے لکھنے کی صورت اور ہوتی ہے اور طباعت کی اور، لہٰذا یہ ۱۶۶ حروف دوہرے ہو کر ۳۳۲ بن جاتے ہیں اور اُردو زبان کے لیے ہر پڑھے لکھے آدمی کو یہ ۳۳۲ نقوش ہمہ دم یاد رکھنے پڑیں گے۔

اس مختصری تشریح کے بعد جس میں خود آپ کی طرف سے بہت سے قیمتی اضافے کی ضرورت ہے۔ خود غور کر لیجیے کہ اُردو زبان کے لیے رومن حروف کا رواج دینا خالص صوتی نقطۂ نظر سے کس حد تک مفید قرار دیا جا سکتا ہے۔

تعلیم

دوسری تنقیح یہ ہے کہ کیا تعلیم بالغاں و نابالغاں میں رومن خط کے اختیار کر لینے سے ہمیں کوئی آسانی میسر آ سکتی ہے؟ تعلیم چاہے بچوں کی ہو یا تعلیم بالغاں، اس کی دو مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ مادری زبان کی تعلیم، یعنی ان لوگوں کو لکھنا، پڑھنا سکھانا جو اس زبان، اس کی آوازوں اور اس کے الفاظ سے واقف ہیں۔

۲۔ اجنبی زبان کی تعلیم، یعنی لوگوں کو کسی ایسی زبان کا لکھنا پڑھنا سکھانا جو اس زبان کے الفاظ، اس کی آوازوں، اس کی ترکیبوں اور اس کی ساخت سے ناواقف ہوں۔ یہ دوسری صورت ہماری تنقیح سے باہر ہے، اس پر یہاں بحث مقصود نہیں۔ رہی پہلی صورت یعنی اُردو زبان جاننے والے بچوں یا بڑوں کی تعلیم کے مسئلہ پر غور کیجیے کہ رومن حروف میں آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے یا موجودہ اُردو حروف میں سب سے پہلا سوال حروف کے پہچاننے کا آتا ہے تاکہ پڑھنے والا آسانی کے ساتھ اسے ذہن نشین کر لے اور آسانی کے ساتھ اپنے قلم سے اس کی نقل بنا سکے۔ اُردو حروف کی شکلیں نہایت صحیح ہندسی خطوط پر بنی ہوئی ہیں اور یہ آسانی کے ساتھ گروپوں میں تقسیم ہو کر سیکھنے والے کے ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ پڑھنے اور لکھنے کے حروف ایک دوسرے سے مختلف شکلیں نہیں رکھتے، اس کے برخلاف رومن حروف کی شکلیں اُلجھی ہوئی اور ایسی ہین کہ انھیں گروپوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں کوئی حروف تہجی اپنی شکلوں کے اعتبار سے اُردو حروف سے زیادہ آسان اور سائنٹیفک نہیں ہیں۔

کسی سطح مستوی کے چاہے وہ کاغذ ہو یا تختی، تختہ سیاہ ہو یا سلیٹ، صرف تین ہی رخ ہو سکتے ہیں، (ا-/) اور جب اس سطح پر آپ کسی بچہ کو لکیر بنانے کو کہیں گے تو وہ صرف چار قسم کی لکیریں بنا سکتا ہے (ا-/c) اُردو کے سارے حروف ان ہی چار لکیروں اور ایک نقطہ سے بنتے ہیں اور ان کی شکلیں ایسی واقع ہوئی ہیں کہ نہایت آسانی کے ساتھ چار گروپوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ذرا ان شکلوں کو دیکھیے۔

اط ظ-ل-م- ب پ ت ٹ ث ف ک گ-ے

ج چ ح خ ع غ س ش ص ض ق ن د ھ دذ ر ڑ ز ژ ڈ

شکلوں کے اعتبار سے یہ سارے حروف کس قدر عمدگی کے ساتھ چار گروپوں میں تقسیم ہو گئے اور پھر یہ آسانی بھی ہے کہ یہ حروف لکھنے اور چھپنے میں اپنی شکلیں نہیں بدلتے۔ یہ جہاں ٹکڑے ہو کر ملتے ہیں وہاں بھی اپنی شکل کا امتیازی نشان قائم رکھتے ہیں۔ اس لیے اشتباہ کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ اُردو کے حروف میں سے ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ ط ظ و، گیارہ حروف تو وہ ہیں جن کی منفرد اور مرکب شکلیں یکساں رہتی ہیں۔ ان

میں ط ظ کے علاوہ باقی نو حروف کبھی کسی سے نہیں ملتے۔ دوسرے حروف ان سے ملتے ہیں لیکن بہر حال یہ اپنی مکمل شکل ہمیشہ قائم رکھتے ہیں۔ باقی حروف جو ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان میں سے بھی صرف گول دائرہ الگ ہوتا ہے۔ باقی سب شکلیں محفوظ رہتی ہیں۔ اُردو حروف میں ایک آسانی یہ بھی ہے کہ ان میں بڑے اور چھوٹے حرف نہیں ہوا کرتے۔

اس کے بعد رومن حروف مین سے صرف ایک حرف G کی چار صورتوں پر غور کر لیجیے اور دیکھیے کہ ان میں کتنا باہمی تفاوت موجود ہے۔ کیا ایک ان پڑھ کو یہ بتانا کچھ آسان کام ہے کہ یہ چاروں قسم کے نقوش ایک ہی آواز کے لیے ہیں۔

g, g, **G**, G

دوسری بات، اس پر بھی غور فرمائیے کہ ایک ان پڑھ آدمی کو جو اُردو بولتا ہو یا کم از کم اُردو زبان کی آوازوں سے مانوس ہو، اسے اُردو حروف تہجی کے ۳۵ نقوش یاد کرانا آسان ہے یا رومن حروف کے ۳۳۲ نقوش۔

ہاں! اور یہ بھی یاد رکھیے کہ پاکستانی مسلمان اپنے بچوں کو قرآن مجید کا اصلی الفاظ میں پڑھانا نہیں چھوڑیں گے اس لیے ہر بچہ کو عربی رسم الخط کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ آج کل وہ ایک ہی رسم الخط سیکھتا ہے اور دونوں کام چلتے ہیں۔ رومن خط کے بعد اسے دو رسم الخط سیکھنے پڑیں گے۔ تعلیم کا کام ہلکا نہیں بلکہ اور بوجھل ہو جائے گا۔

کچھ لوگ جب یورپین ممالک کا معیار خواندگی دیکھتے ہیں اور پاکستان میں عام جہالت پاتے ہیں تو نہایت شریفانہ اور مخلصانہ جذبات کی رو میں کبھی تبدیلی خط کو ضروری قرار دیتے ہیں اور کبھی زبان کی ساخت بدلنے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر خط رومن اختیار کر لیا جائے تو ہمارے یہاں لوگ اسی طرح تعلیم یافتہ ہو جائیں گے جیسے سویڈن اور ڈنمارک میں ہیں۔ یہ لوگ سوچنے سمجھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ جن ممالک کا معیار خواندگی بہت بلند ہے وہاں کے عوام اور وہاں کی حکومت نے کتنی منظم، کتنی مسلسل اور کتنی طویل مدت سے خواندگی کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ کیا آپ کی حکومت نے اتنی ہی کوششیں کر کے دیکھ لیا ہے کہ اُردو رسم الخط کامیابی میں حائل ثابت ہوا ہے؟

اگر رومن رسم الخط تعلیمی آسانی کی بنیاد ہوتا تو ڈنمارک اور رومانیہ اور سویڈن اور یونان کے معیار میں اتنا تفاوت نہ ہوتا جتنا کہ آج تک نظر آتا ہے۔ اگر رومن خط ڈنمارک میں رائج ہے تو یونان میں بھی تو یہی

رسم الخط ہے، رومن رسم الخط تو درحقیقت اطالیہ ہی کا رسم الخط ہے جہاں سے دوسرے ممالک میں پھیلا ہے۔ پھر اطالیہ کا معیار خواندگی اتنا بلند کیوں نہیں جتنا کہ ڈنمارک اور سویڈن کا ہے۔

آپ کو غالباً معلوم ہی ہوگا کہ تمام ایشیائی اور افریقی ممالک میں سب سے اونچا معیار خواندگی برما کا ہے حالانکہ برمی رسم الخط کسی اعتبار سے سائنٹیفک رسم الخط نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے لیے وہاں کے پھونگیوں نے مہم چلائی تھی اور اب تک وہ اس سے غافل نہیں ہیں۔ پاکستان میں جب کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نے اس کے لیے حقیقی طور پر کوئی قابل ذکر کوشش کی ہی نہیں، تو یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے کہ ہم اپنی غفلتوں کا بوجھ اُردو رسم الخط پر ڈال دیں۔ اس رسم الخط پر جو اگرچہ اتنا مکمل تو نہیں جتنا کہ اسے ہونا چاہیے مگر پھر بھی، اس وقت دنیا کے تمام مشہور خطوں میں ہر اعتبار سے بہتر اور نسبتاً سب سے مکمل اور سائنٹیفک خط ہے۔

عام ضروریات

تیسری تنقیح یہ ہے کہ ''کیا روزمرہ کی تحریری ضروریات میں رومن حروف کی وجہ سے آسانیاں مل جاتی ہیں؟

ہم نہیں سمجھتے کہ اس سلسلہ میں کسی ایسے شخص کو جو دونوں خطوط سے واقف ہو، کوئی غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ اُردو رسم الخط لکھنے میں رومن خط سے تقریباً نصف جگہ صرف ہوتی ہے، قلم کو بقدر ایک تہائی کم حرکت کرنی پڑتی ہے، بقدر نصف وقت صرف ہوتا ہے، زیادہ تیزی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے اور اُردو رسم الخط میں دکھائی دینے کی صلاحیت رومن خط سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ۲۵ فٹ کے فاصلہ پر ۲۴ پوائنٹ کے رومن اور اُردو حروف رکھ کر دیکھ لیجیے۔ حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ اُردو رسم الخط میں حروف ٹکڑے ہو کر ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں اس لیے مختصر نویسی کی طرح اس خط میں نہایت تیزی کے ساتھ تحریری کام ہوسکتا ہے، رومن خط اس اعتبار سے اُردو رسم الخط کا مدمقابل نہیں ہوسکتا۔

ٹائپ مشین

روزانہ کی عام ضروریات کے سلسلہ میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو رومن خط کو اُردو خط پر تفوق کا سبب بتائی جاتی ہے اور وہ ہے، ٹائپ رائٹر مشین۔ ہمارے پاس اُردو کے لیے اچھے ٹائپ رائٹر نہیں ہیں، مختلف یورپین کمپنیوں نے جو ٹائپ رائٹر بنا کر بھیجے ہیں، وہ کچھ بہت اچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد میں دفتری کاموں کے لیے اُردو کے ٹائپ رائٹر مستعمل تھے، اور تشفی بخش طریقہ پر ان سے کام چل جاتا تھا لیکن پھر

بھی وہ اتنے اچھے نہ تھے جتنے ہمیں جرمنی ساخت کے عربی ٹائپ رائٹر مصر و شام کے تجارتی و سرکاری دفاتر میں استعمال ہوتے نظر آتے ہیں، لیکن اس میں ہماری اپنی کاہلی کو جتنا دخل ہے، شاید کسی دوسری چیز کو نہیں، ٹائپ رائٹر مشین بنانا کوئی ایسا کام تو نہیں ہے جو ہم کر ہی نہیں سکتے۔ ذرا سوچیے تو ہم آزاد و خود مختار ہیں، کبھی ہم نے اُردو یا انگریزی ہی کے ٹائپ رائٹر بنانے کی کوئی ناکام کوشش بھی کی ہے؟ غیروں نے جو بنا کر دے دیا، ہم نے اسی کو فکرِ انسانی کا نقطۂ ارتقا سمجھ لیا اور یہ یقین کر لیا کہ اس سے بہتر کوشش محال ہے۔ کبھی ہم نے غور ہی نہیں کیا کہ بیرونی کارخانے جو اُردو کے ٹائپ رائٹر ہمیں دیتے ہیں وہ یکساں ترتیب حروف کیوں نہیں رکھتے، ریمنگٹن کی ترتیب اور ہے، انڈرووڈ کی اور، پھر ان میں بعض دوسرے نقائص کیوں رہ جاتے ہیں، کیا ہم اس کی اصلاح نہیں کر سکتے ہیں۔

نستعلیق حروف اور نسخ حروف کے مابین تفاوت اس سے زیادہ تو نہیں ہے جتنا رومن حروف کی ٹائپ رائٹر والی شکل اور اس تحریری حروف کی شکل کے مابین ہے جو عموماً ناموں اور ملاقاتی کارڈوں پر چھاپے جاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں تصویر سازی عام طور پر ممنوع و مخدور عمل ہے، اس لیے ساری قوم کا ذوق جمال تحسینِ خط کی طرف متوجہ ہو گیا، اس لیے عربی حروف کی درجنوں حسین سے حسین تر شکلیں پیدا ہو گئیں۔

نسخ، ثلث، رقاع، موشح، تعلیق، توقیع، دیوانی، کوفی، نستعلیق، شفیعا، ریحانی، غبار، ماہی، گلزار، افشانی، وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ اتنی زیادہ تو نہیں لیکن رومن حروف کی بھی بہت سی شکلیں، اور زیب و زینت کے ساتھ ان کی متعدد صورتیں بنائی گئی تھیں اور بہت سی شکلیں تو اب بھی رائج ہیں جو ہمیں سائن بورڈوں اور سرناموں پر نظر آتی ہیں۔ کیا ان میں سے ہر شکل کے حروف کا ٹائپ رائٹر بن گیا ہے، یا بن سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو کام ایک اچھے فن کار کے ذوق جمال کی پیداوار ہو وہ مشین کی حرکت سے انجام نہیں پا سکتا، زردوزی کے نازک کام ہوں یا قالین بافی کے خوشنما بیل بوٹے انھیں مشینوں کی مدد سے بنانے کی سعی کیوں کیجیے؟ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں رومن حروف کی جو حسین پھول دار اور منحنی شکلیں مقبول عام تھیں اور ہمیں اس وقت کی قلمی کتابوں میں دکھائی دیتی تھیں، ان شکلوں کا نہ ٹائپ بنایا جا سکا اور نہ ٹائپ رائٹر، بلکہ ٹائپ رائٹر کے حروف کے لیے ایک سادہ سی مضبوط صورت پیدا کی گئی، باریک اور نوک دار حصے نکال دیے گئے تاکہ وہ جلدی ٹوٹ نہ جائیں۔ ایسی شکل اُردو حروف کی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی پاکستانی کارخانہ دار ٹائپ رائٹر بنانے کے تیار

ہوتو ایسی شکلیں بنادی جائیں گی۔

مختصر نویسی

مختصر نویسی کا تعلق آواز کی ترسیم سے ہے اور اب بھی اُردو آوازوں کی ترسیم یعنی مختصر نویسی نہایت کامیابی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مشق و مہارت پیدا کر کے اسے اور زیادہ ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری عملی ضرورتوں کے لیے بالکل کافی ہے، کسی طرح دوسری زبانوں سے کمتر نہیں ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ جس طرح اچھی انگریزی جاننے والا مختصر نویس بہتر اور صحیح کام کرتا ہے، بالکل اسی طرح اچھی اُردو جاننے والا مختصر نویس اُردو املا نویسی اور تقریر نویسی کا کام زیادہ صحت اور تیزی کے ساتھ کر سکتا ہے، اس کا تعلق زبان پر قدرت اور مہارت سے ہے۔ ورنہ فنی نقطۂ نظر سے اُردو مختصر نویسی اتنی ہی اچھی ہے جتنی کسی دوسری زبان کی ہو سکتی ہے، بلکہ انگریزی سے بدرجہا بہتر ہے۔

اُردو مختصر نویسی میں مہارت پیدا کرنے کی ہم نے کب کوشش کی ہے اور جنھوں نے کوشش کی ہے، ان کے مقابلہ میں انگریزی مختصر نویسوں کو رکھ کر دیکھ لیجیے۔

مسئلہ طباعت

چوتھی تنقیح یہ ہے کہ کیا طباعت کا کام رومن حروف میں زیادہ آسانی کے ساتھ اور نسبتاً زیادہ ارزاں ہو سکے گا؟ یہ صرف طباعت ہی کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے بعض لوگ رومن حروف کی تعریف کرتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ یورپ و امریکہ کی مطبوعات بڑی تعداد میں اور متعدد رنگوں میں تصاویر سے مزین ہو کر تیزی کے ساتھ چھپ جاتی ہیں۔ اس کے برخلاف اُردو کی طباعت مشکل نظر آتی ہے۔ مطبوعات کی تعداد اتنی نہیں ہوتی، صفائی اتنی نہیں ہوتی، تصاویر اتنی اچھی نہیں چھپتی ہیں تو گھبرا کر ان ساری ناکامیوں اور نادانیوں کا بوجھ اُردو رسم الخط کے سر ڈال دیتے ہیں، اور یہ پکار اٹھتے ہیں کہ رومن رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ ایسے لوگ بے چارے طباعت کے کاموں سے واقف نہیں ہوتے، نہ اس کے مختلف منازل و مراحل سے باخبر ہوتے ہیں، اس لیے ناکامی و نامرادی کے اصلی سبب سے بے خبر ہوتے ہیں اور گھبرا جاتے ہیں۔ حالانکہ اُردو مطبوعات کے پھیلاؤ کی کمی، طباعت کی دقتیں اور مطبوعات کے نقص کا اُردو رسم الخط سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے اسباب بالکل دوسرے ہیں۔

اُردو مطبوعات کی خرابی اور قلت اشاعت کی وجہ کچھ تو فرسودہ طریقہ طباعت ہے، کچھ کاریگروں کی فنی تربیت کا فقدان ہے، کچھ کاروباری سرمایہ کی کمی اور سب سے زیادہ غربت اس کا سبب ہے۔ جو آبادی اپنے

لیے آٹا خریدنے کی پوری طرح قوت خرید نہ رکھتی ہو، اس سے آپ کتاب اور رسالے خریدنے کی امید کس حد تک کر سکتے ہیں؟ اور اُردو بولنے والوں میں سے جو لوگ اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ کتابیں اور رسالے خرید سکیں وہ یورپ و امریکہ کی نہایت تیسرے درجہ کی مطبوعات خریدتے ہیں، اُردو مطبوعات کی خریداری میں اپنی کسر شان محسوس کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ توسیع اشاعت کا تصور کس طرح پیدا کریں گے، اور ایک گھنٹہ میں چالیس ہزار داب اور ساٹھ ہزار داب چھاپنے والی خود کار مشینوں پر اُردو مطبوعات کی پلیٹیں کون بد نصیب چڑھائے گا۔ پھر اتنی تعداد میں چھاپ کر وہ کیا حاصل کرے گا۔ آپ اُردو کو رومن میں چھاپیں یا عربی حروف میں، اس کا اثر مطبوعات کی وسعت اشاعت پر کچھ بھی نہ پڑے گا۔

ان وجوہ و اسباب پر آپ خود اچھی طرح غور کریں اور تعلیم کے جدید نظام کے ذریعہ ذہنیت کی اصلاح وغیرہ کو خود سوچ لیں بہت سی افسوسناک تفصیلات اور اسی کے ساتھ بہت سی مفید تجاویز آپ کے سامنے آجائیں گی۔ ہمیں تو اس جگہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ اُردو زبان کے لیے اگر رومن حروف اختیار کر لیے جائیں تو طباعت کا کیا حال ہوگا۔

طباعت کے طریقے

طباعت کے لیے اس زمانہ میں کئی طریقے رائج ہیں، ان میں سے طباعت حجری (لیتھوگرافی) اور طباعت رصاصی (لیٹر پرنٹنگ) بہت مشہور قسمیں ہیں اور اکثر کام ان ہی دو طریقوں پر انجام پاتے ہیں۔ چونکہ ابتداً لیتھوگرافی کے لیے پتھر استعمال کیے گئے تھے بلکہ اب تک نفیس رنگین کاموں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اس لیے اسے طباعت حجری یعنی پتھر کی طباعت کا نام دیا گیا، اسی طرح اٹلی میں پہلے ٹائپ خالص رانگ کے ڈھالے گئے تھے اس لیے اس طریقہ طباعت کا نام طباعت رصاصی پڑ گیا۔

بعض لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ طباعت حجری کا طریقہ چونکہ قدیم اور فرسودہ ہے، اس لیے ناکارہ اور بالکلیہ قابل ترک ہے۔ اوّل تو تاریخی طور پر یہ بات غلط ہے۔ طباعت کا طریقہ سب سے پہلی بار چینیوں نے شروع کیا تھا۔ شاہی فرامین اور ایسی ہی ضروری چیزیں مختصر عبارت میں چھاپی جاتی تھیں، اس وقت پہلے پہلے لکڑی کے اور اس کے بعد تانبے اور کانسی کے حروف اور ٹھپے ڈھالے گئے تھے۔ البتہ یورپ میں بمقام روما جب حروف ڈھالے گئے تو رانگ کے ڈھالے گئے۔ چینی اس سے کئی سو سال پہلے سے لکڑی اور کانسی کے حروف سے بہت ہی محدود پیمانے پر طباعت کا کام کر رہے تھے۔

دوسرا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ یہ طریقہ فرسودہ اور ناکارہ ہے، فائن آرٹ کی اچھی نقلیں حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مختلف ممالک خصوصاً مغربی جرمنی میں رنگین لیبل اور نفیس برش کاری کی طباعت کے لیے یہی طریقہ پسندیدہ طریقہ کار سمجھا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اس میں کام کرنے والے کاریگر اپنے اپنے کاموں میں پوری طرح ماہر ہوں تو یہ طریقہ اور تمام طریقوں سے کم خرچ بھی ہے اور مطبوعات بھی بہتر ہوتی ہیں۔

خودکار مشینوں پر طباعت کا طریقہ یہ ہے کہ کمپوزنگ کے بعد چیس بنا کر اس سے اسبسٹوس شیٹ پر نیگٹیو بنا لیا جاتا ہے اور اس کے بعد پوری پلیٹ اس نیگٹیو سے ڈھال کر کٹنگ مشین پر چڑھا دیتے ہیں، جب پلیٹیں کٹ پٹ کر برابر تقطیع کی بن جاتی ہیں تو انھیں خودکار مشین کے رولوں پر چڑھا دیا جاتا ہے اور ایک گھنٹہ میں چالیس ہزار اور ساٹھ ہزار کی رفتار سے مطبوعات چھپ کر تیار ہو جاتی ہیں۔

یہی خودکار مشینیں لیتھو کی چھپائی کے لیے بھی اگر بڑی تعداد میں چھاپنا مقصود ہو تو کارآمد ہوتی ہیں، لیتھو کی کاپی سے پہلی زنک پلیٹ اور پھر اس سے چربہ لے کر متعدد پلیٹیں بنالی جاتی ہیں، اور وہ پلیٹیں خودکار مشینوں پر چڑھا کر اسی رفتار سے چھپائی کرلی جاتی ہے۔ ویسے بھی ٹرانسفر پریس کے کام میں اگر جلد بازی سے غلطی نہ رہ جائے تو ایک ہی پلیٹ بارہ پندرہ ہزار اب تک بہت اچھے نتائج دے دیتی ہے۔

یہ تو طریقہ طباعت کا ذکر تھا۔ اُردو کی طباعت اگر نسخ کے حروف اور ٹائپ میں ہو تو یہ ساری بحثیں خدود بخود خارج از بحث ہو جاتی ہیں۔ زیرِ غور مسئلہ اُردو حروف اور رومن حروف کی طباعت کا ہے، لیتھوگرافی اور لیٹر پرنٹنگ کا نہیں۔ جہاں تک کمپوزنگ کا تعلق ہے، دونوں قسم کے حروف ہاتھوں سے بھی کمپوز کیے جاتے ہیں اور مشین سے بھی، مونو ٹائپ سے بھی، لائنو مشین سے بھی اور انٹر ٹائپ مشین سے بھی۔ عربی کے تمام مشہور جرائد مشینوں ہی کے ذریعے کمپوز کیے جاتے ہیں اور خودکار پریسوں ہی پر چھپتے ہیں۔ اس لیے یہ تو کہا ہی نہیں جاسکتا کہ اُردو کا موجودہ رسم الخط قائم رکھتے ہوئے ہم جدید ترین ایجادات سے استفادہ نہیں کرسکتے، اس طرح یہ کہنا بھی نادانی ہے کہ رنگین طباعت یا عبارتوں کے ساتھ تصاویر کی طباعت اچھی نہیں ہوسکتی ہے۔ جو کچھ رومن حروف کے ساتھ ممکن ہے، وہ سب کچھ اُردو کے ٹائپ حروف کی طباعت کے ساتھ بھی ممکن ہے۔

اس جگہ شاید یہ خیال ہو کہ اُردو میں جس طرح کتابیں نستعلیق حروف میں بذریعہ طباعت حجری، اور ٹائپ کے نسخ حروف میں بذریعہ طباعت رصاصی دونوں طریقہ پر چھاپی جاتی ہیں، اسی طرح عام روزنامے اور رسائل کیوں نہیں چھاپے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے،

جہالت عام ہے، تعلیم کا معیار کم ہے۔ اُردو داں عوام غریب ہیں، خوش حال اور تعلیم یافتہ حضرات اپنی شکست خوردہ ذہنیت کی وجہ سے یورپ وامریکہ کے مصور رسالے خرید کر ہاتھوں میں فخریہ لیے پھرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے اکثر انھیں پڑھا نہیں کرتے، اور اُردو مطبوعات کا خریدنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں اور اجنبی ممالک کے استعماری ادارے سینکڑوں کی تعداد میں بصورت ابتدائی وثانوی مدارس ایسی ذہنیت کے پیدا کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں۔ سڑک کی تختیوں سے لے کر تجارتی وسرکاری دفاتر تک اور پان فروش کے سائن بورڈ سے لے کر غیر ممالک کی تجارتی کوٹھیوں تک ہر جگہ انگریزی زبان اور رومن حروف ہی کا دور دورہ ہے، اس لیے اُردو رسائل اور اُردو اخبارات کو بڑی تعداد میں چھاپنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور نہ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہوتا ہے کہ قیمتی خود کار مشینیں مہیا کر سکیں۔ چنانچہ وہ سب سے آسان اور سب سے سستا طریقہ طباعت یعنی لیتھو ہی میں چھاپے جاتے ہیں۔ جب زیادہ تعداد مطبوعات کی ضرورت ہی نہ ہو تو گول دائرے اور نازک جوڑوں والے حسین نستعلیق حروف کیوں چھوڑے جائیں اور جب ہمارے خریدار صرف غریب و مفلس ہی لوگ ہوں تو لیتھو کا سستا اور آسان طریقہ ہی کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ اس سے کوئی نادان بھی انکار نہیں کر سکتا کہ لیتھو سے زیادہ سستا طریقہ طباعت اور کوئی نہیں ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے طباعت کے کام میں آسانی پیدا ہو جائے گی وہ غلط اندیش اور انتہائی ناواقف لوگ ہیں۔ ان کو طباعت کے کاموں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ ذرا دو صفحوں ہی کی ایک اُردو عبارت کو دونوں حروف میں چھپوا کر دیکھ لیجیے بلکہ ہماری درخواست ہے کہ اس کی طباعت کے دوران میں آپ خود پریس میں موجود رہیں اور پوری احتیاط کے ساتھ وقت، محنت اور کام کی صورت حال پر غور کریں، پھر حساب کر کے دیکھ لیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ:

کمپوزنگ میں ۷۵ فی صد زیادہ کام کرنا پڑے گا اور ۷۵ فی صد زائد وزن کے ٹائپ استعمال میں آئیں گے، کاغذ کی مقدار پچاسی فی صد زائد صرف ہوگی۔ روشنائی ۸۵ فی صد زائد خرچ ہوگی۔ ایک ہی معیار اور ضخامت خط کی دونوں طباعت کے لیے رومن حروف کے لیے کاغذ کی قسم بہتر لینی پڑے گی۔ طباعت کے بعد حروف کی ڈھلائی میں زیادہ وقت صرف ہوگا، اور پھر تقسیم میں ۷۵ فی صد زائد کام کرنا پڑے گا۔ اس طرح جب کام پوری طرح مکمل ہو چکے گا تو آپ دیکھیں گے کہ کتاب کا پڑتل یہ ہوگا:

اُردو حروف میں	۱۰۰ روپے
رومن حروف میں	۲۷۸ روپے

اور اگر عملی تجربہ کا آپ کو موقع نہ ملے تو ایک لفظ بشیر پر غور کر لیجیے۔ اُردو کمپوزیٹر کو اس کے لیے

۴	۳	۲	۱
ر	ی	ش	ب

چار مرتبہ انگلیاں چلانی پڑیں گی، اور رومن کمپوزیٹر کو BASHEER کے لیے سات مرتبہ۔ اگر حروف دس پوائنٹ کے، دونوں کے لیے استعمال کیے گئے تو اُردو میں جتنی جگہ صرف ہوگی، رومن حروف کے لیے اس سے تقریباً دوگنی جگہ کی ضرورت ہوگی۔ اُردو کے حروف چونکہ ٹکڑے ہو کر ملتے ہیں اس لیے مندرجہ بالا چاروں ٹکڑوں کے مابین کھلی ہوئی سفید جگہ کوئی نہیں رہے گی۔ اس کے برخلاف رومن حروف ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں اس لیے ٹائپ ڈھالتے ہوئے ان کے مابین فاصلہ کو قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ہر حرف کے ساتھ یہ فاصلہ پورے صفحہ پر پھیل کر تقریباً ۷۵ فی صد زائد جگہ لے لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی ہے اور نہ صرف کمپوزیٹر اور ڈسٹری بیوٹر کا کام ہی بڑھ جاتا ہے بلکہ کتاب سے متعلق ہر کام فرموں کی موزائی، جز بندی، جلد سازی کا خرچ سب ہی کچھ بڑھ جاتا ہے، اور وہ کتاب جو اُردو حروف میں سے ایک سو روپیہ کے خرچ سے تیار ہو سکتی ہے، رومن حروف میں ۲۷۸ میں تیار ہوگی۔

غالباً اس کے بعد اب یہ واضح کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ رومن رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد ہم طباعت میں کچھ آسانیاں مہیا کر لیں گے یا کچھ زیادہ مصائب کا اضافہ کر کے اُردو مطبوعات کی قیمتیں بڑھا دیں گے؟

اس سلسلے میں آپ انگلینڈ اور امریکہ کی مطبوعات پر نہ جائیے، اوّل تو ان کی زبان انگریزی ہوتی ہے، اُردو نہیں ہوتی، اس لیے ان کی ضخامت میں ویسا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ان کی بہت بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اس لیے ابتدائی اخراجات بڑی تعداد پر تقسیم ہو کر کتاب فی نسخہ نسبتاً ارزاں پڑ جاتی ہے۔ آپ اُردو کو نہ اس تعداد میں چھاپ سکتے ہیں اور نہ پھیلا سکتے ہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی زبان سے لغات کو خارج کر دیں، قواعد بدل دیں اور آوازوں کی تعداد کم کر دیں۔

قومی اتحاد

پانچویں تنقیح یہ ہے کہ کیا قومی اتحاد بین الاقوامی تفاہم میں رومن حروف ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟

اس مضمون کی ابتدائی سطور میں اس تنقیح پر کسی حد تک بحث کی جا چکی ہے۔ دنیا کی پانچ ہزار سالہ

پچھلی تاریخ پر گہری نظر ڈال کر دیکھیے، رسم الخط کا ایک ہونا، کب اور کس زمانہ میں، کہاں اور کس ملک میں آپ کو اتحاد خیال اور قومی یکجہتی کے لیے مؤثر عامل کی طرح دکھائی دیتا ہے؟ افراد انسانی کے مابین اتحاد کی ابتدائی بنیاد والدین کا اتحاد ہے جس سے خاندان اور قبائل وجود میں آتے ہیں، اس کے بعد ان خاندانوں کو مشترک خاندانی روایات اور سب سے زیادہ مشترک اعتقادات اور مشترک مقصد زندگی جوڑ کر ایک مربوط قوم بنا دیتے ہیں۔ اس طرح افراد انسانی میں باہمی تعاون اور ایثار کا وہ قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے جو قومیت کی روح ہے۔ زبان کا اشتراک اس میں کسی قدر امداد ضرور دیتا ہے لیکن حقیقی طور پر مؤثر کی حیثیت تو زبان کو بھی حاصل نہیں ہے چہ جائیکہ صرف رسم الخط کے اشتراک کو کوئی حیثیت حاصل ہو۔

جہاں تک پاکستان میں بسنے والوں کے اتحاد و اشتراک کا تعلق ہے، یہ کہنا کہ رومن رسم الخط کا اتحاد مشرق و مغرب کے مابین ربط و یکجہتی پیدا کرے گا، انتہائی سطحی اور غیر حقیقت پسندانہ دعویٰ ہے۔ اگر صدیوں سے، مشترک روایات، مشترک اعتقادات اور حروف القرآن سے مسلمانان مشرقی کا مانوس ہونا، خدانخواستہ قومی یکجہتی پیدا کرنے میں کامیاب ثابت نہ ہو سکے تو رومن رسم الخط بے چارہ کیا مؤثر ہو سکتا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دونوں جگہ کے حروف شناس لوگ قرآن مجید کو اس کے اصلی حروف ہی میں پڑھتے ہیں۔ کیا اس واقعیت کا انکار ممکن ہے کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دونوں حصہ ملک میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں دینی مدارس و مکاتب کام کر رہے ہیں جہاں اب ت ث کا یہی خط رائج ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ تمام روابط قومی اتحاد پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوں تو کیا رومن رسم الخط کا رواج ذرہ برابر بھی مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ ہوائی قلعے، واقعیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، ایک حقیقت پسند آدمی کی طرح غور کیجیے۔ کیا جرمنی اور فرانس کے مابین رومن رسم الخط ہمیشہ سے مشترک نہیں ہے، کیا ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں لیکن ان سب کے باوجود آپ نے دیکھا کہ ان کے مابین رسم الخط کا اتحاد قومی کیا انسانی یکجہتی کو بھی نسلیت کے جنون سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ عراق و شام کے مابین عربی رسم الخط کا اشتراک ابتدائے عہد اسلامی ہی سے قائم ہے لیکن عقیدہ کی گرفت جب دونوں کے مابین کمزور پڑی تو آپ نے دیکھا کہ سرحدوں کا اتصال، زبان کے اکثر حصہ کا اشتراک اور رسم الخط کا اتحاد ایک منٹ کے لیے کام نہ آ سکا۔ ۱۳۴۴ھ تک تو ایران اور ترکی کا عربی رسم الخط مشترک تھا، کیا اس سے پہلے کی پانچ سو سال کی تاریخ ہمیں اشتراک رسم الخط کی تاثیر کا کوئی ثبوت مہیا کرتی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان کے مابین اس پوری مدت میں خونی آویزش اور دردناک مظالم کے سوا اور کچھ

نہیں دکھائی دیتا۔

اس کے برخلاف رسم الخط بلکہ زبانوں کے اختلاف کے باوجود قومی ربط وضبط اور باہمی یکجہتی واتحاد کی مثالیں بھی آپ کو چین، ہندوستان، افریقہ اور یورپ کی تاریخوں میں بہت مل سکتی ہیں اور آج کے موجودہ دور میں بھی ایسی مثالیں ان ممالک میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ رسم الخط کا اشتراک حقیقتاً کوئی مؤثر اشتراکی کی حیثیت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟

مسلمانان بنگال کی ہمت

بنگلہ زبان انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ سب سے بڑے بنگلہ شاعر علال کی کلیات اور بنگلہ زبان کے ابتدائی کارنامے سب عربی رسم الخط میں ملتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے بنگالی مسلمانوں کو کچلنے اور پسپا کرنے کا کام شروع کیا تھا، ان کے مدارس کو جبراً بند کیا، ان کی جائیدادیں ضبط کر کے ہندو بنگالیوں کو جو انگریزوں کے ایجنٹ تھے عطا کی گئیں۔ غرض، اس طرح جب انیسویں صدی کے ابتدا میں مسلمانوں کا زور ٹوٹ چکا تو ہندو بنگالیوں کی یہ کوشش کامیاب ہوگئی کہ بنگلہ زبان کی شُدھی کر لی جائے۔ انھوں نے ناگری رسم الخط اختیار کرلیا، زبان کو سنسکرت الفاظ اور ہندو دیومالا کے قصوں سے بھر دیا۔ مسلمان اگرچہ بری طرح کچلے جا چکے تھے اور اب ان کے بس کی بات نہ تھی کہ بنگلہ زبان اور قرآن مجید کے حروف کے مابین ربط قائم رکھتے لیکن انھوں نے صورت حال کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگلہ زبان ان کے قبضہ سے نکل گئی۔ اگرچہ انھوں نے بہر قیمت اپنا ربط قرآن مجید سے قائم رکھا اور بہار و یوپی کے دینی مدارس میں بکثرت اپنے نوجوانوں کو تعلیم کے لیے ہمیشہ بھیجتے رہے۔

ان صوبوں سے اہل علم کو بلا کر اپنے یہاں رکھتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس طرح انگریزی حکومت میں کوئی اعزاز حاصل نہ کر سکے۔ ہندو ہر میدان میں ان سے آگے بڑھ گئے لیکن پھر بھی مسلمانان بنگال نے دینی تعلیم کو نہیں چھوڑا۔ یہ باتیں ہندوؤں کو، جو اب انگریزوں کی امداد سے بااختیار بھی تھے اور ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے بھی، ہمیشہ ناگوار گزریں۔ ۱۸۷۰ سے ۱۹۴۰ء تک کے انگریزی و بنگلہ اخبارات ان شکووں سے بھرے پڑے ہیں، (ملاحظہ ہوں ہندو پیٹریٹ کلکتہ کی جلدیں)۔ ۱۹۳۲ء کے بعد ان کا ردعمل ہوا اور وہ تحریک پیدا ہوئی جو قرآنی حروف کی تحریک کہلاتی ہے۔ اس نے بنگلہ کو عربی رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے پڑھانے کا کام شروع کیا۔

آج مشرقی پاکستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی جو تعداد پائی جاتی ہے ان میں سے شاید ایک فی صد ایسے حضرات ہوں جو اب ت ث والے رسم الخط سے واقف نہ ہوں، اب اگر پاکستان میں رومن رسم الخط رائج کیا گیا تو مزید ایک تیسرے رسم الخط کا بوجھ ان پر ڈالنے کے سوا اور کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ رہا یہ تصور کہ اس طرح اُردو اور بنگلہ زبانیں ایک سی ہو جائیں گی تو یہ اتنا غیر منطقی استدلال ہے کہ کسی ذی ہوش کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ اگر یورپ کی زبانیں ہزار ہا الفاظ کے اشتراک اور رسم الخط کی یکسانی کے باوجود ایک نہ ہو سکیں، فارسی اور عربی ایک ہی رسم الخط میں لکھے جانے کے باوجود اور ان کے باوجود کہ فارسی زبان میں خود اپنے لفظی سرمایہ سے کہیں زیادہ عربی الفاظ پائے جاتے ہیں، مل کر ایک زبان نہیں ہو گئیں تو یہ کیسے نتیجہ نکال لیا جائے کہ بنگلہ اور اُردو رومن رسم الخط اختیار کرنے کے بعد ایک زبان ہو جائیں گی۔

ابھی چند دن ہوئے کہ بنگلہ زبان کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا خیال دو چار ناپختہ دماغوں نے اٹھایا ہے۔ مشرقی پاکستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان سے رائے لے کر دیکھ لیجیے اگر ۱۵۔۲۰ فی صد آرا بھی رومن رسم الخط کے حق میں آ جائیں تو ہمارے ان ناعاقبت اندیش دانشمندوں کی تعریف کیجیے۔ ورنہ پھر ان عقلمندوں کی عقل کا ماتم، بنگلہ رسم الخط اگرچہ ہندو تسلط کا کرشمہ اور غیر مفید و ناکارہ رسم الخط ہی ہے لیکن رومن رسم الخط سے تو بہر اعتبار زیادہ بہتر ہے، کون رومن حروف کے حق میں رائے دے گا؟

بین الاقوامی تعلقات کے لیے اوّل درجہ پر انگریزی اور اس کے بعد فرانسیسی زبان کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ان اقوام کے تسلط اور امریکہ کے بین الاقوامی اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کی طرف سے پانچ زبانوں کو یہ مرتبہ دیا گیا ہے اور ان دو زبانوں کے علاوہ چینی، روسی اور اسپینش کو بھی یہی مرتبہ حاصل ہے مگر عملاً جنرل اسمبلی کی تقریروں میں جو زبانیں استعمال کی جاتی ہیں وہ زیادہ تر یہی اولالذکر دونوں زبانیں ہوتی ہیں۔ جب بین الاقوامی افہام تفہیم کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم آپ پاکستان میں باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اُردو اور بنگلہ زبانوں کے لیے رومن رسم الخط سے مزید کیا استفادہ مقصود ہے؟ آپ کے ہمسایہ ممالک ایران، عراق، افغانستان، برما، تھائی لینڈ اور ملایا میں سے چار ممالک میں عربی رسم الخط اور دو میں ان کے اپنے مخصوص رسم الخط رائج ہیں۔ پھر رومن خط کی افادیت کیا ہو سکتی ہے۔

نقصان اور محرومی

چھٹی تنقیح یہ ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کر لینے سے کیا کچھ زیادہ علمی و ادبی سرمایہ ہمیں حاصل ہو

سکے گا۔

ظاہر ہے کہ اس تنقیح کا جواب صرف منفی ہی ہوسکتا ہے۔ اُردو یا بنگلہ زبان میں اور رومن خط میں چھپی ہوئی کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہیں، جس تک ہماری رسائی ہو جائے گی۔ انگریزی، فرنچ اور جرمن زبانوں کا سرمایہ علمی صرف رومن رسم الخط اختیار کر لینے سے ہمیں نہیں مل جائے گا اور نہ رومن رسم الخط اختیار کرتے ہی ان زبانوں کا سیکھنا سکھانا ہمارے لیے آسان ہو جائے گا۔ اس لیے یہ تصور تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ ہم رومن رسم الخط کے ذریعہ کچھ حاصل کر سکیں گے، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ اب تک کا سارا علمی و ادبی سرمایہ جو تالیفات اور تراجم کی شکل میں تقریباً چار لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے ہم سے چھوٹ جائے گا۔ ہم اپنے ماضی سے بالکلیہ منقطع ہو کر ایک جدید ادب پیدا کریں گے اور نہ جانے کتنے عرصے میں کم از کم اتنا کچھ پیدا کر سکیں گے جو ہماری حیاتِ ابدی کی ضمانت ہو سکے۔

یہ بالکل ناممکن بات ہے کہ حکومت اور عوام کی مشترک مساعی سے بھی ہم ان چار لاکھ کتابوں کے نئے ایڈیشن رومن رسم الخط میں تیار کر لیں۔ ولی گجراتی سے لے کر جگر مرادآبادی تک تمام شاعروں کے دیوان چھاپ لیں۔ خواجہ گیسو دراز کی انیس العاشقین بلکہ خسرو کی پہیلیوں سے لے کر شوکت تھانوی کی مزاحیہ تحریروں تک کو رومن میں منتقل کر لیں۔

بڑی محرومی

ان ساری محرومیوں کے علاوہ ایک سب سے بڑی محرومی یہ ہوگی کہ کچھ دنوں کے بعد ہم قرآن مجید کے حروف سے بے خبر ہو جائیں گے۔ یہ حروف ہمیں نامانوس سے نظر آنے لگیں گے۔ ہماری دعا و درود کی کتابیں صرف ریسرچ اسکالر ہی پڑھ سکیں گے اور اسلامی و دینیات کی ساری کتابیں عجائب خانوں کی الماریوں میں تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ ہو جائیں گی۔

ذرا اس دردناک صورت حال کا تصور تو کیجیے جبکہ پاکستانی بچے قرآن مجید کے حروف کو اس نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے پیرا گوئے کا ایک عیسائی قرآن مجید کے صفحات کو دیکھتا ہے۔

خلاصہ

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) رومن حروف میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اُردو زبان کی آوازیں ان سے ادا ہو سکیں۔

(۲) رومن حروف ناقص، غیر سائنٹیفک اور غلط قسم کی لکیروں کے مرکبات ہیں۔ اس میں تعلیم بالغاں و نابالغاں دونوں اُردو حروف سے زیادہ مشکل ہیں۔ ہمیں اگر تعلیم کو عام کرنا ہے تو یہ مشکل اور نامناسب خط ہرگز نہ اختیار کرنا چاہیے۔ پچھلے تقریباً دو سو سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس میں تعلیم کی کوشش بری طرح ناکام ہو چکی ہے اور پونے دو فی صد بھی حرف شناس نہ بن سکے۔

(۳) رومن حروف، ہماری روزمرہ کی تحریری ضروریات کے لیے کارآمد نہیں ہیں، یہ مشتبہ تحریریں پیدا کرتے ہیں اور بمشکل تمام لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

(۴) اُردو زبان کی طباعت کے لیے رومن حروف بالکل نامناسب ہیں، کتاب کا حجم بہت بڑھ جائے گا، لاگت بہت زیادہ آئے گی حتیٰ کہ سو روپے کی چھپائی ۲۷۸ روپے کو پڑے گی۔

(۵) رومن حروف پاکستانیوں کے مابین قومی اتحاد پیدا کرنے میں کسی طرح ممد و معاون نہیں ثابت ہو سکتے بلکہ ان حروف کی وجہ سے وہ رہا سہا اتحاد بھی جو دینی کتابوں اور دینی تعلیم کی بدولت قائم ہے، غارت ہو جائے گا اور بین الاقوامی تعلقات میں بھی ان حروف سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

(۶) رومن حروف کے رواج دینے سے ہم اب تک کے وسیع علمی و ادبی سرمایہ سے عموماً اور قرآن و دینیات سے خصوصاً بالکلیہ محروم ہو جائیں گے۔

اب آخر میں صرف ایک سوال اور رہ جاتا ہے جس کا جواب ہم ناظرین ہی پر چھوڑتے ہیں، وہ یہ کہ ان ساری ظاہر اور ناقابل انکار خرابیوں کے ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ کیوں رومن حروف کو رائج کرنا چاہتے ہیں؟

کسی کی نیت پر حملہ کرنے کا ہمیں کیا حق ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ ناظرین میں سے ہر شخص خود اس پر غور کرلے یا ایسے لوگوں سے پوچھ کر وجہ معلوم کرلے۔

☆☆☆

سیّد مصطفیٰ علی بریلوی

زبان اور رسم الخط

قوموں کی زندگی میں زبانوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زبان دراصل وہ آئینہ ہے جس میں کسی قوم کے افکار و خیالات، تہذیب و معاشرت اور عقائد و نظریات پوری طرح منعکس ہوتے ہیں۔ زبان محض روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والا ہی ایک آلہ نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ماضی، حال اور مستقبل تینوں ادوار کی محافظ و امین ہوتی ہے۔ اسی سے قوم کے افراد کے خیالات میں یک رنگی، ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے ایک دوسرے کے دل میں مہر و محبت کے جذبات نشو و نما پاتے ہیں اور آپس کی ہمدردی اور یگانگت اسی کی رہین منت ہیں۔ غرض مختلف قلوب کو ملانے اور خیالات میں یکسانیت پیدا کرنے میں اس کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا جادو ہے جس سے اغیار کو بھی رام کرلیا جاتا ہے، زبانوں کی یکسانیت دور افتادہ لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لے آتی ہے۔ اس کے برعکس زبانوں کے اختلاف سے اپنے غیر ہو جاتے ہیں۔ مذہب کا رشتہ اگرچہ بے حد مضبوط ہوتا ہے لیکن بعض اوقات زبان کے اختلاف کی وجہ سے وہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور ہم مذہبی کا جو اثر ہونا چاہیے ہو قائم نہیں رہتا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں مسلمانوں کی تاریخ کو سامنے رکھ لیجیے اور دیکھیے کہ ان کے لیے اسلام کا رشتہ سب سے زیادہ مضبوط ہے لیکن یہ رشتہ اس وقت تک جتنا مضبوط رہا جب تک تمام مسلمانوں کی زبان عربی رہی، اتنا اس وقت استوار نہیں رہ سکا جب مختلف ممالک میں مختلف زبانیں کام میں لائی جانے لگیں اس نکتہ کو ابتدائے اسلام میں بخوبی سمجھ لیا گیا تھا۔ لہٰذا ان ممالک میں بھی جہاں کی زبان عربی نہیں تھی رفتہ رفتہ اسی زبان کو رائج کیا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے باوصف ان ممالک میں اسلام آج بھی قائم ہے اور کئی ممالک اس وقت بھی عربی کو اپنی قومی زبان بنائے ہوئے ہیں۔

رسم الخط کا مسئلہ بھی زبان سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ رسم الخط اور زبان میں جسم و جان کا سا تعلق ہے۔ ہر زبان کا رسم الخط اس زبان کے مزاج کے عین مطابق ہوتا ہے۔ کسی زبان کی مختلف خصوصیات کو اس کا اپنا رسم الخط ہی کچھ اچھی طرح ظاہر کرسکتا ہے۔ دوسرا کوئی رسم الخط اس زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ بہت سے مخارج اور آوازیں جو کسی مخصوص زبان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو اسی زبان کا رسم الخط بخوبی ظاہر کرسکتا ہے۔

دوسرا رسم الخط اس معاملہ میں ناکام رہتا ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زبان کی اپنی خصوصیات فنا ہو جائیں اور زبان کا اپنا اسلوب اور مزاج بگڑ جائے۔ یہ بگاڑ بعض اوقات اتنا مہلک ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بناء پر وہ زبان فنا کی منزل پر جا پہنچتی ہے۔ چنانچہ جب انگریزوں کا ورود برصغیر میں ہوا اور انھوں نے اپنی بعض مصلحتوں کی بناء پر اُردو زبان سیکھنی شروع کی تو ابتداً انھوں نے اس زبان کے لیے رومن رسم الخط استعمال کیا لیکن جلد ہی انھیں اس کے نقائص کا احساس ہو گیا اور اُردو زبان کے ساتھ اس کے مخصوص رسم الخط فارسی کو سیکھنا ضروری سمجھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو زبان اپنی خصوصیات کو برقرار رکھے رہی اور آج بھی رکھے ہوئے ہے۔ اگر اس وقت مستقلاً رومن رسم الخط اختیار کر لیا جاتا تو اب تک اگر اس زبان کا وجود ختم نہ ہو گیا ہوتا تو کم از کم اس کی صورت ضرور مسخ ہو چکی ہوتی۔

اپنے اس بیان کی تائید میں کہ زبان اور رسم الخط کو قوموں کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، ہم بعض ماہرین لسانیات اور مفکرین کے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا ارشاد ہے کہ:

> ''زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت ان کی ہمدم ہے۔ ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہے۔ زبان کا حشر وہی ہوگا جو اس کے بولنے والوں کا۔ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ گزشتہ زمانہ میں جیسا کہ ہم نے اسے بنانا چاہا ویسی ہی بنی اور آئندہ بھی جیسا اسے بنانا چاہیں گے ویسی ہی بن جائے گی۔''(۱)

یہی بات شمس العلما مولانا محمد امین عباسی چڑیا کوٹی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اقوام عالم کی ترقی اور پستی کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان اس قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے جس میں وہ زبان رائج ہے۔ جس قوم کی جو زبان ہے، جب تک وہ قوم زندہ ہے۔ زبان بھی زندہ ہے کسی قوم کا انحطاط شروع ہوتا ہے تو زبان بھی مائل بہ زوال ہو جاتی ہے۔ اسی اصول کے ماتحت جس طرح نظامِ قومی میں انقلابات اور تغیرات ہوتے ہیں اسی طرح زبان بھی اپنے اصل مبدا سے آگے بڑھتی ہے تو اس میں بھی انقلابات لازم ہوتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر

قوم کی حیات اس کے لٹریچر کی زندگی سے وابستہ ہے۔ نظامِ قومی میں جب انقلاب وتغیر پیدا ہوگا تو اس قوم کا لٹریچر بھی اسی سانچے میں خود بخود ڈھل جائے گا۔ اس کی واضح دلیل زبان عربی کے لٹریچر کا انقلاب ہے جو اسلام کے بعد پیدا ہوا۔'' (۲)

ڈاکٹر زبیر نے مندرجہ بالا دونوں رایوں کا نچوڑ اس طرح پیش کیا ہے:

''اور جب قومی اور ترقی یافتہ قوم کے ساتھ حکومت کی طاقت اور مذہبی جوش وخروش بھی شامل ہو تو اس کی زبان سے صرف اس کے زمانے ہی کی دوسری قوم کی زبان متاثر نہیں ہوتی بلکہ بعض قدیم تر اور ترقی یافتہ زبانیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔'' (۳)

جناب مطیع الرحمٰن کا قول ہے کہ:

''فاتحین کی زبان رائج کرنے سے مفتوحہ علاقوں پر دیر تک حکومت کی جا سکتی ہے''۔ (۴)

زبان کی مندرجہ بالا مسلمہ حیثیت سیاسی اعتبار سے فاتح اقوام اچھی طرح سمجھتی ہیں لہٰذا سب سے پہلے مفتوح اقوام کو قطعاً بے بس کرنے کے واسطے ان کی زبان اور تعلیمی نظام پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔ برصغیر پاک وہند پر جب انگریزوں نے قبضہ واقتدار حاصل کیا تو مندرجہ بالا نظریات کے تحت انھوں نے سب سے پہلے زبان کے مسئلہ پر توجہ کی۔ ملاحظہ ہو:

''کمپنی کی عمل داری کے دوسرے پچاس سال میں دفتری سیلاب کی رفتار ابتدا میں سست تھی مگر مسلسل بڑھتی گئی کیونکہ اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بجائے مسلمان فاتحوں کی اجنبی زبان کے دیسی (یعنی بنگالی) زبان میں دفتر رکھا جائے۔ تب سے ہندوؤں کا غلبہ شروع ہوا اور اس وقت سے سرکاری ملازمت کے ہر درجے میں ہندو ہی ہندو بھر گئے۔ (۵)

فاضل اجل مولانا سید سلیمان ندوی نے انگریزوں کی لسانی پالیسی کی تشریح کرتے ہوئے کیا خوب نتائج اخذ کیے ہیں:

''ابھی اٹھارھویں صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اُردو اور ہندی کے دو خاکی، پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول وعرض میں مرنے کٹنے لگے۔ ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا

چاہیے۔ اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت زیادہ کار آمد ثابت ہوئی اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملے میں ظاہر ہوا اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی اور بعض صوبوں میں یہاں تک کیا گیا کہ اُردو رسم الخط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا۔''

''ہمارے وطنی بھائیوں نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ قوم کی پیدائش اور ترقی میں اس کی زبان کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے۔ انسان جانوروں کو تو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہیں لیکن جب ایک قوم دوسری قوم کو اپنا تابعدار بناتی ہے تو گو اس کے منہ میں لوہے کی لگام نہیں لگاتی تاہم اس کے منہ میں ایک لگام لگا دیتی ہے جس کا نام ''بدیسی زبان'' ہے۔ انسان کے تمام اعمال اس کے خیالات کے ماتحت ہیں۔ خیالات کی روح الفاظ کے جسم میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ الفاظ زبان کا دوسرا نام ہیں، اس لیے کسی قوم کی زبان کے معنی ہیں، اس قوم کا تمدن و تاریخ، مذہب و جذبات ہر چیز۔''(۶)

آخر میں، ہم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے زبان و رسم الخط کے بارے میں خیالات پیش کرتے ہیں:

''ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کی بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجیے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لے کر اٹھے گی۔ جن جن لوگوں نے قوموں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے ان سب نے یہی ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں۔''

''یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی۔ وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لیے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے۔

(اب الجزائر آزاد ہوگیا ہے اور کہانی بدل گئی ہے) کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے''۔(۷)

زبان اور رسم الخط کا عام طالب علموں کی صلاحیتوں پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج نے ۱۸۵۲ء کی رپورٹ میں تحریر کیا ہے کہ مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔

(بحوالہ کتاب ''دلی کالج'' از: مولوی عبدالحق)

وحدت قومی اور رسم الخط

سطور بالا میں ہم نے مشہور و بالغ نظر مفکرین کی آراء کی روشنی میں زبان اور رسم الخط کے مسئلے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وحدت قومی اور رسم الخط کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ذیل میں ہم اس بارے میں مشہور ماہرین لسانیات اور اکابرین ملت کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ عربی رسم الخط مسلمانان عالم کی حیات قومی میں ہمیشہ ایک نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری کو سنیے:

''قرآن شریف عربی زبان میں ہے۔ اس کے حروف (رسم الخط) عربی ہیں۔ مسلمانوں نے ابتدا ہی سے قرآن کی اصل زبان (عربی) اور اس کے حروف کو برقرار رکھا۔ اگرچہ انھوں نے سمجھنے سمجھانے کے لیے قرآن شریف کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی کیے لیکن عیسائیوں کی طرح ان ترجموں پر انھوں نے تکیہ نہیں کیا۔ وہ نمازوں میں اصل عربی قرآن شریف پڑھتے رہے اور اپنے بچوں کو عربی قرآن پڑھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنے دینی مرکز یعنی بیت اللہ سے جسے خود قرآن نے مسلمانوں کا مرکز بتایا تھا، دور ہونے کے باوجود اس سے وابستہ رہے اور ان کا عرب کی زبان اور اس کی رسم تحریر سے تعلق منقطع نہ ہوا، جو قرآن شریف کے ترجموں پر تکیہ کرنے کے بعد ہرگز قائم نہ رہتا۔ مسلمان دنیا کے جس گوشے میں بھی ہوں عربی کو اپنی قومی زبان اور عربی حروف کو اپنے ملی اور قومی حروف سمجھتے ہیں۔ ان کا منانا اپنے مرکز یعنی بیت اللہ سے عربی حروف ہی کی وجہ سے قائم ہے۔''

''ہندوؤں میں عقائد وخیالات اور اختلاف زبان کے باوجود کس چیز نے رشتہ اتحاد مضبوط رکھا اور اختلاف زبان ومکان کے ہوتے ہوئے بھی یہود کو کس چیز نے ایک مستحکم حکومت کے قیام پر ابھارا؟ ان سوالوں کا جواب ایک ہے۔ ہندوؤں کو سنسکرت زبان اور دیوناگری حروف نے اور یہودیوں کو عبرانی زبان اور عبرانی حروف نے ۔ براؤن نے ایک مقام پر رسم الخط کی مذہبی اہمیت جتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہود میں کامل اتحاد و یکجہتی عبرانی حروف کی وجہ سے ہے۔ یہودی ایران کا ہو یا ترکستان کا، عرب کا ہو یا افغانستان کا وہ اپنی مادری زبان کو عبرانی حروف میں لکھنا پسند کرتا ہے''۔ (۸)

جناب مخمور اکبرآبادی اپنی مشہور تالیف ''اُردو زبان اور اسالیب'' میں زبان کے نازک مسئلے کی صراحت فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''ہر زبان کو اپنی موروثی زبان سے جو اس سے قدیم تر ہوتی ہے ایک قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ پرانی زبان مستند اور نئی کا ماخذ ہوتی ہے اور اس کی کلاسکس کہلاتی ہے۔ کلاسکس کے الفاظ، ترکیبیں، جملے، فقرے، محاورے، اشعار اور ضرب الامثال نئی زبان میں بسا اوقات جوں کے توں رائج ہو جاتے ہیں۔ اُردو کو یہی واسطہ اپنی کلاسکس عربی وفارسی اور اپنی بہن برج بھاشا کے ساتھ رہا ہے۔ اُردو تحریروں میں ان زبانوں کے اجزا کی بڑی تعداد موجود ہے''۔ (۹)

بعض اچھے پڑھے لکھے اشخاص بھی بعض اوقات رسم الخط کو ضمنی حیثیت دینے لگتے ہیں اور تاریخی شواہد سے سراسر روگردانی کرتے ہوئے اس مسئلے کی اہمیت گھٹانے کے لیے ناکام کوشش کرتے ہوئے سیاسی سمجھوتہ بازی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک معمولی سی بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ رسم الخط کا فرق ایسا ہی ہوتا ہے جیسے یورپ اور افریقہ کے انسان میں ظاہری اور باطنی طور پر پایا جاتا ہے، مثلاً شیخ ممتاز حسن جونپوری مرحوم جن کا خط وخطاطی کے موضوع پر اساطین ادب میں شمار ہوتا ہے، ہندی رسم الخط اور نستعلیق کے عنوان پر لکھتے ہیں:

''ہندی نستعلیق خط اور ایرانی نستعلیق خط کی شان تحریر میں فرق ہے اور یہ فرق قریب قریب اسی طرح کا ہے، جیسے ہندوستانی آدمی اور ایرانی النسل انسان کی صورت اور

شان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ ایک فنی بات ہے۔''(۱۰)

مشہور عالم مولانا محمد امین عباسی شمس العلما جن کا قول ہم ابھی درج کر چکے ہیں، ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

''علمائے اسلام نے مسئلہ لسانیات پر کافی غور کیا تھا۔ آخر اس نکتہ پر پہنچے کہ ہر زبان کا رسم الخط اس زبان کی روح رواں ہے جب تک اس زبان کا رسم الخط باقی ہے وہ زبان باقی ہے۔ فارسی قدیم زبان پہلوی بائیں جانب سے لکھی جاتی تھی، تمام آریائی زبانوں کی طرح لیکن مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا تو پہلے اس زبان کے رسم الخط کو بدل کر عربی رسم الخط کیا۔ جس سے پہلوی زبان مٹتے مٹتے فنا ہوگئی اور اس کی جگہ عربی آمیز فارسی مروج ہوگئی۔ انھیں عربی حروف کی وجہ سے عربی الفاظ دخیل ہو گئے اور زبان فارسی کی کایا پلٹ ہوگئی۔ قدیم پہلوی رسم الخط (۱۱) اس طرح فنا ہوا کہ اب ایران میں اس رسم الخط کا پڑھنے والا یا اس قدیم پہلوی زبان کا سمجھنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ اگر کچھ ہوں گے تو ان کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔ یہ وہ نکتہ تھا کہ جس سے زبان عربی ایران سے فنا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو وہاں کی زبان کو بدلا، عربی مصر کی زبان ہوگئی۔ اس وقت مصر میں عربی کی جس قدر ترقی ہے خود حجاز میں جو عربی کا گہوارہ تھا، یہ ترقی نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی حالت اُردو کی پنجاب میں ہے۔ اُردو کی جتنی اشاعت پنجاب میں ہے وہ لکھنؤ میں، جو اُردو کا مرز و بوم ہے، نہیں ہے''۔ (۱۲)

رسم الخط کی تبدیلی کے ہولناک نتائج

مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ رسم الخط اور زبان کی تبدیلی کا قوموں کی زندگی پر بہت گہرا اور دور رس اثر پڑتا ہے۔

مسلمانوں کے مشہور رہنما نواب محسن الملک کا ارشاد ہے کہ:

''سرکاری دفتروں میں زبان اور خط کا بدلنا کوئی خفیف بات نہیں ہے۔ اس کا بہت برا اثر قوموں پر پڑتا ہے۔ بمبئی اور مدراس کی کیفیت دیکھو۔ تبدیلی خط اور تبدیلی زبان کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں پر کیا کچھ اثر پڑا ہے۔ سرکاری دفتروں میں خصوصاً عملہ

(اسٹاف) میں کہیں ان کا نشان نہیں ملتا۔ امیروں اور سوداگروں میں کوئی نوکری وہ نہیں پا سکتے اور جو تباہی اور بربادی ان کی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔"(۱۳)

اسی عنوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے اجلاس کانفرنس کلکتہ ۱۸۹۹ء میں جسٹس شاہ دین (پنجاب) نے فرمایا:

"میرے خیال میں اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ ان حروف کی تبدیلی جس میں کہ کوئی زبان لکھی جاتی ہو، ضرور اسی زبان پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بہت سے دلائل کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً مشہور مسلمانی نام "یوسف" اور "زکریا" بمبئی میں بوجہ تبدیلی حروف "جوسوف" اور "جاکریا" لکھے جاتے ہیں اور ویسے ہی پڑھے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی حروف کی گوپچر کا پتلا سرا ہے جس سے یہ ارادہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی بجائے اُردو کے رائج ہو جائے جو کہ مسلمانوں کے لیے بے حد مضر ہے۔"(۱۴)

ان تمام آراء کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ حیات قومی و ملی میں زبان اور رسم الخط دونوں ہی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ زبان قوم کے مزاج کا آئینہ ہوتی ہے اور رسم الخط زبان کے مزاج اور اس کی خصوصیات کا محافظ و نگہبان ہے۔ ان میں سے اگر کسی ایک سے ترک تعلق کیا جائے اور اس کو بدل دیا جائے تو قومی زندگی بھی قلب ماہیئت ہو جائے گی اور اگر دونوں کو خیر باد کہہ دیا جائے یا ان میں تبدیلی لائی جائے تو قوم کے لیے اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

حواشی

(۱) خطبۂ صدارت مولوی عبدالحق؛ سالانہ اجلاس انجمن حمایت اسلام، لاہور، ص ۱۷، ۱۹۴۱، ۱۹۴۱ء۔

(۲) مقالہ تدریس اُردو، بحوالہ کتاب ''تعلیم و تعلم'' مرتبہ: سیّد الطاف علی بریلوی، ص ۹۶۔

(۳) مقالہ فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبانوں پر عموماً اور بنگالی زبان پر خصوصاً ''معارف'' اعظم گڑھ، ص ۲۴۵۔

(۴) رپورٹ السنہ شرقیہ کاملہ، از: مطیع الرحمٰن قریشی (ملتان)

(۵) بحوالہ کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' از: ڈبلو ڈبلو ہنٹر

(۶) بحوالہ کتاب ''نقوش سلیمانی''، ص ۶۹۔۶۸

(۷) کتاب ''تحریک آزادی ہند''، از: مولانا ابو الاعلیٰ مودودی؛ شائع کردہ اسلامک پبلیکیشنز ڈھاکہ، مرتبہ جناب خورشید احمد، ص ۴۳۶۔

(۸) کتاب ''لسانی مسائل'' از: ڈاکٹر شوکت سبزواری، ص ۳۲۔۳۴

(۹) ''اُردو زبان و اسالیب'' مصنفہ: سیّد محمد محمود رضوی اکبر آبادی، مطبوعہ ۱۹۶۱ء، ص ۲۳۔۲۴

(۱۰) بحوالہ کتاب ''خط و خطاطی'' از: ممتاز حسن جونپوری، پروفیسر محمد ایوب قادری؛ شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل کانفرنس آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

(۱۱) پہلوی زبان کے زوال کے بارے میں ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب نے ''معارف'' اعظم گڑھ بابت اپریل ۱۹۶۸ء میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''اسلامی فتوحات کے بعد عربی زبان کا اثر ایرانی زبان پر اتنا گہرا اور وسیع ہوا کہ پہلوی اور اسلامی فارسی کے متعلق دو مختلف الاصل زبان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اسلامی فارسی زبان کا رسم الخط اس کا طریق بیان اور اس کا سارا ادب نئے انداز میں ڈھل گیا۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ عربی زبان و ادب پر بھی پہلوی زبان کا اچھا خاصا اثر پڑا۔ بیسیوں ایرانی الاصل الفاظ عربی زبان میں داخل ہو گئے اور آٹھویں اور نویں صدی کی عربی شاعری بھی ایرانی خیالات اور طرزِ ادا سے کافی متاثر ہوئی''۔

(۱۲) مقالہ ''تدریس اُردو'' از: شمس العلماء مولوی محمد امین عباسی چڑیا کوٹی بحوالہ کتاب ''تعلیم و تعلم'' مرتبہ: سیّد الطاف علی بریلوی، ص ۱۱۹۔۱۲۰۔

(۱۳) تقریر نواب محسن الملک، اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۹ء، رپورٹ کا صفحہ ۱۳۱۔

(۱۴) تقریر جسٹس شاہ دین، اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۹ء رپورٹ کا صفحہ ۱۲۵

☆☆☆

اُردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں

اُردو کے لیے رومن حروف اختیار کر لینے کا سوال انگریزوں کے زمانے میں سیاسی نوعیت رکھتا تھا مگراب اس کی حیثیت ایک نفسیاتی بیماری کی ہے۔ یہ وہی بیماری ہے جس میں مبتلا ہو کر ہمارا درزی ٹیلر ماسٹر کہلوانے پر فخر کرتا ہے اور ہمارے بعض دوست عید مبارک کی جگہ (Eid Greeting) کہنے میں بڑائی محسوس کرتے ہیں۔غرض یہ اپنے بطن کی بیماری ہے جس کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔

کسی رسم الخط کے سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نو آموزوں کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں کہاں تک کامیاب ہے اور نو آموزوں سے یہاں مراد غیر ملکی نہیں، ملکی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ عربی یا اُردو رسم الخط اس معاملے میں رومن سے زیادہ کامیاب ہے کیونکہ اُردو رسم الخط میں بچوں کے لیے فرصت اور دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے جس کی وجہ سے تحصیل میں بھی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اُردو ابجد کی ترتیب پر غور فرمایئے۔ الف کے بعد آپ کو ہم شکل حروف کے چند سلسلے نظر آئیں گے۔ ب۔ پ۔ ت۔ ٹ۔ ث۔ ج چ ح خ۔ د ذ۔ ر ڑ ز ژ۔ س ش ص ض۔ ط ظ۔ ع غ۔ ان سلسلوں کو دیکھتے ہی بچے کے تخیل میں کچھ معین اور ٹھوس تحریریں ابھر آتی ہیں۔ ب پ ت ٹ ث کا سلسلہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ریل گاڑی چل رہی ہے۔ ج چ ح خ یوں محسوس ہوتا ہے گویا کسی منڈیر پر لقا کبوتروں کی ایک قطار ہے۔ باقی سلسلوں سے بھی کوئی تصویر ابھر آتی ہے۔ غرض ہمارے نظام تہجی میں قانون مشابہت نے حسن پیدا کر کے تخیل اور تعجب کو بیدار کرنے کے وسائل مہیا کر دیے ہیں۔ حروف کی یہ مشابہت شناخت کے اعتبار سے بھی مفید ہے اور دلچسپی کے لیے بھی۔ اس کے برعکس یہ خوبیاں رومن میں موجود نہیں جس کے حروف کو ابھی لکھ کر دیکھ لیجیے آپ کو یوں محسوس ہوگا گویا مکھیاں اور کیڑے کسی صفحے پر چپکا دیے گئے ہیں۔ ان میں نو آموز کے لیے حفظ کی سہولت کا پہلو موجود نہیں اور حسن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر عربی رسم الخط کی بڑی تعریف کی جائے تو ب پ ت ٹ وغیرہ کے سلسلے میں زندگی کی روانی، تسلسل اور رفتار کا ج چ ح خ اور ل ن ق س ص وغیرہ میں مسجدوں کے گنبدوں کی گولائیوں اور قوسوں کا

احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر معلم اچھا ہو، اس رمزیت اور تصویروں سے اچھے اچھے خیالات ابھار سکتا ہے تا کہ سیدھے خطوط اور گولائیوں سے یہ تصور پیدا ہو سکے کہ زندگی سیدھا چلتے چلتے کبھی کبھی گول بھی ہو جاتی ہے۔ معلم اچھا ہو تو انھی سیدھی لکیروں، گولائیوں اور خطوط خم دار کے اندر بچوں کو دنیا کے طلسمات اور عجائبات سے آگاہ کر سکتا ہے کیونکہ زندگی کی عمارت بھی تو اس قسم کی جیومیٹری سے تیار ہوئی ہے اور اگر استاد آگاہ نہیں کر سکتا تو وہ یقیناً کسی رومن سکول کا پڑھا ہوا ہو گا لہٰذا گواہ رہیے کہ قصور بد مذاق استاد کا ہو گا، خط کا نہیں ہو گا۔ غرض ہمارے رسم الخط میں ابتدائی تدریس کے نقطۂ نظر سے (Romance) اور وہ (Wonder) ہے جس پر رائٹ ہیڈ کے نزدیک ابتدائی تعلیم کی ساری منطق قائم ہے۔

ہمارے نظام تہجی پر آوازوں کی بے ترتیبی کا بھی اعتراض ہے مگر یہ بے بنیاد بات ہے، اس لیے کہ خود رومن کی ترتیب سائنس نہیں، سائنس ترتیب یہ چاہتی ہے کہ تدریسی آسانی کے لحاظ سے آوازیں سب سے پہلے لبوں سے، پھر دانتوں کے پیچھے سے، پھر تالو کے اگلے حصے سے، اسی طرح جاتے جاتے آخر میں گلے اور ناک کے اندر سے نکلیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی و تہجی آوازی ترتیب پر کم، شکل وصورت کی مماثلت کے اصول پر زیادہ قائم ہے کیونکہ خط کا مقصد سب سے پہلے اہل زبان بچوں کو تحریر سکھانا ہے نہ کہ تقریر، اہل زبان کی ضرورتیں ملفوظی نہیں ہوتیں مکتوبی ہوتی ہیں۔ البتہ غیر ملکیوں کی مشکل جدا ہے مگر غیر ملکیوں کے لیے ہر پرائی زبان پرائی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مشکل ذرا مشکل ہی ہوتی ہے اور اس سے رومن خط بھی مبّتے نہیں۔ یہاں میں یہ بھی کہتا جاؤں کہ جس لاطینی خط کی اتنی تعریف کی جا رہی ہے وہ سامی خط کی ایک ابتدائی اور نیم شائستہ شکل ہے۔ یعنی ایک رد کیا ہوا فرسودہ اور پرانا طرز تحریر ہے جس میں ارتقا کا عمل کم ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ امریکہ میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے مگر امریکہ والے بھی G کا کچھ علاج نہیں کر سکے اور ہم غیر ملک اس J-G کے ہاتھوں خواہ مخواہ خراب ہو رہے ہیں۔ رومن خط کی یہ بہت بڑی بیماری ہے جو لا علاج ہے۔ اگر اس قسم کی بیماری غریب اُردو رسم الخط میں ہوتی تو ہمارے رومن زدہ حضرات اب تک ہمارا ناطقہ بند کر چکے ہوتے۔ غرض رومن خط فرسودہ اور جمود کا شکار ہے۔ اس کے مقابلے میں عربی خط نے ابتدائی کوفی سے لے کر نسخ، تعلیق، نستعلیق تک صدہا منزلیں طے کر لیں۔ اب بھی ضرورت کے مطابق ہر طرح ڈھلنے اور بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اب عربی خط کی مخصوص ترکیب کو لیجیے علم الاقوام کی سائنس کا یہ کہنا ہے کہ نابالغ اور نیم مہذب اقوام میں "Synthesis" یعنی ترکیب و امتزاج کی قابلیت نہیں ہوتی۔ وہ اشیا کو الگ الگ تو دیکھ سکتے ہیں مگر

خوشگوار ترکیب اور آمیزش کی استعداد سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اگر یہ سچ ہے تو رومن خط ایک نابالغ ذہنیت کا مشاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کو ابھی ترکیب و امتزاج کی اعلیٰ فن کارانہ اہلیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس میں ابھی تک حرف الگ الگ لکھا جاتا ہے اور فصل و وصل کی صفت یا خوبی سے محروم ہے۔ اس کے مقابلے میں عربوں کے رسم الخط کو دیکھیے انھوں نے امتزاجی صلاحیت سے اپنے خط کو ''کل فہم'' مختصر نویسی بنا کر کئی خوبیوں کے علاوہ وقت، کاغذ اور لاگت کی بے اندازہ بچت کی کیسی عمدہ سبیل نکالی ہے اور تعجب یہ ہے کہ اس اختصار کی علامیت نے کسی جگہ ابہام پیدا نہیں ہونے دیا اور یہ نہیں ہوتا کہ CH لکھ کر اس کو Church میں چ، Chivalry میں ش اور Monarch میں ک پڑھا جائے۔

اب مختصر سی مابعد الطبیعیاتی قسم کی بحث کی اجازت چاہتا ہوں۔ خط چونکہ کسی قوم کی روحانی ذہنی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے عربی خط بھی ایک خاص روحانی معنویت رکھتا ہے سب سے پہلی بات یہ کہ اس کا رخ راستی اور فطرت کے اصول پر قائم ہے کیونکہ داہنے ہاتھ کی جو انصرام امور کا فطری کارندہ ہے، ہر قوم میں فضیلت مسلم ہے۔ اس رخ میں سہولت بھی ہے اور معقولیت بھی ہے۔ اس وجہ سے آنحضرت ﷺ کے اقوال میں داہنے ہاتھ کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ محمد حسن عسکری کے الفاظ میں ہمارا خط تو ملت ابراہیمؑ حنیف کا پرچم ہے جو راستی کے اصول پر اصرار کرتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلامی تہذیب کے وسیع اثر کا سب سے بڑا خارجی مظہر یہی خط تھا جس پر عربی تہذیب نے باقی معاملات میں کھلی بے رنگی یا ہمہ رنگی کے باوجود ہمیشہ اصرار کیا۔ شاید اسی نکتے سے باخبر ہو جانے کی وجہ سے فرنگی تہذیب رومن خط کو پھیلا دینا چاہتی ہے کیونکہ اقوام اپنے خط سے پہچانی جاتی ہیں، جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ عربی خط کی دینی اہمیت یہ ہے کہ اس کے نشوونما ارتقا کی سب سے زیادہ تحریک قرآن مجید کی کتابت سے ہوئی، پھر مسلمانوں نے اپنے ایک اعلیٰ فن لطیف کو عملی طور پر ایک ریاضیاتی سائنس کی سطح پر جا پہنچایا جس کے ہر ہر حرف کے لیے مقدار اور نسبت کے پیمانے مقرر ہوئے۔ غرض خط مسلمانوں کی فکری اور جمالیاتی روح کی ایک بہت بڑی نمائندہ علامت ہے۔

☆☆☆

مولانا صلاح الدین احمد

ہماری قومی زبان اور اس کا رسم الخط

جس طرح ہم انسانوں میں سے بعض انسان عقل کے افلاطون، حکمت کے ارسطو، محاسن ظاہری میں یوسفؑ کے مثیل اور فیض رسانی میں مسیحاؑ کے حریف ہونے کے باوجود نصیبے کے سکندر ہوتے ہیں اسی طرح اس دنیا میں ایک زبان اُردو ہے کہ حسن و لطافت میں بے مثال اور قبول و نفوذ میں بے عدیل ہونے کے باوصف قسمت کی کھوٹی اور تقدیر کی ہیٹی ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ خمیر اس کا اسی خاک پاک سے اٹھا اور نانک نے اسی زبان میں وحدت کا گیت گایا اور چشتی نے اسی کے وسیلے سے پیغام حق سنایا۔ پھر یہ خلجیوں اور تغلقوں اور مغلوں کی افواج قاہر کے ساتھ کشور ہند کے جنوبی ساحلوں تک جا پہنچی اور جہاں سنگین مورچے اور سنگلاخ چٹانیں اور فلک نما قلعے اور غدار شہر فاتحین کی شمشیر خاراشگاف نے مغلوب کیے۔ وہاں دلوں کی تسخیر اسی کے حصے میں آئی اور اس کا جادو کہ عربی کی فصاحت، فارسی کی لطافت اور ہندی کی سلاست سے ترکیب پا کر سحر سامری کا حریف ہوا تھا، فاتح، مفتوح، غالب و مغلوب، راعی و رعایا، ہندی ولایتی، سب کے سر پہ چڑھ کر بولا اور سرزمین ہند پورے پانچ سو برس تک اس کی موہنی میں اسیر رہی۔

لیکن جب یہ اس قابل ہوئی کہ راج دربار کا کام سنبھالنے اور نظم و نسق کا سکہ رائج کرے تو فرنگی نے طوطے کی طرح صاف آنکھیں پھیر لیں اور فارسی کی جگہ انگریزی کو سریر آرائے سلطنت کر دیا، حالانکہ اُردو اپنی اہلیت اور استعداد ملی کا ثبوت وافر دے چکی تھی اور آج سے سوا سو سال پہلے دہلی کالج کے طلبہ، وہ طلبہ جن میں شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد، شمس العلما مولوی نذیر احمد، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے صاحب کمال شامل تھے۔ اسی بے مایہ زبان کے ذریعے علوم جدید کے منتہی ہوئے اور زمانہ اپنی ساری ترقیوں کے باوجود آج تک ان کے ثانی پیدا نہ کر سکا۔

کفران نعمت اور سازباز کی یہ ایک طویل داستان الم ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ اگر محسن الملک مرحوم اُردو کے تحفظ کے لیے مسلم لیگ کی بنیاد استوار نہ کرتے تو یو۔ پی کے گورنر اور بنارس کے دربانوں اور تعلق داروں کی سازش یقیناً کامیاب ہو جاتی اور تقسیم ہند سے نصف صدی پہلے ہی اُردو کی وہ ثانوی حیثیت بھی

چھن جاتی جو اسے ماتحت عدالتوں کی زبان ہونے کے اعتبار سے ہی شمالی ہند میں حاصل ہو گئی تھی۔

بیسویں صدی کا نصف اول متحدہ ہندوستان میں اُردو کا دورِ زرین ہے۔ اسی دور میں وہ اپنے شباب کو پہنچی اور برعظیم کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ رہا جہاں وہ سمجھی، بولی یا پڑھی نہ جاتی ہو، اخبار، رسالے، فلم، ریڈیو اور نشر و اشاعت کے وہ تمام وسائل جو عوام کو ایک دوسرے کے قریب تر لاتے ہیں اسی طلسمی زبان کے مرہون تھے۔ ریلوں، جہازوں، سٹیشنوں، بندرگاہوں، بازاروں، منڈیوں، قیدخانوں اور جلسہ گاہوں میں یہی زبان دلوں کی گھنڈیاں کھولتی اور مطالب کو یارائے اظہار بخشتی ہے اور آزادی کی وہ تحریکِ عظیم جس نے ۱۹۱۹ء میں اسی خطہ مینو سواد یعنی خاک پاک پنجاب سے جنم لیا، اسی زبان کے فلک سیر بازوؤں پر سارے ہندوستان میں پھیل گئی، اور ملک بھر میں کوئی ایسا گاؤں نہ رہا جہاں ''انقلاب زندہ باد،، کا نعرہ سنائی نہ دیتا ہو اور ہندوستان کا کیا ذکر ہے، برما اور لنکا کے تصویر خانوں میں جب کوئی اُردو فلم جاری ہوتی تو ہجوم کی یورش سے دروازے ٹوٹ ٹوٹ جاتے اور شائقین جب تماشا گاہ سے باہر نکلتے تو ان کی زبانوں پر اُردو موہنی غزلوں اور گیتوں کے روپ میں اپنے جلوے بکھیرتی چلی آتی۔ پھر قومی تحریک کے ایام عروج ہی میں قومی زبان کا مسئلہ سامنے آیا۔ آریہ سماجی پریس اور ہندو مہا سبھا کے لیڈر اُردو کی مخالفت میں پیش پیش تھے لیکن یہ مخالفت اُردو ہی میں ہوتی تھی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نہایت شستہ اُردو میں تقریر کرتے تھے مگر اُردو کی قومی حیثیت کے سب سے بڑے منکر تھے۔ گاندھی جی اُردو بولتے بھی تھے، اُردو لکھتے بھی تھے لیکن جب ان کے محبوب نظریے کا پردہ بابائے اُردو کی صاف بیانی نے چاک کیا تو ان کے لیے اس اعتراف کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ:

> ''میں مانتا ہوں، اُردو ہمارے عوام میں سب سے زیادہ مقبول زبان ہے لیکن افسوس کہ یہ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے قومی زبان کے طور پر یہ ہمارے لیے ناقابل قبول ہے''۔

اس کے بعد ہندی اور اُردو کے راستے قطعی طور پر الگ الگ ہو گئے اور برادرانِ وطن کی اکثریت نے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کو فروغ دینے کے پیمان باندھ لیے۔ اس پیمان ہندی میں پنجاب کا آریہ سماجی اور یو۔ پی اور بہار کا مہا سبھائی پریس بھی دل و جان سے شریک تھا! اگرچہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، اس کی تمام مخالف اُردو کوششیں خود اُردو ہی میں انجام پائی تھیں اور اُردو کا جادو پھر حریف ہی کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ یہ صورتحال کم و بیش ربع صدی تک قائم رہی تا آنکہ تقسیم برعظیم نے ہماری سیاسی بساط کا نقشہ اور ہماری کتاب زندگی کا ورق الٹ دیا اور ہندی اپنے پراچین روپ یعنی ناگری لپی میں ہندوستان کی چودہ زبانوں کی

رانی قرار پائی اور راج سنگھاسن پر بڑی آن بان کے ساتھ براجمان ہوئی۔ ہندوستان کی اُردو آج اس کی باندیوں میں شامل ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ اسلامیان ہند کی نژادِ نو اپنی معاشی اور معاشرتی ضروریات سے مجبور ہو کر ناگری لپی کو مستقل طور پر قبول کرے گی اور اُردو رسم الخط سے آہستہ آہستہ بیگانہ محض ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی اُردو اہل ہند کی زبانوں پر آج بھی زندہ ہے اور اس سرزمین کی فطری زبان ہونے کے اعتبار سے غالباً ایک عرصہ دراز تک زندہ رہے گی۔ لیکن اس کی نگارش مٹ رہی ہے اور اس کا ادبی و علمی پہلو کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی جو ہندوستان میں اُردو کا مینار روشنی تھی، آج اپنی اس روشنی سے محروم ہو چکی ہے اور وہاں ایک مضمون کے طور پر ضرور پڑھائی جاتی ہے لیکن ذریعہ تعلیم نہیں رہی۔ اس کی جگہ ہندی اور انگریزی نے چھین لی ہے اور ہندی کی مضبوط قومی حیثیت کے پیش نظر اس بات کی ہرگز کوئی توقع نہیں کہ وہ اپنا چھنا ہوا مقام کبھی پھر سے حاصل کرے گی۔ اُردو کے مرکز ثانی یعنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی صورتحال دگرگوں ہے۔ اگرچہ ابھی وہاں اس کا چرچا باقی اور اس کا کام جاری ہے لیکن اس کیفیت کو شمع سحر کا سنبھالا کہنا چاہیے۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں وہاں اُردو کا چراغ گل ہو جائے گا اور اگر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو اس کا پھر سے روشن ہو جانا محالات میں سے ہے۔

اس یاس آفرین صورت حال میں اگر نگاہیں کسی طرف اٹھتی تھیں تو وہ لامحالہ ہمارے اس وطن عزیز کی طرف اٹھتی تھیں اور از بس کہ یہ مملکت خداداد بعض اعلیٰ مقاصد کے حصول اور چند مقدس نظریات کی تکمیل کے لیے معرض وجود میں آئی تھی اور زبان اُردو کا تحفظ اور اُن تہذیبی روایات کا فروغ جو اس زبان سے خاص ہے ان مقاصد اور نظریات میں ایک مقام امتیاز رکھتا تھا۔ اس لیے امید کامل تھی کہ اب اُردو کے دن پھریں گے اور اس نقصان عظیم کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے گی جو اس کے ہاتھوں سے ہندوستان کی سلطنت جاتی رہنے سے واقع ہوا تھا۔ مگر ہیہات

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

اس کی تقدیر کچھ ایسی سوئی تھی کہ اب صورِ اسرافیل بھی اسے نہیں جگا سکتا تھا۔ بظاہر وہ اپنے وطن میں لوٹ آئی تھی اور ایک آبرومندانہ زندگی کی شاداب وسعتیں اس کے سامنے تھیں۔ اس مملکت کے بانی نے فرمایا تھا کہ یہی ہماری قومی زبان ہوگی اور بنگالی ہو یا سندھی، پٹھان ہو یا پنجابی سب اسی کو اپنی آنکھوں اور اپنے دلوں میں جگہ دیں گے لیکن قائداعظمؒ کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ بنگال اپنے قول سے پھر گیا۔ وہی ڈھاکہ جہاں کا بچہ بچہ اُردو جانتا ہے اور جہاں آج سے پچیس سال پیشتر قومیت اسلام کا گل نو بہار اُردو ہی کی

نسیم جاں فزا میں لہلہایا تھا اور جہاں اُردو ہی کے سوال پر اسلامیان ہند کے تہذیبی اور سیاسی تحفظ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اسی ڈھاکے کے گم کردہ راہ نوجوانوں نے اُردو کے جنازے کو کندھا دیا اور آج اگرچہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی اُردو زبانوں پر جاری ہے لیکن دفتر اور عدالتوں اور مدرسوں میں دختر شوخ وشنگ فرنگ اور اس کی شرمیلی بہن بنگالی کا ہی راج ہے اور غریب اُردو کو جو بقول گاندھی قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے قرآن خواں بنگالی مسلمان پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔

ادھر مغربی پاکستان میں اس پر جو کچھ گزری، اس پر ہم کسی طرح فخر نہیں کر سکتے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ اسی دیس کی بیٹی تھی، اگرچہ اس کا شباب گنگ وجمن کی وادیوں میں جلوہ آرائے گیتی ہوا۔ اب وہ اجڑ کر واپس اپنے میکے میں پہنچی تھی اور ہم سے اسی حسن سلوک کی طالب تھی جو مصیبت زدہ بیٹیوں کا حق ہوا کرتا ہے۔ افسوس کہ ہم نے اس کی دلجوئی نہیں کی بلکہ اسے درخور اعتنا بھی نہیں سمجھا۔ آج ہمارے دفتروں، محکموں، عدالتوں، اونچے مدرسوں کالجوں اور کھاتے پیتے گھروں میں بدستور انگریزی کا طنطنہ نہ صرف قائم بلکہ روز افزوں ہے اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت اپنے ہر فقرے کو غلط ملط انگریزی میں اور نصف اُردو پنجابی سندھی یا پشتو میں ادا کرتی ہے۔ آزادی سے پہلے اس سارے ملک میں نصف درجن سے زائد انگریزی سکول نہیں تھے جن میں زیادہ تر انگریز بچے تعلیم پاتے تھے لیکن آج نہ صرف ان مدارس کی اپنی تعداد خاصی بڑھ گئی ہے بلکہ ان کے طلبہ کی تعداد میں ہزار فی صد کا اضافہ ہو چکا ہے اور یہ سب پاکستانی بلکہ اینگلو پاکستانی بابا لوگ ہیں جو آئندہ چند برس میں ہمارے قائد اور حاکم بننے والے ہیں۔ رومن رسم الخط رائج کرنے کی یہ نادر تجویز انھی بابا لوگ کی آسانی اور اعانت کے لیے سامنے آئی ہے۔

یہ بچے جو کل ہماری کشتی کے ناخدا ہوں گے، اس گناہ سے جس کا نام اُردو ہے قطعاً آلودہ نہیں ہوئے۔ وہ انگریزی ہی کا دودھ پی کر پلے بڑھے ہیں اور انھوں نے اسی کی انگلی تھام کر چلنا سیکھا ہے۔ پھر ایک نقلی کلچر کی طرز دل کشا ان کے سامنے ہے اور یہی آئندہ زندگی میں ان کے مراتب کی ضامن اور مناصب کی کفیل ثابت ہوگی۔ ان کے والدین یہ سوچتے ہیں کہ ہم نے تو اپنی زندگیاں انگریز کے ظل عاطفت میں بخیر وخوبی بسر کر لیں، خدا اس کے اقبال کا سایہ اور دراز کرے، ہمارے بچوں کی عافیت اور سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اسی سائے سے لپٹے رہیں اور اسی کی اطمینان بخش فضا میں اپنی زندگی کی کامیابیوں سے ہمکنار ہو جائیں۔ چنانچہ وہ رات دن اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ اُردو کبھی اپنے صحیح منصب کو نہ پہنچے اور ہمیشہ انتشار کا شکار اور ہر آن ایک نئی مصیبت میں گرفتار رہے۔ تاکہ ان کی اولاد کے مفاد بدستور محفوظ رہیں اور ایک قومی

زبان، قومی تہذیب اور قومی رسم الخط کے فروغ کے نتائج اسے بھگتنے نہ پڑیں اور وہ اپنے اینگلو پاکستانی ماحول کی آسائشوں میں مگن رہ کر اپنی زندگی ہماری ہی طرح خیر و خوبی سے بسر کر جائے۔

رومن رسم الخط اختیار کرنے کی اس تباہ کن تجویز سے پہلے ایک اور بظاہر بے معنی تجویز اس کے پیش رو کی حیثیت سے منظر عام پر آئی تھی۔ میں نے بے معنی کے ساتھ بظاہر کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس وقت وہ واقعی بے معنی معلوم ہوتی تھی لیکن موجودہ تجویز نے اس کے معنی عیاں کر دیے ہیں۔ یہ تجویز بلکہ منصوبہ ایجوکیشن کمیشن کے دانشوروں نے اپنی رپورٹ میں پیش کیا تھا اور اس کا مدعا یہ تھا کہ اُردو اور بنگالی کی ملاوٹ سے تعلیمات کے کارخانے میں ایک نئی زبان تیار کی جائے جو یکساں طور پر پاکستان کے دونوں بازوؤں کے کام آئے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں اس لیے نہیں آئی تھی کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی زبان آج تک فرمائش پر تیار نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ شربت ''اربنگا'' کیوں کر تیار ہو سکتا تھا؟ (اس فقیر نے اُردو اور بنگالی کی اس آمیزش کے لیے یہی نام تجویز کیا ہے اور اسے باقیات کمیشن کی نذر کرتا ہے) لیکن یہ معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ دانشوران کمیشن یہ جانتے تھے کہ یہ زبان چلے نہ چلے لیکن اس کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کے لیے لازماً ایک رسم الخط درکار ہوگا۔ اب ہم لوگ تو بنگالی رسم الخط تو سیکھنے سے رہے وہ لوگ ہمارا رسم الخط جاننے کے باوجود اس سے اپنی آشنائی تسلیم نہیں کریں گے۔ لامحالہ اس زبان کے لیے انگریزی رسم الخط ہی اختیار کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے صاحب لوگوں کا پہلا وار تھا جو اگرچہ اوچھا پڑا لیکن اس دوسرے وار کے لیے پیش بندی کر گیا جو بالکل سیدھا اور صاف ہے اور سامنے سے آیا ہے۔ اس کی پذیرائی کے لیے ہماری گردنیں خم اور ہمارے سینے حاضر ہیں۔

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے؟
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے؟

انگریز نے اپنی جتنی اچھی اور بری یادگاریں اس ملک میں چھوڑی ہیں، ان میں رومن رسم الخط سب سے مکروہ اور شرمناک یادگار ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے تک فرنگی اپنی ملکی، تجارتی اور سماجی ضروریات کے لیے نہ صرف ہماری زبان خود ہمارے رسم الخط میں پڑھتے تھے بلکہ ان کی معاشرت بھی ایک بڑی حد تک ہندوستانی انداز اختیار کر گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ شعر بھی کہنے لگے تھے۔ ان میں سے بعض شعرا مثلاً الیگزنڈر ہیڈرلی آزاد کے اشعار آبدار آج بھی اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ ایک آدھ شعر آپ بھی سنیے:

ہنگام سحر بادہ گساری کا مزہ ہے
اوقات کریں اپنے تلف بہر دعا ہم
ہیں شمع صفت انجمن دہر میں آزاد
سرگرم رہ وادیٔ اقلیم فنا ہم ۔ (آزاد)

لیکن ۱۸۵۷ء کی اس آخری کوشش کے بعد جو ہم نے اپنی آزادی کے لیے کی، جب انگریز ہم پر پوری طرح غالب آ گئے تو ان کی رعونت کا آفتاب سیاہ نصف النہار پر پہنچ گیا اور وہ سیم وزر کے سوا اس دیس کی کسی چیز کو چھونے تک کے لیے آمادہ نہ رہے لیکن اپنے سیاسی اور فوجی تقاضوں کے پیش نظر انھیں ایک وفادار دیسی فوج کی ضرورت بھی تھی جس کے ان پڑھ سپاہیوں اور چھوٹے افسروں سے وہ زبانی اور کسی قدر تحریری رابطہ بھی رکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت ان کی دیسی فوج کا عنصر غالب گورکھوں، مرہٹوں اور مدراسیوں پر مشتمل تھا جن میں سے اکثر خود اپنی اپنی زبان میں بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور انگریز کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ان سب کے رسم الخط سیکھے۔ ملک کی عام زبان اُردو تھی لیکن انگریز فوجی افسر کو اُردو پڑھنا لکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔ وہ اپنے بیروں، خانساموں سے گٹ پٹ کر لیتا تھا لیکن صوبیداروں اور حوالداروں سے کبھی کبھی تحریری ربط کی بھی ضرورت پیش آتی تھی اور انھیں جو ہدایات جاری ہوتی تھیں یا انھیں جو کتابچے پڑھائے جاتے تھے، وہ ان پر بھی اپنی نظر رکھنا چاہتا تھا۔ پس اس کی آسانی کے لیے یہ رسم الخط ایجاد کیا گیا اور چھوٹے درجے کے لشکریوں کے لیے اس میں مہارت پیدا کرنا لازم قرار پایا۔ انگریز کی دیسی فوج کے سوا نہ کسی کو اس رسم الخط کی ضرورت تھی اور نہ قدر، اس لیے یہ ہم سے دور دور رہا اور الحمدللہ کہ ہم بھی اس سے دور دور رہے۔ فوج میں بھی بعض دفعہ یہ عجیب وغریب گل کھلاتا تھا مثلاً ایک دفعہ ایک میجر صاحب نے اپنے ایک حوالدار کو اپنے اردلی کے ہاتھ ایک چٹ بھیجی جس پر رومن میں لکھا تھا کہ Hamara Khat Leyao? غریب حوالدار یہ چٹ پڑھ کر جلد جلد صاحب کے بنگلے پر پہنچا اور صاحب کا پلنگ سر پر اٹھا کر نوک دم واپس بھاگا۔ میم صاحب چیختی ہی رہ گئیں کہ یہ پلنگ کیوں لیے جاتے ہو لیکن اس نے ایک نہ سنی اور ''حکم، حکم'' کہتا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔ صاحب کے سامنے پہنچ کر اس کی جو گت بنی اور بنگلے پہنچنے پر خود صاحب کی جو گت بنی، وہ ایک علیحدہ تفصیل کی طالب ہے لیکن یہ سارا کرشمہ رومن میں لکھے ہوئے ایک لفظ کا تھا جو Khat پر مشتمل ہے جسے لکھنے والا خط سمجھ کر لکھتا ہے اور پڑھنے والا ''کھٹ'' سمجھ کر اٹھ دوڑتا ہے۔

پھر فوج کی بات کچھ اور تھی، وہاں معدودے چند ضروریات تھیں اور ان کی مناسبت سے زیادہ سے

زیادہ چند سو الفاظ، اس لیے فرنگی آقا ہمارے رسم الخط سے آشنائی حاصل کیے بغیر بھی اپنا کام کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے لیکن ہماری شہری اور علمی ضروریات بے اندازہ ہیں اور ہمیں اپنے ربط وضبط اور تعلیم میں ہزاروں الفاظ سے ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔ یہ الفاظ صحت معنی کے ساتھ ہمارے ہی رسم الخط میں ادا ہو سکتے ہیں۔ کسی غیر رسم الخط کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے پر غور نہیں کیا ان میں سے اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ رسم الخط زبان کے لیے ایک قسم کا لباس ہے کہ اگر بدلنا چاہیں تو بآسانی بدل سکتے ہیں، اچکن نہ پہنی سوٹ پہن لیا، قمیض شلوار فیشن کے مطابق نہ رہی تو سکرٹ میں کیا مضائقہ ہے لیکن یہ خیال ان کا سراسر غلط ہے۔ رسم الخط زبان کا لباس نہیں ہے۔ اس کا جز و بدن ہے اور اگر لباس ہے تو اس قسم کا لباس کہ اسے اتارنے سے جسم کی کھال بھی ساتھ ہی کھنچ آتی ہے اور دل وجگر کے ساتھ انتڑیاں بھی باہر نکل پڑتی ہیں۔ قدیم مصر اور ایران نے عربی رسم الخط قبول کیا، آج ایرانی مذہب وادب اور قدیم مصری تہذیب کہاں ہے؟

یہی حشر چینی مسلمانوں کا ہوا۔ وہاں کے کروڑوں مسلمانوں میں آج چند ہزار عربی خواں بھی آپ کو نہیں ملیں گے۔ ان کے نام تک بدل گئے ہیں اور کون جانتا ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ کچھ ایسی ہی صورتحال آج اسلامیان ہند کو درپیش ہے۔ وہ ناگری رسم الخط اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کی نئی نسل کا ایک بہت بڑا حصہ صرف ہندی یا ہندی اور انگریزی پڑھتا ہے۔ وہ قرآن کے رسم الخط سے جو درحقیقت ہمارے علوم دین کے علاوہ ہمارے تمدن، ہماری تہذیب، ہمارے ادب اور ہماری روایات کا سرچشمہ ہے روز بروز دور ہوتا چلا جارہا ہے۔ تا آنکہ ایک وقت آئے گا جب وہ ہماری چہاردہ صد سالہ روایات سے ناآشنائے محض ہو کر رہ جائے گا لیکن کس قدر حیرت وافسوس کا مقام ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے اس انجام کی طرف مجبوراً بڑھ رہا ہے اور بنگالی مسلمان مختار، اس سے زیادہ المناک یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ناخداؤں اور رہنماؤں کو اس آنے والی مصیبت کا احساس تک نہیں ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہمارے دانشوروں نے مشرقی ومغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے قریب ترلانے کا جو طریقہ تراشا ہے اور اس طرح رومن رسم الخط کے رواج کے لیے جو صورت جواز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ محض ایک عذر لنگ ہے۔ خواندہ مسلم بنگالیوں کی اکثریت اب تک قرآن کے رسم الخط سے بخوبی واقف ہے اور یہی عین ہمارا رسم الخط ہے۔ پس اگر وہ اپنی عام اور تعلیمی ضروریات کے لیے بھی یہی انداز تحریر اختیار کرلیں تو ان کی

اکثریت کو انگریزی حروف سیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ زمانہ سابقہ میں ایک طویل عرصہ تک اسی رسم الخط سے اپنے سارے کام لیتے رہے ہیں پھر وہ آج ایسا کیوں نہیں کرتے، جبکہ وہ اس کی بدولت اپنی عظیم الشان دینی اور قومی روایات سے بھی قریب تر رہ سکتے اور اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں میں رکھ سکتے ہیں۔

رہی وہاں کی غیر مسلم اقلیت تو جناب والا! اگر ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان ناگری لپی اختیار کر چکے ہیں تو بنگال کے چند لاکھ ہندوؤں کے عربی رسم الخط اختیار کرنے سے کون سی قیامت آ جائے گی! میں اپنی ان گزارشات کو ختم کرنے سے پہلے اپنے رسم الخط کی فنی برتری اور اپنی زبان میں عربی، فارسی اور ہندی کا جو لازوال مجموعہ ہے اس کی مناسبت تامہ کی نسبت ایک دو لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ یہاں تختہ سیاہ نہیں ورنہ میں آپ کو انگریزی کے چند فقرے، ایسے فقرے جنھیں آپ خود تجویز فرمائیں، اُردو رسم الخط میں لکھ کر دکھاتا کہ یہ رسم الخط رومن رسم الخط سے کتنی کم جگہ لیتا ہے اور کس قدر جلد معرض تحریر میں آ جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کالج کے زمانے میں ہم اپنے انگریزی کلاس نوٹ انگریزی حروف کی بجائے اُردو حروف میں لکھتے تھے اور فقروں کو استاد کے منہ سے نکلتے ہی قلم بند کر لیتے تھے اور ہماری اس خفیہ چابکدستی پر ہمارے استاد بھی حیران رہ جاتے تھے۔ مجھے اس بات کی قطعاً کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایک زیادہ ترقی یافتہ اور سائنٹیفک رسم الخط سے جو ایک طرح سے شارٹ ہینڈ کا کام بھی دیتا ہے ہم کیوں ایک ابتدائی قسم کے طرز تحریر کے حق میں دست کش ہو جائیں؟ پھر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رومن رسم الخط عربی، فارسی اور ہندی کے بے شمار الفاظ اور ان کے اندرونی اختلافات و تغیرات کو صحیح طور پر ہرگز ظاہر نہیں کر سکتا، بلکہ ناظر کو شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسے الفاظ ہزارہا کی تعداد میں موجود ہیں مگر میں ان میں سے صرف چند الفاظ آپ کی خدمت میں پیش کر کے رخصت چاہوں گا۔ ملاحظہ ہو:

سحر	س۔ح۔ر	بمعنی جادو
صحر	ص۔ح۔ر	بمعنی خسر

رومن میں دونوں الفاظ (Sehr) کا جامہ پہنیں گے۔ ان کا باہمی فرق جو زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکر ظاہر ہوگا۔

صورت	ص۔و۔ر۔ت	بمعنی شکل
سورت	س۔و۔ر۔ت	بمعنی قرآن مجید کا ایک باب یا فصل

انگریزی میں دونوں الفاظ ایک ہی طرح لکھے جائیں گے۔

صوت	ص۔و۔ت	بمعنی آواز
سوت	س۔و۔ت	بمعنی سوکن

انگریزی میں یہ فرق کیونکر ظاہر ہوگا۔

سریر:	س۔ر۔ی۔ر	بمعنی تخت
صریر:	ص۔ر۔ی۔ر	بمعنی قلم کی آواز
سیف:	س۔ی۔ف	بمعنی تلوار
صیف:	ص۔ی۔ف	بمعنی گرمی
سفر:	س۔ف۔ر	بمعنی ظاہر ہیں
صفر:	ص۔ف۔ر	بمعنی ایک مہینے کا نام
سلب:	س۔ل۔ب	بمعنی اچک لینا، چھین لینا
صلب:	ص۔ل۔ب	سولی دینا
سفیر:	س۔ف۔ی۔ر	ایک ملک یا جماعت کا نمائندہ دوسرے ملک میں جیسے ہمارے میاں بشیر احمد
صفیر:	ص۔ف۔ی۔ر	پرندے کی بولی
سبوح:	س۔ب۔و۔ح	بمعنی پاک
صبوح:	ص۔ب۔و۔ح	بمعنی صبح کی شراب

کجا پاک، کجا شراب، لاحول ولا قوۃ الا باللہ

یہ مثالیں میں نے صرف س اور ص سے شروع ہونے والے چند الفاظ کی پیش کی ہیں جو رومن کے ذریعے اظہار پا کر اپنی اصل کیفیت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ورنہ ذ۔ز۔ض اور ظ۔ت۔ اور ط حائے حطی اور ہائے ہوز کے تبدل سے معنی میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جانے کی مثالیں سینکڑوں کی تعداد میں آسانی سے مہیا کی جاسکتی ہیں۔ پھر ع اور گھ، خ اور کھ کے تفاوت کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ ایام جوانی میں ایک بار ہم نے ایک ان پڑھ گانے والی سے ایک مصرع یوں سنا تھا کہ:

توغلے پر فیر خنجر ہم تجھے ویخا کریں

وہ بے چاری سمجھتی تھی کہ اُردو میں گلے کو غلا اور دیکھا کو ویخا کہنا چاہیے اور اب عین ممکن ہے کہ

رومن والے دیکھا لکھیں اور رومن ہی والے اسے دیکھا پڑھیں۔

اور اب آخر میں میں جناب صدر مملکت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے دوسرے بیان میں یہ فرما کر ''کہ میں آخر ایک سپاہی ہوں، زبان و رسم الخط کے رموز کو نہیں سمجھ سکتا'' نہ صرف ایک نہایت قابل قدر بات کہی بلکہ سنت نبوی ﷺ کا اتباع کیا ہے۔ ہمارے صدر نے رومن کے بارے میں یہی طرز بیان اختیار کیا اور یہ ایک نہایت مبارک بات ہے لیکن مجھے اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ وہی صاحب لوگ جو اپنے اپنے مفادات کے پیش نظر اُردو کے فروغ سے خوش نہیں ہیں اور جو اسے ہر نوع کی پریشانی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہیں پھر کوئی گل نہ کھلائیں اور اپنی پوزیشن، اپنے قرب اور اپنے رسوخ سے فائدہ اٹھا کر اس روز بد کو قریب نہ لے آئیں جب خدانخواستہ، خدانخواستہ ہم پر یہ اجنبی اور مردود رسم الخط کسی نہ کسی طرح نافذ ہو جائے۔ اس لیے یہ امر نہایت اہم اور بے حد ضروری ہے کہ جناب صدر اس قسم کی کسی تحریک سے متاثر ہو کر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے قوم کے ہر فرد کو ایک عام استصواب کے ذریعے اس بارے میں اپنی رائے کے اظہار کا پورا موقع دیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور اس بارے میں کوئی زبردستی کی گئی تو میں نہایت ادب کے ساتھ انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہم اپنی زبان کے مفاد میں قرآن کریم کا رسم الخط برقرار رکھنا اور اسی سے حیات ملی کی تمام سعادتیں، تمام برکات اور تمام فتوحات حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اگر ہم سے یہ حق چھینا گیا تو اس کی بازیابی کی غرض سے ہم بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار ہیں۔

☆☆☆

محمد حسن عسکری

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے

کوئی پچھلے سو سال سے یعنی جب سے اُردو اور ہندی کا جھگڑا شروع ہوا ہے، یہ سوال وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے پیش کیا جاتا رہا ہے کہ ہم اپنا رسم الخط برقرار رکھیں یا لاطینی رسم الخط اختیار کرلیں۔ اس مسئلے پر ایک تو عملی نقطۂ نظر سے بحث ہوئی ہے اور دوسرے علمی اعتبار سے مگر اپنا تعلق ٹھہرا ادب سے، چنانچہ ادب سے پیار بڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میں عمل سے بھی بے بہرہ ہوں اور علم سے بھی۔ آج تک مجھ سے نہ تو ڈیل کارنیگی کی کتاب پڑھی گئی، نہ برٹرنڈ رسل کی...... علم اور عمل سے محروم ہونے کے بعد مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایسے گھمبیر مسئلے پر مضمون لکھنے بیٹھ جاؤں...... لیکن ادیب ان معاملات میں ہمیشہ غیر دیانتدار پائے گئے ہیں...... خصوصاً ہمارے شاعر، کھیت کی خبر نہ کھاد کی، کسی نے فرمائش کی کہ آم کی شان میں قصیدہ ہو جائے۔ آ گا دیکھا نہ پیچھا بس تشبیہ، استعارے، صنائع، بدائع، خیال آرائی مبالغہ بازی اور ایسی ہی دو چار لغویات جمع کیں، محاکات نگاری کے فرض کو بالائے طاق رکھا اور قصیدہ تیار۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مولانا حالی کیا کہیں گے؟ اس روایت نے اپنی عادت بھی بگاڑ رکھی ہے۔ رسم الخط کے مسئلے پر عالمانہ مضامین شائع ہوتے دیکھ کر جی بھر آیا کہ لاؤ ہم بھی طبع آزمائی کر ڈالیں اور کچھ نہ بن پڑے تو اس موضوع پر جو گپ زنی اپنے یہاں ہوتی رہی ہے، اسی کو جمع کریں، خیالی طوطا مینا اڑتے دیکھ کر تھوڑی دیر اپنا بھی دل بہلے گا اور دوسروں کا بھی۔ کس چیز میں عملی فائدہ ہے اور کس چیز میں عملی نقصان، اس کی مجھے خود خبر نہیں اوروں کو کیا بتاؤں گا اور میری علمیت اس غضب کی ہے کہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اقوام متحدہ کا صدر مقام نیویارک شہر کے اندر ہے یا باہر، بلکہ لہٰذا اس مضمون میں آپ کو نہ تو کوئی کام کی بات ملے گی اور نہ علمی دلائل۔ البتہ لطائف وظرائف کثرت سے ہوں گے۔ ہنسنے ہنسانے کو جی چاہتا ہو تو یہ مضمون پڑھ لیجیے، جہاں تک اصلی مسئلے کا تعلق ہے، میں اس معاملے میں آپ کی کوئی رہنمائی نہیں کرسکوں گا۔ قطعی فیصلوں کے بجائے مجھے تو لطائف وظرائف پسند ہیں اس قدر کہ میں نے تو اپنی دل لگی کے لیے ابن عربی کی یہ بات پکڑ لی ہے...... دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اچھا ہو رہا ہے۔ تو موجودہ رسم الخط چاہے رہے، چاہے جائے، میں تو دونوں آموں کو میٹھا ہی کہوں گا۔ اس مضمون میں میرا مقصد تو بس اتنا ہے کہ

رسم الخط کے بارے میں آپ کو چند لطیفے سناؤں جو پرانے ملاؤں نے گھڑے ہیں اور سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ کل جو ملا تھا وہ آج خلائی سفر کے زمانے میں ملا دو پیازہ ہو گیا ہے اور اس کے عقائد لطائف بیربل۔

ملا کے لطیفوں کا مزہ لینے تو خیر ہم بیٹھے ہی ہیں، لایے پہلے ذرا عملی اور علمی دنیا کی بے چینی سے بھی لطف اندوز ہو لیں۔ لاطینی رسم الخط کی موافقت میں واحد دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ مغرب کا رسم الخط ہے اور مغرب آج سب سے طاقتور، سب سے دولت مند اور سارے علم و عمل کا مالک ہے۔ اس دلیل کے پیچھے مفروضہ یہ ہے کہ مغرب کی یہ عظمت لازوال ہے مگر سیدھی سی حقیقت یہ ہے کہ مغرب آج بھی وحدہ، لاشریک لہ نہیں۔ اس کے تین حریف موجود ہیں روس، چین اور جاپان اور یہ تینوں اپنا اپنا رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ علمی اور عملی ترقی لاطینی رسم الخط کی بوتل میں بند نہیں بلکہ روس جو اپنا رسم الخط استعمال کرتا ہے، کم سے کم سائنس میں مغرب سے چار قدم آگے ہے۔ یہ علمی اور عملی ترقی تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ اب تو بے چارا مغرب بھی اپنے آپ کو لازوال نہیں سمجھتا۔ یہ پیشگوئی تیس سال پہلے والیری نے کر دی تھی کہ یورپ آہستہ آہستہ ایشیائی براعظم کا ایک کونا بن کے رہ جائے گا۔ اب تو یہ احساس مغرب میں عام ہو چلا ہے۔ ''ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ'' جیسے قدامت پسند اخبار نے حال ہی میں لکھا ہے کہ لوگوں کو ایزرا پاؤنڈ سے شکایت ہے کہ وہ چینی الفاظ چینی رسم الخط میں لکھ کے ہمیں خواہ مخواہ الجھن میں ڈالتا ہے۔ لیکن شاید اگلی صدی میں یہی شاعر سب سے زیادہ قابل قبول ہوگا کیونکہ ممکن ہے سو سال کے اندر مغرب چینی زبان بول رہا ہو۔ اگر مغرب والوں کا یہ اندیشہ درست نکلا اور اکیسویں صدی میں مغرب چینی بولنے لگا تو ہماری حیثیت کتنی دلچسپ ہو جائے گی۔ بیسویں صدی میں ہم لاطینی رسم الخط اختیار کریں۔ اکیسویں صدی میں چینی رسم الخط اور بائیسویں صدی میں افریقہ کا کوئی رسم الخط۔ چلیے! یہ نقشہ کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ اس کوٹھی کا اناج اس کوٹھی میں کرتے رہنے سے ہم علم اور عمل دونوں میں مصروف رہیں گے۔

لیکن رسم الخط کا معاملہ کیا محض کپڑوں کا سا ہے کہ جب جی چاہا بدل ڈالے؟ ممکن ہے مغرب والوں کو رسم الخط صرف خارجی اور غیر مستقل چیز ہی نظر آتا ہو اور انھیں رسم الخط بدلنے میں نہ تو کوئی تکلیف ہو اور نہ کوئی نقصان پہنچے۔ دوسری روایتوں کے برخلاف عیسائیت کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں نہ تو تفصیلی فقہ ہے نہ مقدس زبان۔ عبادت کی زبان کے طور پر عیسوی دنیا میں لاطینی، یونانی، شامی اور دیگر زبانیں استعمال کی گئی ہیں لیکن کوئی ایسی زبان نہیں جس میں ان کی روایت کے بنیادی صحیفے محفوظ ہوں۔ اس لیے عیسائیوں کے لیے ایک خاص زبان اور ایک خاص رسم الخط وہ اہمیت اور معنویت نہیں رکھتے جو ان چیزوں کو مشرق کی بڑی روایتوں

میں حاصل ہے، مثلاً چینی روایت کی تو وحدت ہی رسم الخط کے سہارے قائم ہے اور اس روایت میں رسم الخط کی حیثیت بہت ہی مرکزی ہے۔ چینی روایت کا امتیاز یہ ہے کہ مابعدالطبیعیاتی معارف کو صرف چند عالموں تک محدود کر دیا گیا تھا اور عام لوگوں کے لیے وہ اخلاقی اور سماجی اصول تھے جو اس مابعدالطبیعیات سے اخذ کیے گئے تھے۔ اس کے دو نتیجے ہونے چاہئیں تھے۔ ایک تو یہ کہ عام لوگ مابعدالطبیعیات کو بالکل ہی بھول جائیں اور دوسرے جن علاقوں میں یہ روایت پھیلے، ان میں یگانگت اور وحدت کا احساس برقرار نہ رہے۔ ان دونوں خطرات سے چینی روایت کو رسم الخط نے ہی بچائے رکھا ہے۔ پورے مشرق بعید میں سماجی اور تہذیبی وحدت کا احساس پیدا کرنے والی چیز ہے، ''رسم الخط''۔ دوسرے مابعدالطبیعیات اور سماجی اخلاقیات کے تعلق کو عام لوگوں کے شعور میں بھی زندہ رکھنے کا فریضہ رسم الخط نے ہی سر انجام دیا ہے۔ کیونکہ یہ رسم الخط تصویری ہے اور اس میں ہر علامت بیک وقت حیات، معقولات اور مابعدالطبیعیات تینوں سے تعلق رکھتی ہے۔ گویا چینی روایت میں تو مابعدالطبیعات کی حفاظت اور نگہبانی ہی رسم الخط کے سپرد ہے۔ یہ ایک زندہ نمونہ ہے، وحدت الوجود کا جو ہر پڑھے لکھے چینی کے سامنے ہر وقت حاضر رہتا ہے۔ اس اعتبار سے چینی روایت میں رسم الخط عرفان حقیقت کا ایک وسیلہ ہے، جس طرح ہندو روایت میں بت ہیں اور چینی رسم الخط بلاواسطہ ایک مابعدالطبیعاتی فریضے کا عامل ہے۔

مغرب والوں کے نزدیک رسم الخط کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آلو، مٹر کی خریداری کا حساب رکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ رسم الخط کے مابعدالطبیعیاتی فریضے کا تصوّر انھیں مذاق معلوم ہوگا اور ان سے زیادہ ہمارے یہاں کے مغرب پرستوں کو، کیونکہ مرید پیر سے چار جوتے آگے رہنا چاہتا ہے۔ پھر مغرب والوں کے استعماری مفاد کا بھی تقاضا یہی رہا ہے کہ کسی طرح مشرق کے لوگ ان باتوں کو مذاق ہی سمجھتے رہیں۔ آج مغرب ایشیا اور افریقہ کے جہاد آزادی سے بھی زیادہ اس بات سے خائف ہے کہ مشرق والے اپنے اداروں اور اپنے تصورات کو پھر سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے دل میں اپنی اقدار کی عزت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہ خوف میں نے ایجاد نہیں کیا۔ ابھی ایک صاحب نے بی بی سی سے اقوام متحدہ کے ایک اجلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو چیز مغرب کے مستقبل پر سیاست سے بھی زیادہ اثر انداز ہوگی، وہ یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے لوگ دنیاوی زندگی کی مشکلات کا حل بھی اپنے اپنے مذہب میں ڈھونڈنے لگے ہیں۔ اگر یہ ذہنیت ترقی کر گئی تو مغرب کو تہذیبی برتری کا جو احساس اور یقین حاصل ہے، وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو تصدیق منظور ہو تو بی بی سی کا رسالہ ''لسنر'' دیکھیے۔ ۶-اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۴۹۔ اسی تہذیبی برتری کے تحفظ کی

خاطر ہی تو مغربی حکومتوں کی طرف سے اسلامیات اور عربی زبان و ادب کے ''عالم'' اور ماہر اور مستشرق اسلامی ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں جو قرآن وحدیث سے یہ ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ اسلام کا تعلق کسی خاص رسم الخط سے نہیں اور مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ لاطینی رسم الخط اختیار کر لیں۔

خیر یہ تو عملی اور علمی باتیں ہیں۔ ہم اس بکھیڑے میں کیوں پڑیں۔ ہم تو ایک کھیل کھیلنے بیٹھے ہیں اور آج کل مابعد الطبیعیات ہی ایک چیز رہ گئی ہے، جس سے آدمی کھیل سکتا ہے۔ باقی سب چیزیں علمی اور عملی بن گئی ہیں۔ مابعد الطبیعیات سے کھیلنے میں ہم گنہگار ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ خدا کے، خدا غفور اور رحیم ہے اس سے تو ہم اپنا گناہ بخشوا ہی لیں گے۔ انسان سے البتہ معافی ملنی مشکل ہے تو خدا سے کیا ڈرنا! آیئے مابعد الطبیعیاتی شطرنج کی بازی جم جائے۔

پہلے اس شطرنج کا بنیادی اصول سمجھ لیجیے۔ انسانی تاریخ کی عظیم ترین اور مکمل ترین روایتی تہذیبیں تین ہیں، چینی، ہندو، اور اسلامی۔ ان کے علاوہ اگر کسی اور تہذیب نے تکمیل کا درجہ حاصل کیا تو ہمیں اس کا صحیح علم نہیں۔ یونانی یہودی اور ازمنۂ وسطیٰ کی عیسوی تہذیبیں اپنی اپنی جگہ قابل قدر ہیں لیکن کسی نہ کسی اعتبار سے نامکمل ہیں۔ موجودہ مغرب کسی طرح روایتی تہذیب کے دائرے میں آتا ہی نہیں کیونکہ اس میں روایت کا وجود ہی نہیں بلکہ یہ بات بھی مشکوک ہے کہ جس معاشرے میں تہذیب نفس کا کوئی مرکزی اصول نہ ہو، اسے تہذیب کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ بہر حال ان تین بڑی تہذیبوں میں طرح طرح کے اختلافات کے باوجود ایک چیز مشترک ہے۔ توحید کا نظریہ، یعنی مابعد الطبیعیاتی عنصر جس پر ان تہذیبوں کی بنیاد قائم ہے۔ پھر ان تہذیبوں کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ عقائد، عبادات، اخلاقیات اور رسمیں تو الگ رہیں، دنیاوی زندگی کا بھی کوئی فعل یا قول اس مابعد الطبیعیات سے آزاد نہیں ہوتا۔ اچھی سے اچھی اور بری سے بری سب چیزوں میں اس کا عکس اور ظہور ملتا ہے۔ بلکہ مادی چیزوں کو مابعد الطبیعیاتی حقائق کی علامت بنا کر ان سے مابعد الطبیعیات کی حفاظت کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ مادی چیزیں ایک وسیلہ بن جاتی ہیں جن کے ذریعے حقائق عام لوگوں کے شعور اور طرز احساس میں رس بس جاتے ہیں، چنانچہ ان تہذیبوں میں کوئی عنصر بھی اتفاقی یا حادثاتی امر نہیں ہوتا بلکہ لازمی حیثیت رکھتا ہے اور اگر کسی عنصر کو خارج کر دیا جائے تو اس کی اضافی اہمیت کے بمقدار تہذیب کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

یہی حال رسم الخط کا بھی ہے۔ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں کہ چینی تہذیب کی بقاء اور استحکام کس حد تک رسم الخط پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ لاطینی رسم الخط پر چینی رسم الخط کی برتری کا اظہار ہی نہیں بلکہ اعلان بالجہر مغرب میں فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آئن سٹائن جیسے لوگ کر چکے ہیں۔ اسلامی روایت میں رسم الخط کو اتنی مرکزی

اہمیت تو حاصل نہیں مگر یہاں بھی رسم الخط ہمارے بنیادی عقائد کے ساتھ مربوط اور منضبط ہے اور ایک ایک حرف کیا معنی، نقطوں اور حروف کی شکلوں کی بھی مابعد الطبیعیاتی اور علامتی معنویت مقرر ہے۔ یہ رموز تفصیل کے ساتھ حضرت عبدالکریم جیلی نے ''الکہف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' میں لکھے ہیں۔ میں ان رموز کو سمجھنے اور سمجھانے کا ذمہ نہیں لیتا۔ میں تو بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ نمونے کے طور پر چند جملے نقل کر دوں مثلاً:

''نقطہ ب سے کہتا ہے کہ اے حرف میں تیری اصل ہوں کیونکہ تیری ترکیب مجھ سے ہے بلکہ تو اپنی ترکیب میں میری اصل ہے۔ اس لیے کہ تیرا ہر جز نقطہ ہے، پس تو کُل ہے اور میں جُز ہوں اور کل اصل ہے اور جز فرع بلکہ میں حقیقت میں اصل ہوں، اس لیے کہ تیری ترکیب عین میری ترکیب ہے۔''

''ب الف مبسوط ہے اور ح الف معوجۃ الطرفین ہے اور د الف منحنی الوسط ہے اور الف بوجہ ہر حرف کے اس سے مرکب ہونے کے مقام نقطہ میں ہے اور ہر حرف نقطے سے مرکب ہے۔ بس نقطہ ہر حرف کے لیے مثل جوہر بسیط کے ہے اور حرف مثل جسم مرکب کے ہے۔ پس الف نہ قائم ہوا بجسمہ بجائے نقطے کے ......اسی طرح حقیقت محمدیہ ﷺ ہے کہ تمام عالم اس سے پیدا کیا گیا ہے۔''

''بعض حروف ایسے ہیں کہ جن کا نقطہ اوپر ہوتا ہے اور وہ اس کے نیچے ہوتے ہیں اور یہ مقام مارایت شیئا الا ورایت اللہ قبلہ کا ہے اور بعض حروف ایسے ہیں کہ جن کا نقطہ نیچے ہوتا ہے اور وہ اس کے اوپر ہوتے ہیں۔ یہ مقام مارایت شیئا الا ورایت اللہ بعدہ کا ہے۔ بعض حروف ایسے ہیں جن کا نقطہ ان کے وسط میں ہے...... یہ محل مارایت شیئا الا ورایت اللہ فیہ کا ہے۔''

اگر میں نے اور اقتباس نقل کیے تو ہماری شطرنج بازی بہت مشکل چیز بن جائے گی۔ اس کے علاوہ میں لافورگ اور لوتریاموں کا پڑھنے والا ہو کے بھی مولانا حالی کی روح سے بہت ڈرتا ہوں۔ اگر میں نے دو چار جملے اور ایسے نقل کیے تو آپ کہیں گے کہ یہ تو نری خیال آرائی اور مبالغہ بازی ہے۔ اس میں خلوص اور توازن کا فقدان ہے۔ یہ تو اس زمانے کی باتیں ہیں جب لوگ عمل اور تسخیر کائنات کے فریضے سے غافل تھے اور ان فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے تھے اور یہی اسباب زوال امت ہیں۔

دوسرا اعتراض آپ یہ کریں گے کہ ایسی خیال آرائی تو لاطینی رسم الخط کے متعلق بھی ہو سکتی ہے، اس

کا رسم الخط سے کوئی لازمی اور اندرونی تعلق نہیں۔ چلیے میں مان گیا۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے بجائے میں آپ کو رسم الخط کے اندر ہی لیے چلتا ہوں۔

عبرانی اور عربی زبانوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ کے معنی اور مطلب کا تعین ابجدی اعداد کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے بلکہ معارف اور حقائق کے معاملے میں تو بعض دفعہ صرف اس طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ مغرب والوں نے لسانیات کے جو اصول گھڑے ہیں، وہ یہاں آ کے بالکل بیکار ہو جاتے ہیں۔ ابجدی حساب صرف پیدائش اور موت کی تاریخیں نکالنے کے ہی کام میں نہیں آتا بلکہ اس میں ہماری روایت کے بنیادی عقائد محفوظ ہیں۔ اس زمین میں تو دفینہ گڑا ہوا ہے۔ میں تو اس علم کے معاملے میں بھی کورا ہوں۔ البتہ دو ایک سنی سنائی باتیں عرض کرتا ہوں۔ مثلاً تصوف کے بارے میں مستشرقین اور خود ہم لوگ بھی خیال آرائی کرتے پھرتے ہیں کہ اس کی تعریف کیا ہے، یہ لفظ کہاں سے نکلا ہے اور اس کا رمز چھپا ہوا ہے۔ ابجدی حساب میں لفظ ''صوفی،، کے اتنے ہی اعداد ہوتے ہیں جتنے ''الحکمۃ الالھیہ،، کے، یہی تصوف ہے۔ ہمارے یہاں اصطلاحات کی تعریف اسی طرح بیان کی جاتی ہے۔ ان باتوں کو معما بنانے کی مصلحت یہ ہے کہ جن لوگوں میں معارف کی استعداد نہیں، وہ انھیں کھیل نہ بنالیں، جیسے میں اس وقت بنا رہا ہوں۔ دوسری مصلحت یہ ہے کہ حقائق کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں طرح طرح کی ٹھوس شکلیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ اب ایک مثال دیکھیے، مابعد الطبیعیاتی رموز کو ابجدی حساب سے بیان کرنے کی۔

حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ نے آدم کو اپنی شکل پر بنایا۔ ابجد کی رو سے جتنے عدد اللہ کے ہوتے ہیں، اتنے ہی ''آدم وحوا،، کے ہیں۔ پرانے لوگ کہتے تھے کہ یہ ساری باتیں اللہ کی طرف سے ہیں لیکن شاید آپ اس ابجدی تطبیق کو مشرقی ذہن کی نازک خیالی اور قوت ایجاد کا کرشمہ سمجھیں گے۔ لہٰذا اب ایک ایسی مثال لیجیے جس میں قوت ایجاد سرے سے غائب ہو۔ اسم اور فعل میں تو کوئی نہ کوئی واضح معنیٰ ہوتے ہیں جن سے خیال آفرینی کی جاسکتی ہے لیکن ایک معمولی حرف اتصال میں تو کوئی اور لفظ ساتھ لگائے بغیر نازک خیالی دکھانے کا موقع نہیں ہوتا۔ مگر یہاں تو حرف اتصال بھی مابعد الطبیعیات کے دائرے سے باہر نہیں۔ عربی میں ''و'' کے معنی ہیں ''اور'' اس کے عدد ہوتے ہیں۔ چھ مشرقی علم الاعداد کے حساب سے طاق اعداد عالم لاہوت پر دلالت کرتے ہیں یعنی خدا اور روح سے متعلق ہیں اور جفت اعداد عالم ناہوت یعنی مخلوقات پر۔ چنانچہ اصولاً تو چھ کا عدد کائنات سے متعلق ہونا چاہیے تھا مگر اسے مانا گیا ہے عالم لاہوت کی علامات کیونکہ یہ عدد ۲ اور ۳ کو ضرب دینے سے بنتا ہے جن میں سے ایک عدد عالم ناسوت کا ہے اور دوسرا عالم لاہوت کا۔ ان دونوں کا

حاصل ضرب ۶ علامت بن گیا، لاہوت اور ناسوت کے تعلق اور اتصال کی۔ اس عدد کے مقابل حرف ''و،، ہے۔ چنانچہ یہی حرف عربی گرامر میں حرف اتصال کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

یہ ابجدی حساب ہے تو واقعی جھنجٹ اور خلائی سفر کے زمانے میں باعمل انسانوں کو اتنی مہلت کہاں کہ ایسے بکھیڑوں میں پڑیں مگر ان مثالوں سے یہ تو پتہ چل گیا ہوگا کہ ہمارے پرانے علوم کا بہت بڑا حصہ عربی رسم الخط میں بند ہے۔ جب ہم اپنا رسم الخط بدلیں گے تو یہ علوم بھی فی امان اللہ کہہ کر چلتے بنیں گے۔ لیکن واقعی ہائیڈروجن بم کی موجودگی میں ان علوم کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔

ہمارے علوم کے لیے ابجدی حساب لازمی سہی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری مقدس زبان تو عربی ہے، عربی میں ابجدی حساب قائم رہے گا اور ہمارے علوم بھی زندہ رہیں گے، اُردو خالص دنیاوی چیز ہے اور یہاں رسم الخط کو تقدیس کا درجہ حاصل نہیں۔ لہٰذا اب یہ سمجھنا لازمی ہوگیا کہ عربی رسم الخط کا اسلام اور اسلامی تہذیب سے کیا تعلق ہے اور یہ رسم الخط مسلمانوں کے بنیادی عقائد اور نظام حیات اور طرز احساس کی کہاں تک نمائندگی کرتا ہے۔

عربی رسم الخط کا سب سے نمایاں فرق تو یہی ہے کہ یہ دائیں طرف سے بائیں طرف کو لکھا جاتا ہے۔ سنسکرت میں بائیں طرف سے دائیں طرف کو چلتے ہیں۔ چینی میں پہلے اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں اور پھر بائیں طرف سے دائیں طرف۔ کیا یہ فرق محض اتفاق کا یا عادت کا نتیجہ ہے؟

ہم لوگوں نے عام طور سے یہ بات نظر انداز کر رکھی ہے کہ ہمارے رسم الخط کا رخ بھی وہی ہے جو طواف کعبہ کا رخ ہے۔ طواف کرتے ہوئے حاجی مرکز یعنی کعبے کو بائیں ہاتھ کی طرف رکھتے ہیں اور دائیں سے بائیں کو چلتے ہیں۔ ہندو اپنے طواف میں مرکز کو دائیں ہاتھ رکھتے ہیں اور بائیں سے دائیں کو چلتے ہیں، جیسے سنسکرت رسم الخط میں ہوتا ہے۔ طواف شروع کرتے ہوئے ہندو پہلے بایاں پیر آگے بڑھاتے ہیں اور مسلمان دایاں پیر، یعنی طواف کی جو رسم چند حاجی سال میں ایک دفعہ ادا کرتے ہیں وہ ہر پڑھا لکھا مسلمان رسم الخط کے ذریعے ہر روز ادا کرتا ہے۔ اگر طواف کی کوئی دینی اور روحانی معنویت ہے تو یہ فیض ہمیں رسم الخط ہر روز پہنچاتا ہے اور حقیقت کعبہ ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔

رسم الخط اور طواف کعبہ کا رخ تو خیر ایک ہوا لیکن طواف کا طریقہ بھی کوئی بے خیالی میں مقرر نہیں ہوا۔ اس کا تعلق سمتوں کے تعین سے ہے۔ دنیا میں سمتیں دو طریقوں سے متعین ہوئی ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ شمال کی طرف منہ کریں تو پیچھے جنوب ہوگا، دائیں ہاتھ کی طرف مشرق اور بائیں ہاتھ کی طرف مغرب، اسے قطبی تعین کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جنوب کی طرف منہ کریں تو پیچھے شمال ہوگا، دائیں طرف مغرب

اور بائیں طرف مشرق۔ یہ شمسی تعین ہے لیکن دونوں طریقوں میں فضیلت مشرق کو ہی حاصل ہے کیونکہ مشرق نور سے وابستہ ہے اور مغرب تاریکی سے۔ قطبی تعین میں دایاں ہاتھ مشرق کی طرف ہوتا ہے، اس لیے دائیں ہاتھ کو برتر سمجھا جاتا ہے۔ شمسی تعین میں مشرق کی طرف بایاں ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لیے برتری بائیں ہاتھ کو ملتی ہے جیسے چینیوں کے یہاں ہر اچھا کام بائیں ہاتھ سے ہوتا ہے۔ قطبی طریقہ اسلامی روایت میں رائج ہے اور شمسی طریقہ ہندو اور چینی روایت میں۔ کہتے ہیں کہ انسان کا سب سے قدیمی طریقہ قطبی تھا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانے میں انسان کے لیے معرفت حاصل کرنا بھی آسان تھا لیکن جیسے جیسے انسان مخلوقات میں پھنستا گیا اور اصل الاصول سے دور ہوتا گیا، اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ کائنات اور محسوسات کے ذریعہ حقیقت تک پہنچے۔ جب معرفت کے طریقے بدلے تو سمتوں کا تعین بھی بدل گیا اور شمسی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس شمسی تعین کے علامتی معنی یہ ہیں کہ پہلے کائنات کا عرفان حاصل کرو، پھر اس کے ذریعے حقیقت تک پہنچو گے۔ یہ کیفیت چونکہ تنزل کی تھی، اس لیے ہر پرانی تہذیب میں وقتاً فوقتاً یہ کوشش ہوتی رہی کہ پرانی حالت پھر واپس آئے اور اصل الاصول سے براہ راست تعلق دوبارہ قائم ہو۔ ان کوششوں کے ضمن میں قطبی تعین بھی دوبارہ اختیار کیا گیا، مثلاً چین میں گیارھویں صدی قبل مسیح کے قریب یہی تجدیدی تحریک چلی اور دائیں ہاتھ کو فوقیت دی گئی مگر لوگ پھر شمسی تعین پر آ رہے۔

ہندوؤں کے یہاں شمسی تعین تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہے، کیونکہ وہ منہ مشرق کی طرف کرتے ہیں مگر ان کے یہاں بھی ابتدا میں قطبی طریقہ ہی رائج تھا۔ یہ اسی سے ظاہر ہے کہ ''اترا،، کے معنی ہیں سب سے اونچا نقطہ۔ اسی طرح چینیوں کی ایک مقدس کتاب کہتی ہے کہ ''آسمانی راستہ،، دائیں ہاتھ کو ترجیح دیتا ہے اور ''زمینی راستہ،، بائیں ہاتھ کو۔ انسانوں نے ''زمینی راستہ،، اس لیے اختیار کیا کہ انھوں نے آسمانی راستہ کھو دیا تھا۔ غرض چینی اور ہندو روایتیں بھی اپنے شمسی تعین کے باوجود قطبی تعین کے قدیم اور افضل ہونے کے قائل ہیں...... اور قطبی تعین کے ساتھ دائیں ہاتھ کی برتری وابستہ ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہر تہذیب میں قطبی تعین کو زندہ کرنے کی ناکام کوشش ہو چکی ہے۔ اسلام نے اس تعین کو کامیابی کے ساتھ زندہ کیا ہے۔ اسلام کا دعویٰ بھی تو یہی ہے کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں بلکہ دین ابراہیمیؑ کا احیاء ہے بلکہ بعض ہندو عارف بھی یہ کہتے ہیں کہ موجودہ یگ میں سناتن دھرم کی آخری شکل اسلام ہے۔

اب اس احیا اور تجدید کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ میں یہ باتیں شیخی بگھارنے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب ہے۔ میرا موضوع تو صرف اتنا ہے کہ

اسلام کے امتیازی اوصاف کیا ہیں اور ان کا رسم الخط سے کیا تعلق ہے۔ جہاں تک بنیادی مابعد الطبیعیات کا تعلق ہے وہ تو چینی، ہندو اور اسلامی تینوں روایتوں میں مشترک ہے اور وحدت الوجود کا تصور بھی تینوں جگہ یکساں ہے۔ اگر فرق ہے تو نقطۂ نظر میں اور معرفت حاصل کرنے کے طریقوں میں اور ان حقائق کے اظہار کے اسالیب میں۔ اصل الاصول کو تو ہندو اور چینی بھی اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح مسلمان مگر چینی لوگ تو بالعموم اور ہندوؤں میں سانکھیہ درشن سے متعلق لوگ کائناتی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کو ابتدا ان چیزوں سے کرنی چاہیے جو فوراً گرفت میں آسکیں۔ یعنی مخلوقات اور اس کے بعد بتدریج اصل الاصول کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اسی لیے یہ لوگ اپنا منہ سورج کی طرف کر کے سمتوں کا تعین کرتے ہیں اور ان کا رسم الخط بائیں جانب سے دائیں جانب کو چلتا ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان ایک دم سے لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں، یعنی اسلام نے مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور اصل الاصول سے براہ راست تعلق قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ کائناتی نقطۂ نظر اسلام میں بھی موجود ہے اور مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر چینی اور ہندو روایتوں میں بھی۔ فرق صرف اصرار تاکید کا ہے۔ ہندو اور چینی نیچے سے اوپر کی طرف جاتے ہیں۔ مسلمان اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں اور تینوں روایتوں کے نزدیک انسان کا اوّلین اور قدیم ترین طریقہ بھی یہی تھا۔ اسلام نے اسی کو پھر سے زندہ کیا ہے۔ اس مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر پہ زور دینے کی وجہ سے اسلام نے قطبی تعین اختیار کیا۔ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر فوقیت دی۔ طواف کعبہ میں حرکت کی سمت دائیں سے بائیں کو مقرر کی اور رسم الخط بھی وہ لیا جو دائیں سے بائیں کو چلتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں اصل الاصول سے قربت پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ ہمارا رسم الخط تو ملت ابراہیم حنیف کا پرچم ہے بلکہ یہ رسم الخط تو موذن ہے جو ہر وقت لا الٰہ الا اللہ پکارتا رہتا ہے۔ غازی ہے جو اللہ اکبر کے نعروں سے تعینات کی فوجوں کو غارت کر کے واحدیت اور احدیت کا اقتدار قائم کرتا ہے۔

چنانچہ ہمارا رسم الخط سب سے پہلے تو کلمۂ توحید کی نشانی ٹھہرا اور اس سے زیادہ بنیادی چیز اسلام میں کوئی اور ہو نہیں سکتی۔ لیکن ابھی دیکھتے جائیے، اس بھان متی کے پٹارے میں سے بہت کچھ نکلے گا۔ چونکہ ہم ساتھ ساتھ چینی اور سنسکرت رسم الخط پر بھی نظر ڈالیں گے۔ اس لیے چینیوں کی دو ایک اصطلاحیں سمجھ لیجیے۔ ان سے بات آسان اور مختصر بھی ہو جائے گی۔ چینی مابعد الطبیعیات میں اصل الاصول کے پہلے دو تعینات ہیں۔ آسمان اور زمین ہندوؤں کے یہاں انھیں کو پرش اور پراکرتی کہتے ہیں۔ آپ انھیں ماہیت اور مادہ سمجھیے مگر یہاں مادے کے وہ معنی نہیں جو مغرب نے اس لفظ کو دیے ہیں۔ ان دو اصولوں کے ملنے سے ظہور واقع ہوا۔

کائنات وجود میں آئی۔ آسمان فاعلی اصول ہے جو خود تو حرکت نہیں کرتا مگر دوسری چیزوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ زمین مفعولی اصول ہے جو آسمان سے آنے والے اثر کو قبول کرتا ہے اور اس طرح چیزوں کو وجود میں لاتا ہے۔ آسمان میں تذکیر ہے اور زمین میں ثانیت۔ ان دونوں اصولوں کی مشترکہ علامت یہ ہے:

عمودی خط آسمان ہے اُفقی خط زمین۔ ہمارے یہاں ''ا'' اور ''ب'' کے علامتی معنی بھی یہی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چینی رسم الخط پہلے تو اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے اور پھر بائیں سے دائیں طرف چلتا ہے۔ اس طرح چینی رسم الخط میں یہ دونوں لکیریں موجود ہیں۔ چنانچہ رسم الخط ظہور و تخلیق کے ان دو اصولوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ دوسرے اعتبار سے ایک اور معنی پیدا ہوتے ہیں۔ عمودی خط اصل الاصول، اس کے تنزلات اور تعینات کی طرف اشارہ کرتا ہے یا مراتب وجود کی علامت ہے۔ افقی خط مخلوقات کا نمائندہ ہے اور دونوں مل کر انسان اور اس کی کائنات کی قائم مقامی کرتے ہیں۔

غرض رسم الخط اصل الاصوال، مخلوقات اور انسان کے باہمی رشتے کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔ عربی اور سنسکرت رسم الخط میں عمودی خط نہیں ہوتا، صرف افقی خط ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل الاصول تو مخلوقات کے اندر موجود ہی ہے، اسے الگ سے دکھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

آسمان اور زمین تو ظہور کے دو اصول ہوئے۔ اب مخلوقات کو سمجھنے کے لیے چینیوں نے ان سے دو اور اصول اخذ کیے ہیں جنھیں یانگ اور ین کہتے ہیں۔ یانگ باطن ہے، ین ظاہر۔ یانگ نور ہے، ین ظلمت۔ یانگ فاعل، مثبت اور مذکر ہے۔ ین مفعول، منفی اور مؤنث۔ یانگ بالفعل ہے۔ ین بالقوہ۔ یانگ کا تعلق عقل کلی سے ہے اور ین کا حسیات سے لیکن یہ دونوں اصول ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور الگ الگ نہیں رہ سکتے۔ ہر چیز میں یانگ بھی ہوتا ہے اور ین بھی۔ البتہ کسی چیز میں یانگ زیادہ ہوتا ہے اور کسی میں ین۔ اسی زیادتی کے اعتبار سے چیزوں کو یانگ اور ین میں تقسیم کیا جاتا ہے (آسانی کی خاطر میں نے اصطلاحیں چینیوں کی لے لی ہیں ورنہ ان دو اصولوں کا تصور ہر روایت میں موجود ہے۔ ہندوؤں کے یہاں برہم ڈنڈا اور یونانیوں کے یہاں ہرمیز کے عصا پر دو سانپ اور مسلمانوں کے یہاں جنت کی دو نہریں انھیں اصولوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اگر رسم الخط دائیں سے بائیں کو چلے تو یہ قطبی تعین ہوگا اور بائیں سے دائیں کو چلے تو شمسی۔ قطبی تعین میں آدمی کا منہ شمال کی طرف ہوتا ہے اور شمال ین ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اصل الاصول کے مقابلے میں تو اپنے آپ کو ین سمجھتا ہے اور کائنات کے مقابلے میں یانگ۔ اسی لیے تو وہ اپنا تکملہ ڈھونڈنے کے لیے ین یعنی شمال کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ شمسی تعین میں آدمی جنوب یا مشرق کی

طرف منہ کرتا ہے جو یا نگ ہیں۔ یعنی انسان کائنات کے مقابلے میں بھی اپنے آپ کو ین تصور کرتا ہے۔ اس طرح یہ دو تعین انسان اور کائنات کے باہمی رشتے کے متعلق دو مختلف تصورات کے حامل ہیں۔ شمسی تعین اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کائنات کے مقابلے میں انسان کی حیثیت مفعولی، منفی اور مؤنث ہے۔ قطبی تعین کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کے مقابلے میں انسان کی حیثیت فاعلی، مثبت اور مذکر ہے اس قطبی تعین کی رو سے ہی ہمارے رسم الخط کا رخ مقرر ہوا ہے۔ چنانچہ یہ رسم الخط کائنات کے بارے میں ہمارے تصور کی بھی نشانی ہے۔ یوں ہونے کو بھی عبرانی رسم الخط کا بھی رخ یہی ہے مگر یہودیوں نے سمتوں کی تذکیر و تانیث میں ایسی تبدیلیاں کی ہیں کہ ان کے یہاں قطبی تعین کی معنویت پوری طرح محفوظ نہیں رہی۔ حضرت عبدالکریم جیلی کہتے ہیں کہ اول تو خدا نے یہودیوں کو پورا علم نہیں دیا اور جتنا علم انھیں ملا، اسے انھوں نے مسخ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں میں کوئی کامل نہیں۔

عربی رسم الخط کے رخ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان یانگ کو پہلے رکھتے ہیں اور سنسکرت اور چینی رسم الخط کا مفہوم یہ ہے کہ ین کو پہلے لیا گیا۔ یانگ کی فوقیت تو خیر تینوں جگہ مسلم ہے لیکن یانگ کو پہلے رکھنا مابعد الطبیاتی نقطۂ نظر کی نشانی ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے اور ین کو پہلے رکھنا کائناتی نقطۂ نظر کی دلیل ہے جو چینیوں نے اور ہندوؤں میں سانکھیہ درشن نے اختیار کیا ہے۔ یہ سلوک اور معرفت حاصل کرنے کے دو مختلف طریقے ہیں۔ آخر میں جا کے تو خیر سب راستے ایک ہو جاتے ہیں لیکن کائناتی نقطہ نظر کہتا ہے کہ اصل الاصول کی معرفت حاصل کرنے کے لیے پہلے کائنات کو دیکھو، محسوسات سے کام لو، ظاہر سے باطن کی طرف چلو، مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر کہتا ہے کہ پوری توجہ اصل الاصول پر ہی مرکوز رکھو۔ عقل کلی کی رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرو، باطن کے ذریعے ظاہر کو سمجھو۔ ویسے تو یہ دونوں طریقے تینوں جگہ بیک وقت موجود ہیں۔ فرق صرف اس بات کا ہے کہ زور کس طریقے پر دیا گیا۔ مسلمانوں کا قطبی تعین بتاتا ہے کہ یہاں زور مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر پہ ہے۔ لہٰذا ہمارا رسم الخط سلوک کے ایک خاص طریقے کی نشانی بھی بن جاتا ہے۔

پھر چونکہ انسان کامل کا درجہ سلوک کی یہ راہ طے کرنے سے ملتا ہے، اس لیے یہ رسم الخط انسان کامل کی بھی علامت ہے۔ ایک بات اس سے بھی آگے نکلتی ہے۔ انسان کامل کے کئی مفہوم ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کامل تو صرف آنحضرت ﷺ ہیں، اس لیے یہ رسم الخط حقیقت محمدیہ ﷺ کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کیونکہ قطبی تعین کی معنویت جس اکملیت اور جامعیت کے ساتھ آپ ﷺ کو حاصل ہوئی، اس طرح کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔

قطبی اور شمسی تعین سے جو مختلف مطالب پیدا ہوتے ہیں، وہ میں پیش کر چکا ہوں۔ اس بیان سے

آپ کو سمتوں کے تعین کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو گیا ہو گا۔ کسی قوم یا تہذیب کی روحانی اور ذہنی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے قطبی تعین اختیار کیا ہے یا شمسی کیونکہ سمتوں کے تعین ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اس تہذیب نے اصل الاصول اور کائنات کے درمیان انسان کو کیا جگہ دی ہے اور انسان کی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کسی تہذیب نے انسان کی جو حیثیت مقرر کی ہو گی اسی کے حساب سے مختلف تہذیبی مظاہر مثلاً ادب، فنون، لباس، آداب و اطوار وغیرہ صورت پذیر ہوں گے۔ اگر اس تہذیب کے نمائندوں نے اپنی روح برقرار رکھی ہے اور اپنے آپ کو مسخ نہیں کیا تو آپ اس کا رسم الخط دیکھ کر ہی بہت کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کے تہذیبی مظاہر کس قسم کے ہوں گے۔ آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ اگر رسم الخط دائیں سے بائیں کو چلے تو اس کا مطلب ہوتا ہے قطبی تعین اور قطبی تعین سے مراد ہے مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر، ظاہر کے بجائے باطن پر زور، مخلوقات کے بجائے اصل الاصول پر توجہ مرکوز کرنا، حسیات پر عقل کلی کو ترجیح دینا، نورانیت، فاعلیت اور مردانیت۔ کیا یہ وہی عناصر نہیں ہیں جو مختلف لوگوں نے کبھی تعریف کے لیے اور کبھی تنقیص کے لیے اسلامی ادب، فن تعمیر، نقش گری، معاشرت اور فی الجملہ پوری اسلامی تہذیب میں دیکھے ہیں؟ یہ چیزیں اچھی ہیں یا بری، اس سے مجھے یہاں کوئی مطلب نہیں اور نہ اسلامی تہذیب کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کا یہاں موقع ہے۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ عموماً انھیں چیزوں کو اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر سمجھا گیا ہے اور ان تمام تہذیبی عناصر کی ایک نہایت ہی جامع اور نہایت ہی مختصر علامت ہے ہمارا رسم الخط۔

لیجیے میں نے اپنا وعدہ پورا کیا، یہاں سے وہاں تک مضمون لکھ گیا اور کام کی ایک بات نہیں کہی اور نہ افادی یا عملی پہلو کہیں آنے دیا۔ بارے آموں کا بیان ہو گیا۔

لیکن جس چیز کو حقیقی معنوں میں (ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے معنوں میں نہیں) روایت کہتے ہیں وہ بڑی ہنسوڑی ہے، بے ہنگم سے، بے ہنگم بات میں معنی ڈال دیتی ہے۔ میرے ذہن میں ایک مصرع آیا۔ میں نے اسے عنوان کی جگہ رکھ دیا۔ بہر حال عنوان کے ذریعے رسم الخط اور آم ایک دوسرے کے پاس آ بیٹھے۔ آم سرزمین پاکستان و ہند کا خاص پھل ہے۔ یہ بے جوڑ بات ہے کیونکہ یہاں تو ذکر ہونا چاہیے تھا کھجور کا جو عرب کا خاص پھل ہے جہاں سے اسلام شروع ہوا اور میں اسلام ہی کے بارے میں مضمون لکھ رہا ہوں لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ پاکستان و ہند کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سرزمین کا خمیر یثرب اور بطحیٰ کی مٹی سے ہے۔ اگر یہ خیال آرائی نہیں بلکہ ٹھیک بات ہے تو آم اور کھجور ایک چیز ہوئے اور کھجور کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اپنی پھوپھی یعنی درختِ خُرما کی تعظیم کرو، کیونکہ وہ آدمؑ کی بقیہ مٹی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر آم اور

کھجور ایک چیز ہیں تو سرزمین پاکستان و ہند کے اعتبار سے آم کو بھی وہی جامعیت اور عدلیت حاصل ہوئی جو کھجور میں مجدد الف ثانی نے بتائی ہے۔ لہٰذا آم کھایئے۔

مگر آم کھانے کا طریقہ مجدد الف ثانی نے بہت ہی سخت مقرر کیا ہے۔ فرماتے ہیں......

''اس فائدے کی حقیقت اس وقت میسر ہوتی ہے جب اس کا کھانے والا صورت سے گزر کر حقیقت تک جا پہنچا ہو اور ظاہر سے باطن تک پہنچ گیا ہو۔ تا کہ غذا کا ظاہر اس کے ظاہر کو مدد دے اور غذا کا باطن اس کے باطن کو مکمل کرے ورنہ صرف ظاہری امداد پر ہی موقوف ہے اور اس کا کھانے والا عین قصور میں ہے۔،،

یہ مضمون پڑھ کر بعض قارئین کو ایک خالص ''علمی،، بحث میں ''مذہب'' کی بے جا اور غیر ضروری مداخلت گراں گزری کیونکہ ان کے نزدیک مغرب میں ایسا نہیں ہوتا مگر دور جدید کے آغاز تک مغرب بھی اس انداز نظر سے اس قدر بے گانہ نہیں تھا، جتنا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۶۱۳ء میں کلود دیورے (Claude Duret) اپنی کتاب "Tresor de l' histoire des Langues" میں لکھتا ہے کہ: یہودی، مصری، عرب، ایرانی وغیرہ اپنی تحریر میں دائیں طرف سے بائیں طرف چلتے ہیں اور اس طرح پہلے آسمان کی یومیہ گردش اور دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک یہ حرکت کی کامل ترین شکل ہے کیونکہ اس کا رخ وحدت کی جانب ہے۔ یونانی، رومی اور یورپ کی ساری قومیں بائیں طرف سے دائیں طرف چلتی ہیں، یہ دوسرے آسمان کی گردش ہے جو سات سیاروں کا مقام ہے۔ چینی اور جاپانی وغیرہ لکھنے میں اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں۔ یہ ''نظام فطرت،، کے مطابق ہے جس نے انسان کا سر اوپر رکھا ہے اور پیر نیچے۔ میکسیکو کے لوگ تحریر میں یا تو نیچے سے اوپر کی طرف چلتے ہیں یا چکردار لکیریں بناتے ہیں جیسے بارہ برجوں میں سورج کی سالانہ گردش۔ غرض لکھنے کے یہ پانچ طریقے اپنے اپنے انداز سے زمین کی وضع کے رموز، صلیب کی شکل اور زمین و آسمان کی وحدت کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری نہ ہوگا کہ یہ اقتباس ۱۹۷۶ء کے مقبول ترین فرانسیسی فلسفی میشل فوکو (Michel Foucault) کی ایک کتاب سے لیا گیا ہے اور یہ فرق بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ میں نے مضمون صوفیاء کے نقطۂ نظر سے لکھا ہے جو خالص مابعد الطبیعیاتی ہے۔ کلود دیورے کا نقطۂ نظر کائناتی ہے۔ دیورے نے تو صلیب کا ذکر عیسائی ہونے کے اعتبار سے کیا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک صلیب علامت ہے کائنات کی۔

☆☆☆

پروفیسر رشید احمد صدیقی

کچھ اُردو رسم الخط کے بارے میں!

اُردو خوش نویسی کی بہت سی اقسام ہیں مثلاً کوفی، نسخ، نستعلیق، ریحان، شفیعہ، ثلث، طغرا وغیرہ، معلوم نہیں اس کے کون کون اور کیسے کیسے نمونے یا نمائندے اس وقت یہاں موجود ہیں۔ داعیان مذاکرہ کی نظرِ انتخاب کا معترف ہوں کہ انھوں نے اُردو رسم الخط کے ترک یا قبول کی وکالت کے لیے مجھ جیسے خطِ شکست یا خطِ غبار کو منتخب فرمایا، آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو!

ایک بات جو آخر میں کہنے کی تھی وہ پہلے ہی کہہ دینا مناسب خیال کرتا ہوں، اس لیے کہ گفتگو کے دوران یا بحران میں وہی بات کہنے سے رہ جاتی ہے جو کہی جانی چاہیے تھی اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ جو نہیں کہنا چاہیے تھا، وہ کہہ ڈالا ہے۔ اس طرح کہ سانحوں کا ذکر محض احتیاط کے خیال سے کر دیا ہے ورنہ اب تک نیت و حواس دونوں بخیر ہیں، اس لیے امید یہی ہے کہ آخر میں وہی عرض کروں گا جن سے آپ آسانی سے اختلاف یا انحراف نہیں کر سکیں گے، گو وہ کوئی بدیہی بات نہ ہو عجب نہیں!

بہت دن ہوئے غالباً کسی مغربی دانش مند نے کہا تھا کہ گھوڑے پر سوار کوئی دریا پار کر رہا ہو تو منجدھار میں کبھی راہوار نہ بدلنا۔ اس مشورے یا تنبیہ کے مطابق جس سیاسی دھارے میں آج ہم آپ، اُردو سماج، اُردو زبان و ادب اور رسم الخط رواں دواں یا کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں، اس میں راہوار بدلنے کا سوال ہی نہیں بلکہ اس پر خوب جم کر بیٹھنا چاہیے، یہاں تک کہ سفینہ کنارے پر آ لگے۔ پھر ہم سب کو اختیار ہوگا کہ ناخدا کے ستم و جور کا ذکر یا خدا کا شکر ادا کریں۔

اُردو رسم خط کی طرف سے میرا رویہ کبھی بے تکلفی کا نہیں رہا ہے۔ جن عزیزوں اور دوستوں کا رہا ہے یا اب ہے ان سے جواب طلبی کا نہیں ہے اپنی جوابدہی کا ہے۔ اس میں کسر نفسی کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا تحفظ جسم و جان کو! بوڑھے جسمانی ہی نہیں ذہنی اعتبار سے بھی لچکنے میں احتیاط کرتے ہیں۔ کبھی اپنی تندرستی، اکثر اپنی آبرو کے خیال سے۔ بڑھاپے کے ساتھ پندار بھی بڑھتا رہتا ہے۔ طرح طرح کا پندار، ان کی بھی دلجوئی مدنظر ہوتی ہے۔ بایں ہمہ یونیورسٹی میں تقریباً تمام عمر گزارنے کے بعد اور آپ دوستوں کو قریب پا کر کچھ

تقویت بھی محسوس کرتا ہوں۔ چنانچہ شامتِ اعمال کی طرف سے تھوڑی دیر کے لیے بے فکر ہو کر عرض کروں گا کہ رسم الخط کی تبدیلی چاہنے والے احباب ملک کے لسانی حقائق اور لسانی عصبیت کے درمیان جو فرق ہے اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے مقاصد، نقطۂ نظر اور ان کی وکالت میں ایک طرح کا ادعائی رنگ جھلکتا ہے۔ صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ لسانی عصبیت اور لسانی حقیقت دونوں کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ لسانی حقائق زبان کے فطری عملِ ارتقا سے متعلق ہوتے ہیں اور زبان و ادب کے ماہرین کی مسلسل توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف لسانی عصبیت کے عوامل ان کی سطح اور سمت اکثر و بیشتر سیاسی ہوتے ہیں۔ ان کا پلیٹ فارم جدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے بھی پورے طور پر باخبر اور چوکنا رہنا چاہیے۔

جس طرح معاشی و سیاسی عصبیت نے قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی درجے پر امپریلزم کا رنگ اختیار کیا، اسی طرح آج کل نو آزاد ملکوں میں خاص طور پر مختلف لسانی عصبیتیں ملکی درجے پر ایک نئی امپریلزم کو ظہور میں لا رہی ہیں۔ پرانی امپریلزم کمزور اور چھوٹی قوموں اور ملکوں کو زیر کرنے اور رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربوں کو کام میں لاتی تھی۔ نئی امپریلزم بھی نئے نمونے کے حربے کام میں لاتی ہے۔ ایک مختلف اللسان ملک میں قومی زبان کے انتخاب کا اصول بالعموم یہ ہوتا ہے کہ باشندوں کی اکثریت اس سے واقف ہو اور وہ مختلف لسانی علاقوں اور جماعتوں میں رابطہ کی زبان کی حیثیت سے استعمال کیے جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ہمارے ملک میں ہندی کا انتخاب قومی زبان کی حیثیت سے اسی اصول کے تحت ہوا۔ اس طور پر ہر ہندوستانی کے لیے لازمی قرار پایا کہ وہ ہندی سے قابل لحاظ واقفیت پیدا کرے تاکہ قومی زبان کو مقبول اور مالا مال کرنے میں تمام لسانی علاقے زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں۔ یہ فیصلہ سب کی مرضی سے ہوا اور سب نے اسے تسلیم کیا۔ آئین میں ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیتے وقت آئین بنانے والوں نے یہ کہا تھا کہ سرکاری زبان کی تشکیل، ترکیب اور ترویج میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ وہ عام بول چال کی زبان سے بہت قریب ہو اور رہے لیکن عملاً نہ ایسا ہوا نہ ہو رہا ہے۔ عام فہم ہندی کے بجائے بہت زیادہ سنسکرت آمیز ہندی ہمارے سامنے آئی اور لائی جا رہی ہے، یہاں تک کہ اگر سرکاری ہندی کو نئی سنسکرت کہیں تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ وضع اصطلاحات کے پیش نظر ہندی کے لیے سنسکرت کا سہارا لینا نہ صرف ایک فطری امر ہے بلکہ ایک لازمی علمی ضرورت بھی ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے لیے باستثنائے ملیالم، تامل اور اُردو اصطلاح سازی کے لیے سنسکرت ماخذ زبان کی حیثیت رکھتی ہے، ملک نے اسے بھی تسلیم کر لیا۔ اس سے آگے بڑھ کر اب اس پر اصرار ہے کہ چونکہ ہندی راشٹر بھاشا ہے اس لیے راشٹریہ ساہتیہ کی

نمائندگی کا جتنا اور جیسا حق یا اختیار اس کو ہے وہ کسی دوسری زبان کو نہیں اور نمائندگی کا مقصد اس وقت پورا ہوگا جب وہ زبانیں جو ہندی اور اس کے رسم الخط سے دور ہیں، ان دونوں کو اپنانے پر آمادہ یا مجبور کی جائیں۔ اس پس منظر میں میرے نزدیک اُردو رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ ملک میں جس مخصوص ذہنیت رکھنے والوں کا پتہ دیتا ہے، اس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دو زبانوں کو خاص طور پر دیا جاتا ہے ایک اُردو اور دوسرے سندھی کو۔ اس کا ایک سبب بظاہر یہ ہوسکتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں میں ایسی کوئی قوت موجود نہیں ہے جو کسی سیاسی دباؤ کی شکل اختیار کر سکے جس کا لحاظ کرنے پر ارباب اختیار مائل یا مجبور ہوں۔ دوسرے یہ کہ اُردو اور سندھی رسم الخط بدیسی زبانوں یعنی فارسی اور عربی سے مستعار ہیں، اس لیے اس کو قومیانے کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر کلچر کے معیار اور مقاصد کے تعین میں عالمگیریت کے اصول کو اپنانے اور برتنے کے بجائے دیسی اور بدیسی کی تخصیص پر زور دیا جائے گا تو یہ ہمارے ہی نہیں کسی کے تہذیبی مستقبل کے بارے میں کوئی امید افزا علامت نہیں ہے۔ انصاف اور مصلحت اندیشی کا تقاضا یہ تھا کہ ناگری لپی کو اختیار کرنے کا مشورہ پہلے ان علاقائی زبانوں کو دیا جاتا جن کی لپیاں ناگری کے مماثل یا قریب تر ہیں اور جن کی معیاری لغت بیشتر سنسکرت سے اخذ کی گئی ہے یا کی جائے گی۔ ان زبانوں کے لیے ناگری لپی اختیار کرنے سے ملک تہذیبی، ہم آہنگی اور یگانگت کو، جس کا سیاسی نام قومی یک جہتی ہے، زیادہ محکمی نصیب ہوتی۔ یہ اقدام اس مقصد کے حصول میں زیادہ مدد دے سکتا ہے جو ملک کے بہی خواہوں کو بہت عزیز ہے، یعنی ایک مختلف اللسان ماحول میں صرف ایک رسم الخط ہو جو سب زبانوں کے لیے کفایت کرے۔ رسم الخط کے اعتبار سے، اُردو اور سندھی بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناگری لپی اختیار کرنے کے بعد ان کا بین الاقوامی رشتہ ٹوٹ جائے گا اور آئندہ ان کو ہندوستانی کی مقامی زبانوں کی حیثیت حاصل رہے گی اور یہ حیثیت بھی اندیشے سے خالی نہیں، اس لیے ناگری لپی اختیار کرنے کے بعد شاید بنگالی اپنی امتیازی خصوصیت قائم رکھ سکے کیونکہ وہ انڈین یونین کی ایک ریاست کی باقاعدہ زبان ہے برخلاف اس کے اُردو اور سندھی، ناگری لپی اختیار کرنے کے بعد اپنی امتیازی خصوصیات کا تحفظ تو کجا اپنے وجود سے بھی ہاتھ دھوبیٹھیں گی۔ اس لیے کہ نہ ان کا کوئی متعین علاقہ ہے، نہ ان کو وہ آئینی تحفظات عملاً حاصل ہیں جن کا ذکر ایسے کثیر المعانی الفاظ و انداز میں آئینِ ہند میں موجود ہے جن کی تفسیر تو ملتی ہے، تعبیر کی اب تک تلاش ہے۔

اتر پردیش کے ایک دانشور نے جن کو بڑی اہم سرکاری و سیاسی حیثیت حاصل تھی اور ایک فاضل

ادیب بھی تھے، اُردو ہندی کے قصے یا قضیے کا حل اس فارمولے میں پیش کیا تھا کہ ان کو اُردو سے کوئی اختلاف نہ ہوگا اگر وہ ناگری رسم الخط قبول کر لے اور اپنے ذخیرے سے بدیسی الفاظ، تشبیہ، استعارے، تلمیحات وغیرہ خارج کر دے۔ یہ مشورہ یا مطالبہ علمی، ادبی یا لسانی نہیں بلکہ سیاسی جبر وطاقت کا ہے اور سیاسی جبر وطاقت، صلح صفائی اور امن واتحاد کی معین کبھی نہیں، منافی ہمیشہ رہی ہے۔ دانشور موصوف نے اس نیک مشورہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قول کو عمل کے مطابق رکھنے کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر ایک ہمہ گیر وسیع اور منظم پیمانے پر عمل بھی شروع کر دیا۔ وہ بھی اس طور پر کہ قول اور عمل کا رشتہ تطابق سے آگے بڑھ کر تجاوز تک جا پہنچا۔ غالباً وہ جانتے تھے کہ تطابق اگر تجاوز تک پہنچ جائے تو جنگ میں جہاد کا ثواب ملنے لگتا ہے، چنانچہ انھوں نے اور ان کے جانشینوں اور معاصرین نے ایسا کیا کہ اُردو جس کی مادری زبان تھی، اس سے وہ ناآشنا ہوتے ہوتے محروم ہوگئے، چنانچہ موجود پوزیشن یہ ہے کہ اولاد اپنی ماں کی ہے اور زبان دوسرے کی ماں کی ہے۔

اُردو کے حمایتی اس وقت دوگونہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف وہ ابتدائی وثانوی مدارس میں اپنے بچوں کی اُردو تعلیم کی فکر میں بھاگتے پھرتے ہیں، دوسری طرف اس کی تگ ودو میں گرفتار ہیں کہ کالج اور یونیورسٹی کے منازل میں اُردو کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کس طرح کیا اور رکھا جائے۔ ان کی اس دوادوش اور پریشانی کو دیکھ کر حضرت اسماعیلؑ کی ولادت کا واقعہ یاد آتا ہے۔ خدا کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ، اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہ کو ہمراہ لیے ہوئے وادی غیر ذی زرع میں داخل ہوئے تو حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ پینے کا پانی نایاب تھا، اس کی تلاش میں حضرت ہاجرہ دوڑتی ہوئی دور نکل جاتیں۔ حضرت اسماعیلؑ کا خیال آتا تو بھاگتی ہوئی واپس آتی، اس طرح بار بار جاتی آتی رہیں لیکن پانی میسر نہیں آتا تھا۔ آخری بار تلاش سے مایوس وہ پھریں تو دیکھا کہ تکلیف میں مبتلا جہاں حضرت اسماعیلؑ ایڑیاں رگڑتے تھے۔ وہاں سے پانی کا چشمہ ابل رہا ہے۔ یہ آبِ زمزم کی شانِ نزول ہے کہ حضرت ہاجرہ کی تگ ودو، حج کا ایک رکن سعی صفا ومروہ قرار پائی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُردو والوں کی سعی صفا ومروہ سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے یا نہیں؟

اُردو رسم الخط میں جو نقائص بتائے جاتے ہیں وہ اتنے بنیادی نہیں ہیں، جتنے فروعی جو ماہرینِ فن اور شعر وادب کے مبصرین کی توجہ وتعاون سے دور کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کے نقائص سے دنیا کی کوئی زبان خالی نہیں ہے لیکن اس سے ان کی افادیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ آخر کچھ اور زبانیں بھی ہیں جن کا رسم الخط وہی ہے جو اُردو کا ہے لیکن وہ زبانیں نہ مردہ سمجھی جاتی ہیں نہ معطل یا معذور۔ ان سے کام لینے والے کسی احساس کمتری میں بھی کبھی مبتلا نہیں پائے گئے۔ ان زبانوں کے شاعر اور مصنف اور ان کا شعر وادب دنیا کی

کسی ترقی یافتہ قوم یا اس کی زبان سے ہر سطح پر ہمدمی کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ان زبانوں کے سربراہ رسم الخط کی خلش میں کیوں نہیں مبتلا ہیں اور ان سے رسم الخط کے بدلنے کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس میں شک نہیں کہ مخلوط یا مرکب رسم الخط میں نقطوں اور اعراب کی بے ترتیبی، کاتبوں کی عدم استعداد اور کبھی کبھی مولفین لغت کی بے احتیاطی لغت میں بعض بے معنی الفاظ وجود میں لانے کا باعث ہوئی ہے جن کو کچھ نہ کچھ معنی دے کر قبول کرنا پڑا۔ اس طرح کا حادثہ شاید ہی کسی اور زبان کی لغت کو پیش آیا ہو لیکن اس کے مقابلے میں اس رسم الخط کی جو خوبیاں ہیں، ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان خوبیوں کا ذکر اس کثرت سے ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ ان کو دہرانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ اس ڈر سے بھی کہ ان میں سے کچھ بیان کرنے سے رہ نہ جائیں۔ اُردو کا رسم الخط دنیا کے ان چند قدیم و عظیم زبانوں کے رسم الخط کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے، جن پر اپنے اپنے عہد کے کاملین فن اور ارباب علم و فضل کے اپنے ذوق ہنر اور احساس تقدیس و تکریم کو بوجوہ احسن صرف کیا ہے۔ معلوم نہیں فن خطاطی کی یہ محرومی ہے یا منزلت کہ اس پر تجریدی ہنر کا عمل اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ ایک پرانا شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بادصبا کی شوخی چل نہ سکی اس لیے کہ اس نے محبوب کی زلف کو جتنا بگاڑنے کی کوشش کی اتنا ہی وہ بنتی (سنورتی) گئی۔ شعر اس وجہ سے نہیں لکھا کہ ممکن ہے شاعر نے غیر موزوں کہا ہو اور اسی طور پر مجھے یاد آ گیا ہو۔ معلوم نہیں اب اس طرح کی بادِ صبا چلتی ہے اور محبوب ہوتے ہیں یا نہیں لیکن یہ شعر اُردو رسم الخط کے خطِ شکست پر پورے طور پر صادق آتا ہے۔ شاید ہی کہیں اور کوئی رسم الخط ایسا ہو جس کا گھسیٹ لکھنا بھی باقاعدہ ایک فن ہو۔ وہ بھی فن برائے فن نہیں بلکہ فن برائے افادہ۔ خط شکست کا بڑا اہم، عجیب اور افادی پہلو یہ ہے کہ لکھنا تیز تر ہو گیا اور پڑھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کہتے ہیں اُردو رسم الخط کا سیکھنا مشکل ہے۔ اُردو کا صحیح تلفظ بھی آسان نہیں ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اعلیٰ ہنر، یوں بھی سہل الحصول نہیں ہوتا، ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ورنہ نئے ڈھنگ کی فنی بطن الشاعر شاعری اور ''دارالاورا'' مصوری کی مانند، جن کو ہرزہ نوردی یا ہرزہ نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں، ہنر کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی، اُردو رسم الخط کو سمجھنے، سیکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے، پہنچانے اور لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ اسی طرح کے ذوق، استعداد اور توفیق کی ضرورت ہے جو اُردو اور اُردو غزل سے بہرہ مند اور لذت یاب ہونے کے لیے لازم آتی ہے۔ یہ کچھ اُردو ہی کے رسم الخط پر منحصر نہیں ہے، ہر زبان کے شعر و ادب سے واقف اور مستفید ہونے کے لیے لازم آتا ہے کہ اس کا مطالبہ اسی رسم الخط اور اسی زبان میں کیا جائے۔

اگر مجھے اُردو کا مطالعہ اُردو خط کے بجائے کسی اور رسم الخط میں کرنا پڑے تو میرا ذوق، میری عافیت، میری

کارکردگی اور میری بینائی سب جواب دے جائیں گے۔ یہ میں کسی پندار کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں، باوجود اس کے کہ آپ نے میری اس لغزش کو ہمیشہ انگیز ہی نہیں بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کی ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر اعلیٰ ادب کی مانند اُردو کا اس کے شائقین کے ساتھ بڑا قوی اور دلکش رابطہ اس کا رسم خط ہے۔ اُردو کوئی نیم مہذب قبائلی بولی نہیں ہے جس کا نہ کوئی رسم الخط ہوتا ہے، نہ شعر و ادب، شاید اس پر مرنے اور ماتم کرنے والے بھی زیادہ نہیں ہوتے۔

میں اُردو رسم الخط کو ترک کر دینے کے حق میں نہیں لیکن اس کی پرزور تائید کروں گا کہ اُردو کی قابل قدر تصانیف ہندوستان کی دیسی بدیسی زبانوں میں بڑی احتیاط اور اہتمام سے شائع کی جائیں۔ اس سے ایک طرف اُردو کا رشتہ عربی، فارسی سے بدستور قائم رہے گا، دوسری طرف ملک کی تمام قابل لحاظ زبانوں سے اس کا رشتہ استوار ہوگا۔ اس طرح اُردو کا ملکی زبانوں سے آشنا ہونے اور رہنے اور دوسری زبانوں کو اُردو سے آشنا ہونے اور رہنے کا جو حق ہے وہ بطریق احسن پورا ہوگا۔ کیا اس سے وہ تعمیری و تہذیبی مقصد پورا نہیں ہوتا جو اُردو رسم الخط کو یکسر ترک کر دینے اور دوسرے کسی رسم الخط کو اختیار کر لینے سے متوقع ہے؟ اُردو رسم الخط کو بالضرور ترک کیا جائے اور دوسرا رسم الخط بالضرور اختیار کیا جائے، یہ منطق تو اسی کی ہو سکتی ہے جو منطق اور عقل سلیم دونوں سے بہرہ ور ہو۔

اُردو رسم الخط کاملین ادب اور شرفائے فن کے بڑے طویل، مسلسل اور مقدس ریاض، شوق اور شغف کا نتیجہ ہے۔ بذات خود مدت الایام سے مروج اور مقبول ہر رسم الخط کو یہی درجہ دیتا ہوں۔ بے سوچے سمجھے کسی رسم الخط کو ترک کرنے کا مشورہ دینا یا اس کا مرتکب ہونا یا اس سے کھیلنا ایک بڑے ہی قیمتی ورثے اور تعمیر کو تاراج کرنا ہوگا۔ رسم الخط زبان کا لباس نہیں ہوا کرتا کہ جب جی چاہا اُتار دیا اور دوسرا اختیار کر لیا۔ یہ زبان کی مخصوص ہیئت، حسن، مزاج اور اس کا نشانِ امتیاز ہوتا ہے جس کو اس کی ''شخصیت'' یا ''ذات'' سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کا بدلنا نہ آسان ہے نہ عقل مندی۔ اس کے بدلنے سے اُردو زبان و شعر و ادب اور اس کے پیچھے جو تاریخ و تہذیب ہے، وہ ایک گورستان بن کر رہ جائے گی۔ یہاں اقبال کا ایک مقولہ یاد آتا ہے جو کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ رسم الخط زبان کی عزتِ نفس (Self Respect) ہوتا ہے، اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ اقبال نے اس نکتے میں اپنے مخصوص عارفانہ، شاعرانہ انداز میں حرف آخر کہہ دیا ہے۔ بایں ہمہ اس طرح کے مسائل میں اصلاح، اجتہاد اور اجماع کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش اسی طرح ممکن ہے۔ یہ تلاش و تجسس انسان کا بہت بڑا شرف اور بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ خوب سے خوب تر ہم تک اسی طرح سے

پہنچا ہے اور ہم نے دوسروں تک پہنچایا ہے!

زبان، رسم الخط اور ادبی سرمایہ کے اعتبار سے اُردو قطعاً آزاد حیثیت کی مالک اور بلند مقام پر فائز ہے۔ اس کی طبعی نشو و نما اور تہذیبی ساخت پرداخت میں ہندوستانی تمدن کے مشترک دلکش اور گراں بہا عناصر کے ساتھ، عرب و عجم کی شنگرف کاری کی بڑی مبارک اور واضح جھلک ملتی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر وہ ایک مخصوص اور منفرد تہذیبی مزاج اور روایت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم عہد حکومت، بالخصوص مغل عہد میں، جب کم و بیش کل ہند پیمانے پر ملک کی ہمہ جہتی تنظیم عمل میں آئی تو نہ صرف ملک کے مختلف خطوں کے درمیان آمد و رفت بڑھنے سے تہذیبی واقفیت اور یگانگت پیدا ہوئی بلکہ ایران و عرب کے بے شمار علما، اطبا، فضلا، صوفیا، شعرا، تجار، اہل فن و حرفہ نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ہندوستان کی طبعی، حکومتی، سماجی اور تہذیبی فضا نے ان کو اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد دی اور انھوں نے ان صلاحیتوں سے ہندوستان کا نام روشن اور بلند کیا اور یہیں کے ہو رہے۔ تاریخ اور تاریخی آثار یہی کہتے ہیں، ان کو مٹانے اور مسخ کرنے والے چاہے جو کہیں یا کریں!

مغل دور معاشی اور سیاسی کوائف سے قطع نظر، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس زمانے میں ہندوستان کو جس صحت مند اور وسیع پیمانے پر آزاد تہذیبی ارتباط کے جیسے سازگار مواقع میسر آئے۔ وہ ہماری تاریخ کے کسی اور دور میں شاید ہی نظر آئیں۔ اس عہد میں تہذیبوں کے اتصال سے جو ''سنگینی'' تہذیب برآمد ہوئی، اُردو اسی کا نغمہ نشید ہے۔ اس طور پر وہ اس تہذیب و شائستگی کی نمائندگی کرتی اور دعوت دیتی ہے جو ہر اچھی تہذیبی قدر کو خواہ وہ کسی کی ہو یا کہیں سے آئی ہو، عزیز رکھتی ہے۔ اُردو کو یہ درجہ میرے آپ کے کہنے سے نہیں ملا ہے، اسے یہ درجہ حاصل ہوا ہے اس کردار کی بنا پر جو اس نے ہماری تہذیبی تاریخ میں ادا کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اُردو ہندی کی شیلی ہے، کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا تو ہرگز نہیں ہے، مبتلا کرنے کا شوق فضول ضرور ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اُردو زبان اور رسم الخط اپنا مستقل اور آزاد وجود رکھتے ہیں۔ اس زبان کے بعض نام نہاد دوست قومی ہم آہنگی کے دلکش خواب کو اقلیتی انہدام اور انضمام کی تبدیلی اور تعبیر میں دیکھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا مستقبل صرف اس صورت میں متعین ہو سکتا ہے جب اُردو کو ہندی کی شیلی کی حیثیت دی جائے اور وہ ناگری کی لپی اختیار کرے۔ صورت حال یہ ہوگی تو ظاہر ہے اُردو کے بہی خواہ کس طرح اور کیا سوچنے پر مجبور ہوں گے؟

جانتے ہم دونوں ہیں، میں کم آپ زیادہ کہ بعض ملکوں اور قوموں نے اپنی زبان کے رسم الخط میں

بہتر تبدیلی لانے کی خاطر نہایت اہم اقدامات کیے ہیں یعنی پرانے رسم الخط کی جگہ نئے رسم الخط اختیار کر لیے ہیں۔ ان تجربات اور تبدیلیوں کے بارے میں میرا مطالعہ محدود ہے، لیکن ممکن ہے ناقص بھی ہو۔ اس لیے تفصیلی بحث کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ تاہم ان تجربوں اور تبدیلیوں کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو میری سمجھ میں آئے۔ اس میں دو فائدے ہیں، ایک یہ کہ اگر میری سمجھ میں صحیح آئے ہیں تو آپ کو زیر بحث مسئلے سے دلچسپی پیدا ہوگی، غلط آئے ہیں تو آپ کو مجھ سے ہمدردی ہوگی۔ ایک میں مجھ کو ثواب ملے گا، دوسرے میں آپ کو، برابر کا ایسا سودا آج کل کہاں دیکھنے میں آتا ہے، بالخصوص اصحاب علم وفن کی محفل میں!

آپ جانتے ہیں اس صدی میں چند ملکوں مثلاً ترکی، جرمنی اور انڈونیشیا نے اپنے روایتی رسم الخط کی جگہ نیا رسم الخط اپنایا ہے۔ ترکی کا پرانا رسم الخط تقریباً عربی یا تمام تر عربی خط سے ماخوذ تھا، اس لیے اس کو ترک کر کے بالکل نیا یعنی رومن رسم الخط اختیار کیا۔ جرمن زبان کا اپنا ایک قدیمی روایتی رسم الخط تھا اور ہے جسے برقرار رکھتے ہوئے اس کی کوشش کی گئی کہ رومن رسم الخط کو عام طور پر قبول کر لیا جائے۔ ایسا بھی ہو گیا لیکن جرمن زبان کا پرانا رسم الخط ختم نہیں ہوا ہے۔ ہر جرمن لازمی طور پر اپنے روایتی رسم الخط سے واقف ہوتا ہے، اس لیے کہ سکول میں زبان کی تعلیم دیتے وقت بچے کو اس رسم الخط سے واقفیت پیدا کر دی جاتی ہے۔ انڈونیشیا میں کوئی ایسا قدیم معیاری رسم الخط موجود نہ تھا جو ملک کے ہر حصے یعنی جاوا، ساٹرا، دو بڑے جزیروں کے ساتھ، بے شمار دوسرے جزائر میں بھی یکساں طور پر رائج ہوتا۔ بالفاظ دیگر ملک کی کوئی مشترک معیاری زبان نہ تھی۔ آزادی کے بعد ملک کی قومی زبان کے انتخاب کا وقت آیا تو قوم نے اس زبان کے حق میں فیصلہ کیا جس کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ (Basic Vocabulary) ملک کی مختلف بولیوں کے مشترک عناصر و اقدار سے مستعار ہو اور اس زبان کا رسم الخط رومن قرار پایا۔ اس طور پر یہ زبان جو بھاشا انڈونیشیا کہلاتی ہے، ذرا بدلی ہوئی شکل میں گاندھی جی کی ہندوستانی کے تصور کی عملی تعبیر ہے۔ گاندھی جی کا قومی زبان کا تصور کم وبیش یہ تھا کہ یہ ایک ایسی زبان ہوگی جس کا ذخیرۂ الفاظ ملک کی تمام زبانوں سے ماخوذ ہوگا اور یہ ایک عام فہم زبان ہوگی جسے ناگری اور فارسی دونوں لپیوں میں لکھنے کی اجازت ہوگی تاکہ قومی زبان کو ہر ہندوستانی خوشی سے سیکھے اور کام میں لائے۔ گاندھی قومی زبان اور اس کے رسم الخط کو دلوں کو جوڑنے اور ذہنوں کو کشادہ اور صحت مند رکھنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ ان کو زور اور زیادتی کا بہانہ بنانے پر کبھی آمادہ نہ کیے جا سکے اور نہ کیے جا سکتے تھے۔

ان ممالک کے رسم الخط میں متذکرہ تبدیلیوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تینوں ملکوں میں مختلف اسباب ومحرکات کارفرما تھے جنھوں نے ان تبدیلیوں کو ایک خاص شکل اور ہیئت دی۔ ترکی میں رسم

الخط کی تبدیلی ایک عظیم سیاسی انقلاب کا نتیجہ تھی۔ جدید ترکی کے سربراہوں نے صحیح یا غلط، مگر پوری قوت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ ترک قوم اپنی تقدیر کی نئی تعمیر کی خاطر، ہر اس چیز کر ترک کردے گی جو ان کو اپنی کلفت اور ہزیمت کی یاد دلاتی ہو اور ہر وہ بات اختیار کرے گی جو ان کے نزدیک انھیں اقوام عالم میں بلند کرنے اور رکھنے میں مدد پہنچائے گی۔ یہ فکری رویہ اور ملی جذبہ تھا جو سبب تھا ان کے عربی رسم الخط کو ترک کردینے اور رومن رسم الخط اختیار کرنے کا۔ اس وقت یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ زبان و ادب اور تہذیب و تمدن پر رسم الخط کی اس تبدیلی کا کیا اور کتنا اثر پڑا۔ صرف اتنا واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اُردو والوں کے نہ ایسے حالات ہیں، نہ ایسے محرکات جو ذہنی مماثلت رکھتے ہوں۔ آج سے تقریباً پچاس برس پہلے کی ترکی اور ترکوں کے حالات و حوادث سے!

جرمن زبان کے لیے رومن رسم الخط کے عام استعمال کی تحریک کا زیادہ تر مقصد ایسا رسم الخط اختیار کرنے میں مدد دینا تھا جو بین الاقوامی سطح پر عالم گیر حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کی بیشتر زبانوں نے رومن خط کو بطور قومی رسم الخط اختیار کرلیا تھا۔ ان حالات میں جرمن قوم کو اس کا احساس ہوا کہ ایک بین الاقوامی رسم الخط کے عام استعمال سے اس کی تہذیب، تمدن اور مواصلات کو فروغ دینے میں مدد ملے گی۔ یورپ میں جرمن بولنے والے علاقے جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے نہایت واضح مخصوص اور منظم شکل میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان علاقوں میں کسی اور زبان یا رسم الخط کی عدم موجودگی کی بنا پر ایک بین الاقوامی رسم الخط کا استعمال ان کے لیے کسی الجھن یا پیچیدگی کا باعث نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لیے جرمنی میں رومن رسم الخط کے عام استعمال کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ اُردو سے تعلق رکھنے والے بالکل مختلف صورت حال سے دوچار ہیں، اس لیے جرمنی کی مثال سامنے رکھ کر اُردو رسم الخط کو بدلنے کا مشورہ نہ قرینِ منطق ہے، نہ قرینِ مصلحت!

انڈونیشیا نے رومن رسم الخط اختیار کرتے وقت جن مقاصد کو پیش نظر رکھا، ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس نے قومی زبان کی تعمیر و ترقی میں جس لسانی پالیسی کو اپنایا ہے، وہ دانش مندانہ اور قابل ستائش ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ وقت گیا اور وہ قیادت رخصت ہوگئی جو قومی لسانی پالیسی کو ہندوستانی تہذیب کے موقف و معیار کے مطابق تشکیل دینے کی اہل بھی تھی اور خواہش مند بھی۔ اُردو والوں کے لیے انڈونیشیا کے رسم الخط کی پالیسی کو اپنانا ممکن نہیں، اس لیے کہ اُردو قومی سرکاری زبان کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ ایک ایسی تہذیبی اقلیت کی نمائندگی کرتی ہے جو ایک ناروا لسانی پالیسی کی شکار ہے اور دفاعی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کر

دی گئی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ جس کو جان اور آبرو کی پڑی ہو، اس کو شور سودائے خط و خال کہاں؟

ماضی قریب میں رسم الخط کی ان کلی تبدیلیوں کے علاوہ اس کی اصلاح، کمی و بیشی یا تنظیم نو سے متعلق متعدد مثالیں سامنے آئی ہیں، ان کو سائنٹیفک تبدیلیوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ان کو عمل میں لانے سے قبل مناسب ماحول میں نہایت معروضی و ماہرانہ انداز میں مطالعے اور تجربے کیے گئے۔ مثال کے طور پر چینی رسم خط میں کیے گئے تجربے کو لیجیے۔ چین کا قدیم روایتی رسم الخط اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی مخصوص خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ حروف تہجی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ علامتوں سے تشکیل پایا ہے یا ان کے مرکب ہے۔ تہجاتی (Alphabetically) اور علامتی تصوراتی (Ideographic) لکھاوٹیں قطعاً مختلف چیزیں ہیں۔ زبان نویسی کے تہجاتی طرز میں ہر حرف کسی لفظ یا صوت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علامتی طرز میں علامت یا نشان کسی لفظ یا صوت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ براہ راست شے یا اشیا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میرا ان میں سے کسی ایک کا بھی تخصیصی مطالعہ نہیں ہے، اس لیے کوئی اندازہ نہیں کہ دونوں کے عیب و ہنر کیا ہیں۔ البتہ اتنا عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں جدید چین میں ایک نہایت انقلابی تجربہ کیا گیا ہے یعنی چینی زبان کے قدیم علامتی طرز کے رسم الخط کا ایک متبادل تہجاتی طرز دریافت کر لیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ قدیم علامتی طرز سے واقف ہونے کے لیے تقریباً ساڑھے چار سو علامتوں یا نشانات کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اب جو نیا تہجاتی طرز دریافت ہوا ہے وہ صرف کم و بیش پینتالیس حروف تہجی پر مشتمل ہے۔ جدید عہد میں رسم الخط سے متعلق سائنٹیفک تجربات کے سلسلوں میں غالباً یہ سب سے بڑا تجربہ ہے اور مثالیں بھی سننے میں آئی ہیں، مثلاً یہ کہ جدید روسی زبان کے صوتی اور لفظی نظام کو زیادہ جامع اور سائنٹیفک بنانے کی غرض سے اس کے حروف تہجی میں اصلاح یعنی قطع و برید کی گئی ہے۔ رسم الخط میں ان بنیادی تجربات کے علاوہ ہر اہم اور ترقی یافتہ زبان میں املا اور تلفظ کی اصلاحات سے متعلق مسلسل تحقیقات اور تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

رسم الخط کے متعلق ان تمام تبدیلیوں کی غایت اور اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ اُردو رسم الخط نہ علامتی ہے، نہ ہماری زبان کے صوتی نظام کی تنظیم نو کا کوئی ضروری مسئلہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک بے ضرورت بحث میں آپ کو حصہ لینے یا الجھنے کی دعوت دی جائے۔ موجودہ بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ احباب جو ہم کو ناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، انھوں نے فارسی اور ناگری رسم الخط کے مطالعے اور موازنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی ہے، نہ وہ ایسے نتائج نکالنے میں کامیاب ہوئے

ہیں جن کی روشنی میں ان کا یہ مطالعہ قابل لحاظ ہوتا رسم الخط کی تبدیلی کی ایسی بے سوچی سمجھی تجویز آج تک مشکل ہی سے کہیں اور پیش کی گئی ہوگی۔ اُردو کے لیے ناگری رسم الخط کی تائید کرنے والوں کو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (لکھنؤ) کی اس رائے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے:

> ''ناگری کے طرفدار اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں، یہ دعویٰ حقیقت سے بہت دور ہے کہ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ (اس زبان کے) معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہے۔ دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود ہندی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا ہوسکتا۔ ان حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ ہر زبان کے الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جاسکتے ہیں۔ اُردو رسم الخط کے لیے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا مگر اتنا تو بے خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اُردو حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں'' (اُردو کا رسم خط۔ از: سیّد مسعود حسن رضوی، ادیب رسالہ شب خون، نومبر ۱۹۷۰ء ص ۶)۔

مذاکرہ کے طور پر اُردو رسم الخط کے بدلنے کے لیے وقتاً فوقتاً ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہ خیال کرنا کہ اس سے جو اصحاب اُردو یا اُردو رسم الخط سے بدگمان یا الرجک ہیں، وہ اس کے عاشق زاد بن جائیں گے صحیح نہیں ہے۔ اُردو رسم الخط کی حمایت اور اس کو زیادہ مقبول اور مستحکم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اُردو رسم الخط کے کینڈے یا ہیئت اور نوک پلک میں درک یا اس کا ذوق رکھتے ہوں وہ اپنی ان اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاکر موجودہ رسم الخط کو زیادہ کارآمد اور خوش نما بنانے کی تجویز پیش کریں اور وہ مناسب و مقبول تسلیم کی جائیں تو ان کو برسرکار لانے اور معقول بنانے کی کوشش کریں۔ ان سے کچھ کم کارگر مساعی ان دوستوں اور بزرگوں کی نہ ہوں گی جو اُردو زبان اور رسم الخط میں شعر و ادب کے خوب سے خوب تر نمونے مسلسل پیش کرتے رہیں جن سے فائدہ اور لطف اٹھانے کے لیے دوسری زبانوں کے اعلیٰ شاعر و ادیب اور فن کار اُردو ادب اور اس کے رسم الخط کی طرف بے اختیار مائل ہوں گے، کرنے کی یہ مفید لیکن نہایت صبر آزما اور ریاض طلب باتیں ہیں۔ ویسے اکبر کے مقولے کے مطابق پلاؤ کھانے کے لیے نہ فوتی کی کمی ہے نہ

فاتحہ کی اور آپ کہیں تو اس میں ''فتنے'' کو بھی شامل کر دوں۔

زبان اور رسم الخط کی طرف بہر صورت ہمارا رویہ مثبت اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے۔ اس مسئلے میں عرض کروں گا کہ اُردو رسم الخط سے متعلق بنیادی تحقیق و رہنمائی کے کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کرنا چاہیے جہاں زبان اور رسم الخط کے ماہرین مناسب ماحول میں ضروری وسائل کے ساتھ مستقلاً تحقیق و تدقیق کے کاموں میں مصروف رہ سکیں۔ اس کام کے لیے میرے نزدیک دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کا انتخاب بہتر ہوگا اس لیے کہ ان اداروں میں یکسوئی کے ساتھ موزوں ماحول میں تمام وسائل کی مدد سے، فن و ادب کے کاملین کی رہنمائی میں اعلیٰ سطح پر کام کرنے کی جو سہولت ہوگی وہ شاید کہیں اور آسانی سے میسر نہ آئے۔

یہ قصہ تو اپنی جگہ پر رہا لیکن اُردو کا مستقبل ہندوستان، پاکستان یا کہیں اور کتنا ہی یاس افزا کیوں نہ معلوم ہوتا ہو اور اس کی تصدیق اصحاب اختیار، اغراض و اقتدار کے ناروا سلوک اور اس کے المناک نتائج سے کیسی ہی ہوتی ہو، یا ارباب علم و ماہرین فن کے بیانات اور شمار و اعداد اس کی کیسی ہی تاریک تصویر پیش کرتے ہوں، یہ امر مسلم ہے کہ افراد و جماعت میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے جس کو جینے اور جیتے رہنے ہی کا نہیں بلکہ عزت سے جینے اور اس سے زیادہ عزت سے مر جانے کا عزم کہتے ہیں۔ یہ چیز نہ اعداد و شمار کو خاطر میں لاتی ہے، نہ سیاسی اور جماعتی جبر و اقتدار کو۔ اعلیٰ مقاصد کی حفاظت اور حصول میں اس عزم پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ حق کی حمایت حق کا حصول ہے، میزائلیں اور تسخیر قمر کا دور چاہے جو کہے یا کرے، ہوگا وہی جو مردانِ حق چاہیں اور کریں گے۔ انسان کی تاریخ اور تقدیر یہی رہی ہے اور رہے گی!

تعجب نہیں لیکن افسوس ضرور ہوتا ہے کہ بعض ایسے ادیب اور شاعر جن کا شمار اُردو کے مشاہیر میں ہوتا ہے، ایسے نازک مسئلے میں یا مواقع پر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح ان کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ آزمائش کا سامنا ہو تو سچے اور پکے لوگ خطرے کا مقابلہ کرتے ہیں، منافع نہیں کماتے۔ یہ تو سیاست کے دسترخوان پر ہوتا ہے جہاں حرام و حلال نہیں دیکھتے، شکم سیر ہونے، رہنے یا کچھ نہ کچھ لے بھاگنے کی فکر کرتے ہیں۔ ادب، تہذیب اور اقدار کی حفاظت اور حمایت کا معرکہ ہو تو رخ کربلا کی طرف رکھتے ہیں۔ کوفہ کی جانب نہیں!

☆☆☆

اُردو رسم الخط...... چند خیالات

جس طرح وہ تمام الفاظ جو اُردو میں رائج ہیں اور عام استعمال کی وجہ سے اُردو زبان کا جز بن گئے ہیں، چاہے ان کی اصل عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، پرتگالی اور انگریزی کیوں نہ ہوا، اُردو ہی کے لفظ سمجھے جاتے ہیں اور اُردو ہی کے قواعدی اصولوں کا اطلاق ان پر ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ رسم الخط جس میں اُردو زبان بالعموم لکھی جاتی ہے اور اُردو رسم الخط کہا جائے گا چاہے اس کی اصل عربی اور فارسی کا وہ رسم الخط ہو جو ابتدائی سامی رسم الخط سے وجود پذیر ہوا یا کوئی اور۔ اسے اس وجہ سے بھی اُردو رسم الخط کہنا ہی مناسب ہوگا کہ اس کی بہت سی صوتی علامتیں وہ ہیں جو نہ عربی میں پائی جاتی ہیں، نہ فارسی میں ان کی تخلیق نہ صرف یہ کہ اُردو ہی کے لیے ہوئی ہے بلکہ اُردو زبان کے آغاز اور ارتقا سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اُردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے تو اس کے رسم الخط کو بھی اسی طرح آزاد اور مستقل رسم الخط ماننا چاہیے کیوں کہ تقریباً آٹھ سو سال سے یہی رسم الخط اُردو کے تحریری اظہار کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اُردو رسم الخط پر کوئی گفتگو کرنے سے پہلے اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جب اُردو زبان کا آغاز ہوا اس وقت اس کے بولنے والے وہ لوگ تھے جو یا تو ایران، عرب، ترکستان، منگولیا وغیرہ سے آئے تھے اور اپنی زبانیں رکھتے تھے یا ہندوستان کے وہ باشندے تھے جن کی اپنی اپنی علاقائی بولیاں یا زبانیں تشکیلی حالت میں موجود تھیں۔ یہ صرف تاریخ کا تقاضا تھا کہ بول چال کی ایک نئی مشترک زبان پیدا ہو۔ مخصوص سماجی اور تہذیبی ضروریات نے ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو کئی زبانیں بولنے والوں کی مشترک تمناؤں کی مظہر تھی۔ ہوسکتا ہے کہ جب اسے تحریری شکل دینے کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت یہاں کی مختلف لکھاوٹوں میں سے کوئی ایک لکھاوٹ اس کے لیے اختیار کر لی جاتی لیکن جس طرح یہ بات ہو کر رہی کہ یہاں کی ایک بولی تغیرات سے گزر کر اُردو بنی اسی طرح اس نے ترمیم و تغیر کر کے اپنے لیے ایک رسم الخط کا بھی انتخاب کیا جو املا اور صوتی علامات کے لحاظ سے اس رسم الخط سے مختلف ہے جس پر وہ مبنی ہے۔ ہندوستانی رسم الخطوں میں سے کوئی رسم الخط اختیار نہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں اس وقت کوئی معیاری اور عام

رسم الخط مستعمل نہ تھا، جو تھے بھی ان میں بہت سی وہ صوتی علامتیں موجود نہ تھیں جو اُردو زبان کی تشکیل میں شامل ہو چکی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کمی تو اس رسم الخط میں بھی تھی جس پر اُردو رسم الخط کی بنیاد ہے لیکن تاریخی اور تہذیبی اسباب کا شعور رکھنے والے بڑی آسانی سے اس انتخاب کی حقیقت سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ ایک سامنے کی بات تو یہی ہے کہ ہندوستان کے کسی رسم الخط میں ث ح خ ذ ز ژ ص ض ط ظ ع غ ف ق کی آوازوں کے لیے تحریری علامتیں موجود نہ تھیں۔ اس کے برعکس عربی اور فارسی رسم الخط میں ہائیہ آوازوں کے علاوہ صرف ٹ ڈ ڑ کے لیے علامتیں نہیں تھیں۔ ہائیہ کے لیے، بہت سی علامتوں کے بجائے جہاں ضرورت ہوئی حرف صحیح میں ھ لگا کر ہائیہ آوازوں (ک + ھ = کھ، گ + ھ = گھ، ڈ + ھ = ڈھ، ت + ھ = تھ وغیرہ) کی علامتیں بنالی گئیں اور ٹ ڈ ڑ کی ضرورت بھی ایک ہی قسم کی معمولی تبدیلی سے پوری کر لی گئی (پہلے چار نقطے لگا کر، پھر دو نقطے اور ایک مختصر سا خط کھینچ کر اور پھر ط کی علامت کا اضافہ کر کے) یہ سارا عمل ضرورت اور وقتی سوجھ بوجھ کے تابع تھا۔ اس طرح ایک رسم الخط جس سے بہت سے لوگ مانوس تھے، ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ اُردو کی ابتدائی شکل سے وابستہ ہو گیا۔ ہر زبان کو ایک منزل پر کسی نہ کسی رسم الخط کی ضرورت پڑی ہے۔ کیونکہ زبان ملفوظی اور صوتی حیثیت سے پہلے وجود میں آ جاتی ہے اور تحریری حیثیت سے بعد میں۔

رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ایک پہلو اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ کسی زبان کے پاس کوئی رسم الخط نہ ہونا ایک بات ہے اور برا بھلا کوئی رسم الخط ہو، اس کا بدلنا بالکل دوسری بات۔ لاکھوں سال پہلے جب انسان نے بولنا شروع کیا تو اس کے پاس کوئی رسم الخط نہ تھا۔ صرف بولی جانے والی زبان تھی جو کئی منزلوں سے گزر کر آوازوں کی بنیاد پر وسیلۂ اظہار بنی تھی۔ تحریر تک پہنچنے کی منزل کیوں کر آئی اس کے متعلق میں اپنے ہی ایک بیس سال پہلے کے لکھے ہوئے مضمون کی کچھ سطریں نقل کرنا چاہتا ہوں:

> ''اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زبان پہلے وجود میں آئی۔ اس کی ابتدا جو شکل بھی رہی ہو، وہ اظہار خیال اور اظہار جذبات کا ایک ذریعہ تھی۔ اس کا مقصد اظہار و ابلاغ تھا۔ اس سے وہ ضرورت پوری ہوتی تھی جس سے سماج کے ذہن میں کسی حد تک یکسانیت اور وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بحث بھی اٹھتی ہے کہ سب سے پہلے زبان کہاں اور کن لوگوں میں پیدا ہوئی؟ ابتدا میں ایک زبان تھی یا کئی زبانیں؟ یہاں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں...... ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ زبان انسانوں میں پیدا ہوئی اور ایک زبردست اجتماعی اساس کی حیثیت سے

ابتدائی تمدن کو منضبط کرنے میں معین ہوئی .... جب زبان اجتماعی زندگی کی تشکیل میں اتنی اہم ثابت ہوئی، جب اس نے ارتقا میں مدد دی تو اس کی خود بھی ترقی ہوئی اور انسانی ذہن نے اس عجیب و غریب ایجاد کو دوام بخشنے کے لیے رسم الخط ایجاد کرنے کی کوشش بھی کی........... جہاں تک رسم الخط کے سلسلہ میں تحقیقات ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا تصویری حروف کی مختلف شکلوں سے ہوئی۔ مصری، بابلی، چینی اور ہندوستانی، فن تحریر کو دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے اور یہودی حضرت موسیٰؑ سے۔ اس میں شک نہیں کہ تحریر کی ایجاد بھی تسخیر فطرت کا ایک ذریعہ تھی اور اپنی قوت یادداشت کو دیرپا اور قوی تر بنانے کے لیے انسان نے اپنے خیالات کو جانی بوجھی تصویروں میں منتقل کر لیا تا کہ تلازمۂ ذہنی کی مدد سے وہ اپنے خیالات اور تجربات کی باز آفرینی پر قادر ہو سکے۔ یہ اہم سماجی کارنامہ سحر اور ٹونکے کے تصور پر مبنی تھا لیکن جب اس پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ سحر کی مدد سے بھی فطرت کو شکست دینے یا اس پر قابو پانے ہی کی کوششیں کی جاتی تھیں کیونکہ انسان اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرت کے خلاف جدوجہد کرنے لگا تھا اور اپنے محدود مادی وسائل سے کام لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ تحریر آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ یادداشت میں سب سے زیادہ مدد قریب ترین مماثلت سے ملتی ہے اس لیے چیزوں کی تصویریں سب سے زیادہ فطری تحریر کہی جا سکتی ہیں...... لیکن زبان محض اشیاء کے ناموں کا مجموعہ تو نہیں۔ متحرک زندگی میں بنی بنائی چیزیں کم ہیں، خیالات کی رفتار عمل کی مختلف صورتوں اور حالتوں میں ربط پیدا کر لیتی ہے۔ اسی لیے تصویری تحریر کے علاوہ تصوری تحریر بھی پیدا ہوئی یعنی الفاظ خیالوں کی ملفوظی اور صوتی علامات بھی بن گئے......

تصویری تحریر خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتدائی اور بھدی کوشش تھی لیکن جب انسانی ذہن استوار ہوا اور اس کی تجدیدی طاقت بڑھی تو اس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی...... حروف تہجی یا صوتی علامتیں ان ہی تصویری یا تصوری تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ عبرانی اور یونانی حروف تہجی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حرف کوئی معنی رکھتا ہے اور ان کی ابتدائی شکل اس مفہوم یا معنی

سے صوری مماثلت رکھتی ہے۔ جب لکھنے کا فن ایجاد ہوا تو تاثر اور ردعمل کو دوام بخشنے کے لیے صوتی تصویروں کو جو سامعہ کی مدد سے ذہن میں بنتی تھیں، تحریری علامتوں میں منتقل کر دیا گیا اور وہ تاثر باصرہ کی مدد سے ذہن پر منعکس ہونے لگا۔"

اس عبارت کو نقل کر کے ذہن کو دو باتوں کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ ایک یہ کہ جب تک کسی زبان کے لیے کوئی رسم الخط معین نہ ہو اس کے لیے رسم الخط اختیار کرنے یا بنانے کا معاملہ اور ہے اور جب زبان کا کوئی رسم الخط موجود ہو تو اسے بدلنے کا مسئلہ بالکل دوسرا ہے۔ تقریباً پچاس سال پہلے روس کے مختلف علاقوں میں کئی زبانیں ایسی بولی جاتی تھیں جن کا کوئی رسم الخط نہ تھا کیونکہ وہ کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھیں، اس لیے ماہرین نے روسی رسم الخط میں ترمیمیں اور اضافے کر کے ان زبانوں کی صوتیات کے مطابق ان کے لیے رسم الخط بنا دیے اور وہی رائج ہو گئے لیکن جب کسی زبان کے لیے کوئی رسم الخط برابر استعمال ہوتا رہا ہو اس وقت اس کا رسم الخط بدلنے میں اکثر و بیشتر دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے جیسا کہ ترکی اور بعض دوسری زبانوں کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے کے سلسلے میں ہوا، دوسری بات جسے سمجھنا ہے وہ یہ ہے کہ زبان اور رسم الخط اختیار کرنے کے سلسلہ میں ہوا، دوسری بات جسے سمجھنا ہے وہ یہ ہے کہ زبان اور رسم خط تاریخ و تہذیب کی دین ہیں۔ ان میں کوئی بڑی تبدیلی اسی وقت ہو سکتی ہے جب تاریخ اور تہذیبی سانچے میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ اس کے اندر زبان و رسم الخط کی سمائی نہ ہو سکے۔

اُردو رسم الخط کا مسئلہ انھیں علمی، تاریخی اور نفسیاتی حقائق سے وابستہ ہے۔ ماہرین رسم الخط کی بڑی تعداد اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ تصویری اور تصوری تحریروں کے بعد تجریدی علامتوں کا آغاز شمالی سامی قوموں کے یہاں ملتا ہے۔ انھیں کی مختلف شاخیں کنعانی، عمرانی، فنیقی، ارامی، جنوبی، سامی اور یونانی کے روپ میں بڑھیں اور پھلیں۔ ارامی رسم الخط خاص طور سے معمولی اور بڑے تغیرات اور اضافوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں پہنچا۔ چنانچہ بعض اہم علما کا خیال ہے کہ وہ برہمی رسم الخط بھی اسی کے اثرات سے وجود میں آیا جسے ہندوستان کے قدیم رسم الخطوں کا مخرج اور منبع سمجھا جاتا ہے۔ یقین سے کچھ کہنا اس لیے مشکل ہے کہ ایک طرف تو ابھی تک وہ دراوڑی تحریریں ٹھیک سے پڑھی نہیں جا سکی ہیں جو موہنجوڈاڑو اور ہڑپا میں ملی ہیں اور جن کا رشتہ سمیری اور بابلی سے جوڑا جا سکتا ہے اور دوسری طرف گوتم بدھ سے پہلے فن تحریر کے متعلق کوئی حوالہ قدیم ہندو صحیفوں میں نہیں ملتا۔ تحریر کا انقلابی فن گو ابتداً بادشاہوں، پروہتوں اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ مضبوط کرتا رہا اور کبھی زبان کی طرح عام نہ بن سکا لیکن اس نے زبان کی حفاظت کی۔ اس کی بے ترتیبی میں نظم پیدا کیا اور

آوازوں کو بامعنی شکل میں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا۔ تحریر ہی لسانی اور معنوی تغیرات کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ جب آوازوں کو محفوظ رکھنے کے سائنسی ذرائع وجود میں نہیں آئے تھے، اس وقت صرف تحریر زبان کو استحکام بخشنے اور گزری ہوئی نسلوں سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ تھی بلکہ دوسرے ذرائع کے مقابلہ میں آج بھی عمومی اہمیت رکھتی ہے۔ غرض کسی زبان ہی کی طرح رسم الخط کی کہانی بھی دلچسپ اور دائرہ عمل وسیع ہے اور تہذیبی تسلسل کو برقرار رکھنے کی سب سے مضبوط اور سب سے اہم کڑی۔

زبان بدلتی رہتی ہے اور گو اسی رفتار سے نہیں لیکن رسم الخط میں بھی تغیر اور ارتقا ہوتا ہے جس کی مثال ہر زبان اور اس کے رسم الخط سے دی جاسکتی ہے۔ اُردو اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس میں بھی تغیرات ہوئے ہیں اور ہوسکتے ہیں لیکن کوئی تغیر کسی قسم کے جبر یا دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا۔ کسی تبدیلی کے پیچھے کوئی سیاسی مصلحت نہیں تھی۔ ضرورت کے احساس نے تبدیلیاں کرائیں اور لوگوں نے بحث مباحثہ کے بغیر عام طور سے انھیں قبول کرلیا لیکن گزشتہ چالیس برسوں کے اندر اُردو رسم الخط میں ترمیم، اصلاح یا تبدیلی کے متعلق جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ خالص علمی اور سائنٹیفک محرکات کے علاوہ کئی اور باتیں ایسی بھی شامل ہو گئی ہیں جن کا تجزیہ آسان نہیں۔ تبدیلی چاہنے اور نہ چاہنے والے دونوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو غیر علمی، جذباتی، مذہبی یا سیاسی مصلحت پسندانہ رویہ کا شکار ہیں۔ وہ یا تو تمام پہلوؤں پر نگاہ ڈالے بغیر ترمیم اور تبدیلی کے متعلق تجویزیں پیش کر رہے ہیں یا ہر تجویز کی مخالفت خالص جذباتی انداز میں کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صورتحال کا تجزیہ سنجیدگی سے کیا جائے۔ مختصراً میں اپنے خیالات ان معروضات کی روشنی میں پیش کرتا ہوں جو گزشتہ صفحات میں ظاہر کیے گئے۔

چھوٹی چھوٹی موشگافیوں کو چھوڑ کر اُردو رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ہمیں پانچ قسم کے خیالات سے سابقہ پڑتا ہے:

۱۔ اُردو رسم الخط میں نقائص ہیں، معمولی ترمیمیں کر لینے سے کام چل سکتا ہے جیسے عربی کے ال کو نظر انداز کرنا۔ ہم صوت حروف میں سے صرف ایک حرف منتخب کر لینا مجہول و اور ی کے لیے علامتیں مقرر کر لینا وغیرہ۔

۲۔ اُردو رسم الخط یکسر غیر صوتیاتی ہے، محض انداز سے پڑھتے ہیں کیونکہ حروف علت کا کوئی نظام نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی صوتیاتی رسم الخط اختیار کر لیا جائے جیسے بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط۔

۳۔ رومن رسم الخط بعض اضافوں کے ساتھ اپنالیا جائے۔اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دنیا کی بہت سی زبانوں کے رسم الخط سے رشتہ آسانی سے قائم کیا جاسکے گا۔ایک رسم الخط سیکھ لینے سے کئی زبانوں کے سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ٹائپ کے استعمال کے لیے راہ ہموار ہوگی۔

۴۔ اگر اپنا رسم الخط چھوڑنا ہی ہے تو دیوناگری میں کیا خرابی ہے جو صوتیاتی اعتبار سے خاصا سائنٹیفک ہے۔ہندی اُردو کا خاندان ایک ہی ہے، رسم الخط ایک ہی ہوجائے تو کبھی دونوں قریب آ کر ایک ہو جائیں گی، اپنی ادبی برتری کی وجہ سے اُردو کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور ہندی اُردو آمیز ہو کر دیوناگری رسم الخط میں زندہ رہے گی یعنی رسم الخط نہ رہا تو کیا اُردو کا بڑا حصہ بچ جائے گا۔تاریخ اُردو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے، ہندی رسم الخط اُردو کے مقابلہ میں آسان بھی ہے اور ہندی کے سرکاری زبان ہو جانے کے بعد سے ہر پڑھے لکھے کو سیکھنا ہی پڑتا ہے۔اس لیے کیوں نہ ایک ہی رسم الخط سے ہندی اُردو دونوں کا کام چلایا جائے وغیرہ۔

۵۔ اُردو رسم الخط مکمل، بے عیب، خوبصورت اور باکفایت ہے۔اس میں کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں۔ہم دیوناگری رسم الخط کیوں اختیار کریں۔اس میں بہت سے نقائص ہیں۔رسم الخط زبان کا لباس نہیں اس کی روح ہے، رسم الخط مٹے گا تو زبان بھی مٹ جائے گی۔بنگالی، پنجابی، تامل، تلگو والے اپنا رسم الخط دیوناگری کیوں نہیں کرتے، ہمیں کیوں کہا جاتا ہے!

ان مختلف نقاط کے حامی کبھی منطقی استدلال کے ساتھ اور کبھی محض جذباتی انداز میں اپنی باتیں پیش کرتے ہیں۔اگر ہم منصفانہ ان پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر پہلو میں تھوڑی بہت صداقت اور وزن ہے۔یہ صحیح ہے کہ اُردو رسم الخط کی بنیاد حروف تہجی پر ہے جن میں حروف علت کی کمی ہے، عام استعمال میں (عربی تجوید کے نقطۂ نظر سے نہیں) کئی حرف ہم صوت ہیں اور کم پڑھے لکھے عربی سے ناواقف اور زبان کو محض کاروباری ضرورتوں کے لیے سیکھنے والوں کے لیے دشواری پیدا کرتے ہیں۔اسی لیے اگر چند ترمیمیں کر دی جائیں تو آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔اس کے برعکس یہ بھی درست ہے کہ اس طرح ایک ہی رسم الخط کی دو شکلیں ہو جائیں گی۔ایک کم پڑھے لکھے کاروباری لوگوں کے لیے اور دوسری زبان کو بحیثیت زبان اور ادب

کے استعمال کرنے والوں کے لیے۔ اس صورتحال سے سخت انتشار پیدا ہوگا۔

رومن رسم الخط کی حمایت کرنے والوں میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اگر محض ان چھبیس حرفوں پر اکتفا کریں جو رومن حروف تہجی میں پائے جاتے ہیں تو اُردو کی بعض آوازیں یا تو لکھی نہ جاسکیں گی یا التباس پیدا کریں گی۔ اگر کچھ نئی علامتیں بنائی جائیں تو حروف کی تعداد خاصی بڑھ جائے گی اور وہ آسانی باقی نہ رہے گی جو مدنظر ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے اندر امریکہ، کینیڈا اور انگلستان سے رومن رسم الخط میں جو اُردو تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں نہ تو یکسانیت ہے اور نہ کوئی معین اصول۔ ہر شخص نے تقریباً اپنے حروف ابجد الگ الگ بنالیے ہیں۔ پھر قدیم مستشرقین نے جو علامتیں وضع کی تھیں وہ اب استعمال میں نہیں ہیں۔ غرض کہ یہاں بھی انتشار اور افراتفری کی صورت ہے۔ جب تک علمی طور پر کوئی رومن نظام ابجد تسلیم نہ کرلیا جائے اُردو کے لیے اسے استعمال کرنا فائدے کے بجائے نقصان پہنچائے گا۔ اس کے علاوہ جو یہ فائدہ پیش نظر ہے کہ اس سے کئی یوروپی اور امریکی زبانوں کے سیکھنے میں مدد ملے گی۔ وہ ہمیں مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا کی بہت سی زبانوں کے استعمال کیے جانے والے رسم الخط سے محروم کردے گا۔ اس طرح فائدہ نقصان کا حساب برابر رہے گا۔ بلکہ شاید نقصان کا پلہ زیادہ بھاری ہوجائے۔

اس وقت اُردو کے لیے دیوناگری رسم الخط استعمال کرنے کی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ حالات کے پیش نظر یہ بحث کسی قدر فطری بھی ہے۔ اُردو ہندی کے نزاع کی تاریخ سو سال سے زیادہ پرانی ہے اور رسم الخط کا مسئلہ اس کا جز ہے جو موجودہ سیاسی اور تاریخی موقف اور عملی آسانیوں اور دشواریوں کی وجہ سے ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ بیس پچیس سال پہلے اس مسئلہ پر عملی نقطۂ نظر سے غور کرنا اور اس کے نتائج پیش کرنا بحث کے دروازے نہیں کھولتا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایسے عناصر وابستہ ہوگئے ہیں کہ انھیں الگ کرنا محال ہے۔ تقریباً بائیس سال پہلے میں اپنے مطالعہ کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ مادری زبان فطری سہی لیکن دو تین نسلوں کی تعلیم و تربیت سے وہ بھی بدل سکتی ہے یا بدلی جاسکتی ہے (جسے علمی حیثیت سے میں آج بھی صحیح سمجھتا ہوں) اسی طرح رسم الخط کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ زبان کے ساتھ بنیادی یا فطری طور پر وابستہ نہیں۔ اگر بالکل ابتدا ہی سے کوئی زبان کسی خاص اہم رسم الخط میں لکھی جانے لگے تو وہی اس کا رسم الخط بن سکتا ہے (اسے آج بھی میں عملی حیثیت سے درست سمجھتا ہوں)۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب تمام لوگ اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط سیکھ لیں تو انھیں اس کی آزادی دے دی جائے کہ وہ جو رسم الخط چاہیں اختیار کریں۔ اس طرح اگر کوئی شخص اُردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنا چاہے تو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ان خیالات پر

نہ کسی نے تنقید کی اور نہ مجھے بدنیتی کا مجرم ٹھہرایا لیکن آج حالات دوسرے ہیں، خود میرے خیالوں میں بھی معمولی تغیرات ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد جب اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ اُردو ہندی ہی کا ایک روپ ہے، اسے ہندی ہی کہنا چاہیے، اسے ہندی کی اکثریت میں شامل ہو جانا چاہیے (کیونکہ بنیادی طور پر دونوں ایک ہیں) دونوں میں فرق صرف رسم الخط کا ہے۔ یہ فرق مٹ جائے تو قومی زبان کا مسئلہ حل ہو جائے اور تعلیمی ارتقا کی راہ ہموار ہو جائے تو اس پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ پندرہ سال پہلے ہندی کے ایک بڑے ادیب رام نریش ترپاٹھی نے جو اردو سے بھی خوب واقف تھے اور اس کی بعض خوبیوں کو سراہتے بھی تھے، یہاں تک کہا کہ اُردو اور ہندی کے درمیان صرف رسم الخط کی دیوار حائل ہے۔ اگر یہ دیوار گرا دی جائے تو اُردو بھی اسی طرح ہندی میں سما جائے گی جیسے اودھی، برج بھاشا، بندیلی، بھوج پوری اور دوسری زبانیں یا بولیاں۔ یہ بھی کہا گیا کہ اُردو کو اس کے رسم الخط میں زندہ رکھنے کی کوشش فرقہ وارانہ ہے اور مشترک تہذیب کے بننے میں حائل۔ ذمہ دار اور غیر ذمہ دار قسم کے لوگوں کی بہت سی ایسی ہی باتیں یہ سوچنے پر مجبور کرنے لگیں کہ اب زبان اور رسم الخط کے فطری تغیر و تبدل اور فطری ارتقا کا سوال نہیں رہا بلکہ جو کچھ سوچا اور کہا جا رہا ہے اس میں ایک ایسی رجعت پسندانہ، فاشسٹ اور احیائی خواہش شامل ہے جو ان تمام صحت مند تہذیبی عناصر کا بھی خاتمہ کر دینا چاہتی ہے جنھیں وہ اپنا نہیں سمجھتی۔ اس جذبہ کی زد پر صرف رسم الخط نہیں زبان، تہذیب، تاریخ، روایات، طرز زندگی، مذہب، عقیدہ، پسند اور ناپسند، علم اور یقین ہر چیز ہے۔ اس کے سامنے سر جھکانے کے معنی ہوں گے۔ ترقی پسندی کے تصور سے دست برداری، عقل اور عقیدے سے دست برداری، تہذیبی روایات کے اس تسلسل سے دستبرداری جو زندگی کی راہوں کو آسان بناتا ہے۔ یہ جذبہ حد سے بڑھ کر خود زندگی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اسی لیے اپنی بقا کے نقطۂ نظر سے اس کا مقابلہ ضروری ہے۔ اس کے سامنے بعض اوقات سائنس، منطق، استدلال سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ماننے کے باوجود کہ زبانیں بنتی بگڑتی، تبدیل ہوتی رہتی ہیں، مادری زبان بھی حالات کے بدل جانے سے بدل سکتی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اُردو ایک آزاد مستقل، ترقی پذیر اور لسانی حیثیت سے ہر دوسری زبان کی طرح مکمل زبان ہے۔ اس میں جو تبدیلیاں ہوں گی وہ ناگزیر ضرورتوں کے ماتحت ہوں گی۔ جنھیں اس زبان کے ذریعہ اظہار خیال میں آسانی ہے۔ وہ اسے چھوڑنے یا جبر کے ماتحت بدلنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اپنے ذوق اور پسند کی بات اور ہے۔ تاریخی اعتبار سے اُردو کا ارتقا ہندی سے بہت پہلے ہوا۔ موجودہ ہندی اُردو کی بگڑتی ہوئی شکل ہے۔ اس کا دائرہ اثر بھی وسیع رہا ہے اور یہی پہلے ملک کی عام زبان تھی۔ یہ کوئی مذہبی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترک سیکولر

تہذیب کی نمائندگی زیادہ واضح شکل میں کرتی ہے۔ یہ ہندی کے مقابلہ میں ایک الگ، آزاد اور مستقل زبان ہے جس کے پیچھے بہت سے لسانی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی اسباب اور افکار ہیں جنھیں ایک بہت بڑی لسانی اقلیت کو کچلے اور درہم برہم کیے بغیر بدلا نہیں جاسکتا۔ یہی صورت اس کے رسم الخط کی بھی ہوگئی ہے۔ اُردو رسم الخط جو تقریباً آٹھ سو سال سے اس کے تحریری اظہار کا ذریعہ بنا ہوا ہے اور نفسیاتی طور پر اس زبان سے وابستہ ہوگیا ہے جس کا وہ مظہر اور تحریری پیکر ہے۔ اس کی کشش، دائروں، نقطوں، صوری علامتوں سے ذہن میں جو تصویریں بنتی ہیں ان کے پیچھے صدیوں کا ساحرانہ اور نفسیاتی عمل ہے۔ اس لیے اب وہ زبان ہی کی طرح زندگی کا جز ہے۔

جیسا کہ کہا گیا رسم الخط آوازوں کی علامت ہے اور علامت بھی اپنے تلازمۂ ذہنی کی وجہ سے وہی پیکر ذہن میں ابھارتی ہے جو اصل سے یا چیزوں کی تصویروں سے ابھر سکتا ہے۔ اس لیے ان علامتوں سے دست بردار ہو کر اُردو کا پڑھنے والا کبھی آسانی سے وہ مانوس فضا حاصل نہیں کر سکے گا جو اس وقت حاصل ہے اور نتیجہ انتشار کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ کسی رسم الخط سے مانوس نگاہیں ہر حرف اور ہر لفظ کو نہیں پڑھتیں بلکہ صرف اچٹتی سی نگاہ صفحات پر تصویروں اور خیالوں مرقع بناتی جاتی ہے جس سے علم کے علاوہ جمالیاتی آسودگی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ سہولت دوسرے رسم الخط سے حاصل نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ مشق و ممارست کی وجہ سے صدیوں میں ذہنی فضا بدل نہ جائے۔

تفصیلات اور غیر ضروری علمی اصطلاحات سے بچ کر میں نے جو خیالات پیش کیے ہیں ان سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ اس سے رسم الخط کے مسئلہ پر سوچنے کی نئی راہیں کھلیں گی۔ اگر گزشتہ صفحات میں پیش کیے ہوئے خیالات کا خلاصہ بیان کرنا ہو تو میں کچھ اس طرح کروں گا:

۱۔ جہاں تک زبان و ادب کے مستقبل کا سوال ہے ہمیں نہیں معلوم کہ مستقبل بعید میں کیا ہوگا؟ ہمارے اخلاف کون سی زبان بولیں گے یا بولنا پسند کریں گے اور اس کا رسم الخط کیا ہوگا، آج کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ کیا بولیں اور کس طرح لکھیں، ہم انھیں اس کا پابند کسی قسم کی وصیت سے بھی نہیں بنا سکتے۔ یہ فیصلہ تاریخ کرے گی۔ اس لیے ہمارے سامنے زبان اور رسم الخط کا جو مسئلہ ہے وہ آج کا اور مستقبل قریب کا ہے۔

۲۔ آج اُردو بولنے والے نہ تو اپنی زبان سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں نہ اپنے رسم الخط سے۔ انفرادی طور سے کوئی اپنے لیے کسی دوسری زبان یا رسم الخط کا انتخاب کر لے تو یہ

دوسری بات ہوگی۔

۳۔ اگر کچھ لوگ یہ چاہیں بھی کہ رسم الخط میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے آسان بنا دیا جائے تو سوال یہ ہوگا کہ وہ اپنی بات عامۃ الناس سے کس طرح منوائیں گے؟ ملک کے تمام ذرائع طباعت واشاعت، تعلیم وتعلم پر کس اقتدار اعلیٰ کے ذریعہ تبدیلی کا حکم نافذ کیا جا سکے گا؟ دوسری بات یہ کہ تبدیلیوں کی حد کیا ہوگی۔ پرانی کتابیں کب اور کس طرح ترمیم شدہ رسم الخط میں شائع ہو سکیں گی؟ درمیانی مدت میں قدیم سرمایہ کا مطالعہ کرنے کے لیے تو موجودہ رسم الخط کا سیکھنا اور جاننا ضروری ہوگا۔ کیا ایسا ہوگا کہ کم پڑھے لکھے اور کاروباری لوگوں کے لیے ایک رسم الخط ہوگا اور ادیبوں، عالموں اور محققوں کے لیے دوسرا جس میں کچھ تحریری علامتیں زیادہ یا کم ہوں گی؟

۴۔ یہی بات رومن اور دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے میں بھی ہے۔ زبردست آمرانہ جبر وقہر کے بغیر اسے نافذ نہیں کیا جا سکے گا اور اس سے بھی چند نسلوں کے بعد ہی مفید نتائج برآمد ہو سکیں گے۔ اس کے علاوہ قدیم کتابوں کے مطالعہ کے لیے اُردو رسم الخط کا سیکھنا پھر بھی ضروری ہوگا۔

۵۔ اُردو رسم الخط یقیناً صوتیاتی اعتبار سے ناقص اور لکھاوٹ کے اعتبار سے مشکل ہے (اس کی کئی خوبیوں سے انکار نہیں) لیکن دنیا میں اور بہت سے رسم الخط ناقص اور مشکل تھے اور ہیں اور انھیں کے استعمال کرنے والوں میں افلاطون اور ارسطو، چاسر اور شیکسپیئر، کونگ فوزی اور لاؤتسے، فردوسی اور مولانا روم پیدا ہوئے۔ خود اُردو رسم الخط کے ناقص یا مشکل ہونے کی شکایت ولی، میر، غالب، انیس، نے نہیں کی۔ اس لیے جسے اُردو زبان کو علمی حیثیت سے استعمال کرنا ہوگا وہ اس کا رسم الخط بھی سیکھ لے گا۔ غیر ملکی عالم تو جب سیکھنے پر آتے ہیں، ہندوستان کے راگ راگنیوں اور مذہبی اساطیر اور رمزیات سے بھی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں اور مردہ زبانوں کے رسم الخط پڑھ لیتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں گے تو اس رسم الخط کا سیکھ لینا ان کے لیے مشکل نہ ہوگا۔

۶۔ طباعت اور اشاعت کے لیے جدید عہد کی سائنسی آسانیاں فراہم ہو جائیں تو کیا کہنا ہے لیکن آج جب نصاب کے علاوہ اچھی سے اچھی کتاب کا پانسو اور ہزار نسخوں کا

ایڈیشن برسوں میں فروخت ہوتا ہے تو پریشانی کیا ہے اور جلدی کس بات کی ہے؟
پاکستان کے اُردو اخبارات جو ہندوستان کے اخباروں سے زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں، وقت پر اور خاصے اچھے چھپتے ہیں۔ بہرحال جب زیادہ چھپنے کی ضرورت ہوگی تو ذہن اس کی سہولتیں پیدا کر لے گا۔

۷۔ اس موضوع پر جو لوگ اظہار خیال کر رہے ہیں انھیں اس کا موقع ملنا چاہیے۔ ان کی نیت پر شک کرنا مناسب نہیں۔ اس کے پیچھے کوئی سازش دیکھنا بھی تنگ نظری ہے۔ کوئی کتنا ہی اہم اور بڑا ادیب کیوں نہ ہو اس مسئلہ پر مضمون لکھ کر تبدیلیاں نہیں لا سکتا۔ اظہار خیال کر سکتا ہے اس لیے مضامین سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ بحث مباحثہ سے ذہن صاف ہوں گے اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی غور وفکر کا سرمایہ بہم پہنچے گا۔

۸۔ اگر اُردو ادب کا کچھ حصہ دیوناگری رسم الخط میں چھپتا ہے اور اس سے اُردو کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہوتا ہے یا اُردو کا پیام اس کے حلقہ کے باہر پہنچتا ہے یا اُردو لکھنے والوں کو مادی منفعت حاصل ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کرنا غلط ہوگا۔ ہمیں اُردو رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی رسم الخط اختیار کرنے اور ہندی رسم الخط میں اُردو کی کتابیں شائع کرنے میں فرق کرنا چاہیے۔

☆☆☆

انتظار حسین

رسم الخط اور پھول

بات ہے رسم الخط کی لیکن معاف کیجیے مجھے ایک اشتہاری اعلان یاد آ رہا ہے جو سنلائیٹ صابون والوں کی طرف سے ہوا ہے۔ سنلائیٹ کی کسی ٹکیا میں انھوں نے ایک چابی چھپا کر رکھ دی ہے، جس کسی خریدار کی ٹکیا سے یہ چابی نکلے گی اسے وہ ایک مؤثر انعام دیں گے۔ اس اعلان کے بعد سے پاکستان کے شہروں میں سنلائیٹ صابون بہت بکنا شروع ہو گیا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ بتایا تھا کہ نئے انداز کی خلعتیں اور زیور جو آج مناسب حال ہیں۔ انگریزی صندوقچوں میں بند ہیں، ان صندوقچوں کی کنجی انگریزی دانوں کے پاس ہے۔

اصل میں ہم پچھلے سو سال سے مغرب سے صابون کی ٹکیاں خرید رہے ہیں اور ان صندوقوں کی کنجی کی تلاش میں ہیں جن میں نئے علوم بند ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ یہ کنجی رومن رسم الخط کی ٹکیا میں بند ہے۔

لاٹری کے ذریعہ دولت تو حاصل کی جا سکتی ہے مگر ہم علم بھی لاٹری ہی کے ذریعہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مسلمان قوم نے اپنے بزرگوں کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق نئے علوم کی کنجی پا لینے کی فکر میں انگریزی پڑھی، پتلون پہنا اور آئی سی ایس افسر پیدا کیے۔ آئی سی ایس افسروں نے برابر والوں سے انگریزی میں اور خانساماؤں سے صاحبوں والے کھرے لہجے میں اُردو بولنے کا طور اختیار کیا اور چمچے اور کانٹے سے بریانی تناول کرنے کا تجربہ کیا اور اپنی کوٹھیوں میں انگریزی پھول لگائے۔ ان کا تجربہ ایسا ناکام نہیں رہا۔ اب لاہور کی کوٹھیوں میں انگریزی پھول عام کھلے دکھائی دیتے ہیں مگر بیلا، چنبیلی نظر نہیں آتے۔ یہ ہے ہمارے جملہ مسائل کی جڑ۔ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ہمیں اپنے پھول عزیز نہیں رہے ہیں۔ رسم الخط کا مسئلہ پھولوں کے مسئلے کا حصہ ہے۔ جب باغیچوں سے ان کے اپنے پھول رخصت ہو جائیں اور پرائے پھول کھلنے لگیں تو یہ وقت اس زمین کی پوری تہذیب پر بھاری ہوتا ہے۔ رسم الخط اپنی جگہ کوئی چیز نہیں ہے، وہ تہذیب کا حصہ ہوتا ہے، یہ تہذیب شکلوں کے ایک سلسلے کو جنم دیتی ہے یا پہلے سے موجود شکلوں کو ایک نئی معنویت دے دیتی ہے۔ بہر حال تہذیبی زندگی شکلوں کا ایک نظام ہوتا ہے، ممکن ہے بظاہر نظر نہ آئے مگر ان کی تہ میں ایک وحدت موجود

ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ سب شکلیں ایک دوسرے سے پیوست ہوتی ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی ایک شکل نکل جائے اور اس کی جگہ کوئی اجنبی شکل لا کر رکھ دی جائے تو اس سے شکلوں کے اس پورے نظام میں درہمی پیدا ہوتی ہے اور ان کی بنیادی وحدت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ فارسی رسم الخط ہماری تہذیب کی دوسری شکلیں جاری ہیں تو یہ نشان کب تک کھڑا رہے گا اور نشان گر گیا تو تہذیب کی وہ شکل ہے جو اس کی بنیادی وحدت کے نشان کا مرتبہ رکھتا ہے لیکن اگر ہماری تہذیب کا باقی شکلیں کتنے دن کی مہمان ہیں۔ پس مسئلہ محض اس رسم الخط کا نہیں بلکہ اس پوری تہذیب کا ہے جس کا یہ رسم الخط نشان ہے۔

اپنی تہذیبی شکلوں کے بارے میں شک اور بے اطمینانی ہمارے یہاں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ پچھلے سو سال سے جاری ہے اور اُردو زبان تو اچھی خاصی ایک دیوار گریہ بن کر رہ گئی ہے۔ سب سے پہلے مولانا حالی روئے تھے کہ اُردو میں نیچرل شاعری نہیں ہوتی، پھر شکایت ہوئی کہ اُردو میں ایپک نہیں لکھی گئی۔ پھر یہ صف ماتم بچھی کہ اُردو میں ڈراما نہیں ہے۔ اب یہ تکلیف ہے کہ اُردو میں رومن رسم الخط نہیں پایا جاتا۔ زبان چیزوں کو دیکھنے، محسوس کرنے اور سوچنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ایک خاص زبان کے اندر اظہار کے جو مختلف سانچے ظہور میں آتے ہیں وہ اس تہذیب کے انداز فکر و نظر کے مظہر ہوتے ہیں۔ جب اپنے اظہار کے سانچوں اور صورتوں کے بارے میں شک پڑ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قوم کو اپنی فکر و نظر پر، اپنے احساسات پر اعتبار نہیں رہا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ اسے اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں بے اعتباری ہمارے یہاں صرف تاریخ، زبان، ادب اور معاشرت تک محدود نہیں رہی بلکہ ہماری ذات کی روحانی علامتیں بھی اس کی زد میں آ گئیں اور سیرت طیبہ لکھنے والے بزرگوں کو رسول اکرم ﷺ کی عظمت ثابت کرنے کے لیے کارلائل اور برنارڈ شا تک جانا پڑا۔ جب ایک قوم پر یہ نوبت آ جائے کہ وہ اپنی روحانی علامتوں کی توثیق کے لیے کارلائل اور برنارڈ شا سے سرٹیفیکیٹ حاصل کرنے لگے تو اس کے معنی تو یہی ہوئے کہ وہ اپنے اعتبار کا اثاثہ تو لٹا بیٹھی۔ اب وہ اپنی ذات کو بلیاں لگا کر کھڑی کرنے اور دوسروں کے سہارے اپنا اعتبار بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

رومن رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز بھی اس قسم کی ایک کوشش ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہم رومن رسم الخط کی بلی لگا کر گری ہوئی اُردو کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور اس بلی کے سہارے نئے سائنسی علوم کے آسمان کو چھونا چاہتے ہیں۔ یوں اگر رومن رسم الخط کی بلی کے سہارے پروفیسر انجم رومانی، آئن سٹائن بن جائیں اور ن۔ م راشد، ٹی ایس ایلیٹ کے برابر کھڑے ہو سکیں تو اس میں بے شک اُردو کی بڑی عزت ہے لیکن کہیں

یہ نہ ہو کہ اس چکر میں پروفیسر انجم رومانی ٹوٹی پھوٹی غزل کہنے سے بھی جائیں اور راشد صاحب کو جو چار بھلے آدمی اب پڑھ لیتے ہیں وہ بھی انھیں طاق میں بٹھادیں اور اُردو بے چاری دھوبی کا کتا بن کر رہ جائے۔ اگر اس ٹوٹکے سے نئی سائنس کے آسمان تک پہنچ جانا اور ترقی کرنا ممکن ہوتا تو ایشیا میں ترکی والے سب سے ترقی یافتہ قوم ہوتے۔ ترکی کے تعلیم یافتہ حضرات بھی تو اسی ہمارے والے روگ میں مبتلا چلے آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اس تاریخ پر بہت شرمندہ تھے جس نے بڑے فاتحین اور جید علما پیدا کیے تھے۔ ادھر وہ اپنی تاریخ و تہذیب سے رسہ تڑا کر رومن رسم الخط کی بیساکھی کے سہارے یورپین قوم بن کر کھڑے ہونے کے لیے ہاتھ پیر مارتے رہے۔ ادھر اس عرصے میں جاپان نے اپنے دقیانوسی رسم الخط کے باوجود بڑے بڑے کارخانے قائم کر لیے اور صنعتی مغرب سے مقابلہ کرنے لگا۔ ترکی کی مثال ہمارے لیے عبرت کا سامان رکھتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یار لوگ اسے رومن رسم الخط کے حق میں سند بناتے ہیں۔

تعلیم یافتہ ترکوں نے عربی رسم الخط کو ترک کر کے رومن رسم الخط اپنا لیا۔ پاکستان کے تعلیم یافتہ حضرات ہنوز تذبذب میں ہیں۔ اگر سوچیے تو ان دونوں صورتوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ذہنی طور پر تو، ہم بھی عربی، فارسی رسم الخط کو ترک کر چکے ہیں۔ ویسے مجھے پھر بھی یقین نہیں آتا کہ ہم اس رسم الخط سے اپنا پیچھا چھڑا سکیں گے۔ بات یہ ہے کہ میں نے مال روڈ پر عین شیزان کے سامنے موتیا کے گجرے بکتے دیکھے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات پچھلے سو سال سے اپنی کوٹھیوں کے باغیچوں میں انگریزی پھولوں کی قلم لگا رہے ہیں لیکن موچی دروازے کا عام آدمی آج بھی موتیا ہی کا گجرا خریدتا ہے اور عقیدت مند عورتیں آج بھی مزاروں پر موتیا ہی کے گجرے چڑھاتی ہیں اس واقعے کے دو پہلو ہیں، ایک ناخوشگوار۔ ایک خوشگوار۔ ناخوشگوار پہلو یہ ہے کہ پھولوں کے معاملے میں یہ دوئی ہمارے تہذیبی انتشار کا اظہار ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے تنفس کا آہنگ برہم ہو گیا تھا، ہماری نظر بٹ گئی ہے۔ عقل و استدلال کی زبان میں اسے فکر و احساس کا انتشار کہتے ہیں۔ خوشگوار پہلو یہ ہے کہ انگریزی پھولوں کی اتنی آبیاری کے بعد بھی موتیا کے پھول کھلتے ہیں اور ان کی مہک مال روڈ تک آتی ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ اپنے پھولوں کو فراموش کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا ن۔م راشد صاحب سمجھتے ہیں۔

آدمی نے پہلے پہل براہ راست چیزوں کی تصویریں بنا کر صرف مطلب کا اظہار کیا۔ یہ تصویریں تجریدی رنگ میں ڈھلتے ڈھلتے رسم الخط بن گئیں۔ اب یہ تصویریں رسم الخط کی تہوں میں اسی طرح پیوست ہیں جس طرح اجتماعی لاشعور میں قدیم شکلیں اور تشبیہیں مدفون رہتی ہیں۔ میں رومن رسم الخط کی بات نہیں کرتا کہ

وہ تو مردہ ہو چکا ہے لیکن اپنے رسم الخط کو لیجیے جو ایک زندہ رسم الخط ہے۔ اس کی کششوں اور دائروں اور قوسوں میں تصویریں اسی طرح زندہ و تابندہ ہیں جس طرح مسلمانوں کے اجتماعی تخیل میں ماضی کی شکلیں زندہ و تابندہ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک قوم نے جس طرح چیزوں کو دیکھا اور تصور کیا اور اپنی ذات سے ہم رشتہ کیا پھر دیکھنے کے سفر میں جو جو منزلیں آئیں اور ذات اور خارجی اشیا کے رشتے نے جس طور ارتقاء کیا وہ سب کچھ رسم الخط میں محفوظ ہوتا ہے۔ گویا رسم الخط اجتماعی طرز نظر کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں ان تصویروں، شکلوں اور تشبیہوں میں ہوتی ہیں جن سے ایک قوم کے تخیل کا خمیر اٹھتا ہے اور احساسات کی شکل بنتی ہے۔ اسی لیے رسم الخط کی تبدیلی محض رسم الخط کی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے باطن کو بھی بدلنے کا اقدام ہوتی ہے لیکن اپنے باطن کو بدلنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ اسی لیے رسم الخط کی تبدیلی صرف اس صورت میں مؤثر ثابت ہوتی ہے جب وہ ایسے عقائد و خیالات کی کمک کے ساتھ آئے جو انسان میں باطنی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ مثلاً جیسا ایران میں ہوا، جہاں عربی رسم الخط ایسے عقائد و خیالات کے راستے پہنچا جو انسان کے باطن کو بدلنے کے مدعی تھے۔ ایران میں رسم الخط کی تبدیلی اس قوم کی اجتماعی ذات کی تبدیلی کا حصہ تھی۔ قوم کا باطن جوں کا توں رہے اور رسم الخط بدل جائے تو پھر یہی ہوتا ہے کہ اچھی بھلی قوم جمہوریہ ترکیہ بن کر رہ جاتی ہے۔

گویا ہم نے اگر رومن رسم الخط کو اختیار کیا تو وہ سرکاری دفتروں میں رہے گا۔ یونیورسٹیوں کی زینت بنے گا اور کوٹھیوں میں گملوں اور گلدانوں میں لگا کر رکھا جائے گا مگر مسجدوں، درگاہوں اور امام باڑوں میں طغرے بھی اور دودھ فروشوں اور پنواریوں کی دکانوں پر غالب و اقبال کے شعر اسی پرانے دہرانے رسم الخط میں آویزاں رہیں گے۔ ریاضیات اور طبیعیات کو پوری حقیقت سمجھنے والوں کو شاید اس واقعے میں کوئی معنی نظر نہ آئیں لیکن جنھیں یہ معلوم ہے کہ یہ طغرے ہماری باطنی زندگی میں کتنا اثر نفوذ رکھتے ہیں اور ان مذہبی اور کاروباری اداروں کو ہماری تہذیبی زندگی میں کیا مقام حاصل ہے، ان کے لیے اس واقعے کے معنی یہ ہیں کہ رومن رسم الخط انگریزی پھولوں کی طرح سجاوٹ کی چیز بن کر رہے گا۔ ہماری اجتماعی زندگی کی جڑوں میں شاید وہ سرایت نہ کر سکے۔ اگر کسی صاحب کو اس میں شک ہے تو ان سے یہ مفید معلومات حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال کے وقت سے اب تک رومن رسم الخط نے عام لوگوں میں کتنا رواج پایا ہے۔ میاں بشیر احمد کہتے ہیں کہ پڑھے لکھے رپورٹر بھی رپورٹنگ کے وقت آسان عربی رسم الخط ہی میں لکھتے ہیں اور پروفیسر حمید احمد خاں بتاتے ہیں کہ انقرہ لائبریریوں کی کتابوں کی فہرست بھی ابھی خیر سے رومن رسم الخط میں منتقل نہیں ہو سکی ہے۔ انقرہ اور استنبول سے نکل کر اس رسم الخط کی کیا اوقات ہوگی، یہ خود تصور کر لیجیے جو قوم روشن

خیالوں کی ساری جدو جہد کے باوجود اب تک ترکی زبان میں اذان گوارا نہیں کرسکی، اسے رومن رسم الخط کیسے ہضم ہو جائے گا۔

انگریزی پھول اور رومن حروف اجنبی زمینوں سے آئے ہیں، ہمیں ان سے مہک نہیں آتی۔ شاید ہماری باطنی زندگی میں وہ رسوخ انھیں کبھی حاصل نہ ہو سکے جس کے بعد پھول اور حروف روحانی معنویت کے حامل بن جایا کرتے ہیں۔ اُردو کو رومن رسم الخط سے بس اتنا فیض حاصل ہوگا کہ وہ ٹیڈی گرل بن جائے گی مگر نقصان یہ ہوگا کہ نظر کا وہ انتشار جسے پھولوں کی دوئی نے جنم دیا ہے، رومن حروف کے طفیل اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ اس کے معنی ہیں مسلمانوں کی تہذیبی وحدت میں انتشار اور طلب و نظر کا فساد اور یہ ایسا نقصان ہے کہ اگر پاکستانی قوم آگے چل کر کوئی آئن سٹائن بھی پیدا کرے تو اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی

صورت و معنی کا رشتہ

ہمارے خوجی اور آزاد کی طرح مارک ٹوئین صاحب بھی بڑے دلچسپ انسان تھے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی مسئلہ ایسا ہو جس پر موصوف کی اپنی کوئی رائے نہ ہو، جب پہلے پہل آبدوز کشتیوں کا استعمال شروع ہوا تو عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ اب سمندر بھی غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔ حسب معمول مارک ٹوئین صاحب نے یہ رائے پیش کی کہ اس عظیم خطرہ کا حل یہ ہے کہ سمندر کے سارے پانی کو کھولا دیا جائے۔ لوگوں نے جب یہ دریافت کیا کہ حضرت سمندر کے پانی کو آخر کھُولایا کیسے جا سکتا ہے تو مارک ٹوئین صاحب نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا کہ حضرات! ''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے''، وہ لوگ جو ہندوستان میں اُردو زبان کو ہندی لپّی اختیار کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں وہ بھی اُردو کے مسئلہ کا حل مارک ٹوئین کے انداز ہی میں پیش کر رہے ہیں اور یہ بھول رہے ہیں کہ اُردو زبان کا مسئلہ خالص سیاسی مسئلہ ہے جسے متعصب ذہنیت نے اس لیے الجھا کر شدید سے شدید تر کر دیا ہے تا کہ اُردو دانوں کا اعتماد ختم ہو جائے اور ان کی قوت ارادی ٹوٹ جائے۔ اب ایسے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ کا اپنی ذات، اپنی تہذیب اور اپنی زبان پر سے اعتماد اٹھ جائے تو پھر آخر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ اس بات کے اظہار میں مجھے کوئی باک نہیں ہے کہ یہ ''ذہنیت'' ہر اس چیز کو ختم کرنے کے درپے ہے جو اس کی تہذیب سے ذرا سی بھی مختلف ہے اور ہر اس چیز کو اکھاڑ پھینکنے کی فکر میں ہے جو مسلمانوں سے وابستہ ہے۔ رسم الخط کا مسئلہ بھی اسی ''ذہنیت'' کا ایک حصہ ہے، یہی وہ ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں میں اپنی علیحدہ قومیت کا احساس پیدا کیا۔ اس ذہنیت کی سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ اپنے علاوہ کسی دوسرے وجود کو برداشت نہیں کرتی۔ آج سے سو سال پہلے حیاتِ جاوید میں مولانا حالی نے ہمیں یہ اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ ''۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔'' یہی تحریک اب سیاسی قوت اور دباؤ کے سہارے شدید تر ہو گئی ہے۔ اس ذہنیت نے، سیاسی قوت ملتے ہی، سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اُردو کو ان

صوبوں اور علاقوں سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جہاں یہ صدیوں سے پھل پھول دے رہی تھی۔ دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ تیزی سے اسے سکولوں اور کالجوں سے غائب کر دیا، تا کہ مسلمان بچے بھی اس زبان کو نہ سیکھ سکیں اور ایک ہی نسل کے بعد یہ زبان اور اس کا رسم الخط اجنبی بن کر رہ جائے۔ جب اس کامیابی کے بعد بھی اُردو ختم نہ ہو سکی تو یہ اشقلہ چھوڑا کہ اس زبان کا رسم الخط بدل کر دیوناگری کر دیا جائے تا کہ یہ زبان، اس کے بولنے والے اور ان کی تہذیب برہمنی تہذیب میں اسی طرح جذب ہو کر رہ جائیں جیسے باختر کے یونانیوں، راجپوتوں، جاٹوں اور گوجروں کی تہذیبیں کسی زمانہ میں سیاسی دباؤ کے ساتھ جذب ہو گئی تھیں لیکن بیسویں صدی اور اس زمانے میں، جب اس ذہنیت نے دوسری آنے والی تہذیبوں کو جذب کیا تھا، بڑا فرق ہے۔ اب دنیا ایک اکائی بنتی جا رہی ہے اور اس کا ایک حصہ دوسرے حصے سے تیزی سے پیوستہ ہوتا جا رہا ہے۔ سارے ایشیا کی تہذیبوں پر، وہ خواہ مسلم تہذیب ہو یا ہندی، چینی تہذیب ہو مغربی تہذیب کا بھاری بھر کم رولر (Roller) پھر رہا ہے اور یہ سب تہذیبیں مغربی تہذیب کے زیر اثر تبدیلی کی اس بھٹی میں سے گزر کر جب سامنے آئیں گی تو وہ، وہ نہ رہیں گی جو پہلے تھیں۔ چھوت چھات کی وہ ذہنیت، جو ایک زمانے میں مذہبی تقدس کا درجہ رکھتی تھی، اب قابل مذمت چیز بنتی جا رہی ہے۔ اب تک اسی ذہنیت کے تقدس کے سہارے ہندوؤں نے خود کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ نہ ان کی دکان سے سودا سلف خریدا تھا۔ نہ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی لذیذ مٹھائیاں کھائی تھیں۔ نہ ایک دسترخوان پر ان کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ نہ ان کے گلاس میں پانی پیا تھا۔ ''ہندو جل'' اور ''مسلمان پانی'' ہر سٹیشن پر ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر دستیاب تھا۔ اس ذہنیت کی اپنی پوری تاریخ ہے جو ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ بہر حال مجھے ذاتی طور پر کوئی شکایت اس لیے نہیں ہے کہ اپنی زبان اور تہذیب کو محفوظ رکھنے کا جذبہ ایک اچھی بات ہے لیکن جو بات بری ہے وہ سیاسی قوت و اقتدار کے سہارے تشدد اور دباؤ سے دوسری تہذیب کو دبانے، کچلنے اور ختم کرنے کا عمل ہے۔ ناگری لپی انڈک (Indic) تہذیب کی پیداوار ہے۔ اس میں وہی الفاظ، تراکیب، طرز احساس و تخیل پروان چڑھ سکتے ہیں جو سنسکرتی تہذیب سے آئے ہیں۔ اُردو رسم الخط ''عربی، ایرانی'' تہذیب کی پیداوار ہے اور اس کی زندگی کے لیے صرف اس تہذیب کی زبانوں سے بلکہ اس کے طرز احساس، نظامِ خیال و اقدار سے بھی گہرا تعلق ضروری ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اُردو رسم الخط کو چھوڑ کر دیوناگری لپی اختیار کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے کلچر کو، عرب ایرانی تہذیب سے کاٹ کر، صرف انڈک تہذیب میں جذب کرنے کے معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں۔ عرب ایرانی تہذیب سیدھے ہاتھ کی تہذیب ہے۔ اس کا عمل دخل قدم

قدم پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بچہ الٹے ہاتھ سے کھانے لگے تو ماں باپ اسے ٹوکتے اور سمجھاتے ہیں۔ پانی سیدھے ہاتھ سے پینا تہذیب میں داخل ہے، کھانا کھاتے وقت جب سیدھا ہاتھ استعمال نہیں کیا جاسکتا تو بھی گلاس کو الٹے ہاتھ میں پکڑ کر سیدھے ہاتھ سے ذرا سا سہارا دینا تہذیب تمیز میں داخل ہے۔ دستر خوان یا کھانے کی میز پر روٹی کی پلیٹ ہمیشہ سیدھے ہاتھ پر رکھی جاتی ہے تا کہ سیدھے ہاتھ سے ٹکڑا توڑ کر سالن میں لگا کر سیدھے ہاتھ سے کھانے میں آسانی رہے۔ بڑے بوڑھے گھر سے قدم نکالتے ہیں تو سیدھے پاؤں کو پہلے نکالتے ہیں۔ طواف کعبہ بھی سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف ہی کیا جاتا ہے لیکن آب دست کرنا ہو تو ہمیشہ الٹا ہاتھ استعمال کیا جائے گا۔ ان تہذیبی عوامل کا تعلق براہ راست اس تہذیب کی زبان اور اس کے رسم الخط سے ہوتا ہے۔ ہر زبان کی اپنی روح ہوتی ہے جو اس کے رسم الخط میں ظاہر ہوتی ہے۔ رسم الخط کی حیثیت تکیے کے غلاف کی سی نہیں ہے کہ جب جی چاہا بدل دیا۔ رسم الخط تو ہر زندہ زبان کے جسم کی کھال کا درجہ رکھتا ہے جیسے ہی اس کی کھال اتاری جائے گی جسم و جان کا رشتہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ آپ سنسکرت کا کوئی ثقیل لفظ اس لیے اُردو میں لانے کی کوشش میں ناکام رہتے ہیں کہ اس رسم الخط کا مزاج اسے قبول نہیں کرتا۔ یہی صورت حال ہندی لپی کی ہے کہ وہ بھی کسی ثقیل عربی و فارسی لفظ کو اپنے تہذیبی مزاج کی وجہ سے قبول نہیں کر سکتی۔ اگر اُردو کی خوبصورت تراکیب، بندشیں اور ذخیرہ الفاظ اس میں داخل کیے جائیں گے تو ان میں سے بیشتر جلد ہی رسم الخط کی چھلنی میں چھن کر خارج ہو جائیں گے۔ ایسے میں یہ سمجھنا کہ اُردو کی خوبصورت ترکیبیں صرف رسم الخط کی تبدیلی سے ہندی والے تیزی سے قبول کر لیں گے نفسیاتی حقائق اور مخصوص ذہنی کیفیات سے منہ موڑ لینے کے مترادف ہے۔ رسم الخط کسی زبان کی شکل و صورت ہی نہیں بلکہ مزاج و کردار بھی متعین کرتا ہے اور اس کے بدلتے ہی اس زبان کا مزاج اور کردار بھی بدل جاتا ہے۔ جب ایران نے عربی رسم الخط کو قبول کیا تو قدیم ایرانی تہذیب کا باطن بھی اسی کے ساتھ بدل کر ایک نئے تہذیبی روپ میں ڈھل گیا اور ایرانی تہذیب کی اجتماعی شخصیت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔

یہاں میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ہندی جاننے والا مولانا محمد حسین آزادؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ اور غالبؔ و اقبالؔ کی تخلیقی کاوشوں کو صرف رسم الخط کے بدل دینے سے سمجھ لے گا؟ کیا ایک ہی رسم الخط ہونے کے باعث ہر اُردو والا فارسی زبان کو سمجھ سکتا ہے؟ اس کے لیے یقیناً زبان کو سیکھنے کی ضرورت پڑے گی۔ اب ایسے میں اصل مسئلہ رسم الخط کا نہیں رہتا بلکہ یہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم ہندی ہے اور اُردو سیکھنے سکھانے کے سارے دروازے سیاسی اقتدار کے سہارے بند

شامل ہورہے ہیں۔ اُردو والوں کی تحریر عام بول چال اور روزمرہ کی زبان سے بے حد قریب ہے۔ عربی و فارسی کے مشکل الفاظ کا رواج آزادی سے پہلے ہی کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اُردو کے ادیبوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریروں کو زیادہ سے زیادہ روزمرہ کی عام بول چال سے شعوری طور پر قریب کرتے چلے جائیں۔

۷۔ جب بھی ہندی اپنی حقیقی تخلیقی قوتوں کے سہارے عام بول چال کی زبان سے قریب تر آئے گی خود ہی اس کی آواز اُردو کی آواز سے قریب تر ہو جائے گی۔ داغ کی غزل خالص اُردو کا کامل نمونہ ہے اور ہندی کی موثر تخلیقی قوت کا اظہار بھی اسی سطح پر ممکن ہے۔

۸۔ اُردو کو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دوسری قوموں نے نئے نئے رنگ ملا کر ایک ایسا رنگ دیا ہے جس میں سب تہذیبوں کی جھلک موجود ہے۔ یہ زبان انڈک اور عرب ایرانی تہذیبوں کا سب سے بڑا بلکہ واحد سنگم ہے۔ ہندی والے اس میں سے ''عربوایرانین'' کلچر کو خارج کر کے اسے خالص انڈک کلچر میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، مغربی تہذیب کے اس بھاری بھرکم رولر (Roller) کی وجہ سے، جو برصغیر کی تہذیبوں پر تیزی سے پھر رہا ہے، اب ممکن نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اُردو کے سیاسی مسئلے کا حل رسم الخط کی تبدیلی ہرگز نہیں ہے بلکہ سکول اور کالجوں وغیرہ کے بند دروازے کھول کر اُردو کی باقاعدہ تعلیم کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

اُردو کا رسم الخط

ہماری زبان کے موجودہ مسائل میں رسم الخط کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ ناگری تحریر کو فارسی رسم الخط پر ترجیح دیتے ہیں اور اُردو کی موجودہ تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کئی طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ ظاہر میں یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقت بہت کم پیش آتی ہے۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے۔ مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کسی عبارت میں ہوتا ہے اور اس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس فقرے کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے جو ایک مثال سے سمجھ میں آ جائے گی۔ فرض کیجیے کہ کہیں لفظ خط لکھا ہوا ہے، اسے تین طرح پڑھ سکتے ہیں خَط، خِط، خُط۔ مگر خِط اور خُط سے ہمارے کان آشنا نہیں اور خط پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے، اس لیے جہاں کہیں ہم خط لکھا ہوا دیکھیں گے اسے بلا تامل خط ہی پڑھیں گے۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر خِط یا خُط کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں خِط یا خُط کوئی لفظ نہیں ہے اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر وہ لوگ نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو اُردو زبان سے واقف نہیں مگر صرف حروف سیکھ کر کسی زبان کی تحریروں کا بالکل صحیح پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس میں اُردو کی کیا تخصیص ہے۔ پھر یہ اتفاق تو شاذ و نادر ہی ہوگا کہ جو شخص اُردو نہ جانتا ہو وہ اُردو کی تحریریں پڑھنا چاہے، ایسے نادر اتفاقات کے خیال سے اُردو کے رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ اگر لفظوں پر اعراب لگے ہوئے ہوں تو ایک حرف شناس آدمی بغیر مطلب سمجھے ہوئے بھی اُردو کی عبارت پڑھ سکتا ہے۔ آخر اعراب بھی تو ہمارے رسم الخط کا ضروری جز ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ابتدائی درسی کتابوں کے علاوہ اعراب کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور یہ مہارت پیدا کر لیتے ہیں کہ بغیر اعراب کے کسی تحریر کو روانی کے ساتھ پڑھ لیں۔

یہ مہارت پیدا کرنے میں اُردو رسم الخط کی ایک خاص خصوصیت سے بہت مدد ملتی ہے۔ وہ

خصوصیت یہ ہے کہ اُردو تحریر میں لفظ کا اصل ڈھانچا صرف حروفِ صوت (Consonants) سے بنتا ہے۔ اعراب (Vowels) اس ڈھانچے کے اندر بیٹھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ حرفوں کے اوپر یا نیچے الگ سے لگا دیے جاتے ہیں۔ کسی لفظ کو پڑھتے وقت نگاہ اور توجہ کا مرکز اس کا اصل ڈھانچا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نقش جو دماغ میں بنتا ہے اس میں اس کا ڈھانچا بہت اجاگر ہوتا ہے اور اعراب دھندلے اور چونکہ اعراب کو ترک کر دینے سے لفظوں کے ڈھانچے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اس لیے اُردو عبارت بغیر اعراب کے آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے۔ یہ بات ان تحریروں میں پیدا نہیں ہو سکتی جن میں اعراب لفظوں کے ڈھانچے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں، جیسا کہ ناگری اور رومن تحریروں میں ہوتا ہے۔

اب رہی گھسیٹ لکھائی تو اس کا تو پڑھنا ناگری تحریر میں اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا اُردو تحریر میں۔ جو شخص اُردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق کے بعد گھسیٹ میں لکھی ہوئی اُردو عبارت آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اُردو تحریر کوئی سوا سو برس سے کچہریوں اور دفتروں میں استعمال کی جا رہی ہے اور اس سے پہلے بھی جب کچہریوں اور دفتروں کی زبان فارسی تھی تب بھی یہی حروف سینکڑوں برس استعمال میں رہ چکے تھے۔ پولیس اور کچہری والوں کی گھسیٹ لکھائی لفظوں کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے۔ پھر بھی ان حرفوں کی وجہ سے کوئی خاص دقت کبھی پیش نہیں آئی۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اس رسم الخط کی خرابی سے ایک فریق کی جگہ دوسرے پر ڈگری ہو گئی ہو یا مجرم کی جگہ کوئی بے قصور سزا پا گیا ہو۔ صدیوں کے ان عملی تجربوں کے مقابلے میں خیالی اعتراض اور فرضی دشواریاں کیا اہمیت رکھتی ہیں؟

فارسی حروف ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہو گئے تھے کہ ہندی زبان کی کتابیں بھی ان ہی حرفوں میں لکھی جاتی تھیں۔ ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی ادب میں جو بلند درجہ حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کتاب کے جتنے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب فارسی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں اور خود میرے مختصر کتابی ذخیرے میں ہندی کی کئی کتابیں فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) سندر سنگار۔ مصنفہ سندر کوی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۲) رسارنو۔ مصنفہ سکھ دیو کوی۔ نائکا بھید۔ گنگا دھر نے ۱۲۱۳ھ میں نقل کی۔

(۳) بھا کھا بھوکن۔ النکا۔ ۱۲۱۳ھ میں نقل کی گئی۔

(۴) اُمر چندرکا۔ بلاغت۔ مصنفہ اُمر لیس۔

(۵) رَسک پریا۔ مصنفہ کیشو داس۔

(۶) رس راج۔ مصنفہ متی رام۔ منالال۔ شیو پرشاد، امید علی اور طالب حق نے ۱۲۱۸ھ میں نقل کی۔

(۷) رام چندر چندر کا۔ مصنفہ کیشو داس۔ سمبت ۱۸۶۰ میں نقل کی گئی۔

(۸) انیکارتھ۔ مصنفہ نند و داس۔

(۹) نام مالا۔ ۱۲۱۵ھ میں نقل کی گئی۔

(۱۰) انور چندر کا۔ مصنفہ انور کوی۔

(۱۱) لیلاوتی ٹیکا۔ مصنفہ ودیادھر۔

(۱۲) بھگود گیتا۔ مصنفہ ہری بلبھ۔ سمبت ۱۸۷۴ میں نقل کی گئی۔

(۱۳) و (۱۴) دو رسالے نائکا بھید پر۔

(۱۵) ایک منظوم کتاب۔ مصنفہ بہاری لال۔

(۱۶) ایک مجموعہ جس میں رحیم، احمد، تلسی داس وغیرہ کے دوہے شامل ہیں۔

یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ناگری کے مقابلے میں اُردو کی تحریر بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ناگری کا سیکھنا نسبتاً کچھ آسان ہو مگر اتنا آسان نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ اُردو اور ناگری تحریروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تفصیلی اور طولانی بحث درکار ہے۔ اس سلسلے میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا ہیں۔

(۱) اُردو حروف ناگری حرفوں سے بہت زیادہ آوازیں ادا کر سکتے ہیں۔

(۲) اُردو کے مفرد حروف بہت سادے اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔

(۳) ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اُردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں اس لیے ان کو سیکھنے میں بھی زیادہ دیر لگتی ہے اور لکھنے میں بھی۔

(۴) ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ حروف مقرر کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ثقیل آوازیں حقیقت میں نئی آوازیں نہیں ہیں، بلکہ خفیف آوازوں میں ھ کی آواز شامل ہونے سے بن جاتی ہیں۔ اُردو تحریر میں اس حقیقت پر نظر رکھی گئی ہے اور ثقیل آوازوں کے لیے علیحدہ

علامتیں مقرر کر کے حرفوں کی تعداد میں بے ضرورت اضافہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو ظاہر کرنے کے لیے معمولی حرفوں کے ساتھ ھ لکھ دی جاتی ہے۔ رومن رسم الخط میں بھی یہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً ت کی ثقیل صورت تھ کے لیے T کے ساتھ H لکھ دیا جاتا ہے، جیسے THEME, THIN, MATHEW, THORAX, THURSDAY, THOUGHT, THANK ناگری میں بھی جن ثقیل آوازں کے لیے مخصوص حرف موجود نہیں ہیں وہ اسی طرح لکھی جاتی ہیں کہ معمولی حرفوں کو کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ مثلاً کولھو، چولھا، آلھا، کلھاڑی، کمھار، تمھاری، ننھا، کنھیا، میں لھ، مھ اور نھ کی آوازیں یوں ظاہر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح کل ثقیل آوازیں ظاہر کی جاسکتی تھیں۔ ان کے لیے علیحدہ علیحدہ علامتیں مقرر کرنے سے ناگری حرفوں کی تعداد بلاضرورت بڑھ گئی۔ اس کے باوجود ر اور ھ کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے جیسے سرھانا وہ ناگری تحریر میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال ڑ اور ھ کی مخلوط آواز کا ہے جیسے گاڑھا، کڑھائی، چڑھنا، گڑھ۔

(۵) ناگری میں زبر کی حرکت ہر حرف کی ذات میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرفوں کی تمام حرکتوں کے لیے علامتیں موجود ہیں جو ماترے کہلاتی ہیں، مگر زبر کے لیے کوئی ماترا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کسی حرف میں زبر کی حرکت کو غیر موجود دکھانا ہوتا ہے تو اس کو اس کے بعد والے حرف سے ملا کر لکھتے ہیں اور اس حالت میں کبھی پہلے حرف کی کبھی دوسرے حرف کی اور کبھی دونوں حرفوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس طرح دو دو حرفوں کے ملانے سے جو نئی صورتیں یا مرکب حرف بنتے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں پہنچتی ہے۔ بعض موقعوں پر تین تین حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی زیادہ پیچیدہ اور مشکل صورتیں بن جاتی ہیں۔ میڈیکل ہال پریس، بنارس میں ۱۸۷۷ء کی چھپی ہوئی ہندی پرائمر میں ناگری کے دہرے اور تہرے حرف دیے ہوئے ہیں۔ دو دو حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں ان کی تعداد ۳۸۲ اور تین تین حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں ان کی تعداد ۶۷ ہے۔ اس طرح ناگری کے مرکب حرفوں کی مجموعی تعداد ۴۴۹ ہوئی۔ دو تین حرفوں کو ملا کر ایک کرنے کا کوئی اصول

بھی مقرر نہیں ہے۔ اس لیے ان سب صورتوں کو یاد کرنا پڑتا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(۶) ناگری میں تشدید کے لیے کوئی علامت نہیں ہے۔ مشدّد حرف ادھورا لکھ کر پورے حرف سے ملا دیا جاتا ہے۔ ادھورے حرفوں کی صورتیں اور ان کو پورے حرفوں سے ملانے کے طریقے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو یاد رکھنے کے لیے بہت محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو تحریر میں حرف پر تشدید کی چھوٹی سی علامت بنا دینا کافی ہوتا ہے۔

(۷) ناگری میں حرف رؔ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد علامتیں ہیں جو مختلف حالتوں میں مختلف جگہوں پر مختلف صورتوں سے لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح نون غنہ کے لیے کئی علامتیں ہیں جو مختلف حرفوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حرف ش کی آواز کے لیے بھی ناگری میں دو حرف ہیں۔ بعض لفظوں میں ایک حرف لکھا جاتا ہے بعض میں دوسرا۔

(۸) بعض آوازوں کے لیے دو دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے۔ خواہ ایک حرف لکھا جائے خواہ دوسرا۔

(۹) کھ کی آواز کے لیے جو حرف ہے وہ رؔ اور وؔ کی علامتوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں۔ مثلاً دوا کھانا ہے لکھا جائے تو اس کو دوا روانہ ہے، بھی پڑھ سکتے ہیں اور اب خ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے کھؔ کے نیچے نقطہ بھی نہیں دیا جاتا اس لیے اب اس فقرے کو دوا خانہ ہے، بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ چیزیں ناگری تحریر میں اچھی خاصی دشواری پیدا کرتی ہیں اور ان سب پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کے تمام لفظوں کو بھی فقط سن کر ناگری حرفوں میں صحیح طور پر لکھ لینا ممکن نہیں ہے۔ سینکڑوں لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے بڑی مدت اور کافی محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناگری کے بعض حرف جو صرف سنسکرت لفظوں میں آتے ہیں ان کی صورت بہت پیچیدہ اور تلفظ نہایت مشکل ہے۔ یہ حرف ہندی الف بے سے تقریباً خارج کر دیے گئے تھے۔ مگر اب جبکہ ہندی لفظوں کا تلفظ اصل سنسکرت کے مطابق کیا جا رہا ہے اور سنسکرت کے نئے الفاظ ہندی میں کثرت سے داخل کیے جا رہے ہیں تو وہ حروف بھی استعمال میں آئیں گے اور تحریر کی دقتوں کو بڑھائیں گے۔

ناگری رسم الخط کے طرف دار اکثر ان دقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُردو تحریر سیکھنے میں ناگری سے کچھ زیادہ وقت صرف ہوتا ہے تو بھی آخر میں اُردو ہی کی تحریر زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ یعنی اگر ایک آدمی تیس چالیس برس تک برابر اُردو حرفوں میں لکھتا رہے اور دوسرا ناگری حرفوں میں تو اُردو میں لکھنے والے کے کام کی مقدار کہیں زیادہ نکلے گی اور اس کو ابتدا میں جو تھوڑے سے وقت کا نقصان پہنچا تھا اس سے کہیں زیادہ نفع ہوگا۔ اُردو کی تحریر ایک طرح کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) ہے جس کو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص پڑھ لکھ سکتا ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ بھی اور اس عجلت پسندی اور اقتصادی کشمکش کے زمانے میں یہ وقت اور کاغذ کی بچت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ناگری کے طرف دار اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔ یہ دعویٰ حقیقت سے بہت دور ہے۔ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ WORLD, DOG, PEN, WAS, MIRAGE, BIRD کے سے معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہے۔ دوسری زبانوں کا کیا ذکر، خود ہندی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا صحیح تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا ہوسکتا۔ مثلاً یہ، وہ، چھاؤں، کھڑاوں، چناؤ، پھیلاؤ، دکھاؤ، سناؤ، سرھانا، جواہر، نہرو۔ ان حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ ہر زبان کے الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جاسکتے ہیں۔ اُردو رسم الخط کے لیے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اتنا تو بے خوف تردید کہا ہی جاسکتا ہے کہ اُردو حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔

ناگری میں ڑ اور ڑھ کے لیے کوئی حرف نہیں ہے۔ ڈ اور ڈھ کے نیچے ایک نقطہ لگا کر یہ آوازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔ اسی طرح چند قریب المخرج حرفوں کے نیچے نقطہ لگا کر خ، ذ، ز، ض، ظ، غ، ف، ق کی آوازیں ادا کرنے کا نہایت آسان طریقہ رائج تھا لیکن اتر پردیش کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت نے تعلیم، کتابت، طباعت وغیرہ کے بڑے بڑے ماہروں کے مشورے سے ناگری خط میں جو اصلاحیں کی ہیں ان کی رو سے اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔ اس طرح متعدد آوازیں ناگری رسم الخط سے خارج ہو گئیں اور اُردو کے ہزاروں اور انگریزی، فرانسیسی وغیرہ کے سینکڑوں لفظ جن میں یہ آوازیں شامل ہیں اگر ناگری خط میں لکھے جائیں تو ان کی ہیئت ہی بگڑ جائے گی۔ فیض پھیج، غالب گالب، اور غزل گجل ہو جائے گی؛ خزانہ کھجانا، خربوزہ کھربوجا اور افریقہ اپھریکا بن جائے گا؛ ٹیلی فون ٹیلی پھوں، فرانس پھرانس، فزکس

پھنکس ہو جائے گا۔ اس طرح اب اُردو کے لیے ناگری رسم الخط اور زیادہ ناموزوں ہو گیا ہے۔

اگر کسی حیثیت سے ناگری تحریر اُردو تحریر سے بہتر ٹھہرے تو بھی اس حقیقت کا انکار نہ کیا جا سکے گا کہ ناگری خط ہندوستان کے بعض حصوں کے سوا دنیا کے کسی اور خطے میں مستعمل نہیں ہے اور اُردو کا رسم الخط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں، یورپ کے بعض خطوں اور افریقہ کے ایک بڑے حصے میں رائج ہے اور دنیا کی کئی زبانیں ان ہی حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر ہندوستان کو ان تمام ملکوں سے سیاسی، تجارتی اور تہذیبی تعلقات قائم کرنا ہیں تو اُردو زبان کے ساتھ فارسی خط کو باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ فارسی خط تو ہندوستان میں صدیوں سے رائج ہے اس کو ترک کرنے کا کیا ذکر، اگر ہندوستان کو اپنے پاس پڑوس کے ملکوں سے ہر طرح کے تعلقات قائم کرنا ہیں، تو اس کو برمی، چینی، جاپانی، روسی وغیرہ کے رسم الخط بھی سیکھنا پڑیں گے۔

اُردو کی تحریر کو اور زیادہ آسان بنانے کے خیال سے بعض لوگوں کی تجویز ہے کہ ث۔ ح۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ یہ آٹھ حرف اُردو کے حروف تہجی سے خارج کر دیے جائیں۔ اس لیے کہ جو آوازیں ان حرفوں سے ادا کی جاتی ہیں ان کے لیے دوسرے حروف موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں ہر حرف ایک مخصوص آواز کی علامت ہے جو کسی دوسرے حرف سے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ ان حرفوں کی مخصوص آوازوں کو ہم ادا بھی کر سکتے ہیں۔ مگر بالعموم ایسا نہیں کرتے، بلکہ ث اور ص کو س کی طرح، ذ۔ ض۔ ظ کو ز کی طرح، ح کو ہ کی طرح اور ع کو الف کی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آٹھ حرف زائد اور بے ضرورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ حرف تحریر میں کچھ دشواریاں بھی پیدا کرتے ہیں، مگر وہ کون سا رسم الخط ہے جس میں اس طرح کی دشواریاں نہیں ہیں اور جن کے صرف حروف سیکھ لینے سے تمام الفاظ صحیح لکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان حرفوں کی وجہ سے اُردو کے بہت سے لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہی دقت ناگری تحریر میں بھی ہے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اور یہی دقت اُردو اور ناگری دونوں سے کہیں زیادہ رومن تحریر میں موجود ہے جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔

یہ حروف جو بظاہر بے کار معلوم ہوتے ہیں ان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں جب کہ لکھ دیے جاتے ہیں تو املا کے اختلاف سے اپنے معنی خود بتا دیتے ہیں جیسے نال اور نعل، نظیر اور نذیر، ثواب اور صواب، کسرت اور کثرت، علَم اور اَلَم، عام اور آم، حائل اور ہائل، لعل اور لال، ذکی اور زکی، اسیر اور اثیر، سریر اور صریر، ہار اور حار، صُور اور سُور، جعل اور جال، صدا اور سدا، باد اور بعد، صد اور سد، تان اور طعن، باز اور بعض، عرض اور ارض، عیال اور

ایال، سفر اور صفر، حال اور ہال، تانا اور طعنہ، زن اور ظن، ماموراور معمور اور صورت اور سورت، صور اور سور، حل اور ہل، جالی اور جعلی، عرضی اور ارضی۔ جن لفظوں کے تلفظ یکساں اور معنی مختلف ہیں اگران کی املا بھی یکساں ہو جائے تو جو غلط فہمیاں ابھی صرف کانوں کے ذریعے سے ہوتی ہیں وہ آنکھوں کے ذریعے سے بھی ہونے لگیں گی۔

یہی حرف ہم کو اس بات کا پتا لگانے میں مدد دیتے ہیں کہ کون سا لفظ کس لسانی خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ لفظوں کے خاندانی، ملکی اور نسلی امتیازات پر غور کرنے سے بیش قیمت تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور قوموں اور ملکوں کے باہمی تعلقات کا پتا لگتا ہے۔ ان حرفوں کو ترک کر دینے سے بہت سے لفظوں کی صورت بدل جائے گی اور اس سے ایک طرف اس طرح کی معلومات اور انکشافات کا ایک دروازہ بند ہو جائے گا اور دوسری طرف جب لفظوں کی اصل کا پتا نہ لگ سکے گا تو نہ ان کے بنیادی معنی معلوم ہو سکیں گے، نہ لغوی اور مجازی معنوں کا تعلق نظر آئے گا، نہ عام اور خاص مفہوم کا ربط سمجھ میں آئے گا۔ اس طرح اُردو رفتہ رفتہ وہ خصوصیتیں کھو بیٹھے گی جو ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور معیاری زبان کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں اور جو ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور زباں دانوں کی صدیوں کی مسلسل کوششوں سے اُردو کو حاصل ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ کم مقدار میں وہ تمام نقصانات پہنچیں گے جو کوئی نیا رسم الخط اختیار کرنے سے پہنچ سکتے ہیں اور جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان حرفوں کو نکال ڈالنے سے لفظوں کی صورت کیا سے کیا ہو جائے گا:

موجودہ صورت	مجوزہ صورت
حضرت	ہزرت
عرض	ارز
صاحب	ساہب
طرح	ترہ
حفیظ	ہفیز

جن لوگوں کی نگاہیں ترہ، ارز اور ہزرت کی عادی ہو جائیں گی وہ طرح، عرض، حضرت کو کیونکر پڑھ سکیں گے۔ اگر ان کی تعلیم کی اعلیٰ منزلوں میں یہ خارج کیے ہوئے حرف سکھا بھی دیے جائیں تو بھی

ان لفظوں کو ان صورتوں میں پڑھنا ان کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کوئی لفظ ایک ایک حرف کو ٹٹول ٹٹول کر اور ہجے لگا لگا کر نہیں پڑھا جاتا، بلکہ اس کی معین صورت اس کے تلفظ کی ایک مستقل علامت بن کر ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور صورت، تلفظ اور معنی میں ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ ادھر لفظ کی صورت آنکھوں کے سامنے آئی ادھر وہ پڑھ بھی لیا گیا اور سمجھ بھی لیا گیا۔ صورت بدل جانے سے لفظ کا پڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں بھی دیر لگ جاتی ہے۔ یعنی اس کو پڑھنے اور سمجھنے میں دماغ پر معمول سے زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔

بعض لوگ اُردو حرفوں کے ناموں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حروف مفرد آوازوں کی علامتیں ہیں، ان کے ناموں کا کئی کئی آوازوں سے مرکب ہونا درست نہیں۔ مثلاً اَ کی آواز کو ظاہر کرنے والے حرف کا الف نام رکھنا مناسب نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ناگری میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ درست ہے کہ حرف جس آواز کو ظاہر کرتا ہے وہی آواز اس حرف کا نام ہے، مثلاً اَ کی آواز کے لیے جو حرف ہے اس کا نام بھی آ ہے۔ یہ اعتراض ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں الف اَ کی آواز کا نام نہیں ہے بلکہ اس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جو اَ، آ، اِ، اِی، اُ، او، اِے، اَے اَو، اَو، میں مشترک ہے۔ یہ سب صورتیں ایک ہی آواز کی مختلف حرکتوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس مجرد آواز کی علامت آ ہے اور اس علامت کا نام اَلف ہے۔ یہی حالت اور سب حرفوں کی ہے، مثلاً میم، یہ مَ کا نام نہیں ہے بلکہ اُس علامت کا نام ہے جو اس آواز کو ظاہر کرتی ہے جس سے ان لفظوں کی ابتدا ہوتی ہے مَن، ماش، مِس، میر، مُل، مُونھ، میچ، میل، مَوچ، مَوج۔ یہ سب لفظ ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں مگر اس کی حرکت ہر جگہ مختلف ہے، جس سے اس ایک آواز کی دس صورتیں ہو گئیں ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی صورت کو ''م'' کہنا درست ہے۔ زیادہ سے زیادہ دوسری صورت کو بھی مَ کہہ لیجیے۔ اس لیے کہ مَ کی حرکت کو کھینچنے ہی سے مَا بن جاتا ہے۔ ان دو صورتوں کو چھوڑ کر باقی آٹھ صورتوں کو مَ کہنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ناگری میں حرفوں کی جو آوازیں ہیں وہی ان کے نام ہیں کہاں تک درست ہے۔

جس طرح اوپر دی ہوئی مثالوں میں مِس، میر، مُل، مُونھ، میچ، میل، مُوچ، مَوج کی ابتدائی متحرک آواز مَ نہیں ہے، اسی طرح نام، دام کام کی آخری ساکن آواز بھی مَ نہیں ہے۔ اس لیے ناگری میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے والے حرف کا نام بھی مَ نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں ہندی اور اُردو تلفظ کا ایک اصولی فرق توجہ کے قابل ہے۔ ہندی میں لفظ کی آخری آواز متحرک ہوتی ہے، جیسے رامَ، شیامَ۔

اس لیے ہندی میں ان لفظوں کے آخری حرف کو مَ کہنا درست ہے لیکن اُردو میں اسم کی آخری آواز ہمیشہ ساکن ہوتی ہے۔ اس لیے رام اور شیام کی آخری آواز کو بھی اُردو میں مَ نہیں کہہ سکتے۔

ناگری میں ساکن آوازیں نظر انداز کر دی گئی ہیں اور زبر کی حرکت ہر آواز کی فطری حرکت مان لی گئی ہے۔ اسی وجہ سے آوازوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جن سے زبر کی حرکت ظاہر ہوتی ہے لیکن چونکہ ہندی میں بھی ہر آواز دس مختلف حرکتیں اختیار کر سکتی ہے اس لیے وہ نام بیش تر حالتوں میں آوازوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہر آواز کو متحرک ماننے اور زبر کو اس کی فطری حرکت قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً مَ پر اوٗ، کا ماترَا اور گَ پر اِی کا ماترا لگانے سے مُو اور گی کی آوازیں نکلنا چاہیے۔ ان کو مؤاور گی پڑھنا اُصولاً صحیح نہ ہوگا، بلکہ ان آوازوں کا ناگری حرفوں سے ادا کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔

اُردو میں دنیا کی اور زبانوں کی طرح متحرک اور ساکن دونوں طرح کی آوازیں ہیں اور حروف غیر متحرک آوازوں کی علامتیں ہیں اس لیے حرفوں کے نام ایسے رکھے گئے ہیں جو آوازوں کی کسی حرکت کو ظاہر نہیں کرتے اور اس طرح اُردو رسم الخط ناگری تحریر کی ان بے اصولیوں اور دشواریوں سے محفوظ ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں ہر حرف کا نام اسی آواز سے شروع ہوتا ہے جس کی وہ علامت ہے اور اس طرح حرفوں کے نام ان کی آوازوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

اس مختصر بحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ نہ ناگری حرفوں کے نام تعریف کے لائق ہیں نہ اُردو حرفوں کے نام اعتراض کے قابل۔

بعض لوگ رومن رسمِ الخط کی تائید کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر اُردو اور ہندی دونوں کے لیے رومن رسم الخط اختیار کر لیا جائے تو ان زبانوں کے افتراق کا ایک بڑا سبب دور ہو جائے گا اور دونوں کے مل کر ایک ہو جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ مگر جب ان دونوں زبانوں کے قریب لانے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی خواہش بھی معلوم نہیں ہوتی اور جب ہندی کے بعض بڑے ذی اثر حامی بالا علان کہہ رہے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کی آمیزش کرنا چاہیے اور سنسکرت آمیز ہندی کو ملک کی عام زبان ہونا چاہیے، تو صرف رسم الخط کی تبدیلی سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس حالت میں اگر ہم رومن حروف اختیار کر لیں تو اُردو اور ہندی کے میل سے ایک عام فہم زبان تو پیدا نہ ہوگی البتہ اُردو اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گی اور اس کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے غیر ملک اور غیر زبان والوں کو اُردو سیکھنے میں آسانی ہوگی لیکن کسی زبان کا رسم الخط معین کرتے وقت اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی آسانی یا فائدے کا خیال اصل اصول ہونا چاہیے۔ جب ہم اس اصول پر اس مسئلے کو طے کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ رسم الخط کو اُردو کے لیے سب سے زیادہ مناسب پاتے ہیں۔ مدت دراز کے تجربے سے اپنی ضرورتوں کے موافق جو ترمیمیں اس رسم الخط میں ہوتی رہی ہیں، انھوں نے اس کو اُردو کے لیے سب سے زیادہ موزوں بنا دیا ہے۔ اب اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا خط اختیار کیا جائے تو اس کی ضروری ترمیم و اصلاح کے لیے پھر ایک طویل مدت درکار ہو گی۔ پھر بھی اس کو اُردو کے مزاج سے ہم آہنگ بنا لینا مشکوک ہی رہے گا۔

رومن رسم الخط اختیار کر لینے کا ایک فائدہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کو سیکھ کر ہم کو مختلف تحریروں کے سیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم اُردو، ہندی، انگریزی اور دوسری مغربی زبانیں رومن خط کی مدد سے بآسانی پڑھ سکیں گے۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اگر تمام زبانیں رومن حرفوں میں لکھی جانے لگیں تو ہم کو کوئی نئی زبان سیکھنے کے لیے نئی صورتوں کے مفرد حروف کم سیکھنا پڑیں گے اور اس سے وقت کی کچھ بچت ہوگی۔ مگر اس زبان کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی دو تین حرفوں کو ملا کر ایک حرف بنانا ہوگا، کبھی نئے حروف بنانا اور نئی علامتیں مقرر کرنا ہوں گی، کبھی پرانے حرفوں سے نئی آوازیں ادا کرنا ہوں گی اور کبھی ایک پُرانا اور ایک نیا حرف ملا کر لکھنا ہوگا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں اس کثرت سے واقع ہوں گی کہ مفرد حرفوں میں بہت کچھ یکساں ہونے کے باوجود ہر زبان کا رسم الخط بدل جائے گا اور یہ ممکن نہ ہوگا کہ بغیر کسی زبان سے واقفیت پیدا کیے ہوئے اس کی لکھی ہوئی عبارت صحیح پڑھ لی جائے۔

تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جو لوگ ساری عمر رومن حرفوں میں انگریزی پڑھتے لکھتے رہتے ہیں وہ ان ہی حرفوں میں لکھی ہوئی فرانسیسی یا جرمن عبارت کا ایک جملہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو لوگ اُردو اور انگریزی دونوں زبانیں بخوبی جانتے ہیں اور فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اُردو اور رومن حرفوں میں لکھی ہوئی انگریزی کو بڑی روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ان کو رومن میں لکھی ہوئی اُردو کو پڑھنے میں بڑی دیر لگتی ہے اور بہت دماغی محنت کرنا پڑتی ہے۔ زبان نہ جاننے کی حالت میں تو اکثر لفظوں کا پڑھنا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا، مثلاً کوئی شخص جس نے رومن حرف سیکھ لیے ہوں مگر نہ انگریزی زبان سے واقف ہو نہ اُردو سے، وہ اگر کسی عبارت میں MAZE لکھا ہوا دیکھے تو وہ کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کو میز پڑھنا چاہیے یا مزے۔ اسی طرح Mail کے بارے میں یہ طے نہیں کر سکتا کہ اس کو میل پڑھے یا مَیل۔

لیکن جو شخص یہ دونوں زبانیں جانتا ہو وہ ان لفظوں کو انگریزی عبارت میں میز اور میل پڑھے گا اور اُردو عبارت میں مزے اور میل ۔ ایک دوسری صورت ملاحظہ ہو۔ اگر کہیں اُردو کے لفظ ''لوگ'' اور ''تھے'' لکھے ہوئے ہوں یعنی LOG اور THE اور ان کو کوئی ایسا شخص پڑھے جو صرف انگریزی زبان جانتا ہو تو یقیناً وہ ان کو لاگ اور دی پڑھے گا۔ لوگ اور تھے ہرگز نہ پڑھے گا۔ ایسی ہی نہ معلوم کتنی دقتیں پیش آئیں گی جن کا حل زبان کے علم کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ پس یہ دعویٰ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ رومن حرفوں کے ذریعے سے ان حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔

رومن حروف سیکھ کر ان حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتوں کا پڑھ سکنا تو ایک خیال محال ہے۔ اگر انگریزی دان حضرات غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ صرف انگریزی عبارت پڑھ لینے کی قابلیت جو ان میں پیدا ہوئی ہے وہ بھی فقط رومن حروف سیکھ لینے کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قابلیت پیدا کرنے کے لیے وہ لفظوں کا املا، تلفظ اور معنی سالہا سال تک یاد کرتے رہے ہیں اور اس کے بعد بھی جب کوئی نیا لفظ دیکھنے یا سننے میں آ جاتا ہے تو اس کا صحیح تلفظ یا املا ڈکشنری سے پوچھنا پڑتا ہے۔ خود سے نہ اس کو صحیح طریقے سے بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔

اب تک دنیا میں کوئی ایسا رسم الخط ایجاد نہیں ہوا جو کل زبانوں کا کیا ذکر کسی ایک زبان کی تمام آوازوں کو بھی پورے طور پر ادا کر سکتا ہو۔ خالص صوتیاتی اصول پر بنایا ہوا رسم الخط بھی تمام آوازوں کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں آوازوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت ہو سکتی ہے لیکن اس کی یہ صلاحیت ہی اس کو ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ صوتی رسم الخط جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی زیادہ ناقابل عمل ہوگا۔ یہ بات بظاہر قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے اس کی کچھ توضیح کی جاتی ہے۔ ایک ہی شخص ایک ہی لفظ بولتا ہے تو مختلف موقعوں پر اور مختلف حالتوں میں اس کا لہجہ بدلتا رہتا ہے۔ ایک ہی جگہ کے رہنے والے لوگ ایک ہی لفظ کو مختلف لہجوں سے ادا کرتے ہیں۔ مختلف مقاموں کے رہنے والوں میں تو لہجے کا اختلاف بہت ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ صوتی رسم الخط اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی لفظ کو لہجے کے ہر تغیر کے ساتھ ایک نئی صورت سے لکھنا ہوگا۔ اس طرح کسی لفظ کی کوئی معین صورت ہی باقی نہ رہے گی، بلکہ ایک ایک لفظ کی بہت بہت سی صورتیں ہو جائیں گی۔ ان سب مختلف تحریری صورتوں کو ایک ہی لفظ سمجھنا بھی مشکل ہوگا اور وہ دماغی پریشانی پیدا ہوگی کہ پڑھنا لکھنا ایک مصیبت بن جائے گا۔

صوتی رسم الخط کو جتنا مکمل کرنے کی کوشش کی جائے گی اتنی ہی حرفوں اور علامتوں کی تعداد بڑھتی

جائے گی اور اتنا ہی ان کا یاد رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ انھیں دقتوں سے بچنے کے لیے ہر زبان کی تحریر میں عملی آسانی کو صوتیاتی صحت پر مقدم رکھنا پڑتا ہے۔ تلفظ حقیقت میں ایسی نازک چیز ہے کہ لکھا ہوا لفظ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے، اس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ حرفوں کی آوازوں اور ان کی حرکتوں میں ایسے ایسے باریک فرق ہوتے ہیں کہ ان کو علامتوں کے ذریعے سے بالکل ٹھیک ٹھیک ظاہر نہیں کر سکتے، اسی لیے صوتیات کے ماہروں کی بھی یہی رائے ہے کہ ہر لفظ کی معیاری مکتوبی صورت صرف ایک ہونا چاہیے۔ یعنی لفظ کی تحریری صورت کو اس کے تلفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں بلکہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہیے جو تلفظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہنمائی کرتی ہے۔ اُردو کے رسم الخط کو بھی اسی عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

ایک مدت تک ہندوستان کی عدالتی، دفتری، تجارتی، سیاسی اور علمی زبان انگریزی رہی ہے۔ انگریزی پڑھنے والے اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں اور انگریزی ہی کے ذریعے سے ہم رومن حرفوں سے آشنا ہوئے ہیں۔ جو لوگ اُردو کے لیے رومن رسم الخط تجویز کرتے ہیں انھوں نے بھی رومن حرفوں کا استعمال انگریزی ہی سے سیکھا ہے۔ اس لیے انگریزی کے رسم الخط پر ایک نظر ڈالنا اور اُردو کے رسم الخط سے اس کا مقابلہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

انگریزی زبان صدیوں سے رومن حروف میں لکھی جا رہی ہے اور اس کے رسم الخط میں اصلاحیں بھی ہوتی رہی ہیں مگر اب اس میں اتنی خرابیاں موجود ہیں کہ اُردو کا موجودہ رسم الخط اس سے کہیں بہتر ہے۔ اس دعوے کی تفصیلی بحث بہت پھیلاؤ چاہتی ہے۔ یہاں صرف چند باتیں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہیں:

(۱) کہا جاتا ہے کہ اُردو کی تحریر میں جو چیز سب سے زیادہ دشواری پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں بعض آوازوں کے لیے کئی کئی حرف استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ اُردو میں تین آوازوں کے لیے دو دو حرف، ایک کے لیے تین حرف اور ایک کے لیے چار حرف ہیں۔ مگر ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جو ایک سے زیادہ آوازوں کو ظاہر کرتا ہو۔ اس لیے بعض لفظوں کو لکھنے میں تو کچھ دقت ہو سکتی ہے مگر ان کو پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ صرف چند لفظ ایسے ہیں جن میں نون کا حرف میم کی آواز دیتا ہے۔ مگر ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کسی لفظ میں ساکن نون کے بعد متحرک بے آتی ہے جیسے منبر، عنبر، سنبل۔ اس کے خلاف انگریزی کی تحریر میں جہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں وہاں ایک ایک حرف کی کئی

کئی آوازیں بھی ہیں۔ اس لیے جو دقت بولے ہوئے لفظوں کے لکھنے میں پیش آتی ہے وہی لکھے ہوئے لفظوں کے پڑھنے میں بھی پیش آتی ہے اور انگریزی لکھنا پڑھنا اُردو لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

(۲) اُردو میں ہر آواز ایک مفرد حرف سے ادا کی جاتی ہے۔ انگریزی میں مرکب اور دہرے حرفوں سے بھی بہت کام لیا جاتا ہے اور ایسے حرفوں کی آوازیں بھی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ مثلاً ch کہیں چ کی آواز دیتا ہے کہیں ک کی اور کہیں ش کی۔

(۳) اُردو میں عربی لفظوں کی ابتدا میں کبھی کبھی الف لام لگا دیا جاتا ہے جو تعریف اور تخصیص کا فائدہ دیتا ہے اور ان دو حرفوں میں کبھی ایک کبھی دونوں کوئی آواز نہیں دیتے۔ اسی طرح فارسی کے چند لفظ ہیں جن میں واؤ کا حرف کوئی آواز نہیں دیتا جیسے خواب، خواہش۔ مگر ان دونوں چیزوں کے لیے قاعدے مقرر ہیں۔ انگریزی میں خاموش حروف جو بالکل بے ضرورت ہوتے ہیں، کثرت سے آتے ہیں، ہر جگہ آ سکتے ہیں اور کسی مقررہ قاعدے کی پابندی بھی نہیں کرتے۔

(۴) اُردو میں حرفوں کی حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لیے تھوڑی سی مفرد علامتیں ہیں۔ ہر علامت صرف ایک حرکت کے لیے اور ہر حرکت کے لیے صرف ایک علامت ہے۔ انگریزی میں حرکتوں کی یہ علامتیں، جو حرفوں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں، وہ بھی حروف صحیح کی طرح مفرد، مرکب، دُہری اور بے ضرورت سبھی طرح کی ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود نہ کسی حرکت کے لیے کوئی ایک علامت مخصوص ہے نہ کسی علامت کے لیے کوئی ایک حرکت مخصوص ہے۔ مثلاً Grow, Road, Toe, Go, Shoulder۔ ان پانچ لفظوں میں ایک ہی حرکت کے لیے پانچ علامتیں استعمال کی گئی ہیں یعنی ou, ow, oa, oe, o اس کے خلاف Shoe, Poet, Does اور foe ان چار لفظوں میں ایک ہی علامت oe چار مختلف حرکتوں کا کام دے رہی ہے۔

(۵) اُردو میں حرکت کی علامت ہمیشہ متحرک حرف کے ساتھ آتی ہے۔ انگریزی میں اس کے خلاف بھی ہوتا ہے، مثلاً Date, Joke, Fine ان لفظوں میں F ,I اور

D متحرک حرف ہیں۔اس لیے حرکتوں کی علامتیں صرف ان ہی حرفوں کے بعد ہونی چاہئیں تھیں۔K,Nاور T ساکن حرف ہیں۔ان کے بعد حرکت کی ایک علامت یعنی E کا آنا خلاف اصول بات ہے۔

اُردو کے فارسی رسم الخط اور انگریزی کے رومن رسم الخط کا مقابلہ جو مختصر اور سرسری طور پر یہاں کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ اُردو میں تحریر کی جو دقت بیان کی جاتی ہے وہ انگریزی میں بدرجہا زیادہ ہے۔ مثلاً انگریزی کا ایک معمولی اور کثیر الاستعمال لفظ ہے "Conceive"۔اس میں ابتدائی حرف C کی جگہ Kاور Ch بھی لکھا جا سکتا ہے۔o کی جگہ u بھی آ سکتا ہے،دوسرے c کی جگہ s بھی ہوسکتا ہے۔EI کی جگہ IE،EEاور EA بھی لکھا جا سکتا ہے اور آخری حرف E کو حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔یہ بارہ تبدیلیاں ہیں جو اس ایک لفظ کی تحریری صورت میں کی جا سکتی ہیں۔یعنی ان میں سے ایک یا زیادہ تبدیلیوں کے ساتھ اگر یہ لفظ لکھا جائے تو انگریزی کے موجودہ رسم الخط کے اعتبار سے اس کا یہی تلفظ باقی رہ سکتا ہے۔اب اگر ایک ہی آواز کے حرفوں کو بدل بدل کر اس لفظ کو لکھیں تو اس کی چھیانوے صورتیں بن سکتی ہیں۔اس بحث سے صاف ظاہر ہے کہ رومن حرفوں کی ذات میں یہ صفت داخل نہیں ہے کہ ان کو اختیار کر لینے سے پڑھنے لکھنے کی ساری دقتیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

انگریزی کے رسم الخط کی خرابی کی مثال میں جو لفظ اوپر پیش کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ تمام لفظوں کی حالت بالکل اسی کی سی نہیں ہے۔مگر انگریزی کے تقریباً اسی فی صدی الفاظ ایسے ضرور ہیں جو ایک سے زیادہ اور بعض حالتوں میں بہت زیادہ صورتوں سے لکھے جا سکتے ہیں۔یعنی ان کی جو املا صحیح سمجھی جاتی ہے وہ کسی قاعدے پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک رسمی اور روایتی چیز ہے۔

اگر انگریزی کے رسم الخط کی ان تمام بے قاعدگیوں پر جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے،اصولی حیثیت سے نظر کی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ انگریزی میں تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر باقی تمام الفاظ کی حالت یہ ہے کہ ان کو سن کر صحیح صورت سے لکھ دینا یا لکھا ہوا دیکھ کر صحیح تلفظ سے پڑھ لینا ممکن نہیں۔اس طرح انگریزی کا رسم الخط اتنا مشکل دکھائی دے گا کہ اس کا پڑھنا لکھنا تقریباً محال معلوم ہونے لگے گا۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی رسم الخط کے ساتھ انگریزی ان عظیم زبانوں میں ہے جن کے پڑھنے اور لکھنے والے تعداد میں دنیا کی بیشتر زبانوں سے زیادہ ہیں اور دنیا کے بہت سے حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصولی طور پر جتنی دشواریاں نظر آتی ہیں عملی طور پر اتنی پیش نہیں آتیں۔

بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے بہت سی دشواریاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ ابتدا میں کچھ لفظوں کا املا یاد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد مشاہدے کی تکرار سے بہت سے لفظوں کے نقش بغیر کسی خاص کاوش کے طالب علم کے ذہن میں اتر آتے ہیں اور پھر وہ مماثلت، مشابہت، تقابل، اشتقاق وغیرہ کی رہنمائی میں ان لفظوں کے قیاس پر دوسرے لفظوں کی مکتوبی صورت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ اس طرح اصولی دشواریاں عمل کی منزل میں بہت کچھ آسان ہو جاتی ہیں۔ یہیں سے یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اُردو کا فارسی رسم الخط جو اصولی حیثیت سے بھی انگریزی کے رومن رسم الخط سے کہیں زیادہ آسان ہے، اس کو برتنے میں کوئی غیر معمولی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رومن رسم الخط کو اُردو کے موجودہ رسم الخط پر ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غیر ملکوں کے عیسائی مشنریوں نے، جو نہ اُردو کے طرف دار تھے نہ ہندی کے اور جنھیں نہ اُردو کو فروغ دینا تھا نہ ہندی کو، جب شمالی ہند میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام شروع کیا تو ایک مدت تک اپنا تبلیغی لٹریچر رومن حرفوں میں چھاپتے رہے۔ مگر جب رومن رسم الخط کسی طرح مقبول نہ بن سکا تو آخر کار اس کو چھوڑ کر اُردو اور ناگری حرفوں میں اپنی کتابیں چھاپنے لگے۔ جو تجربہ ایک مرتبہ کیا جا چکا ہے اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔

رسم الخط بدلنے سے زبان کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ موجود ہو تو بحث کی ضرورت نہیں۔ مُسّر، گُپت، سریواستو کے سے کثیر الاستعمال لفظوں کو، جو ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے نام ہیں، اور تو اور خود ہندو اور وہ بھی تعلیم یافتہ ہندو مسرا، گپتا، سریواستو بولنے لگتے ہیں۔ یہ رومن رسم الخط ہی کی برکت تو ہے۔ تانگا کو ٹانگا، تاتا کو ٹاٹا اور دالمیا کو ڈالمیا کر دینا بھی رومن حروف کا کارنامہ ہے۔ صرف یہی چند مثالیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ رومن حروف ہمارے لفظوں کی صورت بگاڑ کر زبان کی شکل ہی بدل دیں گے۔

اگر رومن خط ہمارے لفظوں کا صحیح تلفظ باقی رکھ سکے تو بھی اس سے طرح طرح کے نقصان ضرور پہنچیں گے۔ ایک تو وہ اس رشتے کو قطع کر دے گا جو ہماری زبان کے حال کو اس کے ماضی سے جوڑتا ہے۔ دوسرے وہ بہت سے لفظوں کی اصل اور حقیقت پر پردہ ڈال دے گا اور یہ سمجھنا ممکن نہ رہے گا کہ کون سا لفظ کس خاندان کا ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ یعنی اُردو خط میں سے چند حرفوں کے خارج کر دینے سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں وہی نقصان رومن رسم الخط سے اس سے کہیں زیادہ مقدار میں پہنچے

گا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اُردو کا موجودہ رسم الخط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں میں رائج ہے۔ اگر ہم ایشیائی ملکوں اور ایشیائی زبانوں سے رشتہ توڑ کر یورپ اور یورپی زبانوں سے ناتا جوڑنا چاہتے ہوں تو اس خط کو چھوڑ کر رومن خط اختیار کرنے کا مشورہ ہمارے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

فارسی زبان اُردو کے لیے ایک بنیادی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ عربی سے بھی اُردو کو برابر تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا رسم الخط تقریباً بالکل وہی ہے جو اُردو کا ہے۔ اس لیے اگر اُردو کا تعلق فارسی عربی سے باقی رکھنا ہے تو اس کے موجودہ رسم الخط کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ رومن ہو یا کوئی دوسرا رسم الخط وہ اس تعلق کو قطع کر دے گا اور یہ اُردو کے لیے بے حد مضر ہوگا۔

اُردو زبان و ادب کو فارسی زبان و ادب سے جو قریبی تعلق ہے اس کی بنا پر اُردو کا با اصول مطالعہ فارسی کی واقفیت کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو قواعد اور لغت کی قدیم کتابیں فارسی میں ہیں، اُردو شاعروں کے قدیم تذکرے اور ہزاروں قطعات تاریخ جو اُردو ادب کی تاریخ کے قیمتی ماخذ ہیں، فارسی میں ہیں اور ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ جس کا اُردو زبان و ادب سے گہرا تعلق ہے اس کا تقریباً کل ذخیرہ فارسی میں ہے۔ اس لیے اُردو میں ادبی تحقیق کے واسطے فارسی کا علم ضروری ہے اور ان دونوں زبانوں کے لسانی اور ادبی تعلقات کی وجہ سے اُردو جاننے والوں کے لیے فارسی کا سیکھ لینا آسان ہے۔ اگر اُردو کا رسم الخط بدل دیا جائے تو اس آسانی میں بہت کمی ہو جائے گی اور صرف یہی نہ ہوگا بلکہ فارسی کی تحصیل کا ایک بہت بڑا محرک جاتا رہے گا۔

حروف کی تبدیلی سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہزارہا کتابیں جو اب تک لکھی جا چکی ہیں اور لاکھوں روپے کے صرف سے چھاپی جا چکی ہیں وہ بے کار اور رفتہ رفتہ مفقود ہو جائیں گی۔ اُردو کے کل کتابی ذخیرے کو نئے رسم الخط میں منتقل کرنا عملاً محال ہے۔

ایک نقصان یہ ہوگا کہ بہت سے غیر معمولی ذہانت اور فطانت والے شاعروں اور انشا پردازوں نے لفظی صنعتوں کے استعمال میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آسکے گا لفظی صنعتوں کا استعمال بذات خود کوئی ادبی کمال نہ سہی لیکن اس کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ بجائے خود ایک ایسی صنعت یا آرٹ ہے جس کے لیے ادبی کمال کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس کا شمار بھی بالواسطہ ادبی کمالات میں کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال وہ ایک آرٹ تو ضرور ہی ہے، ادبی ہو یا غیر ادبی۔ اور کسی آرٹ کے بہترین نمونوں کو مٹانا کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لفظی صنعتوں کا مٹ جانا کوئی بہت بڑا نقصان نہ سہی، پھر بھی نقصان تو ہے ہی اور بغیر کسی بڑے

فائدے کی امید کے کوئی چھوٹا سا نقصان بھی کیوں برداشت کیا جائے۔

حرفوں کی تبدیلی سے ایک نقصان یہ بھی ہوگا کہ حساب جمل کا وجود نہ رہے گا اور وہ بے شمار تاریخی نام اور قطعات تاریخ جو جودت طبع اور قوت تلاش کے حیرت خیز مظاہرے ہیں اور گزشتہ حالات و واقعات کا زمانہ معین کرنے میں بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں سب بے کار ہو جائیں گے۔

یہ چند باتیں جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ کسی زبان کے لیے جو رسم الخط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہے اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور تک پہنچنے والے تعلق قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ ریشے میں اس طرح بھد جاتا ہے کہ اس کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی ضروری ہے۔

مختلف پہلوؤں سے نظر کرنے کے بعد یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ اُردو کا موجودہ رسم الخط برقرار رکھا جائے۔ اپنی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس میں اصلاحیں کی جاسکتی ہیں، مگر صرف ایسی جو اس کی صورت کو مسخ نہ کردیں۔ آج کل بعض لوگ اُردو کے لیے نئے نئے خط ایجاد کر رہے ہیں۔ ان صاحبوں سے درخواست ہے کہ وہ ایجاد کی زحمت میں نہ پڑیں، اصلاح کی مناسب صورتیں تجویز کریں۔ ہندوستان میں نستعلیق ٹائپ آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے تیار ہو چکا تھا اور متعدد مطبعوں نے اس سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ مگر غالباً طباعت کی دشواریوں سے مجبور ہو کر اہل مطبع نے کچھ مدت تجربہ کرنے کے بعد اس ٹائپ کو ترک کر دیا۔

نستعلیق ٹائپ کے مطبعے زیادہ تر کلکتہ میں قائم کیے گئے تھے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں، مطبع محمدی، مطبع نبوی، مطبع احمدی، مطبع طبی، مطبع کریمی، مطبع انوری، مطبع مراۃ الاخبار، مطبع محمد فیض اللہ۔ ان مطبعوں کی چھپی ہوئی دو درجن کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

چھپائی میں آسانی کے خیال سے حرفوں کی صورت میں کسی قدر تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی ایسی ہونا چاہیے کہ چھپے ہوئے اور لکھے ہوئے لفظ صورت میں ملتے جلتے ہوں تاکہ جو کوئی چھپا ہوا لفظ پڑھ سکتا ہو وہ لکھا ہوا لفظ بھی آسانی سے پڑھ لے۔

حواشی

(۱) پرائمر کلکتہ سکول بک سوسائٹی کے لیے چھاپی گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مکرمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (ادیب)

(۲) یہ مثالیں پروفیسر جونس کے ایک رسالے سے لی گئی ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

ہمارا رسم الخط

انگریزی تعلیم اور مغربی اثرات کے زیادہ سے زیادہ فروغ پا جانے کے بعد جہاں اور بہت سے اثرات رونما ہوئے، ان میں ایک خطرناک مسئلہ رسم الخط کا بھی ہے۔ پھر وہ تخم جو انیسویں صدی کے شروع میں اُردو اور ہندی کے نزاع کے لیے بویا گیا تھا، اس نے بھی ایک عرصہ کے بعد رسم الخط کا مسئلہ چھیڑا۔ چنانچہ موجودہ صدی میں اُردو انگریزی (یا رومن) رسم الخط اور اُردو اور ناگری رسم الخط پر موافق اور مخالف اس قدر بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ سنتے سنتے کان پک گئے۔ مگر نتیجہ پھر بھی کچھ نہیں۔ کوئی جماعت دوسرے فریق سے اپنا نظریہ نہ منوا سکی۔

نسخ و نستعلیق کا فرق رسم الخط کا کوئی بنیادی اور اختلافی مسئلہ نہیں۔ اسی طرح لیتھو اور ٹائپ کا فرق صرف تجارتی اور اقتصادی مصلحتوں سے علاقہ رکھتا ہے۔ مغربی پاکستان میں اُردو اور ناگری رسم الخط کا کوئی مسئلہ نہیں۔ البتہ رومن رسم الخط کی موافقت میں سوچنے والے یہاں بھی ہیں اور اسی لیے وقتاً فوقتاً یہ بحث اٹھتی رہتی ہے۔ اس لیے میں اس وقت کی بحث کو اُردو رسم الخط اور انگریزی رسم الخط تک محدود رکھوں گا۔

بحث کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ سہولت کی خاطر میں یہ راستہ اختیار کرتا ہوں کہ اول ان اعتراضات کا ذکر کروں جو ہمارے موجودہ رسم الخط پر کیے جاتے ہیں۔ ان اعتراضات کا نچوڑ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اُردو رسم الخط سیکھنے میں دیر لگتی ہے۔ اس کے مقابلے میں رومن رسم الخط جلد سیکھ لیا جاتا ہے۔

۲۔ اعراب کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور چونکہ اعراب عام طور پر لکھنے میں نہیں آتے، اس لیے قاری کی الجھن برابر قائم رہتی ہے، اس کے برعکس رومن رسم الخط میں اعراب حروف کے ساتھ ساتھ شامل رہتے ہیں۔

۳۔ جدید علوم و فنون جن زبانوں میں ہیں وہ تمام رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر شروع سے ہی اس رسم الخط کو رواج دیا جائے تو تحصیل علوم بہت آسان ہو

جاتی ہے۔

۴۔ رومن رسم الخط کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔ مانا کہ ہم صرف انگریزی زبان سیکھیں اور پڑھیں گے لیکن دوسری زبانیں بھی ہمارے لیے اجنبی اور نامانوس نہ رہیں گی۔

۵۔ ہمارے رسم الخط میں حروف شمسی وقمری (ال والے) اور واؤ معدولہ تو بہر حال ایسی چیزیں ہیں جو مبتدی تو کیا اوسط علمیت والے کے لیے بھی الجھن کا سبب بنی رہتی ہیں۔

۶۔ مشابہ الصوت حروف جیسے ذ۔ز۔ظ۔اورض (نیز نسخ ونستعلیق میں لکھی جانے والی زبانوں کے دوسرے مخصوص تلفظ والے حروف) کا صحیح تلفظ تو کسی طرح بھی دوسروں سے صحیح نہیں ادا ہوسکتا۔ اگر رسم الخط بدل دیا جائے تو اس بکھیڑے سے نجات مل جائے گی۔

آیئے ان اعتراضات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں۔

پہلا اعتراض بظاہر جس قدر وزنی نظر آتا ہے اتفاق سے اتنا ہی ہلکا ہے۔ موجودہ صدی میں جن لوگوں نے تعلیم بالغاں کے تجربے کیے ہیں، ان کے نتائج عمل اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یعنی ہمارے موجودہ رسم الخط کو اناڑی آدمی بھی جلد سے جلد سیکھ لیتا ہے۔ اس کے برعکس رومن رسم الخط کی تعلیم بہت زیادہ وقت لیتی ہے۔ رومن رسم الخط ایک مدت تک فوج میں رائج رہا۔ اور جاننے والوں کو اعتراف ہے کہ سپاہیوں کو برسوں میں بھی اس رسم الخط سے مناسبت وموانست نہیں پیدا ہوتی تھی۔

نریندر ناتھ نے اپنی مشہور انگریزی تصنیف ''ہندوستان میں سلاطین اسلام کے عہد میں علوم کی ترقی'' میں لکھا ہے: ''بچوں کو پہلے حروف تہجی سکھائے جاتے تھے، اس میں آٹھ روز صرف ہوتے تھے۔ پھر املا سکھانے میں آٹھ دن لگتے تھے۔ اس کے بعد جملے اور اخلاقی فقرے پڑھائے جاتے تھے اور لڑکا ایک مہینہ کے اندر خود اُردو لکھنے لگتا تھا۔''

کیا ایک غیر آدمی کی یہ شہادت ہمیں مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟

بطور لطیفہ کے ایک اور شہادت سنیے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ ہم لوگ اسلامیہ کالج پشاور کے سٹاف کلب کے سبزہ زار میں بیٹھے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں سے ایک صاحب جو رومن رسم الخط کے بڑے پر جوش حامی تھے۔ ہمارے اُردو رسم الخط پر اعتراض کر رہے تھے اور رومن رسم الخط کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔ ان کی باتیں تیر ونشتر بن کر ہمارے دل وجگر کو چھید رہی تھیں مگر ہم ادباً بحث سے گریز کر رہے تھے کہ اتنے میں

اسلامیہ کالج کے پرنسپل میجر آرتھر برادرٹن آ گئے اور خاموشی سے ان بزرگ کی تقریر سنتے رہے۔ جب ان بزرگوار نے کہا کہ میں نے اپنے نوکر کو دونوں رسم الخط بیک وقت سکھانے شروع کیے اور میں نے دیکھا کہ اس نے انگریزی رسم الخط جلد سیکھ لیا۔ ''مگر میرا تجربہ تو اس کے برعکس ہے'' مسٹر برادرٹن یکا یک مداخلت کرتے ہوئے بولے۔ ان کے یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ ہم سب نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے فرمایا کہ ''یہاں آنے سے قبل میں کالون تعلقدار کالج لکھنو میں تھا۔ میں نے اپنے دونوں کم عمر بچوں کو انگریزی اور اُردو پڑھنے کے لیے ساتھ ہی ساتھ بٹھایا۔ کچھ ہفتے گزرنے کے بعد میں نے ان کا امتحان لیا تو معلوم ہوا کہ وہ انگریزی پڑھنے میں کچے تھے لیکن اُردو رواں پڑھنے لگے تھے۔''

یہ تجربہ ایک انگریز کا ہے اور ظاہر ہے کہ انگریزی ان بچوں کی مادری و پدری زبان تھی۔ اُردو تو شاید ان مولوی صاحب یا ماسٹر صاحب کے علاوہ وہ کسی سے سنتے بھی نہ ہوں گے۔ پھر بھی جہاں تک خواندگی کا تعلق ہے، ہمارا رسم الخط ان بچوں کی اپنی زبان کے رسم الخط سے ان کے لیے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ آپ اجازت دیں تو میں اتنا اضافہ کروں گا کہ انگریزی پڑھانے والا لازماً کوئی سند یافتہ استاد یا میم صاحب ہوں گی اور اُردو کے لیے کسی بیچارے معمولی سے مولوی منشی کو ملازم رکھا گیا ہو گا لیکن رسم الخط کی سہولت ایک غیر ماہر شخص کے ذریعے سے بھی اپنی برتری منوائے بغیر نہ رہی۔

دوسرے اعتراض سے عام طور پر لوگ بیحد مرعوب ہوا کرتے ہیں لیکن اگر آپ صوتیات کے چند بنیادی قواعد سے واقف ہیں تو پھر بات خود ہی صاف ہو جاتی ہے۔

یاد رکھیے کہ تلفظ حقیقت میں ایسی نازک چیز ہے کہ لکھا ہوا لفظ زیادہ سے زیادہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے، اس کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ حروف کی آوازوں اور ان کی حرکات میں ایسے باریک فرق ہوتے ہیں کہ ان کو علامتوں کے ذریعے بالکل ٹھیک ظاہر نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ماہرین صوتیات کی رائے یہ ہے کہ ہر لفظ کی مکتوبی صورت صرف ایک ہونی چاہیے اور لفظ کی تحریری صورت کو اس کے تلفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں، بلکہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہیے جو تلفظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہنمائی کرتی ہے۔

صوتیات کا دوسرا مسلم مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں ایسی قوتیں موجود ہیں، جن سے تلفظ کی بہت سی دشواریاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ ابتدا میں کچھ لفظوں کی املا یاد کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بعد مشاہدے کی تکرار سے بہت سے لفظوں کے نقش بغیر کسی کاوش کے ہمارے ذہن میں اتر آتے ہیں اور پھر ہم مماثلت، مشابہت، تقابل، اشتقاق وغیرہ کی رہنمائی سے ان لفظوں کے قیاس پر دوسرے لفظوں کی مکتوبی صورت کا اندازہ

کر لیتے ہیں اور ان کے تلفظ میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس طرح اگر کچھ ابتدائی دشواریاں ہوں تو وہ بھی عمل کی منزل میں پہنچ کر آسان ہو جاتی ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی لفظ ایک ایک حرف کو ٹٹول کے ایک ایک حرف کے ہجے کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ بلکہ اس لفظ کی معین صورت اس تلفظ کی ایک مستقل علامت بن کر ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ اس طرح صورت، تلفظ اور معنی میں ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ ادھر لفظ کی صورت آنکھوں کے سامنے آئی اور ادھر وہ پڑھ بھی لیا اور سمجھ میں بھی آ گیا۔

اس کے بعد چوتھی چیز یہ سمجھیے کہ اُردو رسم الخط میں لفظ کا ڈھانچا صرف حروف (Consonants) سے بنتا ہے۔ اعراب (Vowels) اس ڈھانچے کے اندر بیٹھے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس لیے اس لفظ کا جو نقش دماغ میں بنتا ہے، اس میں یہ ڈھانچا بہت اجاگر ہوتا ہے۔ اگر اوپر یا نیچے اعراب لگا دیے جائیں، تب بھی وہ اعراب بہت دھندلے رہتے ہیں اور اصل چیز وہ ڈھانچا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے اعراب کے ترک کر دینے سے لفظوں کے ڈھانچے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو عبارت بغیر اعراب کے بآسانی پڑھ لی جاتی ہے۔ جن تحریروں میں اعراب لفظوں کے ڈھانچے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں (جیسا کہ رومن رسم الخط میں) ۔ وہاں یہ آسانی نہیں پیدا ہو سکتی اور ذہن اعراب کے پیچھے بھٹکتا پھرتا ہے۔ اس گفتگو سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ رومن رسم الخط میں اعراب لگانے سے جو خلفشار پیدا ہوتا ہے اور جو اپنی جگہ بے حد اہم ہے، اس کا تذکرہ بعد میں کروں گا۔

اب آیئے تیسرے اعتراض پر لیکن ذرا سوچیے تو اس بات سے صرف انگریزی کی کون سی بڑائی نکلتی ہے جب کہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جدید علوم وفنون پر جرمنی اور روسی زبانوں میں جو ذخیرہ ہے، وہ بعض اعتبارات سے انگریزی سے کچھ زیادہ ہی اہم ہے تو جس طرح ان زبانوں کے تراجم انگریزی میں کیے جاتے ہیں، اسی طرح کسی بھی دوسری زبان میں کیے جا سکتے ہیں، مثلاً عرب ممالک نے ان علوم کو عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ترکی اور ایران بھی یہی کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ لوگ کسی غیر زبان کے محتاج نہ رہیں گے۔ ان سے زیادہ روشن مثال جاپان اور نئے چین کی ہے۔ ان دونوں ملکوں کا رسم الخط تو ساری دنیا سے الگ اور سب سے زیادہ مشکل ہے لیکن جدید علوم وفنون میں ان کی ترقی قابل رشک ہے اور کیا عجب ہے کہ وہ رومن رسم الخط والے ممالک سے آگے نکل جائیں۔

چوتھا اعتراض بھی اسی کے ساتھ ملا لیجیے تو بات اور زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔

رومن رسم الخط کی بین الاقوامی حیثیت ہمارے کسی بھی ایشیائی رسم الخط سے صرف اس لیے زیادہ ہے کہ اس رسم الخط والے ممالک علوم وفنون میں نیز سیاسی اعتبار سے دوسری اقوام وممالک سے بہت آگے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ انگریزی زبان جاننے والے کے لیے دوسری وہ تمام زبانیں جو رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں پانی ہو جاتی ہیں۔

ہم آپ بھی انگریزی جانتے ہیں لیکن کیا ہم اسی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہر دوسری زبان پڑھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ جرمنی، روسی، فرانسیسی، یونانی ہسپانوی وغیرہ ہر زبان ہمارے لیے یکسر اجنبی ہوتی ہے حالانکہ ان سب کا رسم الخط وہی رومن رسم الخط ہے۔

موجودہ دور میں جدید علوم وفنون حاصل کرنے اور علوم کی ترقی میں شرکت کی خواہاں جماعتوں اور افراد کے لیے یقیناً لازم ہے کہ وہ انگریزی ہی نہیں، جرمنی، روسی، چینی وغیرہ زبانیں سیکھیں۔ ان کا یہ فعل کئی لحاظ سے ملک اور قوم کے لیے از بس مفید اور ضروری ہے لیکن اس بات کا رسم الخط کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔

آخری دو اعتراضات پر ایک ساتھ گفتگو کی جائے تو ہم تکرار سے بچ جائیں گے۔ اگر سچ پوچھیے تو میں نے صوتیات کے جو چند اصول پہلے بتائے وہ الؔ، واوِ معدولہ اور مشابہ الصوت حروف و الفاظ پر بھی یکساں منطبق ہوتے ہیں۔ ان کو دوسرے الفاظ سے علیحدہ کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ مگر ایک اور طرح بھی اس بات پر غور فرمایے۔

عربی کے الؔ اور فارسی کی واوِ معدولہ کے لیے تو قاعدے مقرر ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی الفاظ کو دیکھیے تو ان میں کتنے ہی خاموش حروف نظر آتے ہیں جو قطعی بے ضرورت ہوتے ہیں اور ان کے لیے کوئی قاعدہ بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے معترضین کو سب سے زیادہ الجھن مشابہ الصوت حروف سے ہوتی ہے۔ مگر ذرا یہ تو دیکھیے کہ وہ گنتی میں کتنے ہیں۔

دو دو حرف: یعنی تؔ اور طؔ۔ حؔ اور ہؔ۔ اور ءؔ اور عؔ ایک ہی آواز ادا کرتے ہیں۔

تین حرف: یعنی ثؔ۔ سؔ۔ صؔ۔ ایک ہی آواز کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

چار حرف: یعنی ذؔ۔ زؔ۔ ظؔ۔ ضؔ ایک ہی آواز کے لیے آتے ہیں۔

بس ان کے علاوہ کوئی اور حرف ایسا نہیں جو دوسرے حرف کا قائمقام یا مشابہ ہو سکے لیکن اس کے

برعکس انگریزی میں جہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں، وہاں ایک ایک حرف کی کئی کئی آوازیں بھی ہیں۔ اس لیے یہاں دو مشکلات کا سامنا ہے یعنی ایک طرف تو بولے ہوئے لفظوں کا لکھنا مشکل ہے اور دوسری طرف لکھے ہوئی لفظوں کا پڑھنا دشوار ہے۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہم ایک مشکل سے جان چھڑانے کے لیے دو مشکلوں میں پھنس جائیں؟

اب ایک اور بات سوچیے۔ اُردو میں ہر آواز ایک مفرد حرف سے ادا کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس انگریزی میں مرکب اور دہرے حروف سے بھی بہت کام لیا جاتا ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ایسے حروف کی آوازیں بھی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتیں۔ جیسے CH کہ کہیں یہ چ کی آواز دیتا ہے۔ کہیں ک کی اور کہیں ش کی۔ تو گویا اپنے رسم الخط کو بدل کر ہم ایک بھول بھلیاں میں پھنس جانا چاہتے ہیں!!!

اسی ذیل میں رومن رسم الخط کی بابت چند اور باتوں پر بھی غور فرمائیے۔ فرض کیجیے کہ آپ نے اپنا رسم الخط چھوڑ کر انگریزی حروف اختیار کر لیے۔ آپ نے لکھا MAZE اب بتائیے اسے میز پڑھیے گا یا مزے۔ آپ نے لکھا MAIL یہ میل ہوا یا میل۔ آپ نے لکھا LOG اسے لوگ پڑھیے گا یا لاگ۔ اسی طرح آپ نے لکھا THE۔ بتائیے یہ تھے ہوا یا دی۔ ''من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید'' کی اس سے بہتر مثال مشکل سے ملے گی۔

ایک اور مزید بات سنیے۔ انگریزی میں حرکات کی علامات (جو حروف کی شکل میں لکھی جاتی ہیں) مفرد، مرکب، دہری اور بے ضرورت سبھی طرح کی ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے اور اس کے باوجود نہ کسی حرکت کے لیے کوئی ایک علامت مخصوص ہے، اور نہ کسی علامت کے لیے کوئی ایک حرکت مخصوص ہے، مثلاً

(الف) ان پانچ الفاظ میں ایک ہی حرکت کے لیے پانچ علامات استعمال کی گئی ہیں:

GO -FOE -ROAD -GROW -SHOULDER

(ب) ان چار الفاظ میں ایک ہی علامت مختلف حرکات کا کام دے رہی ہے:

DOES - POET -SHOE -FOE

(ج) حرکت کی علامت صرف متحرک حرف کے ساتھ لائی جاتی ہے۔ مگر انگریزی میں اس کے خلاف ساکن حرف کے بعد بھی یہ علامت آ جاتی ہے۔ جیسے ان الفاظ کے آخر کی E۔

DATE - JOKE - WINE

(د) ایک معمولی سا لفظ ہے۔ CONCEIVE

انگریزی میں اس لفظ کو لکھنے کے لیے ۹۶ صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں، جو ایک ہی آواز ادا کرنے والے حرفوں کو بدلنے سے پیدا ہوتی ہیں، مثلاً اس لفظ میں آپ

(i) C کی جگہ K اور CH بھی لکھ سکتے ہیں۔

(ii) O کی جگہ U بھی آ سکتا ہے۔

(iii) دوسری C کی جگہ S بھی ہو سکتا ہے۔

(iv) EI کی جگہ EE یا IE یا EA بھی لکھا جا سکتا ہے۔

(v) آخری حرف E محذوف بھی ہو سکتا ہے۔

اور لطف یہ ہے کہ ان ۹۶ شکلوں میں کوئی رواج اور استعمال کے خلاف نہیں کہی جا سکتی۔ اس لیے کہ دوسرے الفاظ میں یہ حروف انھی آوازوں اور استعمالوں میں نظر آتے ہیں۔ تو کیا اس گورکھ دھندے میں پھنسنا ہمارے لیے آفت جان نہ بن جائے گا!

اب ذرا اپنے رسم الخط کا انگریزی رسم الخط سے ایک اور طرح موازنہ کیجیے:

(۱) اُردو کے مفرد حروف بہت مختصر اور سادہ ہیں اور جب وہ دوسرے حروف سے ملا کر لکھے جاتے ہیں اور بہت کم جگہ گھیرتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وقت کم صرف ہوتا ہے، تخیل میں روانی آتی ہے، اس جوہری دور کی عجلت اور مستعدی کے لیے بیحد موزوں ہے۔

(۲) اعراب کا الفاظ کے ڈھانچے میں شامل نہ ہونا، الف ممدودہ اور تشدید کا استعمال اُردو الفاظ کو آسان بھی کر دیتا ہے اور مختصر بھی۔ جو ضرورت زمانہ کے لیے ازبس مناسب ہے۔

(۳) یہی رسم الخط ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک میں رائج ہے اور ان تمام ممالک سے ہمارے گہرے ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی روابط قائم ہیں۔

(۴) مدت دراز کے تجربات کے بعد ہمارا رسم الخط ہماری ضروریات کے لیے مناسب قرار پا چکا ہے اور اگر ضرورت ہو تو اس میں جزئی اور ضروری اصلاحات اب بھی کی جا سکتی ہیں۔ دوسرا رسم الخط اختیار کیا گیا تو اس کی ترمیم واصلاح میں مدت لگے گی۔ پھر اس کا ہماری زبان سے ہم آہنگ بن سکنا ازبس مشکوک ومشتبہ ہے۔ تو ایسی تبدیلی سے کیا حاصل!!

اسی کے ساتھ اس پر غور فرمایئے کہ:

(۱) رسم الخط بدلنے سے زبان کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ ایسی کتنی مثالیں اسی برصغیر کی زبانوں سے لی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مسرا۔ گپتا۔ اچاریا۔ سریواستوا۔ بولا جاتا ہے اور تلفظ کی یہ تبدیلی صدقہ ہے صرف انگریزی رسم الخط میں لکھے جانے کا۔ ورنہ ان میں سے کسی لفظ کی آخری آواز الف نہیں ہے۔ یا مثلاً تانگا۔ تاتا۔ دالمیا۔ کو صرف رسم الخط کی زبردستی نے ٹانگا۔ ٹاٹا۔ اور ڈالمیا بنا دیا ہے۔ اگر خدانخواستہ رومن رسم الخط ہم پر مسلط کر دیا گیا تو ایسی لاتعداد ناپسندیدہ تبدیلیاں پیدا ہو جانی لازم ہیں۔

(۲) نیا رسم الخط ایک طرف تو ہمارا رشتہ ماضی سے منقطع کر دے گا اور دوسری طرف عربی و فارسی وغیرہ زبانیں بولنے والے ان ممالک سے جن کی زبانیں بحالت موجودہ ہمارے ہی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور جن سے ہمارے چند در چند روابط قائم اور مستحکم ہیں، نیز مغربی پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں سے، ہمیں بہت دور کر دے گا۔

(۳) ہمارا سارا علمی ثقافتی اور ادبی سرمایہ بیکار ہو جائے گا۔ مدت مدید اور صرف کثیر کے بعد بھی یہ سب اور اتنا کچھ دوبارہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ باوجود حکومت کے وعدے اور سرپرستی کے آج تک سب تو کیا تھوڑا سا بھی قدیم سرمایہ نئے رسم الخط میں منتقل نہیں کیا جاسکا۔ حالانکہ وہاں رسم الخط کی تبدیلی کے بعد چالیس سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔

(۴) اُردو رسم الخط سیکھنے میں جس قدر سہولت اور عجلت ہوتی ہے، اس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُردو رسم الخط سیکھنے میں انگریزی رسم الخط سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے تو سیکھ لینے کے بعد والے عمل کا بھی تو اندازہ کیجیے۔ ہمارے رسم الخط کی گوناگوں سہولتوں کے باعث بقیہ زندگی میں (یعنی تیس چالیس پچاس سال میں) وہ شخص جس قدر لکھے گا اور پڑھے گا، اس کی مقدار اُردو رسم الخط میں (بمقابلہ انگریزی رسم الخط کے) اتنی زیادہ ہوگی کہ اس ابتدائی ''مفروضہ'' دشواری یا زیان وقت کی بخوبی تلافی ہو جائے گی بلکہ حساب لگایئے تو اسے رومن رسم الخط کے

مقابلے میں فائدہ ہی رہے گا۔

(۵) پہلے صوتیات کے چند اصول بتائے جا چکے ہیں، پھر بھی فرض کیجیے کہ جن الفاظ کا ہمارا تلفظ یکساں ہے۔ مگر مشابہ الصوت حروف کے آ جانے کے باعث معنی یکسر مختلف ہوتے ہیں، اگر ایسے الفاظ کا املا یکساں ہو جائے تو کیا ہوگا؟

یقین کیجیے کہ جو غلط فہمی اب کانوں کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، پھر آنکھیں بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گی اور معنے سمجھنے ناممکن ہو جائیں گے۔ مثلاً

جال، جعل ۔ باد، بعد ۔ سدا، صدا ۔ تواب، صواب ۔ نال، نعل ۔ نظیر، نذیر ۔ عرض ارض ۔ سفر صفر ۔ حال ہال ۔ زن ظن ۔ تانا طعنہ ۔ ماًمور معمور ۔ سورت صورت وغیرہ وغیرہ۔

اب ذرا انگریزی یا رومن رسم الخط پر ایک نظر ڈالیے:

(۱) (الف) رومن رسم الخط میں ہمارے رسم الخط سے زیادہ جگہ وقت ہوتی ہے۔

(ب) رومن رسم الخط کے لکھنے میں ہمارے رسم الخط سے زیادہ جگہ صرف ہوتا ہے۔

(ج) رومن رسم الخط کے پڑھنے میں ہمارے رسم الخط سے زیادہ جگہ صرف ہوتی ہے۔

(د) رومن رسم الخط کی طباعت میں ہمارے رسم الخط سے زیادہ جگہ صرف ہوتی ہے۔

(ہ) رومن رسم الخط کی طباعت ہمارے رسم الخط سے زیادہ گراں ہے۔

اس لیے رومن رسم الخط اختیار کرنے سے بے اندازہ وقت، قوت، روپیہ کا زیاں ہوگا اور

(۲) اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

(الف) عوام کو تعلیم دینے کی مدت بڑھ جائے گی۔

(ب) مطبوعات کی تعداد کم ہو جائے گی۔

(ج) ہماری زبانوں کے ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

(د) جوہری دور میں جس اختصار اور سرعت کی ضرورت ہے، وہ ہمیں حاصل نہ رہے گی۔

اور اس طرح اس مسودے میں ہمیں خسارہ ہی خسارہ ہوگا۔

(۳) رومن رسم الخط میں کہنے کو تو ۲۶ حروف ہیں لیکن دراصل ۱۰۴۔

اس لیے کہ ہر حرف کی چار شکلیں ہیں کیونکہ طباعت اور دستی تحریر کے لیے CAPITAL اور SMALL حروف قطعاً الگ الگ ہیں۔

(۴) رومن حروف قطعاً غیر صوتی (UN PHONETIC) ہیں، جیسے W کہ اس کی آواز میں D آتا ہے۔ حالانکہ یہ آواز دیتا ہے V سے ملتی جلتی۔ اسی طرح S-R-N-M-L-H-F کہ ان سب کی ابتدا میں الف (یا الف ی) خواہ مخواہ آ جاتے ہیں۔ یا Y کہ اس کی آواز اس کے تلفظ سے بالکل مختلف ہے۔

(۵) ذرا سوچنے کی بات ہے کہ ابتدا میں آوازوں کے حروف کی جو شکل مقرر کی جاتی ہے، وہ بتدریج چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ارتقا کی یہ قدرتی اور سائنٹیفک شکل ہے۔ ہمارے رسم الخط کے شوشے اسی ارتقا کی کامیاب صورت ہیں۔ جن زبانوں نے حروف کی ان چھوٹی شکلوں (یعنی شوشوں) کو رواج نہیں دیا وہ گویا اسی فرسودہ شکل پر قائم ہیں اور رسم الخط کے سائنٹیفک ارتقا سے بہت دور ہیں۔
لفظ کے اس اختصار کا اب یورپ کے ماہرین رسم الخط نے احساس اور اعتراف کر لیا ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنے رسم الخط کو ناقص قرار دیا ہے اور زمانے کی رفتار، تیزی اور حرکت کے اس دور میں انھوں نے اس اختصار کو ازبس مناسب گردانا ہے۔

(۶) ماہرین رسم الخط رومن رسم الخط کو شدید طور پر ناقص اور خود انگریزی (نیز دوسری مغربی زبانوں) کے لیے ناکافی سمجھنے لگے ہیں اور اب مغرب میں اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگی ہیں۔
جولین گولڈ (JULIAN GOLD) ایک مشہور ماہر رسم الخط ہے۔ اس کا ایک مضمون انگریزی رسالہ ''سیکرٹری'' میں چھپا تھا۔ وہاں سے نقل کر کے پاکستان ٹائمز نے ۱۹۔ اپریل ۱۹۵۹ء کو اسے شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں وہ شدید ترین الفاظ میں رومن رسم الخط کی مخالفت کرتا ہے اور پرزور سفارش کرتا ہے کہ اسے فوراً بدل دیا جائے۔ اس کی رائے ہے کہ یا تو حروف تہجی میں زبردست تبدیلیاں کی جائیں یا موجودہ رسم الخط کو یکسر ترک کر دیا جائے۔

اسی طرح برنارڈ شا مستقل اس رسم الخط کی مخالفت کرتا رہا اور اس نے آئندہ ریسرچ کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ اس ٹرسٹ کے ماتحت کام کرنے والے محققین و ماہرین نے کچھ عرصہ ہوا سفارش کی تھی کہ موجودہ انگریزی رسم الخط کو فوراً بدل دیا جائے۔

کیا ان حالات کے ہوتے ہوئے آپ ہمیں انگریزی رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دینا پسند کریں گے؟
اس تبدیلی رسم الخط کے مبلغین کے سامنے ایک بڑی مضبوط دلیل جدید ترقی کا عمل ہے لیکن اس استدلال کی حقیقت ''دور کے ڈھول'' اور ''ڈھول کے پول'' سے زیادہ نہیں۔ اول تو یہی بات غور وفکر کے لائق

ہے کہ ترکی کی تقلید کا خیال ان دوسرے ملکوں کو کیوں نہیں آیا جو نسخ و نستعلیق رسم الخط کو ہمیشہ سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ دوسرے یہ دیکھیے کہ ترکی نے اپنے اس عمل سے کیا کھویا اور کیا پایا۔ ۱۹۵۱ء کے اوائل سرما میں ترک اساتذہ وطلبہ کا ایک ثقافتی وفد پاکستان آیا تھا۔ اسلامیہ کالج پشاور میں ان میں سے بعض پروفیسروں سے ہمیں بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے صاف دلی سے اعتراف کیا تھا کہ نجی طور پر اب بھی ہم اکثر نسخ یا نستعلیق رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔''

میں خود ابھی کچھ مہینے ہوئے ڈھائی سال رہ کر ترکی سے واپس آیا ہوں۔ اپنے ذاتی علم کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس سال یا زیادہ عمر کے ''ہر طبقے'' کے لوگ اکثر قدیم رسم الخط ہی استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اسی میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ترکی کے لیے رومن رسم الخط اختیار کرنا علمی، ادبی اور ثقافتی اعتبار سے سخت نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ H.C.HONEY نے ایک ترکی انگریزی ڈکشنری مشہور ترک عالم FAHIRIZ کی مدد سے مرتب کی ہے۔ اس کے دیباچہ میں وہ اس بات کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ:

''اس طرح موجودہ تحریری زبان اس زبان سے بالکل دور جا پڑی ہے جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔''

دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے کہ:

''اب تک اکثر اہل قلم عربی رسم الخط میں لکھنا پسند کرتے ہیں اور ان کی اس تحریر کو رومن رسم الخط میں منتقل کرنے کا کام پریس انجام دیتا ہے۔ نتیجہ ظاہر کہ ہجے کے معاملے میں ایک ایسا خلفشار برپا ہے جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔''

یہ لغت ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ تو گویا ۱۹۲۸ء کی اصلاح تیس سال گزرنے کے بعد بھی نہ تو دلوں میں گھر کر سکی اور نہ علمی ادبی الجھنوں کا حل نکال سکی۔

انقرہ یونیورسٹی کے ایک بہت سینئر پروفیسر کا عمل خود میرے سامنے ہے۔ میرے ترک اسسٹنٹ نے ایک عرضی لکھی تھی جو اصلاح اور اضافے کے لیے میں نے ان کے سامنے پیش کی۔ انھوں نے بعض ترمیمیں تجویز فرمائیں۔ میں نے کہا یہی میرا مقصد ہے کہ آپ اسے بہتر شکل میں ڈھال دیں۔ ان کو جو اضافے کرنے تھے وہ ساری عبارت انھوں نے اول الگ کاغذ پر عربی رسم الخط میں لکھی اور پھر اسے عرضی میں رومن رسم الخط میں درج کیا۔ یہ ۱۹۷۰ء کے اوائل کی بات ہے۔

میرے نظریہ کی تصدیق دور حاضر کے ایک عالم اور مفکر کی زبان سے سنیے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک مشہور امریکی ادارے AMERICAN FRIENDS OF MIDDLE EAST کے ریسرچ اور مطبوعات کے شعبہ کے ڈائریکٹر مسٹر بیتھ مین ERICH W, BATHMANN پاکستان آئے تھے۔ موصوف نے یہاں کے تعلیمی و تحقیقی مسائل کا جائزہ لیا۔ علمی اور تحقیقی اداروں میں گئے اور اہل علم سے مختلف مسائل پر گفتگو کی۔ رسم الخط کے مسئلے پر بھی موصوف نے بحث و تمحیص کی۔ غور و فکر کے بعد آپ نے جو رائے قائم کی، وہ انھوں نے ایک خط مؤرخہ ۱۳- جولائی ۱۹۶۱ء میں کرنل عطاالرحیم سابق پرنسپل اُردو کالج کراچی کو لکھ کر بھیجی تھی۔ اس خط کا متن یکم اگست ۱۹۶۱ء کے قومی زبان سے نقل کرتا ہوں۔ دیکھیے یہ انگریزی زبان کا عالم و محقق رسم الخط کی بابت ہمیں کیا مشورہ دیتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس خط میں لکھا تھا:

> ''اُردو کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کرنا ایک افسوس ناک امر ہوگا۔ اس طرح پاکستان کے ماضی کا تمام ادبی سرمایہ پاکستانی ثقافت کا حصہ نہ رہے گا اور اس تک ایک عام طالب علم کی دسترس نہ رہے گی۔ پاکستان کے روحانی ورثے کا مطالعہ یا تو مخصوص ماہرین ہی کر سکیں گے یا پھر ایسے طالب علم جنھیں اس کام کے لیے خاص فرصت ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ اس میکانکی زمانے میں فرصت ایک نایاب چیز ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کا ماضی اس کی آئندہ نسلوں کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائے گا۔''

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اور علم الاقوام اس کی شہادت دیتے ہیں کہ کسی زبان کے لیے جو رسم الخط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہے، اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور رس تعلقات قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ و ریشہ میں اس طرح بدھ جاتا ہے کہ رسم الخط کے بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی لازمی امر ہے یہی حال اس قوم کا ہے جو اپنی زبان کے لیے ایک رسم الخط رکھتی ہے۔ اگر اس رسم الخط کو مطلقاً بدل دیا جائے تو وہ قوم اپنے ماضی، روایات، ادب، ثقافت، علوم، فنون سب سے بیگانہ ہو جائے گی۔ گویا صدیوں کی ترقی کے بعد وہ پھر اپنے بچپن کی طرف لوٹ جائے گی اور اس طرح اسے ایک ایسے عظیم خسارے سے واسطہ ہوگا جس کی کسی طرح تلافی نہیں کی جا سکتی۔

(پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے منعقد کردہ مجلس مذاکرہ میں ۳۱- جولائی ۱۹۷۱ء کو پڑھا گیا)

☆☆☆

مغنی تبسم

بھارت

خط نستعلیق

خطاطی کو ایک فن لطیف کی حیثیت سے ترقی دینے میں مسلمانوں کا خاص حصہ رہا ہے۔ خالد بن ابوالہیاج نے کوفی خط کو درجۂ کمال پر پہنچایا اور کئی خط ایجاد کیے۔ اس کے بعد کئی ماہرین فن پیدا ہوئے اور کئی خطوط ایجاد ہوئے۔ ابن مقلہ کے زمانے میں بارہ سے زیادہ رسوم الخط رائج تھے جیسے قلم الجلیل، قلم الدیباج، قلم الزنبور، خط مرصع وغیرہ۔

ابن مقلہ ۳۱ - مارچ ۸۸۶ء کو بغداد میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ خط کوفی کو انھوں نے کمال پر پہنچایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو چھ خط ایجاد کیے وہ یہ ہیں: ۱۔ خط ثلث، ۲۔ خط نسخ، ۳۔ خط توقیع، ۴۔ خط رقاع، ۵۔ خط محقق، ۶۔ خط ریحان۔ ان خطوط کی ایجاد کے بعد بہت سے قدیم خط معدوم ہو گئے۔

۹۳۴ء میں حسن فارسی نے رقاع اور توقیع کو ملا کر ایک نیا خط تعلیق ایجاد کیا۔

ابن مقلہ کے ایجاد کردہ چھ خطوط کے بعد خط تعلیق کو بھی پایۂ استناد حاصل ہوا۔ جیسا کہ مولانا جامی کہتے ہیں:

کاتباں را ہفت خط باش بہ طرزِ مختلف
ثلث و ریحان و محقق، نسخ و توقیع و رقاع
بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہل عجم
از خط توقیع استنباط کردند اختراع

ملا میر علی تبریزی (پیدائش: ۱۳۳۰ء۔ وفات: ۱۴۰۵ء) نے خط نسخ اور خط تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط (نسخ + تعلیق) نستعلیق ایجاد کیا۔ اس خط کو میر علی ہروی نے ترقی دی اور میر عماد الحسن قزوینی نے عروج دیا۔ نستعلیق کو ''احسن الخطوط'' اور ''عروس الخطوط'' کہا گیا ہے۔ یہ خط خوبصورت اعضائے انسانی کی تمثیل ہے۔

حرف ل میں زلف یار کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ اس کی میم کی گھنڈی گویا جعدِ مشکیں ہے۔ حرف صاد میں چشم سرگیں کا حسن ہے۔ اس کے آفتابی دائرے حسینوں کے چہرے ہیں' حرف الف معشوق کا قامت ہے' حرف س کے دندانے گوہر دنداں ہیں۔ حرف م کا نزول ساق سیمیں کے مانند ہے' ق اور ف کی گردن حسینوں کی گردن سے مشابہ ہے۔ نستعلیق وہ خط ہے جس نے خط تعلیق کو منسوخ کر دیا۔ خط نستعلیق کی خوبی اور صفائی کی بنا پر فارسی اور اُردو میں بعض محاورے تراشے گئے۔ فارسی میں پر تکلف گفتگو کرنے کو نستعلیق حرف زدن یا نستعلیق گوئی کہتے ہیں۔ اُردو میں شائستہ اور مہذب آدمی کے لیے کہتے ہیں کہ بڑا نستعلیق آدمی ہے۔

خط نستعلیق ایک جامع خط ہے۔ تعلیق یا شفیعہ کی طرح اس میں حروف کو ملانے کے لیے غیر ضروری طور پر زائد لکیریں نہیں کھینچی جاتیں۔

موجودہ دور میں دو خطوط نسخ اور نستعلیق ہی زیادہ رائج ہیں۔ خط نسخ عربی کے لیے مخصوص ہے۔ کمپیوٹر کتابت سے پہلے اُردو ٹائپ میں نسخ استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب اُردو اور پاکستان کی بعض زبانوں میں خط نستعلیق ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

خط نستعلیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر حرف از روئے قواعد مکمل ہوتا ہے۔ عبارت یا شعر کو مقررہ چوکھٹے میں بٹھانے کے لیے کبھی کشش سے کام لیا جاتا ہے کبھی حرف کے اوپر حرف لکھا جاسکتا ہے۔

نستعلیق میں حروف کو لکھنے کے قاعدے حسب ذیل ہیں:

۱۔ الف

تین قط کا ہوتا ہے۔ یہ حرف ابتدائی اور آخر میں باریک ہوتا ہے۔ بعض کاپی نویس الف کو پانچ قط میں لکھتے ہیں۔

۲۔ ب (پ۔ ت۔ ٹ۔ ث)

اس کا سر ایک نقطے کا ہوتا ہے۔ آخر کا حصہ سر سے ایک نقطہ نیچے رہتا ہے۔ درمیان میں ڈیڑھ نقطے کا فصل ہوتا ہے۔ خوش نویس اسے گیارہ قط' نو قط' سات قط' پانچ قط' یا چار قط سے لکھتے ہیں۔

۳۔ ج (چ۔ ح۔ خ)

اس کا سر نصف ہلال کے مانند ہوتا ہے۔ یہ دو قط کا ہوتا ہے۔ گردن تین قط کی ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ تین قط نیچے اور تین قط اوپر ہوتا ہے۔ قُطر تین قط کا ہوتا ہے۔ سر اور گردن میں ایک قط کا فصل ہوتا ہے۔

اس حرف کے دائرے دو طرح کے ہوتے ہیں: بیضوی اور گول۔

۴۔ د (ڈ۔ذ)

ایک نقطہ+ایک ر

۵۔ ر (ڑ۔ز۔ژ)

اس کا طول دو قط کا ہوتا ہے۔ سر اور دم نوک دار ہوتی ہے۔

۶۔ س (ش)

پہلا دندانہ ایک قط یا نصف قط، دوسرا دندانہ ڈیڑھ یا ایک قط کا ہوتا ہے۔ دائرہ ن کے قطر کے مانند تین قط اور گردن صراحی دار ہوتی ہے۔

۷۔ ص (ض)

ایک خم دار خفی خط اوپر کی طرف لے جائیں پھر اس سے تین قط کے قطر کا دائرہ ملا دیں۔ اندرونی حصے میں خربوزے کے بیج کی طرح شکل بنتی ہے۔

۸۔ ط (ظ)

دو قط کے الف میں ایک سیدھا اور ایک اُلٹا ''ر'' ملا دیں۔

۹۔ ع (غ)

سر صاد کے سر کے مانند، دائرہ مثل ج اور زیریں حصہ ب کی طرح ہوتا ہے۔

۱۰۔ ف

ایک نقطے کا سر بنائیں پھر اس میں ب کو ملائیں۔

۱۱۔ ق

ایک نقطے کا سر بنائیں۔ اس سے ایک تین قط کا دائرہ ملائیں۔

۱۲۔ ک

تین قط کا الف لکھیں (قط کی تعداد نو، سات، پانچ یا چار ہوسکتی ہے)۔ اس الف سے ب کو ملائیں۔

الف پر مرکز لگائیں۔

۱۳۔ گ

ک پر ایک اور مرکز لگائیں۔

۱۴۔ ل

ایک الف سے تین قط کا دائرہ ملائیں۔ الٹا لام کے دائرے کے وسط میں ایک نصف نقطہ لگائیں۔ پورا سر ایک نقطے کا ہو۔ اس سے پانچ قط کا الف ملائیں۔

۱۵۔ ن

نصف الف میں تین قط کا دائرہ ملائیں۔ دو قط کا سر + دو قط کی گردن + تین قط کا دامن۔

۱۶۔ و

ایک مدور نقطے سے ر ملا دیں۔

۱۷۔ ہ

ایک نقطہ لگا کر گول کر دیا جاتا ہے۔ دال میں ایک چھوٹی معکوس دال۔

۱۸۔ دو چشمی ہ (ھ)

دو چشم بادامی آخر میں ر سے ملتی ہوئی ایک لکیر۔ ہ لفظ کی ابتدا میں آئے تو ب کی سی شکل یا کشش بنا کر نیچے لٹکن (ہ) دی جاتی ہے۔ جیسے: ہم۔ اگر لفظ کے درمیان آئے تو کہنی کی شکل بنا کر لٹکن دی جاتی ہے۔ جیسے: کہنا۔

۱۹۔ ء

ہمزہ یائے معروف کی گردن کے مطابق ہوتی ہے۔

۲۰۔ ی

یائے معروف کا سر تین نقطوں کا۔ ایک نقطے کی گردن اور ڈھائی یا تین قط کا دائرہ ہوتا ہے۔

۲۱۔ ے

یائے مجہول ایک ر اور ایک ب کے ملنے سے بنتی ہے۔

مرکبات

دو حروف کو ملانے میں ان اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

۱۔ کسی لفظ میں دندانے دار اور شوشے دار حروف کو ملانا ہو تو پہلے کو باریک اور دوسرے کو موٹا لکھا جائے
جیسے: پیر۔ سیر

۲۔ دو شوشہ دار حروف کو بلا دندانہ حرف سے ملایا جائے تو پہلا موٹا اور دوسرا مہین ہوگا جیسے: ذہین۔ مبین

۳۔ ر سے پہلے کوئی حرف آئے تو ر کے لیے دندانہ نہ بنایا جائے بلکہ ماقبل حرف کا سر ذرا اٹھا کر پیوند لگائیں جیسے: ہنر:

۴۔ کسی عبارت یا شعر کو مقررہ حدود کے اندر لکھنے کے لیے مدٗ کشش اور کسی حرف کو دوسرے حرف کے پیٹ میں یا اوپر لکھ دیا جاتا ہے جیسے: کب (کب) نجات (نجات) شدت (شدت) شان (شان)

مد کو لفظ کے ابتدا یا درمیان میں لانا درست نہیں۔ بستہ اس لفظ کو یوں لکھیں بستہ

کسی لفظ میں ایک سے زیادہ کشش لانا مناسب نہیں۔

استغنا اس کے متبادل یہ الفاظ ہیں استغنا اور استغنا س کو کشش دینا احسن ہے۔

کسی لفظ میں کشش اور مد کی گنجائش ہو تو مد کو ترجیح دیں۔

کشش = حساس۔ وصال:

مد = حساس۔ وصال:

اساتذہ نے حسن پیدا کرنے کے لیے بڑی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ماہر خطاطوں کی وصلیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

☆☆☆